رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ

ماہنامہ

نئے افق

کراچی

نئے اُفق



مدیر اعلیٰ
مشتاق احمد قریشی

مدیر
عمران احمد

مدیر معاون
اقبال بھٹی

طاہر احمد قریشی

نورالدین



جلد	38
شمارہ	10
ستمبر	2014



رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رُکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر
رُکن چیمبر آف کامرس



پاکستان (فی پرچہ)..........50روپے
پاکستان (سالانہ)..........500روپے

اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242

aanchalpk,com

aanchalnovel.com

 naeyufaqonlinemagzine

aanchal.com.pk/blog

onlinemagazinepk.com/recipes

editorufaq@aanchal.com.pk

ابتدائیہ

متفرق کہانیاں

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

سلسلے وار ناول

ابن صفی

مستقل سلسلے

خط و کتابت کا پتہ: "آنچل" پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 کے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز۔ ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

کاش کہ ایسا ہو سکے......!

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ سعودی عرب کے دو ایسے عظیم شہر ہیں جہاں جانے کی خواہش و لگن ہر مسلمان، اہل ایمان کو ہوتی ہے۔ ہر سال لاکھوں فرزندان توحید وہاں کھنچے چلے آتے ہیں۔ ان میں سے سیکڑوں ہر سال وہاں وفات پا جاتے ہیں۔ اکثر اللہ کے بندوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ وہیں رہ جائیں۔ دم واپسیں انہیں وہیں کی خاک نصیب ہو اور اکثر لوگوں کی یہ خواہش پوری بھی ہوتی ہے۔ ان کے مکہ میں وفات پانے پر اکثر بیشتر ان کی نماز جنازہ حرم کعبہ میں ادا کی جاتی ہے اور اکثر لوگوں کی یہ خواہش پوری بھی ہوتی ہے۔ انہیں جنت المالی میں دفن کیا جاتا ہے۔ یقیناً یہ بڑی خوش نصیبی کی بات ہے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں موت کھینچ کر لے جاتی ہے۔ لیکن ان کے نصیب میں وہاں کی مٹی نہیں ہوتی مجبوراً ہی سہی پھر ان کے ساتھی اپنے پیاروں کی میت اپنے وطن لا کر اپنے عزیز و اقارب کی موجودگی میں اپنے ہی قبرستانوں میں دفنا دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو جس پریشانی اور دشواری سے گزرنا پڑتا ہے وہ نا قابل بیان ہے۔ مردے کو وہیں دفن کرا دینا نہایت آسان، درست معاملہ ہوتا ہے اس میں کوئی پائی پیسا کوئی ریال خرچہ نہیں آتا۔ سعودی حکومت تمام خرچہ خود اٹھاتی ہے۔ میت کو کفنانا دفنانا سب سرکاری خرچ پر سرکاری لوگ کرتے ہیں۔ نماز جنازہ تک پڑھا دی جاتی ہے کہیں کوئی دھیلا خرچ نہیں ہوتا۔ ہاں اگر میت کو اس کے عزیز اپنے وطن لے جانا چاہیں تو یہ کسی بلند پہاڑ سر کرنے سے کم درد سر نہیں۔ پہلے مکہ سے جدہ جا کر اپنے سفارت خانے سے ایک این او سی حاصل کرنا ہوگا اس سے پہلے جب میت کو اسپتال کے سرد خانے میں رکھوایا جاتا ہے تو ایک سرٹیفکیٹ متعلقہ اسپتال سے حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس معرکہ میں ہی کئی روز صرف ہو جاتے ہیں۔ پھر اگر معلومات درست حاصل نہ ہوں اور بندہ سیدھا وزارت داخلہ یعنی شرطے خانے یا پولیس

آفس چلا جائے تو وہاں کی پرشش و تحقیق میں کئی کئی روز لگ جاتے ہیں پھر وہ بتاتے ہیں کہ کس کارگو کمپنی سے میت کے لیے بکنگ حاصل کی جائے۔ اس کے لیے بار بار مکہ سے جدہ کا سفر کرنا اور کارگو انوائس حاصل کرنا پھر پولیس آفس سے ڈیتھ سرٹیفکیٹ حاصل کرنا۔ اس کے بعد متعلقہ اسپتال کے مردہ خانے سے میت حاصل کرکے غسل میت اور کفن کے لیے دوسرے اسپتال لے جانا اور پھر وہاں سے میت کارگو کرانے کے لیے جدہ کے بڑے اسپتال لے جانا جہاں میت کو ادویات لگا کر انجکشن وغیرہ لگانا پھر چوبیس گھنٹوں کے لیے سرد خانے میں رکھ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد کم از کم چوبیس گھنٹوں کے بعد سرد خانے سے میت حاصل کرکے کارگو آفس پہنچائی جاتی ہے۔ ایک اجنبی ناواقف شخص جس پر پہلے ہی اپنے عزیز کی موت کا پہاڑ ٹوٹ چکا ہوتا ہے وہ یوں در بدر ایک آفس سے دوسرے آفس پھر تیسرے آفس اور اگر کہیں کوئی غلطی پاسپورٹ یا ویزہ میں رہ گئی ہو تو سارے کیے کرائے پر متعلقہ پولیس آفیسر پانی پھیر دیتا ہے۔ اس ساری کارروائی میں بتایا جاتا ہے کہ کم از کم پندرہ سے بیس دن لگتے ہیں اور اکثر اس سے بھی زیادہ عرصہ لگتا ہے۔

اب جبکہ سعودی عرب میں تمام انتظامات اور دستاویزات کمپیوٹرائز ہیں سب معلومات انگلی کے اشارے پر سامنے اسکرین پر نظر آنے لگی ہیں کیا ہی اچھا ہو کہ سعودی حکومت اس تمام مشقت کو ون ونڈو آپریشن میں تبدیل کرکے آنے والے زائرین کو سہولت پہنچائے اور خود بھی دس قسم کی الجھنوں دقتوں سے محفوظ رہے۔ کاش کہ اب ایسا ہو سکے اور سعودی حکمران تمام معاملات کو ون ونڈو آپریشن کا اہتمام کرکے پریشان حال مصیبت زدہ لوگوں کی تکلیف دور کرنے کا بندوبست کرسکیں۔ اللہ کرے کہ ایسا ہو سکے یقیناً اگر ایسا ہو گیا تو ہزاروں دکھی دلوں سے ان کے لیے دعا نکلے گی۔



گفتگو

عمران احمد

''حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمانوں کی مثال باہم محبت کرنے آپس میں رحم دل ہونے میں اور ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی سے پیش آنے میں ایسی ہے جیسے ایک جسم کہ جب اس کے کسی ایک حصے کو تکلیف ہوتی ہے تو باقی سارا جسم بھی بیداری اور بخار میں اس کے ساتھ شریک ہونے کو پکارا اٹھا ہے۔'' (متفق علیہ)

عزیزان محترم...... سلامت باشد۔

پوری قوم کو یوم آزادی مبارک ہو۔

نئے افق کا خوفناک نمبر حاضر ہے اس شمارے کے سلسلے میں ہم کوئی دعویٰ تو نہیں کرتے کہ اس میں ماسٹر پیس کہانیاں ہیں لیکن یہ ضرور کہیں گے کہ اس نمبر کی تیاری میں ہمارے لکھاریوں نے ہم سے بھر پور تعاون کیا بعض نے تو اصرار کر کے کاپیاں رکوائیں کہ وہ اپنی کہانی بھیج رہے ہیں خیر ہم نے تو اپنی سی کوشش کی ہے اب دیکھیں آپ کے معیار پر یہ خاص نمبر کس حد تک پورا اترتا ہے۔

جس وقت آپ یہ سطور پڑھ رہے ہوں گے 14 اگست گزر چکا ہوگا ہم نہیں کہہ سکتے کہ انقلاب مارچ کامیاب ہوا یا حاکم وقت کی حکمت عملی سرخرو ہوئی البتہ یہ ضرور کہیں گے کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے یہ فتنہ دجال ہے کتاب مبین اور ہمارے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم (ان پر ہمارا سب کچھ قربان) ان کی احادیث بالکل درست جارہی ہیں۔ فی الحال یہود کا امت مسلمہ پر غلبہ طاری ہے۔ دنیائے اسلام کے تمام حکمراں ان کے قبضہ کے زیر اثر ہیں اور اپنا اپنا اقتدار بچانے کے لیے مٹھی بھر یہود و نصاریٰ کی بتائی ہوئی لائن پر چل رہے ہیں ایک حدیث یاد آ رہی ہے جس کے مطابق ''قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک مصر کا حکمراں یہودی نہ ہو۔'' اس وقت مصر کے حاکم جنرل سیسی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ یہودی ہے۔ شاید اسی لیے وہ غزہ میں مسلمان بچوں عورتوں کے یہودی فوج کے ہاتھوں قتل عام پر خاموش تماشائی ہے وہ تو کیا، خود کو ہاشمی خاندان کا چشم و چراغ کہلانے والے اردن کے شاہ حسین کا بیٹا شاہ حسن بھی امریکی سامراج کا دم چھلا بنا ہوا ہے اور تو اور خود کو خادمین حرمین شریفین کہلوانے والے خود اسرائیل کے سرپرست بنے ہوئے ہیں اور اسلامی دنیا کو سنی اور شیعہ بلاک میں تقسیم کر کے مسلمانوں کی طاقت کو کمزور کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ رہا ہمارا خطہ جس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ''مجھے مشرق سے اسلام کے بڑے لشکر کی خوشبو آتی ہے۔''

فرقہ واریت' قبائلیت اور لسانی گروپوں میں منقسم ہو کر آپس میں دست و گریباں ہے بدقسمتی سے ہر دوسرے گروپ کے ڈانڈے گھوم پھر کر صیہونی تنظیموں کارپوریشنوں سے ملتے ہیں وہ چاہے بلیک واٹر ہو موساد ہو یا را، سب کی مالی ضروریات وہیں سے پوری ہو رہی ہیں۔

اس سب کے باوجود ہمارا ایمان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان غلط نہیں ہو سکتا۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ فطری ہے۔ فصل سے قبل جس طرح کسان زمین پر خود رو طریقے سے اگنے والی فالتو جڑی بوٹیاں جھاڑ جھنکار صاف کرتا ہے ایسے ہی ہمارے معاشرے کی بھی صفائی ہو رہی ہے۔ فالتو جھاڑ جھنکار صاف ہو رہا ہے تا کہ ایک صحیح اور پاکیزہ فصل تیار ہو سکے اور وہی پاکیزہ فصل اسلامی لشکر کی صورت اختیار کرے گی اب اس میں بحیثیت مومن ہمارا کردار کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے؟ فرصت کی گھڑیوں میں سے چند لمحے کشید کر کے اس پر ضرور سوچیے گا۔

ریاض حسین قمر ...... منگلا ڈیم۔ محترم و مکرم جناب عمران احمد سلام مسنون، خوب صورت ٹائٹل پر عید مبارک کا جھومر سجائے اگست کا نئے افق نگاہوں کے سامنے ہے پرچے کی سج دھج بتاتی ہے کہ آپ نے اور آپ کے رفقا نے خوب محنت کی ہے جناب مشتاق احمد قریشی کے کالم نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ گفتگو کے آغاز میں بیان کردہ حدیث نے ایمان تازہ کر دیا اور آپ نے اپنے کالم میں جو کچھ بیان فرمایا ہے وہ ہماری گردنیں جھکانے کے لیے کافی ہے شرم ہم کو مگر نہیں آتی۔ میں نے ایک مفتی صاحب سے پوچھا کہ رمضان المبارک میں بلا جواز مہنگائی کرنے والے کیا رمضان شریف کی بے حرمتی کے مرتکب نہیں ہوتے اور ان کی کیا سزا ہے تو انہوں نے برملا فرمایا کہ بے شک وہ لوگ رمضان المبارک کی بے حرمتی کے مرتکب ہوتے ہیں اور وہ واجب القتل لوگ ہیں اب تو قوم اس مقام پر پہنچ گئی ہے کہ کچھ لکھنا بھی بے معنی لگتا ہے اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائے آمین۔ گفتگو میں اس بار کرسی صدارت جناب شیخ ابراہیم صاحب کے حصے میں آئی ان کی باتیں بہت اچھی لگیں اور زبان پر برملا آ گیا کہ اولڈ از گولڈ ان کی بات ٹھیک ہے کہ بزرگوں کی تحریں بھی تبرک کے طور پر نئے افق کے صفحات کی زینت بنی چاہیے بہتر تھا کہ جناب شیخ ابراہیم صاحب اپنی کوئی تحریر بھی ارسال فرما دیتے جس سے نسل نو کی کچھ رہنمائی ہو جاتی۔ ناز سلوش ذشے کافی عرصہ کے بعد تشریف لائی ہیں۔ ان کے آنے سے پرانی یادیں تازہ ہو گئیں واقعی نئے افق میں گفتگو اتنی لمبی ہوتی تھی کہ ہم بہت دیر تک میگزین کے اس حصے میں کھوئے رہتے تھے اب تو چند گنے چنے قارئین ہی گفتگو میں شریک ہوتے ہیں۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ خداوند کریم نے اپنے فضل و کرم سے ان کی گود ہری کر دی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بچی کے نصیب اچھے کرے اور یہ بھی دعا ہے کہ رب کعبہ ان کی والدہ ماجدہ کو صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے اور ان کی نانو کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس عطا فرمائے، آمین۔ جناب ابن مقبول جاوید احمد صدیقی خدائے لم یزل آپ کے بیٹے کی شادی مبارک فرمائے اور شادی خانہ آبادی کے سارے مراحل بخیر و خوبی انجام پائیں آمین، صدیقی صاحب تبصرہ پسند فرمانے کا شکریہ۔ جناب ساحل دعا بخاری صاحب ایک اچھے تبصرے کے ساتھ تشریف لائے بخاری صاحب یاد فرمائی کے لیے شکر گزار ہوں۔ جناب مبارک حسین کا تبصرہ خوب مگر مختصر تھا۔ باقی حسن اختر بریم، محمد شفا، زین الدین اور ثمینہ پیرزادہ کے تبصرے اپنی اپنی جگہ خوب تھے۔ ریاض بٹ صاحب ایک اچھی کہانی کے ساتھ تشریف لائے مگر محفل سے میری طرح غائب تھے۔

شاید ہم دونوں پر ڈاک والوں کی نظر عنایت ہوگئی اقرا میں بیان کردہ احادیث نے ایمان تازہ کر دیا رب کریم طاہر قریشی کی سعی کو قبول و منظور فرمائے خوشبوئے سخن میں سب شعرا کا کلام اپنی اپنی جگہ خوب تھا۔

ادیب سمیع چمن...... حیدر آباد۔ اگست کا شمارہ نئے افق اپنی گونا گوں خوبیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا سچ پوچھیے تو دلکش سرورق ہی دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا ہے ایسے حسین قدرتی مناظر اور سبز و شادابی کا عظیم سنگم یقین جانیے آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سکون سا محسوس ہو رہا ہے۔ یہ بھی آپ کا فن ہے کہ جب چاروں طرف ملک میں افراتفری کراچی اور دیگر شہروں میں حادثوں کی مارا ماری ہے تو دوسری طرف لوٹ مار، دھوکہ، فریب کا بازار گرم ہے ایک طرف ظلم و جبر دکھاتے ہوئے ٹی وی چینلز تو ایک طرف مہنگائی کا طوفان اور زلزلے، ڈائجسٹوں کے سرورق پر کہیں خوفناک چڑیلیں خون پیتے ہوئے آدم خور تو کہیں عریانی کے نئے اور عجب مظاہروں ہم جیسے حساس ذہنوں اور قلم کاروں کا سکون غارت کر دیا ہے۔ عجب ظلم و جبر اور بے ہودگی کا بازار لگا ہوا ہے۔ ایسے میں ہمارے حکمرانوں کو خیر چھوڑیے ہمارے وہ قومی لیڈران اور اقتدار کے بھوکے بھیڑیے۔ نت نئے عنوانوں سے جلسے، دھرنے اور لرزہ خیز دھمکیاں پیش کرتے نظر آ رہے ہیں۔ ایسے میں یقین جانیے عمران بھائی نئے افق کے سبز و شاداب مناظر سے لبریز سرورق نے قدرے سکون اور امیدوں کے چراغ روشن کر دیے میں کبھی کبھی سوچتا تھا بلکہ شاید آپ سے اظہار بیان بھی کر دیا تھا کہ بھائی میاں کبھی کبھار تصویری اسکیچ کا سرورق بھی دے دیا کیجیے شاید آپ ہنسے ہوں گے یا سوچا ہوگا کہ میں ابھی آپ کی سوچوں کی گہرائیوں سے نابلد ہوں۔ اب احساس ہوا کہ اس گہرائی کا کیا راز ہے، یعنی نئے افق کے سرورق کے ذریعہ پڑھنے اور دیکھنے والوں کو ذہنی قلبی راحت اور سکون کا پیغام خیر جناب یہ تو ہوگیا اظہار خیال بنام سرورق اب چلتے ہیں ذرا اندر کی طرف بھئی سچ پوچھیے تو سارا ڈائجسٹ پڑھنے کا موقع نہیں مل سکا پھر بھی حتی الامکان زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنے کی کوشش کی کیونکہ رمضان المبارک کا مہینہ چل رہا تھا میں ان دونوں کو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر رضائے الہیٰ کے لیے وقف کر دینا نجات کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔ پتا نہیں مجھ جیسے پھٹیچر مفلوک الحال اور غریب لکھاری کو اللہ کیسے معجزے سے رزق پہنچا دیتا ہے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ اللہ ہی رزاق ہے۔ گفتگو میں بڑے پیارے خطوط شامل اشاعت ہیں واقعی میں بھی سوچتا ہوں کہ یہ گفتگو میں قارئین کی تعداد اتنی کم کیوں ہے تو بہن محترمہ ناز سلوش ذشے کراچی نے بھی اس خلش کا اظہار فرمایا ہے۔ اب اس کی ایک وجہ بھی سن لیں کہ پھر وہی بات کے بھائی گفتگو میں آپ قارئین کو جواب ضرور دیا کریں۔ اس طرح ان کے سوالات کے جوابات مل جائیں گے اور ہمیں ایک لذت اور رونق پلٹ آئے گی۔ مگر شاید آپ کے کانوں پر جوں نہیں رینگے گی کیونکہ شاید آپ کے کان ہی نہیں ہیں۔ چلو یہ بھی ٹھیک ہے کہ نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔ بہن جی ناز سلوش ذشے کراچی کا خط بڑا سحر اور اثر انگیز تھا۔ انہوں نے بڑی توجہ محنت اور تفصیل سے حالات و واقعات کی عکاسی کی ہے ان کے خلوص چاہت جذبات کا میں بھی تہہ دل سے مشکور ہوا ہوں اور ادارہ بھی یقیناً محظوظ ہوا ہوگا۔ خدا بہن ناز سلوش ذشے کے تمام دکھ اور تفکرات دور کرے اور

درازی عمر امن وسکون کی راحت اور انعامات نازل فرمائے، آمین۔ باقی ایک بھائی گفتگو کی محفل میں اپنی بیماری کا اظہار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ سے ہم سب دعا کرتے ہیں کہ اللہ انہیں جلد از جلد صحتیاب اور بامراد فرمائے آمین۔ اب تک جو تحریریں پڑھ چکا ہوں وہ سب جامع اور بہت اثر انگیز لکھی ہوئی ہے۔ خلیل جبار صاحب نے بھی کانٹا بدل دیا ہے۔ اب ان کی تحریر بھی کروٹ لے رہی ہے۔ ہر لکھاری کی تحریر کا جداگانہ انداز ہونا چاہیے نہ کہ عنوان الگ الگ موضوع ایک جیسا۔ تمام نئے افق کے اسٹاف، آپ کو قبلہ مشتاق احمد قریشی کی خدمت میں عید کی مبارک باد۔

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی۔ اچھے عمران جی اینڈ اقبال بھٹی صاحب، السلام علیکم امید واثق ہے کہ بخیریت ہوں گے اگست کا شمارہ ملا ٹائٹل پہلے سے بھی پرکشش، سادہ، بامعنی اور خوب صورت رنگوں کے امتزاج سے سجا قارئین کو اپنی طرف متوجہ کررہا تھا۔ فہرست دیکھ کر زبردست خوشی ہوئی وہ یوں کہ میری سچی کہانی بھی شامل اشاعت تھی۔ اس کے لیے ممنون ہوں اور قارئین کی آراء کا منتظر رہوں گا۔ ابن صفی پر عارف صاحبہ کا مضمون بڑا ہی معلوماتی اور خوب صورت تھا اب ان کی دوسری کتب بھی خریدنا پڑیں گی۔ پراسرار نمبر کا بے چینی سے منتظر ہوں اس مرتبہ محترم مشتاق احمد صاحب نے دستک خوب دی ہے اور یہ کہا کہ آپ کو محلے میں چند لوگ جانتے ہوں گے آپ کو تو جناب ہزاروں لوگ جانتے ہیں اور پھر جاسوسی دنیا اور میگزین کے حوالے سے ہم جیسے عظیم انسان کی قدر و قیمت جانتے ہیں اور زبردست قدر دان ہیں جس طرح ہزاروں، لاکھوں دلوں میں ابن صفی، اظہر کلیم بستے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح آپ بھی ہمارے دلوں میں گہری جگہ بنا کر بیٹھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو، طاہر صاحب کو عمران جی کو اور تمام اسٹاف کو صحت جاوداں اور عمر خضر سے نوازے آمین ثم آمین۔ گفتگو میں عمران جی بیان کردہ حدیث شریف پر کاش ہم 10 فیصد ہی عمل کرلیں تو یہ معاشر 80 فیصد سے زیادہ سدھر جائے، مگر کاش......! گفتگو میں شیخ محمد ابراہیم صاحب نے خاموشی کا پردہ چاک کرکے قارئین کی صف میں آ کھڑے ہوئے ہیں۔ آپ کا لکھا ہم صدفی صد اس کی تائید کرتے ہیں اور شکر ادا کریں بھائی کہ مدتوں کے بعد گہری خاموشی اور سناٹا عمران جی نے آخرکار ''پاش پاش'' کردیا اور نئے خون کو انجیکٹ کرکے (مثلاً اقبال بھٹی) رسالے کی شکل وصورت کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش ہی نہیں عملی اقدام بھی ہورہے ہیں مثلاً کہانیوں کا معیار ہزار گنا اچھا ہوگیا ہے بدیسی کہانی بھی ہر ایک چھان پھٹک کر لگائی جاتی ہے سلسلے وار کہانیوں میں بھی بہتر معیار آچکا ہے اور اب ابن صفی پر مضمون، ویسے آپ آتے رہیے جناب ہمیں بھی اپنا ہم عمر مل گیا ہے۔ خوش آمدید ابراہیم جی، ناز سلوش ذشے بھئی میں تو آپ کو کشمیری بٹی ہی کہوں گا چاہے آپ اپنے پیا کے ساتھ غیر ملک میں چلی جائیں ٹھیک ہے نا، آخر ناصر جی آپ کو کراچی لے آئے سدا سکھی رہو، سہاگن رہو اور گھر کی خوشیاں سمیٹو آمین۔ پریشے خاشعہ ناصر صاحبہ کی آمد بے حد خوشی کا موقع ہے اور پھر آپ بھی خوش اللہ تعالیٰ اس چھوٹی سی جان کو سلامت تا قیامت رکھے کہ یہ نازک پریاں تو اللہ کا فضل ہوتی ہیں انعام ہیں، برکت ہیں ترقی کے راستے کھولنے والی ہیں لیکن ان سب سے

بڑھ کر یعنی Above All آپ کی محفل میں حاضری ضروری ہے۔ساحل دعا بخاری آپ کا تبصرہ مختصر مگر جامع تھا آپ کی کہانی بھی خوب رہی۔ میرا تو خیال ہے کہ آپ مسلسل لکھا کریں، بھئی مبارک حسین صاحب اتنا مختصر اور اچھا تبصرہ بھی قبول نہیں ہے ذرا تفصیل لایا کریں اور حسن اختر پریم جی کو خوش آمدید۔ محمد شفا صاحب جی آیا نوں۔ زین صاحب بھی مختصر مختصر آئے اور ثمینہ پیرزادہ صاحبہ آپ ایسی سنجیدہ باتوں کو دل پر نہ لیا کریں۔آپ کی آمد کو خوش آمدید امید ہے ہر ماہ آیا کریں گے محترم طاہر قریشی نے پچھلا ہی آداب معاہدہ وغیرہ جاری رکھا ہے انتہائی نصیحت آموز اور دل میں اترنے والی یہ چیزیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی امان میں رکھے آمین۔ بدیسی کہانیوں میں الٹے بانس بے حد اچھی تھی۔اسرار احمد صاحب مبارک باقی دونوں کا معیار بھی بے حد اونچا تھا محنت اور چناؤ دونوں نے کام دکھایا ہے گڈ جی، سنگ دل بھی خلیل جبار جی کا اچھا شاہکار ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ ذرا طویل ہوگیا پھر بھی بہترین کہانی رہی۔ پرچھائیں مختصر مگر بے حد دل میں اتر جانے والی داستان تھی وقارالرحمان کی اس کہانی نے دل ہلا دیا مگر آخر میں اسے عقل آجانے پر دل خوش بھی ہوگیا۔محمد حنیف قادری طویل کہانیوں کے لیے جانے جاتے ہیں۔مگر اندھی عقیدت طویل ہونے کے باوجود بے حد اچھی اور بھرپور داستان رہی۔ ویری گڈ جناب۔ ریاض بٹ جی ہوشیار خبردار اور زیادہ محنت والی کہانی ہونی چاہیے آپ کی اس دفعہ کی بھی کہانی بڑی ہی بہترین رہی مگر یہ سب ہم علی اختر صاحب کے ذہن سے صفحہ قرطاس پر بکھرنے والی جاسوسی ٹائپ کہانی ''بند گلی'' کی بات کررہے ہیں۔علی اختر نے بڑی محنت اور بہت مکمل کہانی لکھی ہے۔ بے حد پسند آئی آپ بھی ہر ماہ آیا کریں۔ خان شفیق نے ہمیں فطری خواہش کی شکل میں بڑی ہی خوب صورت اچھے انجام والی کہانی دی ہے معاشرتی برائیوں کو اجاگر کرنا بھی نیکی ہے تاکہ کوئی دوسری ہستیاں ایسے انجام کو نہ پہنچیں نجات سویرا ملک کی روانی میں لکھی ہوئی اچھی کہانی رہی۔ریاض بٹ صاحب تبصرہ کر چکا کہ جال وصیاد اس دفعہ بھی بہترین کہانی لکھی گئی تھی۔خوشبوئے سخن میں ریحانہ سعیدہ آزاد نظم میں ٹاپ پر تھیں غزلوں عمر فاروق ارشد، ریاض حسین قمر ٹاپ پر تھے۔ پھر قدیر رانا، محمد اسلم جاوید تھے۔ذوق آگہی میں ریاض بٹ جی تو مزہ دے گئے۔صدف مختار کا انتخاب بھی بہت خوب تھا۔باقی اچھے تھے۔ہاں سلسلے وار کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں تبصرہ پھر کبھی سہی۔ ہمارے دوسرے لکھنے والے کہاں ہیں ریحانہ سعیدہ، عالیہ صاحبہ، شہنی صاحبہ، محمد بخش صابر لنگاہ اور ان کے صاحبزادگان اور سرور شاذ، عاکف، سید عبداللہ اور بہت سے دوسرے، براہ کرم بار بار یاددہانی کرانے پر تو واپسی کرلیں۔ ہاں جناب پراسرار نمبر کا انتظار ہے اور دیکھیے نا اب تین چار خاص نمبر پڑھنے کو ملیں گے مزہ آجائے گا، تمام احباب مجلس کو سلام۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم! ماہ اگست کا شمارہ اس وقت میرے ہاتھوں میں ہے خوب صورت سرورق دل کو بھا گیا۔آگے فہرست پر نظر پڑی تو اپنی کہانی موجود پا کر کمر کی تکلیف کافی حد تک بھول گیا، بہت شکریہ۔مہربانی اور نوازش میں حتی الامکان کوشش کررہا ہوں کہ پرانے ردم میں آجاؤں اور ہر ماہ ایک تفتیشی کہانی لکھ کر ارسال کروں بس آپ لوگوں کی دعائیں اور نظر التفات چاہیے

اس بار گفتگو میں زیادہ نئے نام نظر آرہے ہیں بہت خوشی اور طمانیت کا باعث ہے۔ یہ بات، شیخ محمد ابراہیم بھائی خوش آمدید۔آپ نے جن عظیم قلمکاروں کو یاد کیا ہے وہ میرے بھی فیورٹ قلم کار ہیں خاص کرابن صفی مرحوم کو تو میں اپنا روحانی استاد مانتا ہوں۔نازسلوش ذشے بہن پیاری سی ننھی پری کی ماں بننے پراس بھائی کی طرف سے بہت بہت مبارکباد قبول کرو۔میری دعا ہے کہ تم ہمیشہ خوش وخرم رہو، سکھی رہو، ابن مقبول جاوید احمد صدیقی بھائی کیسے ہو، بھائی کمر کی تکلیف اب ذرا کم ہے آپ کے خیالات، جذبات اور حوصلہ افزائی میرے لیے اکسیر کا کام کرتی ہے اس بار میری کہانی موجود ہے اور جناب آپ کی کہانی پہلا قدم زبردست ہے۔ساحل دعا بخاری آپ کا خط اور کہانی آخری خواہش بھی پسند آئی بعض اوقات انسان کو حالات کے مطابق فیصلے کرنے چاہیے۔بے شک دل کرچی کرچی ہو جائے دل کا درد آنسو بن کرآنکھوں میں آجائے۔بھائی مبارک حسین آپ کا خط گو کہ مختصر ہے لیکن گہرائی لیے ہوئے ہے تھوڑے لفظوں میں دل کا مدعا بیان کیا گیا ہے۔حسن اختر پریمی آپ کا خط بھی اچھا ہے۔آتے رہا کریں باقی خطوط بھی پرچے کی شان بڑھا رہے ہیں۔اب بڑھتے ہیں باقی کہانیوں اور سلسلوں کی طرف مغرب سے انتخاب الٹے بانس ٹاپ پر ہے۔باقی دونوں کہانیوں مرد آہن اور نئی شناخت بھی اچھی ہے۔سنگ دل خلیل جبار کی مخصوص انداز میں لکھی حسب معمول سندر ہے۔پرچھائیں میں کمال کا کردار انسانی عظمتوں کو چھوتا ہوا محسوس ہوا کہانی پسند آئی، بلکہ میرے ذہن میں کمال کے کردار کی پرچھائیں چھوڑ گئی باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں باقی سلسلوں ذوق آگہی اور خوشبوئے سخن کے متعلق عرض کرتا چلوں ریحانہ سعیدہ (لاہور)،عمر فاروق ارشد (فورٹ عباس)،ریاض حسین قمر (منگلا ڈیم) قدیر رانا (راولپنڈی) کی کاوشیں بہت اچھی ہیں باقی غزلیں بھی اچھی ہیں۔ذوق آگہی میں رابعہ ساحر نے کھڑے ہوکر پانی پینے کے نقصانات سے آگاہ کیا۔محمد عارف اللہ نثار نے حضرت شیخ سعدیؒ کا واقعہ بیان کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہمیشہ اپنے سے نیچے دیکھو تو آپ میں صبر اور شکر آئے گا۔قیمتی موتی شاہد حسن کا اچھا انتخاب ہے صدف مختار نے کمرشل بریک کے ذریعے ہونٹوں پر ہنسی لانے کی کوشش کی۔دیگر انتخاب بھی دل کو چھو رہا ہے۔جس کے لیے عفان احمد مبارکباد کے مستحق ہیں۔کیونکہ اصل انتخاب تو ان کا ہے۔والسلام۔

ایس ذیشان ریاض...... فیصل آباد۔ السلام علیکم! کے بعد عرض ہے کہ امید ہے خیریت سے ہوں گے۔پہلی دفعہ لائبریری سے نئے افق لایا تو دل چاہا کہ قلم اٹھایا جائے۔اپنا تعارف کروا دوں چھوٹا سا ریسٹورنٹ ہے فیصل آباد میں چار چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔صفحات سے آگے بڑھے تو نازسلوش ذشے کا امید نامہ نظر سے گزرا ناز صاحبہ سلام قبول کریں۔قارئین کی قارئین سے انسیت ہونی چاہیے۔چاہیے لفظی ہو یا کتابی ہو یا بذریعہ ایس ایم ایس پیاری سی گڑیاں کی بہت مبارکباد۔نام بہت مشکل ہے مگر سیل میں سیو کرلیا ہے۔آپ کی نانو امی کا بے حد افسوس ہوا اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ہمارے پاس الفاظ ہوتے ہیں بس وہ ایک دوسرے کو تحفہ دے سکتے ہیں۔

مختصر کہانیاں سبھی اچھی تھیں۔ ہمارا معاشرے اور مغربی معاشرے میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے افسانے کی بنیادی شق میں گھریلو، معاشرتی مسائل کامیڈی رومانس ان سب کے گرد گھومتی ہے۔ افسانہ اردو گرامر کا بنیادی جز ہے۔ افسانے بھی لگائیں نئے افق میں خط بھی زیادہ سے زیادہ شائع کریں مشینی دور میں خط لکھنا جہاد کے برابر ہے۔ ساحل دعا بخاری کا خط لکھنے اور الفاظ کا چناؤ زبردست ہے۔ اللہ اور زورقلم دے، سب قارئین و رائٹرز کو پیار بھرا سلام۔

حسن اختر پریم ...... **ناظم آباد۔** نئے افق شمارہ اگست اپنی خوب صورت تحریروں سے سجا 28 تاریخ کو ملا بلکہ اسے جا پکڑا۔ عید مبارک سے مزین ٹائٹل اس کی تروتازگی میں اضافہ کررہا تھا' دنیاداری' عید کے دن میں بہت سارے کام کاج موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ قارئین اور رائٹرز حضرات' شاعر' کہانی کار' ناول نگار' ہماری رائٹرز بہنیں کیسے مزاج ہیں سب کے؟ اللہ تعالیٰ سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے' آمین۔ دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب نے کیا خوب لکھا۔ ناز سلوش ذشے کو بیٹی کی ماں بننے پر ڈھیروں مبارک باد کے۔ ریاض بٹ صاحب کیسے مزاج ہیں' آپ کی کہانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ بزرگوار فقیر محمد بخش لنگاہ' محترم کیسے ہیں' اللہ پاک آپ کو صحت یابی عطا فرمائے۔ محمد اسلم جاوید' ریاض حسین قمر بھائی' عمر فاروق ارشاد سب کو سلام۔ یہ محترمہ بہن عصمت اقبال کہاں رہ گئیں؟ امجد جاوید ''قلندر ذات'' بہت زبردست جارہی ہے جمالے کا کردار اور اچھا لگ رہا ہے۔ خوشبو سخن میں تمام کلام ہی اچھا تھا۔ ذوق آگہی میں خوب صورت موتیوں کی مالا پروئی گئی تھی۔ اقوال زریں' احادیث نبوی ﷺ سے مزین خوب صورت باتیں دل میں گھر کرجاتی ہیں۔ آخر میں شمیم نوید کی جگت سنگھ بہت زبردست جا رہی ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا' والسلام۔



مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں۔ کوئی بھی تحریر نیلی یا سیاہ روشنائی سے تحریر کریں۔
☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجے جانے والے تمام انتخاب کے کتابی حوالے ضرور دیں
☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کردیا ہے۔
☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔
☆ کہانیوں پر آپ کے تبصرے ادارہ کو ہر ماہ کی 2 تاریخ تک مل جانے چاہئیں۔
☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔ 7' فرید چیمبرز' عبداللہ ہارون روڈ' کراچی۔

اقــرأ

ترتیب: طاہر قریشی

آداب معاہدہ

عہد کی پابندی کا یہ اعلیٰ ترین معیار ہے جو اعلان نبوت سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا لیکن آپ نے اس حد تک عہد کی پابندی کو شرعی طور پر ضروری قرار نہیں دیا اس لیے کہ اسلام دین کامل ہونے کے ساتھ ساتھ دین فطرت بھی ہے چنانچہ رزین میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے کسی دوسرے سے وعدہ کیا پھر نماز کے وقت تک ان میں سے ایک نہیں آیا یہ انتظار کرنے والا نماز پڑھنے کے لیے مقرر جگہ سے چلا گیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

اس ارشاد نبوی سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص عہد کی پابندی کرتے ہوئے دوسرے کا انتظار کرتا رہا تو اس نے حق ادا کر دیا۔ اب اگر یہ شخص نماز کا وقت ہونے پر نماز پڑھنے چلا گیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

اس ارشاد نبوی سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص وعدہ کی پابندی کرتے ہوئے دوسرے کا انتظار کرتا رہا تو اس نے حق ادا کر دیا۔ اب اگر یہ شخص نماز کا وقت ہونے پر نماز پڑھنے چلا جائے یا کسی دوسری ضرورت کے لیے چلا گیا تو اس پر وعدہ خلافی اور عہد شکنی کا الزام نہیں آئے گا اور نہ ہی یہ گنہگار ہوگا۔

عہد کرتے ہوئے اس بات کی نیت ضرور کرنی چاہیے کہ عہد کی پابندی کروں گا اگر یکطرفہ عہد کرتے وقت' نیت پابندی کرنے کی ہو لیکن پھر کسی وجہ سے عہد اور وعدہ پورا نہ کر سکے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ گنہگار رہوگا۔

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے ابوداؤد اور ترمذی میں روایت نقل ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ترجمہ: ''جب کسی شخص نے اپنے بھائی سے آنے کا وعدہ اور عہد کیا اور اس کی نیت یہی تھی کہ وہ وعدہ پورا کرے گا لیکن کسی وجہ سے وہ مقرر وقت پر نہیں آیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔''

(البتہ جس شخص سے عہد کیا ہو اس سے معذرت کر لی جائے تاکہ اس شخص کا اعتماد بحال رہے) لیکن عہد کرتے ہوئے بڑی یقین دہانی کرا دی جائے اور اگر عین اس وقت دل میں نیت یہ ہو کہ اسے پورا نہیں کرنا تو یہ بہت بڑی خیانت ہے۔

حضرت سفیان بن اسید حضرمی سے ارشاد نبوی منقول ہے۔

ترجمہ: ''کہ یہ بہت ہی بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی بات کرو' وہ تمہیں سچا سمجھ رہا ہو حالانکہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔''

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بچوں کے ساتھ کیے گئے عہد کی پابندی کرنے کی بھی تعلیم دی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ اپنے بچپن کا واقعہ بتاتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے

گھر میں تشریف فرما تھے کہ میری والدہ نے مجھے کہا "ھا تعال اعطیک" ادھر آؤ میں تمہیں کچھ دوں گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تم نے اسے کیا چیز دینے کا ارادہ کیا ہے میری ماں نے کہا ایک کھجور دینے کا ارادہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اما انک لو لم تعطیہ شیئا کتبت علیک کذبۃ." اگر تم اس کو کچھ نہ دیتی تو تمہارے نامہ اعمال میں ایک جھوٹ لکھا جاتا۔

معلوم ہوا کہ بچوں سے بھی بدعہدی کی اجازت نہیں جب کہ عموماً معاشرہ میں اس بات کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ عہد کی پابندی ایمانی تقاضا ہے اس لیے کہ وعدہ خلافی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافق کی نشانیوں میں شمار فرمایا ہے۔ جب معاشرہ میں عہد کی پابندی کا خیال رکھا جاتا ہو تو پھر معاشرے میں افراد کا ایک دوسرے پر اعتماد قائم رہتا ہے اور جب عہد شکنی عام ہو جائے تو پھر معاشرے میں باہمی اعتماد ختم ہو کر رہ جاتا ہے جب کہ زندگی کے اکثر معاملات کا انحصار اعتماد پر قائم ہے۔ اس لیے کسی سے عہد کرنے سے پہلے سوچ لیا جائے کہ میں پورا کرسکوں گا یا نہیں اور پورا کرنے کی نیت بھی ہے یا نہیں اور پھر عہد کرنے کے ساتھ انشاء اللہ بھی کہہ دیا جائے۔ اس کے بعد اگر عہد پورا کرنے میں رکاوٹ نظر آ رہی ہو تو کوشش کر کے مقررہ وقت سے پہلے معذوری اور عذر ظاہر کر دیا جائے تا کہ عین وقت پر دوسرے کو پریشان نہ ہونا پڑے اور اگر دوسرا شخص چاہے تو اس کام کے لیے متبادل انتظام بھی کر لے لیکن حیلے بہانے یا جھوٹ اور فریب سے کام لے کر عہد شکنی نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ اصل بات ظاہر کر کے عذر پیش کر دیا جائے اور اگر کبھی عہد شکنی ہو جائے تو دوسرے انسان سے معافی مانگ لی جائے اور کسی نہ کسی طرح اس کو پہنچنے والی تکلیف کا ازالہ کر کے اس کے دل کو خوش کر دیا جائے تا کہ یہیں دنیا میں معاملہ اور حساب صاف ہو جائے اور آخرت میں عہد کا حساب نہ دینا پڑے۔

اللہ ربّ العزت ہمیں عہد کرنے سے پہلے سوچنے اور عہد کرتے وقت خلوص نیت اور بعد میں عہد کی پابندی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

بشکریہ: "درس حدیث" مولانا حافظ فضل الرحیم اشرفیؒ
نائب مہتمم و استاد الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور



قسط نمبر 4

دیدبان

ارشد علی ارشد

صیہونی قوتیں صدیوں سے مسلم امہ کے خلاف ہر محاذ پر سرگرم ہیں۔ مسلمانوں میں جنم لینے والے فرقوں اور فسادات کے پس پشت میں بھی انہی کا ہاتھ کارفرما ہے۔ کبھی ان کی سازشیں حسن بن صباح کے روپ میں سامنے آتی ہیں تو کبھی غلام احمد قادیانی کی شکل میں خلافت ترکی کا خاتمہ کر کے انہوں نے پورے عالم کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کیا اور اب ان کا نشانہ مسلم دنیا کی واحد ایٹمی طاقت پاکستان ہے' جو ہمہ وقت خار کی طرح تکلیف پہنچا رہا ہے زیر نظر ناول انہی سازشوں کے پس منظر میں ہے۔ گو اس کے حالات و واقعات خیالی ہیں' اس کے کسی کردار و علاقہ کا تعلق حقیقت سے نہیں ہے لیکن اس کا تھیم اور خمیر اصل واقعات سے ہی اٹھایا گیا۔

وطن پرستوں کے لیے بطور خاص' دلوں کو جھنجوڑتا ہوا ایک دلچسپ ناول

ڈیوڈ نے مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ ہاورڈ نے روئے سخن ساتھ کھڑے شخص کی طرف کرتے ہوئے تعارف کروایا۔

''یہ ہیں پروفیسر ڈاکٹر کے ایل گارڈن اور ان کے ساتھ پروفیسر ایم الیکسی ہیں۔'' ڈیوڈ نے دونوں سے پرجوش مصافحہ کیا اور تحسین آمیز انداز میں بولا۔

''آپ لوگ ہمارا سرمایہ ہو۔ آپ جیسے باہمت، اعلیٰ و ارفع اور ذہین و فہیم سائنسدان ہمارا فخر ہیں۔''

''تھینک یو مسٹر ڈیوڈ! ہمیں آج بے حد خوشی ہے کہ ہم آپ جیسے مافوق الفطرت صلاحیتوں کے حامل شخص کے ساتھ ایک انوکھا اور انتہائی منفرد و حیرت انگیز تجربہ کرنے جارہے ہیں۔''

''مسٹر ہاورڈ! آپ لوگ تیار ہو؟'' ڈیوڈ نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں ڈیوڈ ہم بالکل تیار ہیں۔ بس آپ کا ہی انتظار تھا۔''

''گڈ! چلیے۔'' ڈیوڈ کی چال میں تیزی اور انداز میں جوش جھلک رہا تھا۔ ہاورڈ اسے ڈرائنگ روم تک لے گیا۔ ڈیوڈ نے ڈرائنگ روم میں صرف دس منٹ لگائے تھے۔ جب وہ باہر آیا تو اس کا حلیہ بدلا ہوا تھا۔ وہ اوور آل کی طرح کا سفید لباس پہن چکا تھا۔ ہاتھوں میں باریک دستانے اور سر پر کپڑا چڑھا لیا تھا۔ پاؤں میں خصوصی سلیپر تھے۔ ہاورڈ اور اس کے ساتھی پہلے سے ہی تیار تھے۔ وہ چاروں مل کر ایک بڑے ہال میں داخل ہوئے وہاں سے دو تین راہداریاں کراس کرنے کے بعد ایک درمیانے سائز کے کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے کے چاروں طرف چھوٹی بڑی اسکرینیں روشن تھیں۔ تمام اسکرینوں کا باہم تعلق و ربط برقرار رکھا گیا تھا۔ ہر اسکرین کے حجم کے لحاظ سے نیچے کی بورڈ منسلک تھا۔ جس میں بے شمار متفرق رنگ کے بٹن اور لیور لگے ہوئے تھے۔ بہت سی مشینیں دیواروں میں فٹ تھی اور کچھ مشینیں کمرے کے وسط میں پڑے ہوئے بیڈ کے ارد گرد ڈیڑھ میٹر کے اسٹینڈ پر رکھی ہوئی تھیں۔ ان مشینوں کے سامنے مشین آپریٹر سفید کوٹ پہنے مختلف پوزیشنوں میں کھڑے تھے۔ بیڈ پر لیٹا ہوا شخص دنیا سے بے گانہ تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ایک عظیم تجربے کے لیے قربانی کا بکرا بننے جارہا ہے۔ یہ خوبصورت نوجوان احمد زعابی تھا۔ جسے فلسطین کے شہر غزہ سے گرفتار کیا گیا تھا۔ وہ دو سالوں سے وزارت دفاع کے زیر انتظام جیل میں سزا کاٹ رہا تھا۔ ڈیوڈ نے اس کا انتخاب مضبوط قوت

ارادی توانا جسم لمبا قد اور پچیس سال کی عمر کے سبب کیا تھا۔ نوجوان کے جسم پر انڈر ویئر کے علاوہ کپڑے نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ تاہم اس کے جسم پر اس قدر عجیب و غریب انداز سے پیوند کاری کی گئی تھی کہ وہ جسم کا کوئی حصہ نظر آتی تھی۔ یہ پیوند کاری مختلف سائز کی تاروں اور باریک نوزل پائپ کے ذریعے کی گئی تھی۔ 5mm اور 3mm کے باریک نوزل پائپ کا سرا گردن سے ناف تک پیوست تھا۔ دوسرا سرا ناف کے پانچ انچ نیچے سے لے کر پاؤں تک داخل تھا۔ گویا پائپوں اور تاروں کے دونوں کنارے احمد زعابی کے بدن میں داخل تھے۔ ان میں سے پچاس ساٹھ تاریں اور باریک پائپ مختلف مشینوں کے ساتھ بھی منسلک تھے۔ ڈیوڈ نے سب کا بغور جائزہ لیا۔ احمد زعابی کے چہرے پر ماسک چڑھا ہوا تھا وہ کوئی مریض نہیں تھا بلکہ تنومند بھرپور صحت کا مالک تھا۔ بس اسے تجربے کے لیے بے ہوش کیا گیا تھا۔ ڈیوڈ کی طرف سے کیا جانے والا یہ انوکھا اور عظیم تجربہ تھا۔ ہاورڈ، کے ایل گارڈن اور پروفیسر ایم اولیکسی اس کے معاون تھے۔ اس تجربے میں برمودا تکون سے حاصل کی جانے والی لہروں سے احمد زعابی کے جسم کو ناف کے پاس دو ٹکڑوں میں تبدیل کیا جائے گا۔ جسم جیسے ہی دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوگا بیڈ کے اطراف میں لگی مشینیں حرکت میں آجائیں گی۔ خون کا دورانیہ دل کی دھڑکن نظام تنفس کو مشینوں کے ذریعے کنٹرول کیا جائے گا۔ ڈیوڈ کے مطابق ابتدائی تجربے میں اگر نوجوان چار منٹ سولہ سیکنڈ تک زندہ رہ گیا تو یہ عظیم تجربہ کامیاب ہوجائے گا۔ یہ مسلسل بارہ گھنٹوں کا آپریشن تھا۔ کمرے میں ٹوٹل بارہ افراد موجود تھے۔ بیڈ کے پاس ڈیوڈ اور اس کے معاون کھڑے تھے۔ ڈیوڈ نے تمام چیزوں کا جائزہ لینے کے بعد ہاورڈ کی طرف دیکھ کر انگوٹھا کھڑا کیا اور ساتھ ہی دھیرے سے اوکے کہا۔ ہاورڈ نے بیڈ کے ساتھ منسلک ایک بٹن پریس کیا جس سے بیڈ کے چاروں کونوں سے شیشے کی دیواریں ابھر آئی تھی۔ اب احمد زعابی شیشے کے جار میں قید تھا۔ پروفیسر ایم الیکسی نے چند بٹن دبانا شروع کر دیئے تھے۔ چند منٹ تک احمد زعابی سفید دھوئیں میں غائب ہوگیا۔ یہ دھواں شیشے سے باہر نہیں نکل رہا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد دھواں رفتہ رفتہ کم ہونا شروع ہوا اور اگلے پانچ منٹ میں بالکل ختم ہوگیا۔

دھواں کے ختم ہوتے ہی ہاورڈ نے سابقہ بٹن دبا کر شیشے کی دیواریں کلوز کر دیں۔ کمرے میں موجود ہر شخص پوری مستعدی سے اپنے کام میں مگن تھے۔ مشینوں کو آپریٹ کرنے والے افراد کی نظریں اسکرینوں پر جم گئی تھیں۔ جہاں آڑھی ترچھی لکیریں دوڑ رہی تھیں۔ ڈیوڈ نے ایک بار پھر احمد زعابی کا جائزہ لیا۔ مطمئن ہونے کے بعد اس نے پروفیسر کے ایل گارڈن کو اشارہ کیا۔ ڈاکٹر گارڈن جہاں کھڑا تھا وہاں بہت سے بٹن لگے ہوئے تھے۔ اس کی انگلیاں ان پر متحرک ہوچکی تھی۔ وہ ساتھ ساتھ احمد زعابی کو اور سامنے کی بڑی اسکرین کو بھی دیکھے جارہا تھا۔

ڈیوڈ، ہاورڈ اور ایم الیکسی کی نظریں بھی حرکت میں تھی۔ کبھی احمد زعابی تک جاتی اور کبھی گارڈن اور کبھی روشن اسکرینوں پر۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد چھت سے کرکر کی دھیمی آواز پیدا ہوئی۔ انہوں نے نظریں اٹھا کر دیکھا چھت کی طرف ایک مشین جس میں باریک سوراخ تھے نکل کر آہستہ آہستہ نیچے کی طرف آرہی تھی۔ مشین احمد زعابی کے عین اوپر لگی تھی نیچے آکے احمد زعابی کے جسم سے ایک فٹ اوپر رک گئی۔

ڈیوڈ نے آگے بڑھ کر اس کا ایک بٹن پریس کیا جس سے مشین میں حرکت پیدا ہوئی۔ ڈیوڈ نے چند منٹ انتظار کے بعد دو اکٹھے بٹن پریس کیے۔ مشین سے باریک پتلی شعاعیں نکل کر احمد زعابی کے بدن سے ٹکرائیں۔ اس کے بعد ہر شخص حرکت میں آچکا تھا۔ احمد زعابی کا بدن کٹنا شروع ہوچکا تھا۔ ہر آدھے گھنٹے بعد کسی تار یا نوزل پائپ کو ہلکا سا جھٹکا لگتا اور کسی ایک اسکرین کی لکیروں میں اضافہ ہوجاتا۔ وہ لوگ سانس روکے اس مشن میں مگن تھے۔ ہر شخص کے دل کی دھڑکنیں

تیز تھیں۔ اس منصوبے پر اربوں ڈالرز جھونکے گئے تھے۔ ہر کسی کی خواہش تھی وہ فاتح بن کر تجربہ گاہ سے باہر نکلے۔ تقریباً پانچ گھنٹوں میں احمد زعابی کے جسم سے پیوست تار اور پائپ کی نصف تعداد متحرک ہو چکی تھی۔ نصف ابھی باقی تھی جسم کا آدھا حصہ بھی کٹ چکا تھا۔ بدن کو درخت کی طرح سیدھا کاٹا جا رہا تھا۔ بدن کے کٹنے سے خون کا ایک قطرہ بھی ٹپک نہیں رہا تھا۔ وہ لوگ اپنے کام میں مگن تھے۔ دفعتاً احمد زعابی کے جسم نے جھٹکا کھایا۔ بائیں جانب کی مشین سے ٹوں ٹوں کی آوازیں آنے لگی۔ وہ سب بری طرح چونک پڑے۔ مگر ڈیوڈ چونکا نہیں تھا۔ بلکہ اس کا دائیاں ہاتھ سائرن بجانے والی مشین کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ مشین اس سے چار میٹر کے فاصلے پر تھی۔ آپریٹر اسے گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سائرن کا سبب وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ڈیوڈ نے اپنی جگہ سے ایک انچ حرکت نہیں کی مگر اس کے بازو کا سائز بڑھتے ہوئے مشین تک پہنچ گیا تھا۔ ڈیوڈ کا ہاتھ فرش کے ساتھ ساتھ سانپ کی طرح رینگتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔ اس کے سامنے ڈاکٹر گارڈن کھڑا ہوا تھا۔ اس لیے ہاتھ ٹانگوں میں بل کھا کے گزر رہا تھا۔ مشین کی جڑ میں سبز بٹن لگا ہوا تھا۔ ڈیوڈ نے بٹن دبا دیا جس سے نہ صرف مشین سے سائرن کی آواز بند ہو گئی تھی بلکہ احمد زعابی کا جھٹکے کھاتا جسم بھی پرسکون ہو گیا تھا۔ ڈیوڈ نے یہ کام صرف بیس سیکنڈ میں بالا ہی بالا کر دیا تھا۔ کسی کو اس کے ہاتھ کے انوکھے اور پراسرار انداز میں بڑھنے کا علم نہیں ہو سکا۔

''کیا معاملہ تھا؟'' ہیڈ فون میں ہاورڈ کی پریشان کن آواز ابھری۔

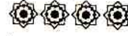
''میں نہیں سمجھ سکا۔'' پروفیسر گارڈن کا لہجہ بھی پریشانی میں ڈوبا ہوا تھا۔

''سب ٹھیک ہے۔ آپ لوگ اپنا کام جاری رکھیے۔ ڈیوڈ نے انہیں تسلی دی۔ جس سے کام دوبارہ شروع ہوا۔ اعصاب شکن آپریشن کو آٹھ گھنٹے بیت چکے تھے احمد زعابی کا جسم دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ جو درمیان سے کٹ جانے کے باوجود احمد زعابی زندہ تھا۔ دل کی دھڑکن اور نظام تنفس بالکل ٹھیک کام کر رہے تھے۔ دو دھڑوں کا انسان اب سانس لے رہا تھا۔ ڈیوڈ سمیت تمام افراد کے چہروں پر خوشی رقصاں تھی۔ ڈیوڈ ٹائم نوٹ کر رہا تھا۔ احمد زعابی کو چار منٹ سولہ سیکنڈ زندہ رہنا ضروری تھا۔ تین منٹ پانچ سیکنڈ گزرے تھے کہ احمد زعابی کے جسم نے ایک بار پھر جھٹکا کھایا۔ بالائی جسم نے اتنی زور سے جھٹکا کھایا تھا کہ اس میں داخل دو باریک تاریں اکھڑ کر جسم سے باہر نکل آئیں۔ ڈیوڈ بری طرح چونک پڑا تھا۔ کیونکہ دو مشینیں آف ہو چکی تھیں۔ اس سے پہلے کہ ڈیوڈ اپنا کچھ کمال دکھاتا۔ آف ہونے والی دونوں مشینیں ایک زوردار دھماکے سے پھٹ گئیں۔

''ڈیوڈ! مجھے لگتا ہے معاملہ بگڑ گیا ہے۔'' ہاورڈ نے چیختے ہوئے کہا۔ اس دوران دھماکوں کا سلسلہ بڑھ رہا تھا۔ ایک ایک کر کے تمام مشینیں پھٹ رہی تھیں۔ بلڈنگ میں سائرن گونجنے لگا۔

''ہمیں جلدی سے عمارت سے نکلنا چاہیے۔'' ڈاکٹر الیکسی نے ہیلمٹ اتار دیا تھا۔ باقی لوگوں نے بھی حالات کو بھانپ لیا۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ہاورڈ نے دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ ڈیوڈ کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی اس کی پیروی کی تھی۔ وہ لوگ ابھی راہداری کراس کر رہے تھے کہ عمارت میں کان پھاڑ دینے والا لرزہ خیز دھماکہ ہوا۔ دھماکہ اتنا زوردار تھا کہ عظیم تجربہ گاہ جس پر اربوں کھربوں ڈالر خرچ کیے گئے تھے۔ تنکوں کی طرح فضا میں اڑنے لگی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے عظیم الشان عمارت ملبے کا ڈھیر بن چکی تھی۔ کئی مایہ ناز دماغ ملبے کے ڈھیر میں چھپ گئے تھے۔ فضا میں گرد وغبار اور آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ اچانک ملبے کے ڈھیر میں سے کوئی چیز آسمان کی طرف ترچھے انداز میں بلند ہوئی۔ لٹو کی طرح گھومتی ہوئی یہ چیز کافی بلندی کے بعد واپس زمین پر آن گری۔ وہ ہنوز لٹو کی طرح گھوم رہی تھی۔ تباہ شدہ عمارت سے آدھا کلومیٹر دور گھومنے والی چیز کا چکر تھما تو اس میں سے بڑے آرام اور

سکون کے ساتھ ڈیوڈ باہر آیا۔ ڈیوڈ نے کھڑے ہو کر تباہ شدہ عمارت کو دیکھا اور پھر کندھے اچک کر ایک طرف چل پڑا۔



شانی حیران نگاہوں سے سامنے بیٹھے ہوئے پرسکون شخص کو دیکھ رہا تھا۔ ہوش میں آتے ہی اس کا خیال تھا کہ اسے رسیوں میں باندھا یا زنجیر میں جکڑا جائے گا۔ مگر اس کے خیال کو شکست ہوئی تھی۔ وہ بیڈ پر آزاد لیٹا ہوا تھا۔ کرسی پر باوقار شخص بڑے مطمئن انداز میں اکیلا براجمان تھا۔ کمرے میں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ شانی خیالات کے ٹیڑھے میڑھے راستوں سے ہوتا ہوا ممی اور منزہ تک پہنچا تو بے اختیار اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ کرسی پر بیٹھا ہوا شخص اسے دیکھ رہا تھا۔

''شانی! تمہیں ہوش آ گیا؟'' اپنائیت اور مہربان لہجہ محسوس کر کے شانی نے ایک بار پھر اسے غور سے دیکھا۔ شانی اسے پہنچاننے سے قاصر تھا۔ تاہم انداز تخاطب سے شانی کو ڈھارس بندھی تھی۔ وہ اپنوں میں ہے۔ مگر یہ انجان اپنے کون ہیں۔ منٹوں میں کئی سوچیں ذہن کی زمین پر اتری تھی۔

''آپ کون ہیں اور مجھے کیوں اغواء کیا گیا ہے۔''

''میرا نام امجد بخاری ہے۔ تم اس وقت میرے گھر میں ہو۔''

''امجد بخاری......!'' شانی نے دل میں دہرایا۔ نام جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ مگر ذہن پر زور دینے کے باوجود شکل وصورت واضح نہیں ہو رہی تھی۔

''میرے ساتھ ممی اور میری بہن تھی' کیا وہ بھی یہاں آپ کے گھر میں ہیں؟''

''نہیں وہ حمزہ کے گھر میں ہیں۔'' امجد بخاری نے بتایا۔ لہجے کی مہربانی اور مٹھاس برقرار تھی۔

''کیا آپ نے ہمیں اغواء کروایا تھا اور یہ حمزہ کون ہے؟''

''جی ہاں۔'' مطمئن سا جواب ملا۔

''حمزہ کے بارے میں تم جلد جان جاؤ گے۔''

''مگر کیوں؟''

''اس لیے بیٹا! کہ تم ہماری اور ہم تمہاری ضرورت ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''جلد سمجھ جاؤ گے۔ جن لوگوں کے خلاف تم صف آرا ہو وہ لوگ ہمارے بھی دشمن ہیں اور مشترکہ دشمن دوستی کی وجہ بنتا ہے۔''

''کون لوگ......؟'' شانی نے چونک کر پوچھا۔

''وہی لوگ جو پاکستان کے دشمن ہیں۔ جنہوں نے پاکستان میں بدنظمی، انتشار، اضطراب و بے چینی، قتل و غارت مچا رکھی ہے۔ جو پاکستان کو ٹکڑوں میں تقسیم ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ جو مذہبی فرقہ واریت کو ہوا دیتے ہیں۔ قوم پرستی اور نسل پرستی کو فروغ دیتے ہیں۔ جو دھوکہ دہی سے ہمیں ایک دوسرے کے خلاف دست و گریبان باہم گتھم گتھا کرتے ہیں اور اپنا مکروہ مفاد پاتے ہیں۔''

امجد بخاری کے لہجے میں نفرت تھی وہی نفرت جو ایسے مواقع پر شانی کے لہجے میں عود آتی تھی۔ امجد بخاری کا لہجہ اس کی سچائی کی دلیل تھا۔ شانی کو یہ سب جان کر خوشی ہوئی کہ وہ ایک محب وطن پاکستانی کے پاس موجود ہے۔ اس کے دل میں تقویت بھرا قیاس جاگا کہ یقیناً ممی اور منزہ بھی بخیریت ہوں گی۔ جب یہ احساس جاگا تو دوریاں بڑی تیزی سے سمٹ گئی تھیں۔ قربتیں اور اعتماد کے رشتے قائم ہونے میں کوئی دیر نہیں لگی تھی۔ امجد بخاری پہلے سے ہی شانی کے بارے میں پوری معلومات رکھتا تھا۔

شانی کو حمزہ، طلحہ، شاہ میل اور گروپ کے دیگر اہم افراد سے ملوایا گیا۔ شانی نے سب کو مخلص دوست کے روپ میں پایا تھا۔ وہ سب محبِّ وطن پاکستانی نوجوان تھے۔ جو دل میں پاکستان کے لیے کچھ کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ ان میں کچھ مکمل مذہبی تھے اور کچھ نماز کی حد تک مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ چند ایسے بھی تھے جو نماز میں بھی سستی برت جاتے تھے۔ شانی حمزہ سے بہت متاثر ہوا تھا۔ حمزہ با اخلاق، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بڑے گھرانے سے

تعلق رکھتا تھا۔ اس کے تین بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ بھائی اور پاپا بزنس سنبھالتے تھے۔ شانی اس کے گھر جا کر ممی اور منزہ کو مل چکا تھا۔ بیگم کلثوم اور منزہ کو وہاں رہنے سے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ کیونکہ حمزہ کا مذہبی گھرانہ ایثار، خلوص اور محبت سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ ان کے بیچ رہ کر بیگانگی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

امجد بخاری نے شانی کو مزید کندن بنانے کے لیے انسٹرکٹر کے پاس کلاس لینے کی ہدایت جاری کی تھی۔ ساتھ ہی شام کو ایک نشست مذہبی اسکالر ڈاکٹر انوار الحق کے ہاں بھی لگتی تھی۔

شانی کو کبھی کبھی ایک سوال بہت کھٹکتا تھا۔ امجد بخاری کے ساتھ نشست میں اچانک وہ پوچھ بیٹھا۔

''سر جی! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ محدود وسائل اور کم تعداد میں بین الاقوامی گروہوں کا خاتمہ کر پائیں گے اور یہ کہ پاکستان کے اندرونی دشمنوں کو بھی کیفر کردار تک پہنچا پائیں گے؟''

''شانی! یہ سوال کم از کم تم جیسے نوجوان کو نہیں کرنا چاہیے۔ جو تن تنہا ملک دشمن لابی کے خلاف لڑنے کے لیے گھر سے نکلا ہے۔ تاہم سوال کا جواب دینا ضروری ہے۔ ہوسکتا ہے یہی سوال ان میں سے کسی نوجوان کے دل میں کھٹک رہا ہو اور وہ کرنے سے اجتناب برت رہا ہو۔'' امجد بخاری نے دوسرے لڑکوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''دنیا میں چند خفیہ ایجنسیاں بہت اہم رول ادا کر رہی ہیں۔ امریکی ایجنسی سی آئی اے کے ٹوٹل 25000 ایجنٹ ہیں یہ پچیس ہزار افراد پوری دنیا میں اپنا کمال دکھا رہے ہیں۔ روس کی خفیہ ایجنسی کے جی بی کے ایجنٹوں کی تعداد تقریباً اڑھائی لاکھ ہے اور آپ یہ سن کر ورطہ حیرت میں ڈوب جائیں گے کہ دنیا میں اس وقت انتہائی اہم کارنامے سرانجام دینے والی اسرائیلی خفیہ تنظیم موساد کی مین پاور صرف 1200 سو افراد پر مشتمل ہے۔ اتنی قلیل تعداد کے باوجود ان کے کارناموں کی فہرست انتہائی طویل ہے۔''

''سر جی......! بارہ سو افراد تو فقط ملک کے اندرونی معاملات ہی نمٹاتے ہوں گے۔''

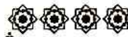
''افراد کی تعداد دیکھ کر یہی قیاس لگایا جاسکتا ہے لیکن ایسی بات نہیں ہے۔ موساد کم تعداد کے باوجود حیران کن نتائج فراہم کرتی ہے موساد کی دو ذیلی شاخیں مشباک اور کڈون ہیں۔ بیرونی معاملات کڈون نمٹاتی ہے جب کہ داخلی کام مشباک سرانجام دیتی ہے یہ فلسطینی کمانڈوز اور مجاہدین سے بھی نبرد آزما رہتے ہیں۔ جبکہ کڈون بیرون ملک اپنی کارکردگی کے جوہر دکھاتی ہے۔ خاص کر مسلمان ممالک میں۔ دہشت گردی، تخریب کاری کی موجب یہی شاخ ہے۔ مسلم ممالک میں علیحدگی پسندوں کی پشت پناہی کرنے، انہیں تربیت دینے اور اسلحہ فراہم کرنا بھی اسی کا کام ہے۔ موساد نے اسلامی ممالک میں خاص نیٹ ورک قائم کر رکھے ہیں......'' امجد بخاری نے چند لحظہ رک کر سب کا جائزہ لیا اور ان کی دلچسپی کو برقرار سمجھتے ہوئے سلسلہ کلام آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''1993-94 میں کشمیری مجاہدین نے موساد کا ایک ایجنٹ گرفتار کر کے اس کا باقاعدہ انٹرویو دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ افغانستان میں موساد کے کئی ایجنٹ طالبان کے ہاتھوں قتل ہوچکے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے سر جی! موساد دنیا کے بیشتر ممالک میں دخل اندازی کر رہی ہے۔''

''بالکل شانی! خصوصاً اسلامی ممالک میں۔ میں تم لوگوں کو ایک اہم واقعہ سناتا ہوں، جو عرب اسرائیل جنگ کے دوران پیش آیا۔ مصری حکومت نے انڈیا سے انسٹرکٹر منگوائے تھے مگر انڈین انسٹرکٹروں کے روپ میں وہاں موساد کے ایجنٹ پہنچ گئے۔ جنہوں نے مصری فضائیہ پر کنٹرول حاصل کرلیا۔ جنگ شروع ہوئی تو مصری فضائیہ کے سارے طیارے بنکروں سے نکل کر ہاتھ جوڑے لائن میں کھڑے تھے۔ اسرائیلی فضائیہ نے بڑے آرام سے بغیر کسی مذاحمت کے مصری فضائیہ کے تقریباً

500 طیاروں کو کھڑے کھڑے راکھ کا ڈھیر بنا دیا تھا۔"
"اونو سر جی! کیا واقعی ایسا ہوا تھا؟" طلحہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
"طلحہ! میں من گھڑت قصے کہانیاں نہیں سنا رہا تاریخ سنا رہا ہوں۔" امجد بخاری کا لہجہ انتہائی تلخ تھا۔
"سوری سر جی! میں حیرانی میں احمقانہ سوال پوچھ بیٹھا۔"
"کوئی بات نہیں۔" اس بار امجد بخاری نے نرم لہجے میں کہا۔
"میں یہ بات اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم لوگ جان سکو یہودی ایجنسی کس طرح دنیا پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ دو ممالک کے درمیان حالات کشیدہ کرنے کے بعد ان میں جنگ چھیڑنا اور دونوں ممالک پر اسرائیلی اسلحہ فروخت کرنا بھی انہی کا کمال ہے۔ اسلامی ممالک میں ترکی سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے ترکی اسرائیل کے اسلحہ کی بڑی منڈی ہے۔ ترکی کا یہ حال ہے کہ ان کی افواج کو اسرائیل ٹریننگ دیتا ہے۔ جبکہ ترک مخالف گروہوں کو اسلحہ فراہم کرنا اور انہیں تربیت دینا بھی موساد کا کام ہے۔ میری اس لمبی چوڑی تمہید کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ موساد کی افرادی قوت صرف 1200 افراد پر مشتمل ہے اور وہ پوری دنیا پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ تو ہم کیونکر اپنے ملک دشمن عناصر کو مٹا نہ پائیں گے۔ دیانت داری، پیشہ ورانہ مہارت اور خلوص نیت سے جو بھی کام کیا جائے کامیابی کا تناسب سو فیصد ہوتا ہے۔ انشاء اللہ ہم بھی کامیابی حاصل کر کے رہیں گے۔"
امجد بخاری انہیں اندر کے اہم معاملات نہیں بتا سکتا تھا۔ جس طرح حکومت میں کالی بھیڑیں موجود ہیں اسی طرح محب وطن لوگوں کی بھی کمی نہیں۔ ایسے لوگ جو اپنی نوکری یا بڑوں کی وجہ سے کچھ کرنے سے محروم ہیں وہ امجد بخاری کی در پردہ مدد کرتے تھے۔ ورنہ امجد بخاری کے ذاتی وسائل اتنے نہیں تھے کہ وہ اس طرح کا کوئی منظم گروپ چلا سکتا۔ باتوں کے دوران فون بول اٹھا۔ امجد بخاری نے ریسیور اٹھایا۔
"ہیلو! امجد بخاری بول رہا ہوں۔"
"سر جی! میں شرجیل بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے احتیاط کا دامن پکڑے شرجیل کی آواز سنائی دی۔
"ہاں، بولو شرجیل کیا خبر ہے؟"
"سر جی! ایم این اے فاروق بلوچ کے گھر ایک شخص داخل ہوا جو حلیے سے مقامی لگتا ہے مگر شکل و صورت سے غیر ملکی دکھائی دیتا تھا۔"
"کیا وہ ابھی تک فاروق بلوچ کے گھر میں موجود ہے؟"
"نہیں سر جی! وہ اندر صرف آدھا گھنٹہ رکا تھا۔"
"ہوں....." امجد بخاری نے پرسوچ ہنکارا بھرا۔ چند لمحے کچھ سوچا اور پھر شرجیل کو نگرانی جاری رکھنے کی ہدایت کرنے کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔
"میرا خیال ہے فاروق بلوچ کو اب ہمارا مہمان بن جانا چاہیے۔"
"جی ہاں۔ سر جی! میں محسوس کر رہا ہوں اس کے پر بہت پھیل رہے ہیں۔ اب وہ اونچی اڑان اڑنے کی کوشش میں ہے۔" حمزہ نے سر جی کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔
"تو ٹھیک ہے حمزہ! تم کچھ لڑکے ساتھ لے جاؤ کل فاروق بلوچ سے دوسری بلڈنگ میں ملاقات کروں گا۔"
"او کے سر جی! کیا میں شانی کو ساتھ لے جا سکتا ہوں؟"
"بالکل لے جا سکتے ہو۔ کیوں شانی تم تیار ہو ناں؟"
"جی سر جی! آپ حکم کریں۔"
"شانی! تم، حمزہ اور شرجیل تینوں یہ کام با آسانی کر سکتے ہو۔ بس خیال رہے کہ فاروق بلوچ موجودہ ایم این اے ہے۔"
"آپ فکر نہ کریں سر جی! انشاء اللہ کل دوسری بلڈنگ میں آپ کی ملاقات ضرور ہوگی۔" شانی نے پرعزم لہجے میں کہا۔ امجد بخاری جانتا تھا شانی اور حمزہ کے لیے یہ معمولی کام ہے۔



"شانی! تم امجد بخاری جیسے مضبوط شخص کے گروپ میں شامل ہو چکے ہو۔ اس لیے میں تمہیں کچھ یاد دلانا چاہتا ہوں۔"

"روشن نواز! یہ اچانک بیٹھے بٹھائے تمہیں کیا یاد آ گیا ہے۔"

"وعدہ......" روشن نواز نے کہا تو شانی نے اسے گھورا۔ پھر بھوئیں اوپر کرتے ہوئے بولا۔

"کون سا وعدہ......؟"

"گوریا بستی کے لیے راستے پر تم نے بروج سے وعدہ کیا تھا۔"

"روشن نواز! میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ وعدہ زبان سے کیا جاتا ہے۔ میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔"

"خود کو فریب دے رہے ہو۔"

"وہ کیسے؟"

"قسم اٹھاؤ۔ جب سے بروج سے بچھڑے ہو کوئی ایسا پل بھی گزرا ہے جس میں اسے یاد نہ کیا ہو۔"

"روشن نواز! میں جن راہوں کا مسافر ہوں۔ ان راہوں پر پیار نام کی چیز پنپ نہیں سکتی۔ اس لیے یہ باتیں رہنے دو۔"

"تو پھر وعدہ کیوں کیا تھا؟ کیا پتہ وہ ابھی تک وعدہ کی ڈور سے بندھی تمہاری راہ تک رہی ہو۔ کیونکہ تم نے عملاً وعدہ کیا تھا جب بروج نے وعدہ کہہ کر ہاتھ بڑھایا تھا تب تم نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس کا مطلب جانتے ہو......؟"

"جانتا ہوں۔ روشن نواز، مگر مصلحت کا تقاضہ ہے کہ میں وعدہ اور جن سے وعدہ کیا اسے بھول جاؤں۔"

"بھول سکو گے؟" روشن نواز نے براہ راست سوال کر دیا تھا۔ شانی اس سوال سے کنی کترانے لگا تھا۔

"مجھے معلوم ہے شانی! بروج تمہارے لاشعور میں مسکن بنا چکی ہے۔"

روشن نواز! تم حالات و واقعات کو سمجھو۔ مجھے ایسی باتوں میں مت الجھاؤ۔ میں گھر سے جیت کی لگن میں نکلا ہوں اور تم مجھے ہارنے کی طرف راغب کر رہے ہو۔

"شانی! میں نہیں چاہتا کہ جیت کی لگن میں دوڑتے ہوئے جب قریب منزل پہنچو تو خود کو ادھورا محسوس کرو۔"

"میں سمجھا نہیں؟"

"شانی! مجھے پوری سچائی کے ساتھ جواب دو۔ کیا تم بروج سے پیار نہیں کرتے۔" روشن نواز کے سوال پر شانی جذباتی ہو گیا تھا سچ اور حقیقت وہی تھی جو روشن نواز کہہ رہا تھا۔

"شانی! تمہیں روشن نواز کی بات ماننا ہو گی۔" اس بار ہم نواز نے کہا۔

"ہم سب جانتے ہیں۔ بروج کی غیر معمولی خوبصورتی کے سامنے تو پہلے ہی ہار چکا ہے۔ روشن نواز ٹھیک کہتا ہے۔ اس کے بغیر تم خود کو ادھورا محسوس کرو گے۔ اس لیے جانا تو پڑے گا۔"

شانی نے عاصم نواز کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"شانی! اندر کی بات تو بتاؤ یار۔"

"اندر کی بات تم سب جانتے ہو۔" شانی نے طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے بہت کوشش کی مگر بروج کے خیالات سے چھٹکارہ نہیں پا سکا ہوں۔ حالات جیسے بھی تھے بروج میرے ساتھ ساتھ رہی۔" شانی اقرار محبت کر چکا ہے تو روشن نواز چہکتے ہوئے بولا۔

"شانی! وہ حسن بے مثال ہی ایسا ہے۔ چلو آج دیدار یار کرتے چلیں۔"



بروج گوریا بستی کی آبادی سے باہر کچے راستے پر کھڑی تھی۔ شانی اسے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

خوبصورتی کی انتہا کو چھونے والی بروج اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ اس کے سامنے تھی۔ شانی بنا پلکیں جھپکائے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ آج کی بروج کل کی بروج سے دو گناہ زیادہ خوبصورت حسین و جمیل لگ رہی تھی۔

روشن نواز نے خوشی سے شانی سے کہا۔
''شانی! قدرت کے اس شہکار کو تم بھلا کیسے بھول سکو گے۔ ایسا حسن کہیں دیکھا نہ سنا ہوگا۔''
''تم ٹھیک کہتے ہو روشن نواز بروج کا حسن خوابوں خیالوں سے بڑھ کر ہے۔'' شانی اور روشن نواز کا مکالمہ چند سیکنڈ میں ہوا تھا۔ بروج شانی کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وارفتگی تھی۔ انسانی رویئے اس کی اندرونی کیفیت کے علمبردار ہوتے ہیں۔ بروج اور شانی یکساں کیفیات کا شکار تھے۔ گوریہ بستی کا کچا راستہ اور کچے راستے سے اڑتی دھول انہیں مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔ جب دو محبت بھرے دل باہم ملتے ہیں تو قدرتی موسم کیسا بھی ہو اندر کا موسم انتہائی خوشگوار اور پرکیف ہو جاتا ہے۔ جس کے زیر اثر باہر کا موسم بھی دلفریب اور دلکش بن جاتا ہے۔ شانی اور بروج بھی انہیں کیفیتوں کے زیر اثر تھے۔
''کیسی ہو بروج......؟''
''اب بہت اچھی ہوں۔'' بروج نے ذرا توقف کرتے ہوئے کہنا شروع کیا تھا۔ شانی کی نظریں اس کے خوبصورت ہونٹوں کا نظارہ کر رہی تھیں۔ سیب کی دو تراشی ہوئی قاشیں باہر سے سرخ اندر سے نرم۔
''بروج میرے آنے کا تمہیں الہام تو نہیں ہوا۔ میرے آنے سے پہلے میرے استقبال کے لیے بستی سے باہر کھڑی ہو۔''
''میں ہر روز اس وقت یہاں ضرور آتی ہوں۔ جس وقت تم مجھ سے جدا ہوئے تھے۔ میں اس کچے راستے کو تکتی رہتی ہوں۔ جس پر چل کر تم گئے تھے۔ میری آنکھوں میں اڑتی دھول کا منظر تمہارے تصور کے سبب لطافت بھر دیتا ہے۔ میں یہاں پتہ نہیں کتنی دیر کھڑی رہتی ہوں۔ درختوں اور کھیتوں کو تکتی رہتی ہوں۔ جو تمہارے وعدہ کے گواہ ہیں۔''
''میں نے اپنا وعدہ نبھا دیا ہے۔ بروج میں لوٹ آیا ہوں۔''
''شانی! وعدہ کرنا انسان کا اپنا فعل ہوتا ہے۔ مگر وعدہ نبھائے جانے کا انحصار دوسروں کے جذبوں سے ہوتا ہے۔ میں اپنے جذبوں کی عینک سے تیرے وعدے کو دیکھتی تھی تو مجھے مایوسی نہیں اطمینان ہوتا تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔''
''اچھا......'' شانی نے اچھا کو خاصہ کھینچ کر کہا۔
''کیا اتنا بھروسہ ہے جذبوں پر؟''
''تمہاری سوچوں سے بھی زیادہ۔''
''بروج ایک بات پوچھوں؟''
''ہاں پوچھو۔'' بروج نے بلا تامل جواب دیا۔
''تم اتنی خوبصورت، فلسفیانہ اور گہری باتیں کیسے کر لیتی ہو۔ جبکہ تمہاری کوئی خاص تعلیم بھی نہیں ہے۔''
''پیار سے بڑھ کر اور کیا تعلیم ہوگی۔''
''کیا تمہیں پیار ہے بروج؟''
''ہاں......''
''کس سے؟''
''اس سے جس کو مجھ سے پیار ہے۔''
شانی کو اس سوال و جواب میں گدگدی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے دیدے گھماتے ہوئے پوچھا۔
''اور تم سے کس کو پیار ہے؟''
''اسی کو جس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر لوٹ آنے کا وعدہ کیا تھا اور اب وعدہ نبھاتے ہوئے میرے سامنے کھڑا ہے۔'' بروج کے انداز واحساس میں عجیب قسم کی خود اعتمادی تھی۔ جو گوریا بستی کے کچے مکان میں پیدا ہونے والی کسی بھی لڑکی کے لیے تصور بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ مگر بروج بہت الگ تھلگ لڑکی تھی۔ اس نے اظہار محبت کیا بھی تھا اور کروایا بھی تھا۔ اس کے بعد شانی اور بروج کے درمیانی فاصلے لمحوں میں مٹ گئے تھے۔
شانی اور حمزہ نے ایک ہفتہ بعد فاروق بلوچ کو اغواء کرنے کا پلان بنایا تو اس دوران شانی بروج سے تین بار مل چکا تھا۔



حمزہ نے فاروق بلوچ کو اس کے بنگلے سے اغواء کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ شانی اور شرجیل کے ساتھ مل کر

پلان پر مکمل غور وخوض کیا گیا تھا۔ ہر نقطے پر ڈسکس کی گئی تھی۔ مگر انہیں خبر ملی کہ فاروق بلوچ کو اچانک اسلام آباد جانا پڑا ہے۔ جہاں انہوں نے وفاقی وزراء کی میٹنگ میں شرکت کرنا تھی۔ دو روز بعد قومی اسمبلی کا اجلاس بھی تھا۔ فاروق بلوچ کا اسلام آباد میں دو ہفتوں کا شیڈول تھا۔ حمزہ نے امجد بخاری سے مشورہ کیا تو انہوں نے حمزہ پر واضح کر دیا تھا۔

''ہم مزید انتظار نہیں کر سکتے۔ مجھے فاروق بلوچ سے جلد ملنا ہے۔''

''او کے سر جی! پھر ہم لوگ اسلام آباد چلتے ہیں۔''

تمہاری مرضی پر منحصر ہے حمزہ۔'' سر جی نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''مجھے فاروق بلوچ چاہئے۔ تم چاہو تو اپنے ساتھ مزید بندے لے سکتے ہو۔''

''میرے خیال میں اس کام کے لیے ہم تین کافی ہیں۔'' حمزہ نے امجد بخاری کے باوقار چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر ایک خیال سے بولا۔

''سر جی! ہم اسے اسلام آباد میں اغواء کر لیں گے مگر کوئٹہ لانے میں دقت ہو گی۔'' امجد بخاری نے حمزہ کی بات سن کر پاکٹ سے والٹ نکالا۔

''یہ وزٹنگ کارڈ ہے۔ تمہیں جو کچھ چاہئے ان سے لے سکتے ہو۔'' حمزہ نے امجد بخاری سے کارڈ لے کر دیکھا

''راجا جنید' اپنا پلان بناتے وقت تم اس پر اعتماد کر سکتے ہو۔ مال و اسباب اور ٹھکانہ راجا صاحب تمہیں مہیا کر دے گا۔'' سر جی نے اس تفصیل سے آگاہ کیا۔

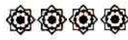
''میں اسے آج ہی فون کر دوں گا۔''

''اس کا مطلب ہے سر جی! ہمیں فاروق بلوچ کو اسلام آباد میں ہی رکھنا ہو گا۔''

''یہی بہتر رہے گا۔ اسلام آباد یا پھر راولپنڈی۔'' امجد بخاری نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تم لوگ خود پلان بناتے وقت فیصلہ کر سکتے ہو۔''

''او کے سر جی! اللہ حافظ۔''



اسلام آباد پہنچتے ہی حمزہ نے سامنے نقشہ پھیلا لیا تھا۔ شرجیل شانی اور راجا جنید اس کے ساتھ شامل تھے۔ راجا جنید بارعب شخص تھا۔ پچاس سے تجاوز کرنے والا راجا جنید انتہائی سنجیدہ شخص تھا۔ کم گوئی اس کا خاصہ تھی۔ مگر جب بولتا مدلل اور ٹھوس بولتا تھا۔ راجا جنید نے انہیں فاروق بلوچ کا مکمل شیڈول پیش کر دیا تھا۔ جس کو مدنظر رکھ کر انہوں نے اغواء کا پلان ترتیب دیا تھا۔

دو دن بعد فاروق بلوچ کو پرسنل دعوت پر مارگلہ ہوٹل جانا تھا۔ اسی دن 1 بجے اسے لوک ورثہ بھی جانا تھا۔ اس شیڈول کو سامنے رکھ کر انہوں نے پلان ترتیب دیا تھا حمزہ نقشے پر انگلی گھماتے ہوئے کہا۔

''اگر فاروق بلوچ سرکاری ہوٹل سے نکلتا ہے تو خیابان سرسید روڈ سے ہوتا ہوا شارع کشمیر پر آئے گا اور یہاں سے مارگلہ ہوٹل کی طرف ٹرن کرے گا اور اگر وہ لوک ورثہ سے براہ راست مارگلہ ہوٹل جاتا ہے تو گارڈن ایونیو کے راستے سے اسلام آباد اسپورٹس کمپلیکس یا جناح اسٹیڈیم کی طرف سے آئے گا۔''

''حمزہ یہاں ایک روڈ روز اینڈ جاسمین گارڈن کی طرف گھوم رہا ہے۔ یہ روڈ Tourist Camp سے ہو کر شارع کشمیر سے جا ملتا ہے اور آگے مارگلہ ہوٹل کی طرف لنک روڈ جاتا ہے۔'' شانی نے حمزہ کو دیکھتے ہوئے بتایا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو شانی' سیکٹر H-6 میں ہمیں یہ کام کرنا ہو گا۔ یا پھر شارع کشمیر پر کیونکہ مارگلہ ہوٹل جاتے وقت اس روڈ سے گزرنا ضروری ہے۔'' حمزہ نے تینوں کو باری باری دیکھا۔

''آپ کا کیا خیال ہے۔ وہ راجا جنید سے رائے طلب کر رہا تھا۔ ہماری ایک گاڑی جناح اسٹیڈیم کے پاس کہیں کھڑی ہو گی اور دوسری لوک ورثہ کے پاس دونوں گاڑیوں میں ہمارے ڈرائیورز موجود رہیں گے۔ میرے خیال میں تم لوگوں کو یہ کام مارگلہ ہوٹل کو جانے

والے روڈ پر کرنا چاہئے وہاں سے تمہیں سیدھا جناح اسٹیڈیم آنا ہے وہاں گاڑی تبدیل کرنی ہے دوسری گاڑی تم لوگوں کو لوک ورثہ کے قریب تبدیل کرنی ہے۔ وہاں سے موقع کی مناسبت سے شکر پڑیاں کی طرف جاؤ یا زیرو پوائنٹ نکلو بہر حال تمہیں راولپنڈی پہنچنا ہے۔" راجا جنید نے بہت اچھا پلان بتایا تھا۔ جسے تینوں نے او کے کر دیا تھا۔

فاروق بلوچ کی وہ نجی مصروفیات تھی۔ اس لیے روایتی سرکاری پروٹوکول نہیں تھا۔ البتہ ان کے ذاتی محافظوں کی گاڑی ان کے ساتھ تھی۔ شرجیل نے محافظوں کی گاڑی پر اندھا دھند فائرنگ کی تھی۔ جس سے گاڑی ڈرائیور کے کنٹرول سے باہر ہو کر لہراتی ڈگماتی ہوئی بجلی کے کھمبے کو رگڑتی ہوئی دکان کی دیوار سے ٹکرائی تھی۔ شرجیل انتظار کرتا رہا مگر شاید محافظ بے ہوش ہو چکے تھے یا پھر گاڑی اس قدر مسخ ہو گئی تھی کہ انہیں باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملا تھا۔ شرجیل کو اب شانی اور حمزہ کو کور کرنا تھا۔ اس کے پاؤں میں بجلیاں بھری ہوئی تھی۔ آنکھیں چیتے کی طرح گردوپیش کا جائزہ لے رہی تھی۔ لوگوں کی چیخ و پکار اور بھاگ دوڑ سے روڈ پر بھگدڑ مچ گئی تھی۔ ٹریفک جام ہو چکا تھا۔ شانی اور حمزہ نے اس موقع پر حیران کن پھرتی دکھائی تھی۔ وہ آناً فاناً فاروق بلوچ کی گاڑی کے دروازے کھول کر محافظوں کو گھسیٹ کر باہر نکال چکے تھے۔ ڈرائیور گاڑی بھگا نہیں سکتا تھا۔ انہیں صورت حال سمجھنے میں چند منٹ لگے تھے۔ تب تک شانی اپنا کام دکھا چکا تھا۔ مشین گن کے دستے اور اس کی لات نے دونوں محافظوں کو یکبار بے ہوش کر دیا تھا۔ حمزہ ڈرائیور سے نمٹ کر خود اس کی جگہ لے چکا تھا۔ شانی نے عقبی سیٹ میں جانے تک کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا تھا۔

"کک ...... کون ہو تم لوگ، مجھے جانتے ہو۔" فاروق بلوچ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھی۔

"ہم ...... میں ایم ......" خوف اور دہشت سے الفاظ اس کے گلے میں پھنس رہے تھے۔

"خاموش رہو۔" عقبی سیٹ سے شانی نے غراتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی فاروق بلوچ کی پسلیوں سے گن لگائی اور تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"اگر ایک لفظ بھی نکالا تو پسلیوں میں شگاف کر دوں گا۔" اس کے لہجے میں ایسی دہشت تھی کہ فاروق بلوچ کو مزید کچھ کہنے کی جرات نہیں ہوئی۔ حمزہ نے گاڑی گولی کی سی رفتار سے قریبی گلی میں گھسا دی تھی۔ اس ساری کارروائی میں بمشکل پندرہ منٹ صرف ہوئے تھے۔ لوک ورثہ پر انہوں نے آخری گاڑی تبدیل کی اور سیدھا 9th Avenue نکل آئے۔ وہاں سے بنا کسی رکاوٹ کے ایک خستہ حال مکان میں پہنچ گئے۔ جہاں راجا جنید اور امجد بخاری ان کے منتظر تھے۔



"امجد بخاری! تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔" فاروق بلوچ امجد بخاری کو سامنے دیکھ کر پہلے حیران ہوا اور پھر انتہائی غصے میں بولا۔

"تم نے ایم این اے کو اغواء کر کے غداری کا ثبوت دیا ہے۔ جس کی تمہیں انتہائی کڑی سزا ملے گی۔" اسے کرسی پر بٹھا کر باندھا گیا تھا۔ امجد بخاری کے ساتھ شانی اور حمزہ موجود تھے۔

فاروق بلوچ کی بات سن کر شانی غصے میں آگے بڑھا اور زبردست مکا فاروق بلوچ کے چہرے پر جڑ دیا۔ وہ درد سے بلبلا اٹھا۔

"کمینے انسان، خود وطن کا سودا کرتے ہو اور دوسروں کو غدار کہتے ہو۔"

"تم مجھے گالی دے رہے ہو۔ میں ایم این اے ہوں۔"

"میرا تو جی چاہ رہا ہے تیری کھوپڑی میں ابھی چھ گولیاں اتار دوں۔" شانی کا پارہ بلندی کو چھو رہا تھا۔ اس نے ریوالور فاروق بلوچ کی کنپٹی سے لگا دیا تھا۔ فاروق بلوچ کانپ کر رہ گیا تھا۔

"فاروق بلوچ! تم جس کرسی پر اترا رہے ہو وہ تو تمہارا حق ہی نہیں بنتا۔ تم اکثریت کے نہیں اقلیت کے

نمائندے ہو۔'' امجد بخاری نے فاروق بلوچ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''مجھے پہلے ہی عبدالبارق نے کہا تھا۔ امجد بخاری پر نظر رکھو۔ مگر میں نے تمہیں نظرانداز کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ تم مجھے ایم این اے ماننے سے انکاری ہو۔'' فاروق بلوچ کے لہجے میں پچھتاوا تھا۔

''فاروق! بلوچ تمہارے حلقے میں ایک لاکھ دس ہزار رجسٹرڈ ووٹر ہیں۔ پانچ اُمیدواروں میں تمہیں ٹوٹل چالیس ہزار سے کچھ اوپر ووٹ ملے تھے۔ باقی ستر ہزار ووٹ چار اُمیدواران میں تقسیم ہو گئے تھے۔ اس لیے تم کامیاب قرار پائے۔ مگر جو ستر ہزار ووٹ تمہارے خلاف پڑے ہیں کیا تم ان کے منتخب نمائندے ہو؟ نہیں تم ستر ہزار کے نہیں صرف چالیس ہزار لوگوں کے نمائندے ہو۔ ان چالیس ہزار میں بھی شاید دس پندرہ ہزار کی تم نے دھاندلی کی ہوگی کیونکہ تم حکومت کے منظورِ نظر رہے ہو۔ سرکار نے تمہیں کامیاب قرار دیا ہے۔ مگر تم اقلیت کے نمائندے ہو اکثریت کے نہیں۔''

''یہ قانون ہے امجد بخاری! اور میں قانونی طور سے کامیاب ہوا ہوں جس کو تم جھٹلا نہیں سکتے۔''

''افسوس تو اسی بات کا ہے لوگوں کے اذہان وقلوب میں مغرب کی پیداوار جمہوریت کو اس طرح ڈالا گیا ہے کہ لوگ اسے اسلامی قانون پر ترجیح دینے لگے ہیں۔ امجد جمہوریت میں کئی تضاد اور نقصانات ہیں۔ یہ فرعون کا قانون ہے اور اصل قانون اسلامی قانون ہے۔ عوام کی ترجمانی کرنے والی طرزِ حکومت حضرت عمر فاروقؓ کی حکومت ہے۔ باقی سب جھوٹے نعرے اور خوبصورت بہلاوے ہیں۔''

''امجد بخاری! تم کچھ بھی کہو۔ ہمیں عوام نے چنا ہے اور پاکستان کے قانون نے مجھے ایم این اے کی کرسی پر بٹھایا ہے۔ تم لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے ایک ایم این اے کیا کچھ کر سکتا ہے۔'' فاروق بلوچ نے انہیں مرعوب کرنے کی غرض سے کہا۔

اس کی بات سن کر شانی نے سابقہ حرکت پھر دہرائی۔ اس بار شاید زور زیادہ صرف ہوا تھا۔ فاروق بلوچ کو دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

''ہمیں دھمکی دیتے ہو غدار انسان۔'' شانی کے گال غصے سے پھڑ پھڑانے لگے تھے۔ فاروق بلوچ اس کا جنون دیکھ کر اندر سے لرز گیا تھا۔

''فاروق! تم جیسے سیاستدانوں کی خوش قسمتی اور پاکستان کی بدقسمتی ہے کہ ملک میں بالغ نظر عوام کی کمی ہے۔'' امجد بخاری نے شانی کو اشارے سے پیچھے ہٹانے کے بعد کہا۔

''اوپر سے حالات ایسے نہج پر ڈالے جاتے ہیں۔ ایک غریب شخص کو دو وقت کی روٹی مل جانا غنیمت ہے۔ ان حالات سے سرمایہ دار فائدہ اٹھا کر ان کی جیب میں ہزار دو ہزار ٹھونس کر ان کے مسیحا بن جاتے ہیں۔ کسی شخص کا بھائی، بیٹا یا خاندان کا کوئی فرد نوکری پر لگا دیتے ہیں تو وہ ان کا غلام بن جاتا ہے۔ کچھ ہماری تعلق داریاں اور محلہ داریاں مار دیتی ہیں۔ نتیجہ پاکستان کو لوٹنے والے تو بہت ملے۔ پاکستان پر لٹانے والا کوئی نہیں ملا۔''

فاروق بلوچ خاموش رہا اسے شانی سے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ غصہ میں کہیں وہ گولی نہ چلا دے۔ امجد بخاری اس کے روبرو ہوتے ہوئے بولا۔

''فاروق بلوچ! نثار پور کی پہاڑیوں پر غیر ملکی گروپ متحرک تھا۔ اس کے ساتھ تمہارے کیا تعلقات ہیں؟''

امجد بخاری کا سوال فاروق بلوچ کے تصور سے بھی بالاتر تھا۔ وہ اس کارروائی کو اغواء برائے تاوان سمجھ رہا تھا

''تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''وہی جو تم سن رہے ہو۔ سنو فاروق بلوچ ہمارے پاس تمہارے خلاف بہت سے ثبوت ہیں بہتر یہی ہے کہ جو پوچھا جا رہا ہے اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔'' حمزہ جو اب تک خاموش کھڑا تھا کرخت لہجے میں بولا۔

''مجھے نہیں معلوم تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں......'' فاروق بلوچ کی بات ادھوری رہ گئی۔ حمزہ کا مکا بہت سخت

تھا۔ فاروق کے دو دانت ٹوٹ چکے تھے اور منہ خون سے بھر گیا تھا۔

"فاروق بلوچ! انہیں دیکھ رہے ہو۔" امجد بخاری نے شانی اور حمزہ کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ منہ سے زیادہ گولی کی زبان پسند کرتے ہیں۔ اسپیشلی تم جیسے قوم کے غداروں کے لیے۔ جو داخلی طور پر سازشوں کا حصہ بن کر بیرونی دشمنوں کے لیے ملک کو تر نوالہ بنانے کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔"

"امجد بخاری!" "تم مسلسل مجھے غدار کہہ رہے ہو۔"

"ہاں تم غدار ہو...... غدار۔" امجد بخاری اس بار اچھل کر حلق کے بل چلایا تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"جب تم جیسے غدار لوگ کرسی بالا پر فائز ہوتے ہیں تو سمجھ لیتے ہیں ہماری طاقت ناقابل تسخیر ہے۔ عصر حاضر کے ہم ہی خدا ہیں۔ مگر تم لوگ بھول جاتے ہو جب یہ ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے تب خدا تعالیٰ حمزہ اور شانی جیسے محبّ وطن نوجوان کھڑے کر دیتا ہے اور جب ایسے نوجوان اٹھتے ہیں تو یہ تم جیسے غداروں کو چیونٹیوں کی طرح مسل کر رکھ دیتے ہیں۔"

"شانی!" امجد بخاری کہتے ہوئے شانی کی طرف گھوما۔

"لیس سر جی......!"

"میں جا رہا ہوں۔ شام تک مجھے اس کے اندر کا سارا سچ باہر چاہیے۔"

او کے سر جی۔" شانی نے امجد بخاری کے جاتے ہی ڈرل مشین نکالی۔ مشین کے سامنے المونیم میں سوراخ کرنے والی دس ایم ایم کی بٹ لگی تھی۔ حمزہ نے مشین کا سوئچ پلگ میں لگا دیا۔ مشین پوری رفتار سے گھوم کر گھر گھر کی خوفناک آواز نکال رہی تھی۔ فاروق بلوچ کے جسم میں خوف سنسناہٹ بن کر دوڑ گیا۔ وہ خوف زدہ آواز میں بولا۔

"کیا...... کیا کر رہے ہو تم......"

"ابھی پتہ چل جائے گا۔" شانی اس کے قریب آ چکا تھا۔ فاروق بلوچ کے دونوں ہاتھ کرسی کے بازو پر بندھے ہوئے تھے۔ شانی نے ڈرل مشین اس کے دائیں ہاتھ کی طرف بڑھائی۔ فاروق بلوچ پر دہشت طاری ہوگئی تھی۔

"نہیں خدا کے لیے یہ ظلم......" وہ کہنا چاہ رہا تھا مگر اس کی آواز چیخوں میں بدل گئی تھی۔ ڈرل مشین نے اس کے ہاتھ میں سوراخ کر دیا تھا۔ خون فوارہ کی طرح نکل کر نیچے گرنے لگا۔ فاروق بلوچ بے ہوش ہو چکا تھا۔ حمزہ نے پانی کا پورا جگ اس کے چہرے پر انڈیل دیا۔ پانی کی ٹھنڈک نے اسے بے ہوشی کی دنیا سے واپس کھینچ لیا۔ ہوش میں آتے ہی فاروق بلوچ درد سے ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا تھا۔

"تم...... تم وحشی ہو۔ درندے ہو۔ تم انسان نہیں ہو سکتے۔" وہ جذباتی انداز میں چیخ رہا تھا۔

"تم جیسے غدار انسان سے ہم وحشی درندے بہتر ہیں۔ جو وطن کا سودا نہیں کرتے۔" حمزہ نے انتہائی نفرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی شانی کو اشارہ کیا۔ اس بار شانی کا ہدف بایاں ہاتھ تھا۔ فاروق بلوچ ایک بار پھر بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس بار بھی حمزہ نے اسے ہوش میں لانے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

"رحم...... رحم کرو' خدا کے لیے' میرا یقین کرو مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"بے غیرت' بے ضمیر انسان تجھ پر رحم کروں۔ جس نے قوم کے بچوں ماؤں اور بہنوں کا سودا کیا ہے۔ تجھ پر رحم کروں۔"

شانی کی آواز میں اس قدر ہیبت ناکی تھی کہ فاروق بلوچ خوف سے سمٹ گیا تھا۔ شانی اور حمزہ کی آنکھوں میں نفرت کا لاوا ابل رہا تھا۔

"تم غداری کے عوض سمیٹنے والی دولت پر اللے تللے کرتے رہو۔ آج وہ ساری دولت تیرے منہ کے راستے پیٹ میں اتنی خطیر مقدار میں ٹھونسوں گا کہ تیرا پیٹ گیند کی طرح پھول کر پھٹ جائے گا۔"

''تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے' مم......''

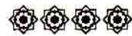
''فاروق بلوچ تمہاری غلط بیانی تمہارے لیے جبر و تشدد کا باعث بنے گی۔ وہ بتاؤ جو سچ ہے۔ تمہاری جاں بخشی کر دوں گا۔''

''میں نہیں جانتا......'' فاروق بلوچ کی بات کٹ گئی تھی کیونکہ دس ایم ایم کی بٹ ایک بار پھر اس کے بازو میں گھسنے لگی تھی مگر اس بار فاروق بلوچ نے اصرار میں زور زور سے گردن ہلانا شروع کر دی تھی۔ شانی نے ہاتھ روک دیا۔

''بتا...... بتاتا ہوں پا...... پانی دو...... پانی۔'' اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ حمزہ نے اسے پانی پلایا۔

''فاروق بلوچ! سب کچھ سچ سچ بتادو۔ بغیر اس کے تمہاری جان بخشی نہیں ہو سکتی۔''

''بتاتا ہوں' پر خدا کے لیے اسے بند کرو۔'' فاروق بلوچ کو پھرکی کی طرح گھومتی ڈرل مشین انتہائی خوفناک دکھائی دے رہی تھی۔ شانی نے آگے بڑھ کر مشین کا سوئچ آف کر دیا۔ فاروق بلوچ نے چند منٹ خود کو ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔ وہ خود میں نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ ہاتھوں اور بازو سے خون کا رساؤ ہنوز جاری تھا۔ اس کے لیے سچ بولنا ناگزیر ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ فر فر بولنے لگا۔ حمزہ اس کی باتیں ریکارڈ کر رہا تھا۔



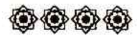
ڈیوڈ کے لیے حکام بالا کو سمجھانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس نے اعتماد کی فضا قائم کر رکھی تھی۔ اس فضا کے زیر سایہ شاذ و نادر ہی کوئی شخص نہ آیا ہوگا۔ اسرائیل میں شاید ہی کوئی ایسا بندہ ہو جو ڈیوڈ کی حیرت ناک، مافوق الفطرت صلاحیتوں کا منحرف ہو۔ ڈیوڈ عجیب و غریب، مدلل مشوروں اور فصیح و بلیغ دلائل کے ساتھ سب کے دلوں کا فاتح حکمران تھا۔ انسان کو دو ٹکڑے کرنے کے بعد دوبارہ اصل حالت میں لانے کا تجربہ بڑی محنت اور کامیاب حکمت عملی کے ساتھ تیار کیا گیا تھا۔ مگر ایک مشین آپریٹر کی ادنیٰ سی غلطی نے سب کچھ تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اس کے باوجود ڈیوڈ اس تجربے کو کامیاب تصور کرتا تھا کیونکہ احمد زعابی تین منٹ پانچ سیکنڈ تک دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر بھی زندہ رہا تھا۔ اگر ہر فرد چابک دستی سے اپنا فریضہ سر انجام دیتا تو انجام توقع سے بڑھ کر ملنے والا تھا۔

اعلیٰ حکمران نے میٹنگ میں ڈیوڈ کو خاموشی، توجہ اور صبر و تحمل سے سنا اور اسے بری الذمہ قرار دیا بلکہ اس کی باتوں سے انہیں تقویت ملی تھی۔ انہوں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا۔ ڈیوڈ کامیابی کے جو بیج تم نے بو دیئے ہیں ان کے دور رس نتائج ملیں گے۔ حکام بالا کے اعتماد میں بھی ڈیوڈ کی کامیابی کا راز مضمر تھا۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے دوسری طرف سوچنا شروع کیا تھا۔ اس کی معلومات کے مطابق دنیا کا رخ بڑی تیزی سے تبدیلی کی طرف گامزن تھا۔ دنیا نے جو راہیں منتخب کر لی تھی وہ ڈیوڈ کی حسب منشا تھی۔ ڈیوڈ نے کئی اہم کامیابیاں سمیٹ لی تھیں۔ دنیا پر کیے جانے والے تجربات ساٹھ فی فیصد کامیابی کی منازل طے کر چکے تھے۔ باقی چالیس فیصد پر زور و شور سے کام جاری تھا۔ دنیا کی بری حالت دیکھ کر اسے اُمید ہو چلی تھی۔ اس کا لیڈر جلد آنے والا ہے۔ پورے کرہ ارض کا فاتح اور حکمران لیڈر جو ڈیوڈ کا آخری ہتھیار تھا۔ جس کے استعمال سے وہ دنیا پر بااختیار ہو سکتا تھا۔ اسی کی خاطر ڈیوڈ سب کچھ کر رہا تھا یا کروا رہا تھا۔

ڈیوڈ کا کمال تھا۔ دنیا میں جاری اس کے مشن میں کہیں بھی کوئی رکاوٹ پیش آتی وہ از خود وہاں پہنچ جاتا تھا اور بالا ہی بالا اپنا کام دکھا کر واپس لوٹ آتا تھا۔ یہ اس کا باطنی فن تھا۔ جسے کوئی نہیں جانتا تھا۔ انسان کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کا تجربہ کرنے کی تیاری ایک بار پھر شروع تھی۔ ساتھ ہی اس کے علم میں آیا کہ پاکستان میں اس کے مشن پر جانے والے لوگوں کو پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ انہیں ابھی تک متوقع کامیابی نہیں ملی تھی۔

اسلامی ممالک اور خصوصاً پاکستان کی اہمیت ڈیوڈ بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہاں سے ناکامی کی خبر باعث تشویش

تھی۔ اس لیے حسب سابق وہ انتہائی خفیہ طریقے سے پاکستان پہنچ گیا تھا۔ پاکستان پہنچتے ہی اس نے کافی پھرتی دکھائی تھی۔ ضلع چاغی میں اس نے این جی او کی معرفت مکمل سروے کروایا تھا۔ سروے کا مقصد وہاں کے گلی کوچوں، سڑکوں کو پختہ کرنا تھا۔ دور دراز علاقوں میں بجلی پہنچانے کا وعدہ، اسپتال، پارک اور اسکول بنانے کا بہلاوا دیا گیا تھا۔ زندگی کی اہم بنیادی سہولتیں این جی او نے فراہم کرنے کا سبز باغ دکھایا تھا۔ جس کے طفیل انہوں نے گلی کوچوں میدانوں اور پہاڑوں کا ناپ تول لے لیا۔ مردم شماری کروائی، مطلوبہ جگہوں سے مٹی اور پتھروں کے نمونے لیے اور بوریا بستر گول کر کے چلے گئے۔ ڈیوڈ جاننا چاہتا تھا پاکستان کے ایٹمی دھماکے میں کس حد تک سچائی ہے اور اگر صدفی صد سچائی ہے تو اس کی طاقت کا توازن کیا ہے۔ دوسرا اہم کام جو ڈیوڈ نے کیا تھا وہ پاکستان کے اہم مگر ادھورے پروجیکٹس اور ان کی مکمل تفصیل تھی۔ ان پروجیکٹس کی جانکاری بھی شامل تھی؛ جو حکومت کی سستی اور نااہلی کے سبب بند پڑے تھے۔ بلوچستان میں معدنی ذخائر کی جگہ کا تعین قدرتی وسائل اور ذخائر کا تخمینہ اور حکومتی پالیسیوں کی تفصیل بھی وہ حاصل کر چکا تھا۔ پاکستان میں کرپٹ، محبّ زر اور مفاد پرست سیاستدانوں اور وزراء محبّ وطن بے لوث دیانتدار اور مذہبی وزرا و سیاستدانوں کی علیحدہ علیحدہ فہرستیں ان کے مکمل بائیو ڈیٹا کے ساتھ ڈیوڈ کے پاس موجود تھیں۔ اب باقی کا کام جان رائٹ نے کرنا تھا۔



بروج کے والدین اور بہن بھائی ابدی نیند سو چکے تھے۔ شانی یہ خبر سن کر چکرا کر رہ گیا تھا۔ پورے کا پورا گھر تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ ماسوائے بروج کے کوئی نہیں بچا تھا۔ شانی کو یہ خبر واقعہ کے ایک ہفتے بعد ملی تھی۔ اس اتفاق پر بھی وہ ششدر تھا۔ راولپنڈی میں اسے گوریا بستی کا مچھیرا مل گیا تھا۔ جس نے دل دہلا دینے والی خبر سنائی تھی۔ بروج اس دن ماموں کے گھر رک گئی تھی۔ گھر والوں نے رات کا بچا ہوا کھانا دن کو اکٹھے کھایا تھا۔ جو ان کے لیے موت کا پیغام لے کر آیا۔ بعد میں دیکھا گیا تو ہانڈی میں مردہ چھپکلی پائی گئی تھی؛ جس کا زہر بروج کے تمام گھر والوں کو نگل گیا تھا۔ شانی کو اپنی سماعت پر دھوکا ہونے لگا تھا۔ یہ کیسی خبر تھی۔ جو اس کے کانوں تک پہنچ کر ان میں سیسہ پگھلا رہی تھی۔ اس نے فوراً ہم نواز کو خبر لانے کو کہا۔ روشن نواز شانی کی طرح اداس اور پریشان تھا۔ اگر یہ خبر سچ ہے تو شانی کو اس وقت گوریا بستی میں ہونا چاہیے۔ ہم نواز نے خبر کی تصدیق کر دی تھی۔ اب صبر کر لینا اس کے اختیار سے باہر تھا۔ اس نے امجد بخاری سے دو دن کی رخصت لی اور گوریا بستی روانہ ہو گیا۔

بروج نے اس کے سینے میں سر چھپا کر آنسوؤں کے دریا بہا دیئے تھے۔ بروج کا بے کراں غم دیکھ کر شانی بھی خود پر ضبط نہ کر سکا تھا۔ وہ اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ مگر بروج کا غم بہت وسیع اور لفظی تسلیوں کی پہنچ سے بہت دور تھا۔ مگر اس سائے کی چھاؤں بہت ٹھنڈی تھی۔ جو شانی نے بروج کے لیے دراز کر رکھا تھا۔ لیکن ان لمحات کی عمر بہت مختصر تھی۔ شانی کو واپس پلٹنا تھا۔ امجد بخاری سے دو دن لیے تھے۔ اس سے زیادہ وہ رک نہیں سکتا تھا۔ فاروق بلوچ نے بہت سے اہم انکشافات کیے تھے۔ امجد بخاری نے ٹیم بھی تشکیل دے دی تھی شانی اس گیم کا حصہ تھا اور انہیں چند دنوں بعد میدان میں اترنا تھا۔ شانی سوچ رہا تھا بروج کو کس کے حوالے چھوڑ کر جاؤں۔ بروج نے خود تڑپتے ہوئے اسے باور کرایا تھا گوریا بستی کا ہر مرد اسے ہوس بھری نگاہ سے دیکھنے لگا ہے۔ اس نے آنسو بہاتے ہوئے بتایا۔

"سر سے باپ کا سایہ جو چھٹ گیا ہے بے سہارا ہو گئی ہوں اب بے حس معاشرہ اپنی فطرت تو دکھائے گا۔"

"بروج تم ماموں کے گھر رہ سکتی ہو۔"

"وہاں رہنے سے مر جانا بہتر ہے۔ مامی طعنے مار مار کر مجھے زندہ درگور کر دے گی؛ وہ سہہ بھی لوں تو ماموں کا بڑا بیٹا حد درجہ بدتمیز اور عیاش ہے۔" بروج نے فوراً جواب دیا۔

"اور تمہارے ماموں؟ وہ تو تمہیں بہت پیار کرتے ہیں۔"

''ہاں لے دے کے ماموں ہی رہ جاتے ہیں۔ مگر ڈر لگتا ہے۔'' بروج کے چہرے پر فکر مندی تھی۔ مستقل وہاں رہنے سے کہیں ماموں کا پیار بھی ماند نہ پڑ جائے۔

''پھر...... پھر بروج۔ اب تم کس کے ساتھ رہو گی؟''

شانی بہت الجھ گیا تھا۔ بروج چند ثانیے خاموش رہی۔ شانی اسے دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بروج نے اس کی طرف شہادت کی انگلی اٹھا کر کہا۔

''تمہارے ساتھ۔'' شانی حیران آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''میرے ساتھ......؟''

''بروج کا اس دنیا میں اگر کوئی ہے تو وہ تم ہو شانی، مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔'' بروج چند قدم آگے بڑھ کر انتہائی جذباتی لہجے میں بولی۔ دونوں کے درمیان صرف ایک منٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اس کا سحر انگیز وجود شانی کے دل و دماغ کو معطر کر رہا تھا۔ افسردہ اور غمزدہ ماحول میں شادیانے بج اٹھے تھے۔ شانی خاموش تھا۔ بروج جواب کی منتظر تھی وہ بولی۔

''شانی خاموش کیوں ہو؟''

''بروج تم میری ہو۔ میں تم سے پیار کرتا ہوں مگر......''

''مگر کیا شانی؟'' بروج تڑپ کر بولی۔ انداز میں بے چینی اور اضطراب تھا۔ وہ بے اختیار مزید آگے سرک گئی تھی۔ شانی اس کے سانس کے اتار چڑھاؤ کو واضح محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس کے خوبصورت ہونٹوں کی جنبش دیکھ رہا تھا۔ پیار میں اگر مگر کہاں سے آ گیا۔ شانی پیار تو عقل و خرد سے بھی ماورا ہوتا ہے۔ تم پیار بھی کرتے ہو تو اگر کا سہارا بھی لیتے ہو۔

''بروج! میں شاید تمہیں ٹھیک سمجھا نہ سکوں۔'' شانی اندرونی انتشار کا شکار ہو چکا تھا۔ ایسے میں روشن نواز بولا۔

''شانی! بروج ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس کی غیر معمولی خوبصورتی کسی مضبوط سہارے کی متقاضی ہے اور یہ مضبوط سہارا صرف تم دے سکتے ہو۔''

''روشن نواز میں جن راہوں کا مسافر ہوں ان راہوں پر بروج کا پیار تو میرے ساتھ چل سکتا ہے۔ اس کا وجود

> **ایک عجیب رات**
>
> دنیا میں ایک ایسی رات بھی گزری ہے جس میں ایک خلیفہ کا انتقال ہوا، دوسرا اس کی جگہ تخت نشین ہوا اور تیسرا پیدا ہوا۔
>
> مرنے والا خلیفہ مہدی کا بیٹا ہادی تھا، تخت نشین ہونے والا ہادی کا بھائی ہارون الرشید تھا اور پیدا ہونے والا ہارون الرشید کا بیٹا مامون الرشید تھا۔
>
> قرۃ العین، صائمہ عمبرین...... دار بن کلاں

نہیں۔ میری ممی اور بہن خود دوسروں کے گھر میں رہ رہی ہیں۔ بروج کو میں کہاں لے کر جاؤں؟'' شانی نے دیکھا بروج اس کی بات سن کر بہت اداس ہو گئی ہے۔ وہ اسے دونوں بازوں سے پکڑ کر بولا۔

''بروج! میں اگر مگر کا سہارا نہیں لیتا اصل میں حالات بہت الجھے ہوئے ہیں۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو شانی۔'' وہ اداسی سے بولی اس کا جسم یوں ڈھیلا پڑ گیا تھا جیسے اس سے روح کھینچ لی گئی ہو۔

''اس سے بڑھ کر حالات کیسے الجھیں گے کہ میرا پورا گھر موت کی آغوش میں اتر گیا ہے۔ کاش ان کے ساتھ میں بھی مر جاتی۔''

''بروج! میرے گھر والے اس وقت خود کسی اور کے گھر پناہ گزین ہیں۔ ہمارا گھر بم دھماکے میں تباہ ہو چکا ہے۔ چند مہینے کسی بھی طرح ماموں کے گھر صبر کر لو۔ میں وعدہ کرتا ہوں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔'' شانی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی وہ بروج کو کیا بتائے اور کیسے سمجھائے۔

''شانی! پتھر کے گھروں کو چھوڑ دو۔'' بروج نے آستین سے آنسو صاف کرنے کے بعد انتہائی ٹھوس اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''کیا یہاں میرے لیے کوئی جگہ ہے؟'' اس نے شانی کے عین دل پر انگلی رکھ دی تھی۔ شانی نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر سینے سے بھینچ لیا۔

''ہاں بروج ہاں۔ میرا یقین کرو۔'' شانی کے اقرار

کے بعد بروج نے آہستگی سے اپنا ہاتھ واپس کھینچا اور وہ چار قدم پیچھے ہٹتی ہوئی بولی۔

''اگر یہ بات ہے شانی تو فیصلہ ابھی کرو۔ مجھے تمہارا ساتھ چاہیے بصورتِ دیگر مجھے زندہ لاش بن کر نہیں جینا۔ میں نہیں چاہتی مجھے غم کے ہزار چوہے نوچ نوچ کر موت کے حوالے کریں۔''

''شانی! انکار مت کرنا۔ روشن نواز نے التجائیہ انداز میں کہا۔

''ایسی محبت تمہیں پھر نہیں ملے گی۔''

''روشن نواز! تم نے ہمیشہ جذبات سے سوچا ہے۔'' ہم نواز نے روشن نواز کی بات رد کردی تھی۔

''شانی ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' شانی ان کی بحث کو نظر انداز کرتے ہوئے بروج سے مخاطب ہوا۔

''بروج! میرا ساتھ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا۔ مجھے کچھ وقت دو میں......''

''وقت ہی تو نہیں ہے شانی! فیصلہ ابھی کرو۔ مجھے دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ تمہارا ساتھ یا موت۔'' بروج نے اچانک ایک طرف پڑی ہوئی چھری اٹھالی تھی۔

''بروج! یہ کیا پاگل پن ہے، تم سمجھ نہیں رہی ہو۔''

''ساتھ یا موت......'' بروج کے لہجے میں قطعیت تھی۔ شانی نے قدم آگے بڑھانا چاہا تو بروج بولی۔

''پہلے جواب دو۔'' شانی پھر آگے بڑھا۔

''بروج تم جذباتی ہورہی ہو۔'' شانی کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ بروج نے چھری پیٹ میں اتار لی تھی۔

''بروج......! شانی چیختا ہوا اس کے پاس پہنچا تو وہ لہرا کر گرنے والی تھی۔ شانی نے اسے باہوں میں اچک لیا۔

''اوہ نو...... یہ کیا؟ بروج تم پاگل ہوگئی ہو۔'' شانی نے خون فوارے کی طرح نکلتا دیکھا تو اسے فوراً زمین پر لٹا کر اس کا دوپٹہ پیٹ کے گرد کس کر باندھ دیا۔ گوریا بستی میں اردگرد کے کئی دیہاتوں میں کوئی ڈاکٹر نہیں تھا۔ شانی نے دیکھا خون کا رساؤ تیزی سے جاری تھا اگر بروج کو فوری طبی امداد نہ دی گئی تو کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ شانی کے دماغ کی چولیں ہل گئی تھیں۔ دفعتاً اسے ہم نواز کا خیال آیا۔

''ہم نواز۔''

''بولو شانی! میں دیکھ رہا ہوں بروج کی حالت ابتر ہو رہی ہے۔''

''ہاں ہم نواز پلیز تم میری مدد کرو۔''

''کیسی مدد شانی؟''

''ہم نواز! یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔ تم پلیز بروج کو اسپتال پہنچادو۔ گاڑی میں لے جانے میں شاید دیر ہو جائے؟''

''شانی! میں تمہاری بات سمجھا نہیں۔''

''ہم نواز! خدا کے لیے میری مدد کرو......''

شانی کے حلق میں کانٹے اگنے لگے تھے۔ بات کرنا دشوار ہورہی تھی کیونکہ بروج کی سانس اکھڑ رہی تھی۔

''ہم نواز! جیسے تم لمحوں میں دور دراز علاقوں میں پہنچ جاتے ہو ویسے ہی بروج کو اسپتال پہنچادو۔ میں تمہاری منت کرتا ہوں۔ ہم نواز پلیز بروج کو بچالو۔ پلیز۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تھا۔ بچوں کی طرح سر جھکائے رونے لگا تھا۔ پھر اسے احساس ہوا بروج کا جسم دھیرے دھیرے ہوا میں اٹھ رہا ہے۔ شانی نے جلدی جلدی آنکھیں صاف کیں۔ بروج کا پورا جسم ہوا میں اٹھ چکا تھا۔ ہم نواز نے اس کی بات مان لی تھی۔ بروج اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوچکی تھی۔

''تھینک یو ہم نواز! تیرا شکریہ۔'' وہ زیرلب بڑبڑایا اور پھر فوراً اٹھ کر گاڑی کی طرف دوڑ لگادی۔



''ہمارے پاس وقت محدود ہے ہم نے محدود وقت میں مطلوبہ کامیابیاں حاصل کرنی ہیں۔''

''جان! ہمارا کام تواتر سے آگے بڑھ رہا ہے۔'' ڈورتھی نے جواباً ولیم، ہیلری اور کولن کی طرف تصدیق آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کرم خان حیدر عباس اور ان کے توسط سے کئی اہم

گروپ بھی ہمارے من چاہے نتائج فراہم کررہے ہیں۔ عبدالبارق، وسان بلوچ، فاروق بلوچ اور کئی اہم وفاقی وزراء ہمارے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم جب چاہیں جہاں چاہیں کارروائی کرسکتے ہیں۔''

''یو آر رائٹ ڈورتھی! مگر تم فاروق بلوچ کو بھول رہی ہو۔'' جان رائٹ نے کہا۔

''فاروق بلوچ کو کئی دن پہلے اسلام آباد سے اغواء کیا گیا تھا۔ میرے خیال میں یہ اغواء برائے تاوان کی واردات ہوسکتی ہے۔'' کولن نے قیاس آرائی کہا۔

''پاکستان میں عموماً ایسا ہوتا ہے۔ کیونکہ فی الحال ہمارے مدمقابل کوئی گروپ سامنے نہیں آیا اور اگر یہ ہمارے کسی ممکنہ مخالف گروپ کی واردات ہے تو بھی فاروق بلوچ سے وہ کیا حاصل کرسکتے ہیں۔''

''ہم میں سے صرف تم فاروق بلوچ کو ملے ہو کولن باقی جو کچھ بھی ہماری ڈیلنگ ہوتی رہی ہے وہ کسی نہ کسی کے توسط سے ہوتی ہے اور شاید سر تھامس نے ایک دوبار اسے فون پر ہدایات جاری کی تھی۔'' ولیم نے کہا۔

''مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آرہی جان رائٹ' ہیلری کی بات پر سب نے اسے چونک کر دیکھا وہ بولی۔

''پاکستان کا ایسا کون سا معاملہ ہے داخلی، خارجی، اقتصادی، معاشی، عسکری یا مذہبی جو ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں ہمارے دسترس سے باہر۔ پھر ہمیں خفیہ سرگرمیاں جاری رکھنے کی کیا ضرورت پڑ جاتی ہے۔''

''ہیلری! تمہیں غلط انفارمیشن دی گئی ہے۔ پاکستان ایٹمی طاقت ہے۔ اس کی فوج دنیا کی بہترین فوج ہے۔''

''ہم حکومت کو خرید سکتے ہیں افواج کو نہیں۔ اس کے باوجود ہم یہاں پاکستان کے وسائل پر قبضے کے لیے نہیں آئے ہیں۔''

''جان! پاکستان ایٹمی طاقت اور بہترین فوج رکھنے کے باوجود ہمارا مقابلہ تو نہیں کرسکتا۔ ہم کسی بھی بہانے اس پر قبضہ کرسکتے ہیں۔ عراق اور افغانستان کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔''

''ہیلری! تم نے جان کی بات نظر انداز کردی ہے۔'' ڈورتھی نے اس کی توجہ جان کی سابقہ بات کی طرف مبذول کروائی۔

''جان نے کہا ہے ہم یہاں پاکستان کے وسائل پر قبضے کے لیے نہیں آئے ہیں وسائل پر قبضے کی جنگ پچاس ساٹھ سال قبل ضرور ہوتی تھی مگر اب نہیں۔''

''پھر......؟''

''تاریخ عالم شاہد ہے۔ طاقت نے کمزور کو ہمیشہ پچھاڑا ہے۔ جن قوموں کے پاس طاقت کی لاٹھی تھی انہوں نے کمزور قوموں کو ریوڑ کی طرح ہانک کر اپنا غلام بنا لیا۔ ان کے علاقوں میں ہر ایک نے اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑھے مگر یہ فتوحات علاقوں پر تو قائم رہی دلوں تک رسائی حاصل نہ کرسکی تھی۔ طاقتور قوموں نے کمزور قوموں کے علاقے تو فتح کیے مگر انہیں کبھی ذہنی طور سے اپنا غلام نہ بنا سکی تھی۔ غلام قوموں کی سوچ، فکر، تہذیب پر قبضہ نہ جما سکی۔ برطانیہ کی حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ پورا ہندوستان بھی اس کا غلام تھا مگر دھیرے دھیرے فاتح حکمرانوں کی طاقت کی زنجیریں ڈھیلی پڑنے لگیں پھر وہ وقت آیا کہ ڈھیلی زنجیر کی کڑیاں آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگیں اور اس کی طاقت کی گرہ کھلنے لگی۔ نتیجاً فاتح قومیں فتح یاب ہوتے ہوئے بھی شکست کھا جاتی تھیں۔ ہم نے عراق اور افغانستان پر حال ہی میں قبضہ کیا مگر یہ فتح بھی سابقہ تاریخ کی طرح علاقوں کی فتح ہے۔ ہم لوگوں کے دلوں پر قبضہ نہیں جما سکے۔ وہ اب بھی اپنی تہذیب و تمدن، سوچ فکر سے جڑے ہوتے ہیں۔ وہ اب بھی اسلام کو پسند کرتے ہیں اسلامی روایات اور قانون کو ترجیح دیتے ہیں۔ اب دیکھا جائے تو ہم اپنی دنیا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ورنہ وہاں ہر گلی، ہر موڑ، بازار، میدان اور پہاڑوں پر ہمارے لیے موت منتظر رہی ہے اور کچھ بعید نہیں موقع پاکر ایک بار پھر عراق اور افغانستان پر اپنا قبضہ جمالیں۔'' وہ سب جان رائٹ کی باتیں توجہ سے سن

رہے تھے۔ خصوصاً ہیلری یوں سر ہلا رہی تھی جیسے بات اور پلان اس کے ذہن میں واضح ہو چکا ہے۔ جان رائٹ بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اب مسلمانوں کو جسمانی نہیں ذہنی غلام بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو کھرچ کر صاف کر دیا جائے گا۔ یا انتہائی محدود کر دیا جائے گا۔ ان کی تہذیب و تمدن میں معاشرتی رویے میں سماج میں اور خیالات میں ہم نے سرائیت کر جانا ہے۔ حالات ایسے پیدا کرنے ہیں کہ زبان ان کی ہو اور بول ہمارے ہوں۔ اچھے کو برا۔ برے کو اچھا سمجھیں۔ نفع نقصان کا ادراک بھول جائیں۔ اپنے پرائے کی پرکھ نہ رہے۔ اس لیے ہم نے جمہوریت کو اسلامی خلافت کا بہترین نعم البدل بنا کر پیش کیا تھا۔ یہ انہوں نے بخوشی قبول کر لیا۔ اب یہ جمہوریت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا چکے ہیں۔ اسی میں ملکی اور اپنا مفاد پنہاں سمجھتے ہیں۔ اب ہم نے کئی کاری ضربیں لگانی ہیں۔ عوام میں ٹوٹ پھوٹ ڈالنی ہے۔ فتنے پیدا کرنا ہیں۔ ہنگامے، انتشار، قتل و غارت گری عام کرنی ہے، لسانی فسادات کو ہوا دینی ہے۔ مسلک کے نام پر لاشوں کے ڈھیر لگانے ہیں۔ ان کی فکری سوچ پر قبضہ جمانا ہے۔ پھر انہوں نے ہماری طرف کشکول پھیلانا ہے۔ ہم نے کشکول میں سکے بھی ڈالنے ہیں اور حکومت بھی کرنی ہے۔" جان رائٹ کی گفتگو جاری تھی۔ مگر اسے چپ ہونا پڑا فون کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔

"ہیلو۔" اس نے ریسیور اٹھایا، چند منٹ دوسری طرف کی باتیں سنتا رہا' پھر بولا۔

"فاروق بلوچ کو بہیمانہ اور وحشیانہ تشدد کے ذریعے قتل کر دیا گیا ہے۔ اس کی لاش مل چکی ہے۔ یہ خبر چونکنے کا سبب بنی تھی۔ ولیم فاروق بلوچ ہمارے جتنے بھی ٹھکانے جانتا تھا انہیں فوراً بم سے اڑا دو۔ ان بندوں کو بھی ٹھکانے لگا دو جو ہمارے حوالے سے اس کے ساتھ ملتے رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے جان! میں حیدر عباس کو ہدایات جاری کر دیتا ہوں۔"

"او کے میں چلتا ہوں تم سب تیار رہو۔ میں کسی بھی وقت کال کر کے بلا سکتا ہوں۔" جان رائٹ نے جلدی جلدی ہدایت دی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔



گرو کرہ ارض کے ہر ملک اور اس کے انتظامی امور پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔ قوم رعایا حکمران سبھی اس کی زیر نظر تھے۔ گرو جانتا تھا ہر رعایا قومی حکمرانوں کے سامنے ہمیشہ سرخم کرتی ہے۔ اس لیے گرو اور اس کے چیلے اپنی حکمرانی کا تاج بلند رکھنے کے لیے حکمرانوں کا سہارا لیتے تھے۔ انہیں قوی اور مضبوط کرتے تھے اور ان کے دل و دماغ کو اپنی مٹھی میں قید رکھتے تھے۔ گرو اس وقت بلند قہقہہ لگاتا تھا۔ جب دنیا کا سب سے طاقتور انسان امریکن صدر کو کہا جاتا تھا۔ گرو قہقہہ لگاتے ہوئے کہتا۔

"دنیا کب جانتی ہے جسے وہ دنیا کا طاقتور شخص تصور کرتے ہیں اس کا ہر قول و فعل ہمارے تابع ہے۔ وہ ہماری باتیں فرمانبردار اولاد کی طرح من و عن مانتا ہے۔"

گرو نے دبے الفاظ میں دنیا کو اپنا پیغام امریکن صدر جارج ڈبلیو بش کی زبانی سنایا تھا۔ کچھ یہ باور ہو چکا تھا کچھ سمجھ کر بھی ناسمجھ بن رہے تھے اور کچھ بالکل بھی نہ سمجھ سکے تھے۔

صدر بش نے افغانستان اور عراق پر قبضے کے بعد کہا تھا۔

"میں نے اپنے حالیہ اقدامات کے لیے براہ راست خدا سے قوت حاصل کی ہے۔"

گرو نے اس بات سے ثابت کر دیا تھا دنیا میں اگر کوئی ناقابل تسخیر طاقت رکھتا ہے تو وہ گرو ہے۔ گرو سب کو آلہ کار بنانے کی قدرت رکھتا تھا۔ اس طاقت کے بل بوتے پر پوری دنیا اپنے مذہب کو فروغ دے چکا تھا۔ اس لیے اس نے کئی بار اپنی جابرانہ قوت کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ جب چاہتا تھا کسی بھی دو ممالک کو دست و گریبان کر کے اپنا مقصد پا لیتا تھا۔ اب تک گرو کی تعلیمات کا حجم بہت

بڑھ گیا تھا۔ طاقت اور فریب کاری گرو کا خاص کارگر حربہ تھا۔ وہ موقع محل دیکھ کر اس کا استعمال کرتا تھا اور فتح پاتا تھا۔ ہاں البتہ اسے شکست کی ذلت آمیز شرمندگی کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا اور یہ شکست اسے ہمیشہ ہی مسلمانوں کے ہاتھوں اٹھانا پڑی تھی۔ اس لیے اب گرو کی توجہ کا مرکز مسلمان تھے۔ بیشتر مسلمانوں کو وہ اندھا، بے عقل بے شعور کر چکا تھا۔ ان کے اذہان وقلوب میں بدمعاشی، فحاشی، بدذاتی، غرور وتکبر، پاپی پن، سرکشی اور کئی باغیانہ خیالات کو موجزن کر چکا تھا اور اب یہی لوگ اس کے لیے بہترین آلہ کار بنے ہوئے تھے اور اس کے مشن کو آگے بڑھانے میں بہترین معاون کا کردار ادا کر رہے تھے گرو ان معاون کاروں کو اپنی طاقت اور لاثانی منصوبہ بندی کے تحت کئی ممالک کا اقتدار اعلیٰ فراہم کر چکا تھا۔

عراق کو ایران کے ساتھ کئی سالوں تک گتھم گتھا رکھا۔ جب وہاں امن ہوا تو 1991ء میں عراق کے فوجی صدر صدام حسین کو یوں ورغلایا کہ وہ مسلم ملک کویت پر چڑھ دوڑا۔ گرو نے اپنا پھینکا گیا جال مزید وسیع کر دیا امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو ملا کر بظاہر کویت کو آزاد کروا دیا' مگر دونوں اطراف میں مرنے والے مسلمان تھے یہ جنگ چھیڑنے کے گرو کے کئی مقاصد تھے۔ کویت پر اپنے ہمنواؤں کو قابض کر دیا۔ عراق' کویت پر حملہ آور نہ ہوتا تو عین ممکن تھا وہ اسرائیل پر حملہ کر دیتا۔ یہاں گرو نے ایک کمال دکھایا۔ صدام حسین کو کویت کے بعد سعودی عرب کو فتح کرنے کی ترغیب دینا شروع کر دی تھی جب وہ ذہنی طور سے آمادہ ہو چکا تو گرو نے سعودی شاہ کے دل ودماغ میں ڈیرے جما لیے۔ اسے اپنے بچاؤ کے لیے امریکہ کے سامنے دامن پھیلانے پر مجبور کر دیا۔ جس کے نتیجے میں ڈیڑھ لاکھ امریکی فوج مستقل طور پر سعودی عرب میں ڈال دی گئی۔ جب گرو نے محسوس کیا اب صدام حسین کا کردار ختم ہو چکا ہے تو اس کا پتہ صاف کرنے کے لیے میدان سجا دیا اس میدان میں ایک بار پھر مسلمان مسلمانوں کو قتل کرنے لگے۔ عراق کا چپہ چپہ مسلمانوں کے خون سے رنگ کر اسرائیل کو محفوظ کر دیا گیا۔

عرب ممالک میں عوام الناس کو جلد نئی راہوں پر ڈالنے کے لیے گرو کی منصوبہ بندی جاری تھی۔ اس کے علاوہ گرو نے مسلمانوں میں ایک نئی اور انتہائی خطرناک روایت ڈال دی تھی۔ ترکی، مصر، تیونس، عرب امارات اور پاکستان میں مختلف ٹی وی چینلز پر قرآن پاک کی تفسیر وہ لوگ کر رہے تھے جو فلموں اور ڈراموں میں کام کرتے ہیں۔ درس قرآن سیاسی کھلاڑی دیتے ہیں۔ جو دن بھر سیاسی میدان میں ایک دوسرے کو گالیاں بکتے ہیں۔ جن کو اپنے مذہب کا ذرہ برابر علم نہیں وہ قرآن پاک کی تفسیر کرتے نظر آ رہے تھے۔

گرو جی جب بھی ایسے مناظر دیکھتا اس کے اندر خوشی و طمانیت انتہائی گہرائی تک اتر جاتی تھی۔ اب اسے اُمید ہو چلی تھی کہ مسلمانوں کا زوال شروع ہو چکا ہے۔ زوال مسلم کے بعد اس کے لیے عالمی حکومت بنانے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے گی۔



پیٹ میں چھری گھونپ کر بروج نے ثابت کر دیا تھا کہ جذبات اس کے دائرہ اختیار میں نہیں ہیں۔ شانی کو اس حرکت سے شدید جھٹکا لگا تھا۔ اسے احساس ہو چکا تھا بروج سے جدائی کا مطلب اس کی تباہی ہے۔ اگر ہم نواز بروج کو اسپتال نہ پہنچاتا تو شانی کے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا اور شاید اس کی زندگی کا چراغ گل ہو جاتا۔ بروج کی زندگی کی اصل روح شانی کی قربت کے اندر مضمر تھی۔ بروج کو کافی گہرا زخم آیا تھا یہ پولیس کیس تھا مگر ہم نواز نے نجانے کیسے اسے ایڈمٹ کروا دیا تھا۔ شانی جب اسپتال پہنچا تو بروج اسپتال کے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ بروج کا زخم حیران کن حد تک بہت جلدی مندمل ہو چکا تھا۔ اب شانی کے لیے سب سے بڑا کام بروج کو کسی معقول ٹھکانے پر ٹھہرانے کا تھا۔

وہ ممی اور منزہ کو عنقریب کرائے کے گھر میں شفٹ کرنے والا تھا۔ انہیں مناسب موقع پر بتا کر بروج کو گھر میں رکھا جا سکتا تھا لیکن بروج کچھ اور ہی چاہتی تھی۔ وہ

شانی کی مصروفیت پر جرح کر رہی تھی وہ کیا کرتا ہے' دن رات کہاں بسر کرتا ہے؟ شانی نے کچھ سچ کچھ جھوٹ کا سہارا لے کر اسے مطمئن کرنے کی از حد کوشش کی۔ مگر بروج مکمل طور سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ بروج نے اس پر واضح کر دیا تھا مجھے صرف تمہارے ساتھ رہنا ہے۔

شانی کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ امجد بخاری اور حمزہ کو ساری صورت حال سے آگاہ کرتا۔ دونوں نے اس کی بات صبر و تحمل اور پورے ارتکاز کے ساتھ سنی بات کی تکمیل پر امجد بخاری بولے۔

''شانی! تمہارے لیے بہت سیریس مسئلہ ہے۔ بروج کی جنونی محبت ہمارے لیے مسائل پیدا کر سکتی ہے۔''

''میں خود یہ بات سوچ کر بہت پریشان ہوں سر جی۔'' شانی کے لہجے میں پریشانی عیاں تھی۔

''ایک بات بتاؤ شانی؟''

''ہاں بولو حمزہ۔''

''تم نے بروج کی محبت کا احوال تو بتا دیا مگر اپنی پوزیشن واضح نہیں کی۔ یہ بتاؤ تم کہاں کھڑے ہو؟'' حمزہ کے سوال پر سر جی نے زیر لب مسکرا کر حمزہ کو دیکھا پھر پلکیں اچکتے ہوئے بولے۔

''ہاں یہ سوال میں کچھ دیر بعد پوچھنے والا تھا۔ حمزہ نے جلدی کر دی ہے تو بتا دو۔'' شانی چند لحظہ رک کے بولا۔

''میں بروج کی محبت سے انکار نہیں کر سکتا سر جی لیکن میرے لیے سب سے اہم میرا مشن ہے میں اپنے مشن کی تکمیل کے لیے سب کچھ قربان کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔'' شانی کے لہجے میں عزم تھا اور ویسے بھی سر جی ان دنوں ہم پر کام کا بہت بوجھ ہے۔''

''تمہارے جذبات تمہارے کام کے شاہد ہیں شانی' یہ اپنی جگہ اتنے قوی ہیں کہ ان پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں لیکن یہاں بات تمہاری نہیں بروج کی ہے۔ تم اپنا سب کچھ قربان کرنے کا حوصلہ رکھتے ہو کیا بروج بھی تمہیں قربان کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔'' امجد بخاری نے اسے تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''سر جی! شانی کی باتیں گواہ ہیں بروج خود کو پیار کی خاطر گنوانے کی طاقت رکھتی ہے لیکن......'' حمزہ کہتے کہتے رک گیا پھر بولا۔

''لیکن وہ کبھی شانی کو کھو نہیں سکے گی۔''

''پھر تمہارے خیال میں کیا کرنا چاہئے؟''

''بروج سے دوٹوک بات۔''

''مطلب......''

''مطلب سر جی! بروج کو اصل حقائق سے آگاہ کرنا ہوگا۔ شانی کون سی راہوں کا مسافر ہے اور اس کی منزل کیا ہے۔''

''ہوں......'' سر جی نے طویل ہنکارا بھرا۔ پرسوچ نگاہوں سے شانی کو دیکھا اور بولے۔

''شانی! کیا حمزہ نے ٹھیک قیاس کیا ہے؟''

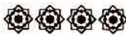
''سر جی! اگر حمزہ ٹھیک بھی کہہ رہا ہے تو بھی آپ کی اجازت کے بنا میں ایسا نہیں کر سکتا کہ بروج کو اپنی خفیہ مصروفیات بتاؤں۔ یا اسے اپنے ساتھ شامل کروں۔''

''شانی! بروج کی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر حق اور سچ پر سوچا جائے تو حمزہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس صورت حال میں اگر تم خود بروج پر اعتماد کرنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک ہے سر جی میں بروج سے بات کرتا ہوں۔''

''جو بھی فیصلہ ہو مجھے بتانا۔ کیونکہ اس کے بعد تم لوگوں کو نکلنا ہے۔''

''جی بہتر۔''



شانی نے پہلی فرصت میں بروج کے گوش گزار سارا ماجرہ کیا تو وہ انتہائی جوشیلے لہجے میں جواباً بولی۔

''شانی! میں پہلے تم سے محبت کرتی تھی۔ مگر اب عشق کرتی ہوں۔ تمہارے انتخاب پر مجھے فخر ہے۔ میں خوش قسمت ہوں کہ میں ایسے شخص سے پیار کرتی ہوں جو ہر لحاظ سے محبت کا پیکر ہے۔ جو مجموعہ عشق ہے۔ جس

کے دل میں میری محبت تو ہے ہی وطن کی محبت بھی کوٹ کوٹ کر بھری پڑی ہے۔" اس نے شانی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"بروج تمہیں یہ سب بتانے کا مقصد یہ ہے کہ تم کوئی فیصلہ کرو۔"

"کیا فیصلہ شانی......؟" بروج نے چونک کر پوچھا۔ پھر خود ہی بولی۔

"فیصلہ تو میں پہلے سے گوریا بستی میں کر چکی تھی۔ جب تمہیں اپنے گھر کچے کمرے میں دیکھا تھا۔ میرے دل پر تمہارے ساتھ جینے مرنے کا فیصلہ بھی صادر ہو چکا تھا۔"

"بروج! تم میری محبت ہی نہیں والدین کی اموات کے بعد میری ذمہ داری بھی ہو۔ میں تمہیں گھر اور زندگی کی تمام سہولیات فراہم کروں گا اور اگر تم چاہو تو تمہاری شادی بھی......"

"ایک منٹ شانی۔ مزید کچھ کہنے سے پہلے میری بات سن لو۔" بروج شاید شانی کا مدعا سمجھ گئی تھی۔ وہ فرط جذبات میں آگے کو سرک گئی۔ شانی کا ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھوں میں دبا ہوا تھا۔

"شانی! میں نے پہلے بھی تمہیں بتا دیا تھا۔ تمہارا ساتھ یا موت۔ میں تمہارے سوا مر سکتی ہوں جی نہیں سکتی۔ اب فیصلہ میں نے نہیں تم نے کرنا ہے۔"

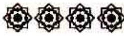
"بروج! تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں نے اپنی جان اپنے وطن کے لیے وقف کر دی ہے۔"

"تم اپنے وطن کی خاطر جان وقف کر سکتے ہو تو میں کیوں نہیں شانی' تمہاری پیروی میں' میں بھی ایسا کر سکتی ہوں۔"

"بروج تم میری خاطر اپنی جان......"

"تمہاری خاطر جان سے انکار نہیں شانی۔ مگر پاکستان میرا بھی وطن ہے۔ اپنے وطن کے لیے میں بھی کسی قربانی سے دریغ نہیں کروں گی۔ کیا ہوا میں ایک لڑکی ہوں جس کے سینے میں غریب کا دل دھڑکتا ہے۔ شانی میں بھی پاکستانی ہوں اور میرے دل میں بھی وطن کے لیے جذبات کا سمندر موجزن رہتا ہے۔ تم اس میدان میں مجھے کبھی پسپا نہیں پاؤ گے۔" بروج کے الفاظ و انداز میں حب وطنی کا الاؤ پھوٹ رہا تھا۔ شانی نے اسے بے اختیار گلے سے لگا لیا۔

"تم جیت گئی ہو بروج۔" شانی اس کے سلکی بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ بروج اس کے سینے میں چہرہ چھپائے انوکھی لذت سے آشنا ہو رہی تھی۔



باہم مشوروں سے بروج امجد بخاری کے گروپ میں شامل ہو چکی تھی۔ اب اس کی باقاعدہ ٹریننگ جاری تھی۔ ابتدائی چند دنوں کی حیران کن رپورٹ امجد بخاری کو مل چکی تھی۔ بروج ناقابل یقین حد تک پھرتیلی، عقل و فراست میں کامل اور مضبوط اعصاب کی مالکہ ثابت ہوئی تھی۔ اس کے انسٹرکٹر رضوان ماجد کا خیال تھا بروج بہت جلد لڑائی کے تمام رموز سیکھ جائے گی اور عملی میدان میں کسی بھی طاقت ور، مضبوط اور جوان مرد سے کم ثابت نہیں ہوگی۔ شانی کے لیے یہ صورت حال تسلی بخش تھی۔ بروج اس کے ساتھ کام کرے گی اور ہمہ وقت اس کے سنگ رہے گی۔

فاروق بلوچ نے دوران تشدد کچھ اہم انکشافات کیے تھے۔ اس نے نثار پور کی پہاڑیوں میں جوزف اور بوتھم کا مشن عیاں کر دیا تھا۔ تاہم امجد بخاری کا خیال تھا وہ مشن جیسا چاہتے تھے ہو چکا ہے۔ پورے علاقے میں منرل واٹر کا رواج عام ہے جس کے سدباب کے لیے پوری مہم چلانے کی ضرورت تھی۔ جس کا وقت ان کے پاس نہیں تھا۔ تاہم چند دوسری اہم باتیں اس کے علم میں آئی تھیں جس سے انہیں آگے بڑھنے کے کلیو ملے تھے۔ فاروق بلوچ کے مطابق ہوم منسٹر عبدالبارق کے غیر ملکی گروہ کے رابطے ہیں۔ ہوم منسٹر عبدالبارق نے ہی انہیں تمام ضروری وسائل فراہم کر رکھے ہیں۔ جس سے وہ نثار پور جیسے مشن پر پاکستان کے دیگر علاقوں میں جہاں قدرتی

پانی پر انحصار زیادہ ہے کام کیا جارہا ہے۔ حیدر عباس ایک انتہائی اہم نام جو اس گروپ کے لیے کام کررہا ہے۔ حیدر عباس کا اپنا ایک منظم انتہائی متحرک گروپ ہے جس سے وہ ہر قسم کا کام لیتا ہے۔ کوئٹہ شہر اور اس کے گردونواح میں ہونے والی اکثر تخریبی کارروائیاں اور فرقہ واریت کی وارداتوں میں حیدر عباس کا ہاتھ تھا۔ تاہم فاروق بلوچ حیدر عباس کے ٹھکانے سے لاعلم تھا۔ نہ ہی غیر ملکی گروہ کا کوئی حتمی ٹھکانہ علم میں آیا تھا۔ یہ گروہ کس ملک سے تعلق رکھتا تھا فاروق بلوچ یہ بات بتانے سے بھی قاصر تھا۔

امجد بخاری نے حیدر عباس کی تلاش شروع کر دی تھی۔ جبکہ شانی کا خیال تھا عبدالبارق کو بھی فاروق بلوچ کی طرح اچک لیتے ہیں۔ جو کچھ اس کے اندر ہوگا اگل دے گا۔ مگر حمزہ اس کی بات سن کر بولا۔

''میرے خیال میں ابھی ہوم منسٹر کی نگرانی کرنی چاہئے۔ حمزہ نے کہتے ہوئے رائے طلب نگاہوں سے امجد بخاری کو دیکھا جو گہری سوچ میں مگن تھے۔

فاروق بلوچ کی نعش ملنے کے بعد عبدالبارق سے ملانے والے افراد چوکنے ہوگئے ہوں گے۔ شاید خفیہ نگرانی کا خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

''سر جی! اگر ہم عبدالبارق کو اغواء نہ کریں تو کم از کم ہمیں ان ٹھکانوں پر حملہ ضرور کرنا چاہئے جو فاروق بلوچ نے بتائے ہیں۔'' شانی کی اس تجویز پر امجد بخاری نے اثبات میں سر ہلایا۔

''یہ ممکن ہے شانی۔ فاروق بلوچ نے ہمیں تین خفیہ ٹھکانے بتائے ہیں۔''

''سر جی! خوش قسمتی سے ہم پنجاب میں موجود ہیں۔ فاروق بلوچ نے جن ٹھکانوں کی نشاندہی کی ہے ان میں سے دو پنجاب میں اور ایک کوئٹہ کے مضافات میں۔'' حمزہ نے کہا۔

''ہاں حمزہ! اور ہمیں تینوں ٹھکانوں پر بروقت کارروائی کرنی ہے۔ پنجاب کے دونوں ٹھکانوں پر تم اور شانی اور دو بندے لے کر کارروائی کر سکتے ہو۔ کوئٹہ والے ٹھکانے پر میں طلحہ کی ڈیوٹی لگا دیتا ہوں۔ اس کے ساتھ شہریار اور عبداللہ جا سکتے ہیں۔'' واجد بخاری نے سامنے رکھا ہوا نقشہ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے سر جی! ہم کل رات کارروائی کرتے ہیں۔ مگر میرے اور حمزہ کے ساتھ جائے گا کون۔'' شانی فوراً بولا۔

''اس کا بندوبست ابھی کیے دیتے ہیں۔'' سر جی نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیا۔

''راجہ جنید مجھے چار قابل اعتماد اور چست و چالاک آدمی چاہئیں۔'' امجد بخاری نے کہنے کے بعد ایک منٹ تک دوسری طرف کی گفتگو سنی پھر کہا۔

''ٹھیک ہے۔ انہیں آج شام ہی یہاں پہنچا دو۔ کل رات ہم نے دو اہم کارروائیاں کرنی ہیں۔'' امجد بخاری نے ریسیور کریڈل پر رکھنے کے بعد شانی سے کہا۔

''شانی! تم نے گجرات میں واقع فارم ہاؤس پر حملہ کرنا ہے۔ تمہارے ساتھ راجا جنید کے بھیجے گئے دو بندے جائیں گے......'' امجد بخاری نے لحظہ بھر توقف کے بعد کہا۔

''تم چاہو تو بروج کو ساتھ لے جا سکتے ہو۔ مجھے رضوان ماجد نے اس کی بہت اچھی رپورٹ دی ہے اس طرح اس کی آزمائش بھی ہو جائے گی۔''

''او کے سر جی! میں بروج کو کال کر کے بلوا لیتا ہوں۔''

''حمزہ، تم اور شرجیل دو بندوں کو لے کر اسلام آباد والے ٹھکانے پر حملہ آور ہو گے۔ کوئٹہ میں طلحہ ہوگا۔ تم سب کو میں حملے کا کاشن دوں گا تاکہ بیک وقت کارروائی کی جا سکے۔''

سر جی کے ساتھ مل کر وہ دو گھنٹوں تک اس پروگرام پر ڈسکس کرتے رہے تھے۔



بروج، شانی کی کال پر دوسری صبح راولپنڈی پہنچی تو شانی اسے خوشگوار حیرت کے ساتھ دیکھتا رہ گیا۔ بروج اس کی نظروں سے محظوظ ہو رہی تھی۔ اس نے شوبز کی

ماڈل کی طرح کمر پر دونوں ہاتھ رکھے اور پلکوں کے اشارے سے پوچھا کیسی لگ رہی ہوں۔

''بروج یہ تم ہی ہو؟''

''تمہیں کیا لگتا ہے۔ میں نے کسی لڑکی کا خول چڑھا رکھا ہے۔''

''بھئی کمال کر دیا ہے تم نے۔'' شانی کے لہجے میں حقیقی داد تحسین تھی۔

بروج کے بال جدید ڈیزائن میں تراشے ہوئے تھے۔ بلیو جینز سرخ داری دار شرٹ اس پر بے حد جچ رہی تھی۔ پاؤں میں سفید جوگر تھے۔ ہلکے میک اپ کے ساتھ اس کا روپ مزید نکھر گیا تھا۔ وہ جدید دنیا کی فیشن ایبل ماڈل لڑکی لگ رہی تھی۔ وہ سنجیدگی سے بولی۔

''مجھے خوشی ہے شانی! تم لوگوں نے مجھ پر اعتماد کیا ہے آج میرا پہلا مشن ہے میں سر جی کو مایوس نہیں کرنا چاہتی۔''

''ویری گڈ! بروج ہمیں یقین ہے تم کبھی مایوس نہیں کرو گی۔'' شانی نے اس کا شانہ محبت سے تھپتھپایا۔

گاڑی میں ان کے ساتھ راجا جنید کے دو بندے طارق محمود اور حافظ قمر علی موجود تھے۔ وہ اس علاقے سے مکمل واقفیت رکھتے تھے۔ جبکہ شانی نے ہاتھ سے فارم ہاؤس کا نقشہ بنوایا تھا۔ رات کے بارہ بجے وہ مشن کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ انہیں تین گھنٹوں کا طویل سفر کرنا تھا۔ حافظ قمر علی ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ طارق محمود براجمان تھا۔ جبکہ بروج اور شانی عقبی سیٹ پر بیٹھے تھے۔

روشن نواز کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ بروج کی موجودگی اور چھو جانے والی قربت باعث مسرت تھی یوں لگتا تھا گاڑی میں ساری مسرتیں اور خوشبوئیں سمٹ آئی ہیں۔ روشن نواز شانی کا مشکور تھا۔ جس نے بروج کو ہمسفر بنا لیا تھا۔ بروج سے روشن نواز کی ساری خوشیاں اور غم وابستہ ہو چکے تھے۔ شانی کی سوچ میں اپنی جگہ ٹھہرے ہوئے صاف شفاف تالاب کی طرح ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ بروج کی قربت نے اس کے سارے غموں کو دھو ڈالا تھا۔

دونوں پیار کی کئی منازل طے کر چکے تھے۔ وہ تنہائی کے لمحات میں ایک دوسرے پر گھنگھور گھٹا کی طرح برستے تھے اور گہرے بادلوں کی طرح ایک دوسر کو ڈھانپ لیتے تھے۔ بروج پیار میں بہت جذباتی تھی وہ سب کچھ کر سکتی تھی بس شانی سے دور رہنا اس کے لیے محال تھا۔ گاڑی چھوٹے بڑے راستوں سے گزر رہی تھی۔ انہیں سفر میں دو گھنٹے ہو چکے تھے حافظ قمر علی اور طارق محمود خاموش تھے۔ شانی اور بروج کی سانس اور آنکھیں باہم گفتگو کر رہی تھی۔ شانی نے شیشوں سے باہر آ کر گھپ اندھیرے میں نظر دوڑائی۔ ایک میٹر سے آگے دیکھنا بہت مشکل تھا۔ فضا میں فصلوں کی سرسراہٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کھیتوں کے بیچ چل رہے ہیں۔ راستوں کے نشیب و فراز سے گاڑی کی اسپیڈ مدہم تھی۔ حافظ قمر بیک مرر پر گاڑی کی ہیڈ لائٹس دیکھ کر بولا۔

''شانی بھائی! مجھے لگتا ہے ہمارے پیچھے گاڑی آ رہی ہے۔''

''کوئی بات نہیں آپ چلتے جائیے۔ ہمیں روکا گیا تو دیکھا جائے گا۔ آپ تھوڑا آہستہ چلیں پیچھے والی گاڑی کو گزرنے دیں۔'' شانی اور بروج کسی بھی ممکنہ خطرے سے نمٹنے کے لیے بالکل تیار بیٹھے تھے۔

''جی بہتر ویسے بھی اس کی رفتار کافی تیز ہے۔ درمیانی فاصلہ کم ہو رہا ہے۔'' حافظ قمر کا خیال درست تھا۔ پانچ منٹ بعد یکے بعد دیگر دو تیز رفتار گاڑیاں گزریں تو شانی کے چہرے پر سوچ کی لکیریں نمودار ہو گئیں۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ دو گاڑیوں کا اندازہ نہیں لگا سکے تھے۔ دونوں پولیس کی گاڑیاں تھیں۔ ان میں سے ایک تھوڑا آگے جا کر رک گئی تھی۔ حافظ قمر کو بھی رکنا پڑا کیونکہ پولیس وین راستے کے درمیان رکی تھی۔

''حافظ قمر! آپ ہی ان سے بات کیجئے گا۔'' شانی نے حوالدار اور کانسٹیبل کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر کہا۔

''ہاں جی سرکار! کتھے جا رہے ہو اور کتھوں آئے او؟ (ہاں جی سرکار کہاں جا رہے ہو اور کہاں سے آئے ہو؟'')

حوالدار نے قریب آتے ہی سوال کیا۔اس کی طاہرانہ نظریں گاڑی کے اندر کا جائزہ لے رہی تھی۔ شانی اور بروج کو اس نے بغور دیکھا۔قمر نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''گجرات شہر سے آئے ہیں جناب اور چکیاں جانا ہے۔''

''شہر سے چکیاں گاؤں کا راستہ پنڈ مولا داد سے ہو کر جاتا ہے۔تم لوگ یہاں گھوم رہے ہو۔'' حوالدار نے مشکوک نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ وہ دوران گفتگو کئی بار بروج کو دیکھ چکا تھا۔

''بجا فرمایا حوالدار صاحب! مگر ہمیں پہلے سروان جانا ہے وہاں سے ہوتے ہوئے چکیاں جائیں گے۔''

''رات کے دو بجے سروان کیا کرنا ہے۔'' حوالدار ان کے معاملے میں مشکوک ہو گیا تھا۔

''وہاں میرا کزن ہے اور حوالدار صاحب رات اسی کے پاس گزارنی ہے۔ چکیاں تو ہم انشاء اللہ صبح نکلیں گے۔''

''یہ لوگ مجھے پنجاب کے نہیں لگتے۔'' اس بار حوالدار نے روئے سخن شانی اور بروج کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کی نظر اور پرکھ کمال ہے حوالدار صاحب یہ ہمارے مہمان ہیں۔ بلوچستان سے آئے ہیں۔'' حافظ قمر نے دانستہ لہجے میں تعریف کا تڑکا لگایا تھا۔ جو کارگر ثابت ہوا۔حوالدار اپنی تعریف سن کر نرم لہجے میں بولا۔

''شاید تم لوگوں کو علم نہیں سروان گاؤں سے تھوڑا آگے بم دھماکا ہوا ہے۔''

''او! اچھا جی، ہمیں واقعی نہیں پتہ۔''

''ہاں ہم لوگ وہیں جا رہے ہیں۔ دوسری گاڑی میں انسپکٹر رشید موجود ہیں۔ انہی کی ہدایت پر تم لوگوں کو چیک کیا گیا ہے۔''

''آپ مجھے فرض شناس حوالدار لگتے ہیں۔ پلیز ہمیں بتائیے اگر حالات مخدوش ہیں تو ہم واپس پلٹ جاتے ہیں۔'' شانی سمجھ گیا تھا۔حوالدار خوشامد پسند ہے۔اس لیے اس کے لہجے میں بھی بھرپور تعریف تھی۔

''سروان گاؤں کے حالات ٹھیک ہوں گے۔ دھماکا گاؤں سے باہر فارم ہاؤس میں ہوا ہے۔'' حوالدار کہتے ہوئے سیدھا کھڑا ہوا۔پھر سپاہی سے بولا۔

''چل ربنواز ایں لوک لہنڑے کم دے نئیں (چل ربنواز یہ لوگ ہمارے کام کے نہیں۔'')

پولیس سے جان چھوٹ گئی تھی مگر شانی کھٹک گیا تھا۔ اس کا ہدف بھی سروان گاؤں سے باہر ایک فارم ہاؤس تھا۔جبکہ بم دھماکہ بھی فارم ہاؤس میں ہوا تھا۔

''شانی بھائی! کہیں ہمارے حملے کی خبر ہم سے پہلے تو نہیں پہنچ گئی۔''

''مجھے بھی یہی خدشہ ہے طارق۔''

''مگر یہ کیسے ممکن ہے شانی؟'' بروج کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہمارے مشن کا چند مخصوص آدمیوں کے علاوہ کسی کو خبر نہیں۔''

''فی الحال کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔قمر آپ دھیمی رفتار سے چلیں پولیس وین کو نکل جانے دیں۔'' شانی کی ہدایت پر قمر نے گاڑی کی رفتار کم کردی تھی۔

''ہم نواز تم آگے جا کر حالات کی خبر گیری کرو۔'' شانی کے حکم پر ہم نواز نے اسے حالات کا جائزہ لے کر بتایا۔

''پورا سروان گاؤں اس وقت جاگ رہا ہے۔ کیونکہ فارم ہاؤس پر شدید دھماکہ ہوا ہے۔جس سے لوگوں میں خوف و ہراس پھیل چکا ہے اور یہ وہی فارم ہاؤس ہے جو ان لوگوں کا ہدف تھا۔'' شانی کے لیے یہ خبر پریشان کن تھی۔ وہ ابھی سوچوں میں گم تھا کہ امجد بخاری کی کال آنے لگی۔

''السلام علیکم! سر جی۔''

''وعلیکم السلام! شانی آپ لوگ کہاں ہو؟''

''سر جی! ہم ابھی سروان گاؤں پہنچنے والے ہیں۔ تاہم بری خبر یہ ہے کہ فارم ہاؤس کو بم دھماکہ سے اڑا دیا گیا ہے۔''

''مجھے اس بات کا ڈر تھا تبھی فون کیا تھا۔'' دوسری طرف سے امجد بخاری کی بات پر شانی کو حیرت ہوئی تھی۔ سر کہہ رہے تھے جن دو دوسرے ٹھکانوں پر حملہ کے لیے گروپ روانہ کیے گئے تھے انہیں بھی ناکامی ہوئی ہے کیونکہ وہ ٹھکانے بھی دھماکوں سے اڑا دیے گئے ہیں۔

''سر جی اس کا مطلب ہے ہمارے حملوں کی مخبری ہو چکی تھی۔''

''نہیں شانی! مثبت سوچ رکھنی چاہیے میرے گروپ کا ہر فرد قابل اعتماد ہے۔ میں کسی پر شک نہیں کر سکتا۔ ہاں البتہ دوسرے امکانات پر سوچ رہا ہوں۔''

''وہ کیا سر جی۔''

''یہ ٹھکانے ہمیں فاروق بلوچ نے بتائے تھے۔ اور ہم نے فاروق بلوچ کی لاش پھینک دی تھی یقیناً وہ لوگ لاش ملتے ہی چوکنے ہو چکے ہوں گے اور یہ ممکن ہے کہ انہیں پتہ ہو۔ فاروق بلوچ کو کون سے ٹھکانوں کا علم ہے۔ اس لیے احتیاطاً ٹھکانے تباہ کر دیے گئے ہیں۔''

''سر جی! ایسی صورت میں انہیں خالی کر دینا بھی کافی تھا۔ جبکہ انہیں طاقتور بموں سے اڑایا گیا ہے۔''

''شاید ان میں ایسا ساز و سامان ہو جسے منتقل کرنا دشوار ہو۔''

''ہو سکتا ہے سر جی۔''

''آپ طارق کو وہاں نگرانی کے لیے چھوڑ کر واپس آ جاؤ۔''

''او کے سر جی۔'' شانی نے رابطہ منقطع کیا اور حافظ قمر سے بولا۔

''ہمیں واپس چلنا ہوگا۔ طارق کو فارم ہاؤس ڈراپ کر دو۔'' حافظ قمر کچھ کہنے کے لیے لب کھول رہا تھا کہ دفعتاً ان پر اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی۔ گولیوں کی بوچھاڑ اس قدر شدید تھی کہ انہیں سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

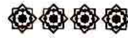


ڈیوڈ پاکستان سے پتھروں اور مٹی کے جو نمونے لایا تھا انہیں جدید ترین لیبارٹری میں انتہائی باریک بینی سے ٹیسٹ کیا گیا تھا۔ ٹیسٹ ہونے کے بعد جو رپورٹ ڈیوڈ کو دی گئی تھی اس نے ڈیوڈ کو تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ رپورٹ میں بالکل واضح بتایا گیا تھا کہ پاکستان واقعی ایٹمی طاقت ہے اور پاکستان نے جو 25 مئی 1998 کو ایٹمی دھماکے کیے تھے ان میں صد فی صد سچائی ہے پاکستان ان ممالک کی فہرست میں شامل تھا جنہیں ڈیوڈ ہر صورت فتح کرنا چاہتا تھا۔ پاکستانی افواج دنیا کی بہترین فوج مانی جاتی ہے۔ بہادری اور فرض کی ادائیگی میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اس لیے وہ محسوس کر رہا تھا کہ پاکستان کو طاقت کے بل بوتے پر فتح کرنا انتہائی مشکل کام ہے عراق، کویت اور افغانستان کی نسبت پاکستان پر فوجی طاقت کا استعمال شاید اتنا آسان نہ ہوگا پاکستان پر طاقت کے استعمال کی بجائے مضبوط حکمت عملی لاگو کی جائے تو کامیابی کے امکانات روشن دکھائی دیتے تھے۔ ڈیوڈ پرسوچ انداز میں بیٹھا تھا۔ پاکستان میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ بھی قابل اطمینان تھا مگر ڈیوڈ مزید آگے جانا چاہتا تھا۔ اس کے دماغ میں ماضی کی فلم چل رہی تھی۔ ماضی میں اسلامی ملک ترکی پر کامیاب ترین حکمت عملی اختیار کی گئی تھی ایک ایسا منصوبہ جو 1924ء میں ترکی پر باقاعدہ لاگو کیا گیا تھا اور جس نے ڈیوڈ اور اس کے اتحادیوں کو سو فیصد کامیابیاں بخشی تھی۔ یہ کامیابیاں بظاہر یہودی مہرہ مصطفیٰ کمال نے ترکی کو ترقی پسند ملک بنانے اور اسلامی روایات سے دور کرنے کی صورت میں سمیٹی تھی۔ مگر درحقیقت مصطفیٰ کمال سے پہلے کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ اسلامی تہذیب کا گہوارہ ترکی بہت پہلے سے نادیدہ طاقتوں کے نشانے پر تھا۔ وہ نادیدہ قوت ڈیوڈ کے علاوہ کوئی دوسری نہیں ہو سکتی۔ ڈیوڈ کے علم میں تھا ترکی دوسرے اسلامی ممالک سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے یہ دو براعظموں کے سنگم پر واقعہ ہے اور ترکی سے ہی براعظم یورپ جہاں ڈیوڈ کے چاہنے اور ماننے والے بستے ہیں کا دروازہ کھلتا ہے۔ ڈیوڈ کو بہت اچھی طرح سے یاد تھا جب اس کی توجہ ترکی کی طرف

مبندول ہوئی تھی۔ تب خلافت عثمانیہ کا سنہرا دور تھا۔ مسلمان بیک وقت تین براعظموں ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے اہم علاقوں پر حکمران تھے۔ یہ بات ڈیوڈ سمیت دیگر غیر اسلامی قوموں کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ ڈیوڈ نے اس نفرت سے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے اذہان وقلوب میں نت نئے منصوبے ڈالنا شروع کردیئے تھے جن کے طفیل وہ خلافت عثمانیہ کے سقوط میں کامیاب ہوا تھا۔ ڈیوڈ ازل سے نیو ورلڈ آرڈر کے لیے کوشاں تھا۔ اب کئی صدیاں بیت جانے کے بعد حالات اس سٹیج پر چل نکلے تھے کہ نیو ورلڈ آرڈر کا قیام بہت جلد ہوتا ہوا نظر آرہا تھا۔ ڈیوڈ کے شاطرانہ دماغ میں ماضی کے وہ تمام حالات محو گردش تھے۔ جو اس نے تین براعظموں سے مسلمانوں کی حکمرانی ختم کرنے کے لیے پیدا کیے تھے۔ ترکوں کے خلاف اس کا پہلا ہتھیار لسانیت اور قومیت کا تھا۔ سب سے پہلے مارچ 1829ء میں یونان نے ترکوں سے آزادی حاصل کی تھی۔ آزادی کا یہ پہلا باب تھا۔ جس نے عسائیوں اور یہودیوں کو نئی راہ دکھائی تھی اس راہ کا اصل محرک ڈیوڈ جو ہانسن تھا۔ جس نے 1830ء میں فرانس کو الجزائر پر 1882ء میں برطانیہ کو مصر پر قبضہ دلانے میں پس پردہ انتہائی اہم کردار ادا کیا تھا۔ ڈیوڈ نے اس پر اکتفا نہیں کیا کہ یورپ کے کئی علاقے ترکوں کے قبضے سے نکل چکے ہیں بلکہ اس نے جو دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے 28 جولائی 1914ء کو پہلی عالمی جنگ چھیڑ دی تھی۔ اس جنگ میں ڈیوڈ نے انگریز کرنل لارنس کو مہرہ بنایا تھا۔ اس نے مسلمانوں پر فتح یابی کے لیے انگریزوں کو عجیب گر سکھائے تھے۔ انگریز گوری رنگت کو گندمی رنگ میں تبدیل کرتے تھے۔ عربوں کے ساتھ خیر خواہ بن کر رہتے تھے۔ نہ صرف ان کا کلچر، ثقافت اور زبان سیکھاتے تھے بلکہ انہیں ترکوں کو قتل کرنے پر اکساتے تھے۔ دنیا آج بھی جانتی ہے کرنل لارنس باقاعدہ عربی لباس پہنتا تھا اور مسلمانوں پر ظلم ڈھاتا تھا۔ اس نے کئی بار مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا تھا۔

حتیٰ کہ 1916ء میں شریف مکہ حسین کو اپنے ہی خلیفہ کے خلاف بغاوت پر مجبور کردیا تھا۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے عراق، مصر، شام، اردن اور فلسطین ترکوں کے قبضے سے نکل گئے تھے ترکی جب اپنی محدود سرحدوں پر سمٹ آیا تو تب ڈیوڈ کو ایک ایسا شخص درکار تھا جو در پردہ اس کے اشاروں پر ناچتا اور سر پردہ ترکوں کا انقلابی لیڈر ہوتا۔ اس کے لیے ڈیوڈ نے مصطفیٰ کمال کا انتخاب کیا تھا جس نے اتاترک یعنی ترکوں کا باپ کا لقب پایا تھا۔ اتاترک نے ترکی کے سیاسی سماجی، قانونی اور تعلیمی نظام میں تبدیلی کا تہلکہ مچادیا تھا۔ زندگی کے ہر شعبے کو جدید طرز پر بدل دیا تھا۔ یہی موقع تھا جب ڈیوڈ کے شاطرانہ دماغ نے اسلامی قانون کی جگہ سیکولر نظام کو فروغ دیا تھا۔ قوم پرستی کو اس طرح ہوا دی تھی کہ ترکی زبان سے عربی اور فارسی کے نہ صرف حروف حذف کردیئے گئے تھے بلکہ اس کا رسم الخط بھی لاطینی بنادیا گیا تھا۔ ترکوں نے مصطفیٰ کمال کی شہہ پر اپنے ماضی سے یکدم قطع تعلق کرلیا تھا۔ یہاں نئے جدید انقلابی نعرے کا سہارا لیا گیا تھا۔ جس کی بنا پر قوم پرستی، جمہوریت پسندی، اسلامی رسم ورواج سے لاتعلقی پروان چڑھی تھی۔ اصلاح پرستی کے نعرے میں مصطفیٰ کمال نے محض چھ برسوں میں ترکی کا مکمل ڈھانچہ بدل دیا تھا ڈیوڈ نے مغربی ممالک کے شاطر ذہنوں کے ساتھ مل کر ایسا کھیل کھیلا تھا کہ ترکی جیسے اسلامی دنیا میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا وہاں مساجد اور مذہبی اداروں میں عربی زبان کا استعمال تک ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ ترکوں کی بدقسمتی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوتا تھی کہ اذان اور نماز وتلاوت کے لیے بھی عربی زبان کو ممنوع قرار دیا گیا۔ مغرب کے شاطر ذہنوں نے انہیں قوم پرستی کا نعرہ سونپ کر ترکیت کا ایسا گرویدہ بنایا کہ وہ اسلامی معاشرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ ڈیوڈ اب جب بھی ترکی کی کشادہ سڑکیں، نائٹ کلب، ناچ گانے کے اڈے اور تھیٹر دیکھتا تو اسے اپنی کامیابی پر فخر محسوس ہونے لگتا ہے۔ اب ایک ایسا ہی پلان پاکستان پر آزمایا جا رہا تھا۔ جو دھیرے دھیرے اسلام کے گڑھ پاکستان پر

پہنچ گاڑھ رہا تھا۔



''تھامس! میں اس لیبارٹری کے اب تک خفیہ رہ جانے پر حیران ہوں۔'' امریکی مایہ ناز سائنسدان ویل ڈویرنٹ نے پارک کے مرکزی دروازے پر لحظہ بھر رک کر کہا۔ تھامس نے اسے مسکرا کر دیکھا انہیں دروازے پر اتارنے والی گاڑی آگے بڑھ چکی تھی۔ تھامس بولا۔

''آپ اس لیے حیران ہیں کہ یہ لیبارٹری مانٹریال کے وسط میں عوامی پارک کے اندر بنائی گئی ہے۔''

''ہاں بالکل۔ انتہائی اہم لیبارٹری کا اس طرح شہر کے بیچ میں قیام راز افشا ہونے کا باعث بن سکتا ہے۔'' باتوں کے دوران وہ دونوں پارک کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ پارک میں باڑھ اور درختوں کے درمیان گری ایک قدیم عمارت بنی ہوئی تھی۔ یہ قدیم عمارت دراصل دنیا میں انتہاء اہم کردار ادا کرنے والی خفیہ تجربہ گاہ تھی۔ دونوں کا رخ عمارت کی طرف تھا۔ تھامس اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

''اس پارک کے چاروں طرف باڑھ لگا کر عوام کے لیے بند کر دیا گیا ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں عمارت کو بھی باڑ اور درختوں سے اس طرح ڈھکا گیا ہے کہ باہر سے اس کا دیکھا جانا انتہائی مشکل ہے......'' تھامس نے گردن موڑ کر ویل ڈیورنٹ کو دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''اصل میں ابتدائی تجربات کے لیے ڈاکٹر وائٹ کو ایسی عمارت درکار تھی جس کے اردگرد عام شہریوں کا آنا جانا ہو۔ کیونکہ پہلا تجربہ انہی عام چلتے پھرتے لوگوں پر کیا گیا تھا۔''

''ڈاکٹر وائٹ لیبارٹری کے انچارج سائنسدان ایون کیمرون کو ہی کہتے ہیں ناں؟''

''جی ہاں ڈاکٹر وائٹ اس کا کوڈ نام ہے۔'' تھامس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ وہ عمارت کے قریب پہنچ گئے تھے۔ وہ جیسے ہی مرکزی دروازے کے پاس پہنچے وہ خود بخود کھل گیا حالانکہ دروازہ خودکار نہیں تھا۔ یقیناً انہیں خفیہ کیمرے سے دیکھا جا رہا تھا۔

''ویلکم مسٹر تھامس اینڈ ویل ڈیورنٹ۔'' اندر راہداری میں دو اشخاص ان کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ دروازہ انہی میں سے ایک نے کھولا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد وہ ان کے پیچھے چل پڑے تھے۔ مختلف راہداریاں ہال اور کمرے کراس کرنے کے بعد میزبان ڈاکٹر وائٹ کے پاس پہنچے تھے۔ اہم ترین پروجیکٹس کا کامیاب ترین نگران اعلیٰ ڈاکٹر وائٹ نے پانچ دوسرے افراد کے ساتھ ان کا پرتپاک استقبال کیا تھا۔

''ڈاکٹر وائٹ ایک مدت سے خواہش تھی کہ آپ سے ملاقات کروں لیکن ہمیشہ مصروفیت آڑے آتی رہی۔''

''تھینک یو ویل ڈیورنٹ۔ سب سے پہلے معذرت قبول کیجئے آپ کے دورے کو خفیہ رکھنے اور میڈیا کی نظر سے بچانے کے لیے آپ لوگوں کو کوئی پروٹوکول نہیں دیا گیا۔''

''ڈونٹ وری ڈاکٹر! ایسی باتوں کو مجھ سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے۔ جس نے ایک مدت سے اپنی اصل شکل آئینے میں نہیں دیکھی۔''

''اوہ! اس کا مطلب ہے ہم عظیم سائنسدان ویل ڈیورنٹ کی اصل صورت دیکھنے سے محروم ہیں۔''

''سوری ڈاکٹر بات سکیورٹی اور میڈیا کی آجاتی ہے۔'' ویل ڈیورنٹ کی بات پر ڈاکٹر وائٹ محض مسکرا کر رہ گیا۔

''میرے خیال میں بریک فاسٹ کر لیتے ہیں گپ شپ تو لگتی ہی رہے گی۔'' ڈاکٹر وائٹ کے معاون سائنسدان بریٹ لی نے انہیں رائے طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''خیال برا نہیں ہے۔'' ویل ڈیورنٹ نے برف کے گالوں کی طرح سفید بھویں اچکتے ہوئے جواباً کہا۔ وہ سب مسکراتے ہوئے کھانے کی ٹیبل پر چلے گئے۔ جہاں پندرہ منٹ میں انہیں پرتکلف بریک فاسٹ سرو کر دیا گیا

تھا۔ اس دوران ہی تھامس نے اصل موضوع چھیڑ دیا تھا۔
''ڈاکٹر آپ کے علم میں ہمارے وزٹ کا مقصد تو ہوگا؟''
''جی ہاں مسٹر تھامس! اس ضمن میں ہماری اسپیشلز سے میٹنگ بھی ہو چکی ہے۔'' لحظہ بھر ناشتے سے ہاتھ روکتے ہوئے ڈاکٹر نے جواب دیا۔
''میں خود اس بات پر اتفاق کرتا ہوں اب وقت آچکا ہے ہمیں ایم کے الٹرا کے تجربات کو وسیع کرنا چاہئے۔''
''ڈاکٹر وائٹ! آپ ایم۔ کے الٹرا کے خالق ہیں۔ یہ ایسی ناقابل فراموش ایجاد ہے جس نے ہمیں سالہا سال سے بے شمار فوائد پہنچائے ہیں۔'' ویل نے تصدیقی انداز میں کہنا شروع کیا۔
''میں نے اس کا باریک بینی سے مشاہدہ، مطالعہ اور پھر تجربہ کیا ہے۔ میں نے اس بات کا نچوڑ نکالا ہے کہ ایم کے الٹرا انتہائی کامیاب ایجاد ہونے کے باوجود اپنے پیچھے چند خامیاں یا دوسرے لفظوں میں ناکامیاں چھوڑ جاتی ہے۔'' گفتگو کے آخری حصے میں ویل نے بغور ڈاکٹر وائٹ کو دیکھا تھا۔ اس کی نگائیں بھی ویل ڈیورنٹ پر اٹکی ہوئی تھی۔
''آپ بلا جھجک اس موضوع پر بات کر سکتے ہیں کیونکہ چند خامیاں خود میں نے بھی نوٹ کی ہیں۔ انہیں دور کرنے کے لیے اہم تجربے سے گزر رہے ہیں۔''
''ڈاکٹر وائٹ! ایم۔ کے الٹرا کے ذریعے آپ اپنے مطلوبہ فرد یا افراد پر ہائی فریکوئنسی مائیکرو ویمز کا خروج کرتے ہیں تیز ترین شعاعیں اپنے ہدف کی طرف پرواز کرتے ہوئے اسے اپنے حصار میں لے لیتی ہیں یہ حصار اس قدر توانا اور مضبوط ہے کہ وہ ہزاروں میل دور ہونے کے باوجود آپ کی ٹرانس میں آجاتا ہے۔ آپ اس کے شعور کو گویا مٹھی میں بند کر لیتے ہیں پھر آپ شعور کو من چاہا پیغام سینڈ کرتے ہیں شعور پیغام لاشعور کو منتقل کرتا ہے لاشعور ہی اس سے وہ کام کرواتا ہے جو آپ کا حکم ہوتا ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔''
''بالکل ویل! ایسی ہی بات ہے جن افراد کا شعور ہمارے کنٹرول میں آجاتا ہے وہ ہمارے تابع ہو جاتے ہیں۔ ہم جیسا کہتے ہیں ویسا کرتے ہیں۔ ابتدائی تجربہ اسی پارک کے ارد گرد منڈلاتے لوگوں پر کیا گیا تھا۔ جو سو فیصد کامیاب رہا تھا۔ جو افراد ہمارے ٹرانس میں آئے تھے انہیں ہم نے باہم لڑنے کا حکم صادر کیا تھا۔ جو انہوں نے من و عن قبول کیا تھا۔ اس کے بعد تجربے کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے کینیڈا کے دور دراز علاقے کا انتخاب کیا گیا۔ جہاں مین شاہراہ پر کار ڈرائیور کو ٹرانس میں لیا گیا تھا۔ اسے حکم دیا کہ وہ جس ٹریک پر جا رہا ہے اس ٹریک پر گاڑی واپس ٹرن کر لے ہم دیکھنا چاہتے تھے کہ ہماری فرمانبرداری میں وہ جان لیوا خطرناک کام کر سکتا ہے اور ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس نے حکم کے عین مطابق گاڑی ٹرن کر کے رانگ سائیڈ پر بھگانا شروع کر دی تھی یہ انتہائی خطرناک عمل تھا۔ جس سے کئی حادثات رونما ہو سکتے تھے۔ اس لیے اسے دوسرے سگنل پر رک جانے کا حکم دیا گیا اس دوران ٹریفک پولیس اس کے تعاقب میں لگ چکی تھی میں سمجھتا ہوں یہاں اس کا شعور ڈبل مائینڈڈ کا شکار تھا۔ ایک طرف پولیس کے ہاتھوں گرفتاری کا خوف مسلط تھا دوسری طرف ہمارے حکم کی بجا آوری کا بوجھ بہر حال اس پر خوف غالب آچکا تھا۔ اس نے گاڑی روکتے روکتے بھی تقریباً پچاس کلومیٹر کا راستہ رانگ سائیڈ پر چلتے ہوئے طے کر لیا تھا۔''
''اور یہ تو انتہائی خطرناک ثابت ہوا ہوگا۔''
''اتفاق سے وہ ماہر ڈرائیور تھا اور خوش قسمتی سے کسی بھی ایکسیڈنٹ سے بچ نکلا تھا۔''
''اس تجربے سے آپ کو پچاس فیصد کامیابی حاصل ہوئی۔''
''پچاس فیصد کامیابی سے بھی ہم مایوس نہیں ہوئے تھے۔ ہم نے تجربہ گاہ میں شعاعوں پر باریک بینی سے از سر نو کام شروع کیا۔ مزید ایک سال اس پر ان تھک محنت کی۔ جس کا خاطر خواہ ثمر ہمارے حصے میں آیا۔ ہم نے ویت نام کی جنگ کے دوران چند فوجیوں کے ذہنوں کو ٹرانس میں لیا ایک سال میں ہم نے چند قدم آگے بڑھے

تھے۔ قبل ازیں ہمیں ہدف کی نگرانی کرنا پڑتی تھی۔ جبکہ اب ہم جسے ٹرانس میں لیتے تھے اس کی حرکات و سکنات اپنے کنٹرول روم کی اسکرین پر دیکھ سکتے تھے۔ ویت نام میں ہمارے چار فوجی جوان ہدف میں تھے۔ انہیں ہم نے اپنے ہی ساتھیوں پر فائرنگ کرنے کا آرڈر دیا تھا۔ ان میں سے دو نے حرف بہ حرف حکم پر عمل کیا تھا جبکہ دو نے گن تانی ضرور تھی مگر فائرنگ نہیں کی تھی۔ وہ بار بار اپنے سروں کو جھٹکا دے رہے تھے۔ ان دونوں نوجوانوں کی قوت مدافعت غیر معمولی تھی۔" ڈاکٹر وائٹ مسلسل بول رہا تھا۔ ٹیبل پر موجود دوسرے سات افراد اسے پورے ارتکاز کے ساتھ سن رہے تھے۔

"ڈاکٹر وائٹ! اگر ہم اس تجربے پر صد فیصد کامیابی حاصل کر لیتے ہیں تو ہم دنیا کا نقشہ اپنے حق میں پلٹنے پر قادر ہو جائیں گے۔" تھامس کے لہجے میں جوش دبا ہوا تھا۔

"ہم کسی بھی ملک کی عسکری قوت کو ٹرانس میں لے کر اسے سرنگوں کر سکتے ہیں۔ انہیں اپنے ہی ملک کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں۔ بغاوت پیدا کر سکتے ہیں اور وہ سب کچھ کر سکتے ہیں جس سے ہماری فتح کے جھنڈے لہرا سکیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہو تھامس! ہم نے دنیا میں ایم کے الٹرا کے کئی کامیاب تجربے کیے ہیں۔ دنیا کی کئی اہم شخصیات کو اپنے ہی محافظوں کے ذریعے ٹارگٹ کیا ہے۔" گارڈنری نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا تھا۔

"ڈاکٹر وائٹ! آپ نہ صرف منجھے ہوئے سائنسدان ہیں بلکہ یہودیوں کے خفیہ جادوئی علم قبالہ کے بھی ماہر ہیں۔ کیا آپ اس تجربے میں اپنے علم قبالہ کی آمیزش بھی کرتے ہیں۔"

"انتہائی قلیل مقدار میں۔ ورنہ میری کوشش رہی ہے کہ اسے صرف سائنسی بنیادوں پر استوار کیا جائے کیونکہ ضروری نہیں میرے بعد آنے والے سائنسدان بھی علم قبالہ کے ماہر ہوں۔"

"پروفیسر ویل ڈیورنٹ ہم نے ڈاکٹر وائٹ سے سعودی اور حکمراں شاہ فیصل کے قتل پر بہت بحث مباحثہ کیا ہے یہ کیس ہمارے مشن سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس لیے اس کا بغور مطالعہ کیا ہے۔" ڈاکٹر وائٹ کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھے بل کیری نے کہا۔

"شاہ فیصل کا قتل ہمیں ایم کے الٹرا کا شاخسانہ لگتا ہے۔ ہمارے علم میں یہ بات بھی آئی ہے کہ اس کے پیچھے مغرب کا ہاتھ ہے۔ کیا آپ اس پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں۔"

"پروفیسر بل کیری! ہم بھی اس شک میں مبتلا ہیں مگر اس قتل کے پس پردہ کچھ حقائق ایسے ہیں جن پر مجھ سے بہتر مسٹر تھامس روشنی ڈال سکتے ہیں۔" ویل نے روئے سخن تھامس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں مسلمانوں کے لیڈر شاہ فیصل پر ایم کے الٹرا یا قبالہ دونوں میں سے کوئی ایک چیز ضرور استعمال کی گئی ہے۔ شاہ فیصل مسلمانوں کا ہمدرد اور مخلص ترین لیڈر تھا۔ وہ یورپ کو کھٹکتا تھا کیونکہ اس نے سعودی عرب سے متواتر نکلنے والے تیل کو مغرب کے خلاف بطور ہتھیار بنا لیا تھا۔ شاہ فیصل کی یہ گستاخی بھی بہت بڑی تھی کہ 1967ء میں وہ ایک اور سنگین غلطی کر بیٹھا۔ اس نے پاکستان سے سعودی افواج کو ٹریننگ کا باقاعدہ معاہدہ کر لیا اس معاہدے کا خمیازہ براہ راست برطانیہ کو سعودی عرب سے اپنی فوج کے انخلا کی صورت بھگتنا پڑا تھا۔ شاید وہیں سے شاہ فیصل کو راہ سے ہٹانے کا پروگرام بنا تھا۔ کیونکہ مستقبل میں یہ شخص اہل یورپ کے لیے بتدریج خطرناک ثابت ہوتا۔ شاہ فیصل کا بھتیجا امریکہ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ دوران تعلیم اس سے ایک خوبرو حسینہ ٹکرائی جسے وہ پہلی نظر میں دل دے بیٹھا۔ اس عشقیہ داستان کے پیچھے بھی قبالہ یا ایم کے الٹرا کارفرما تھے کیونکہ لڑکی یہودیہ تھی اور یہودیوں سے مسلمانوں کی نفرت ازلی ہے۔ اس کے باوجود وہ شخص حسین دوشیزہ کے نہ صرف عشق میں گرفتار ہوا بلکہ اس کے اکسانے پر ہی چچا کو گولی کا نشانہ بنا کر ابدی

نیند سلا دیا۔ گولی چلاتے وقت وہ مکمل ہوش وحواس میں نہیں تھا۔ کئی ماہرین کا خیال ہے کہ اس کا ذہنی توازن ہی بگڑ گیا تھا۔ مگر ایسی بات نہیں تھی۔ دراصل وہ ٹرانس میں تھا اور اس کا سہرا اس کی معشوقہ یہودی حسینہ کے سر بجتا ہے جو اس کے بعد اس سے کبھی نہیں ملی۔"

"ویل! ایم کے الٹرا کے کئی کامیاب تجربات کے باوجود سچ تو یہ ہے کہ ہم ابھی تک اصل ہدف حاصل نہیں کر سکے ہیں۔" ڈاکٹر وائٹ نے کھلے دل سے تسلیم کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں پتہ ہے ڈاکٹر وائٹ۔ اس پروجیکٹ کی نگرانی امریکہ کر رہا ہے۔ اس لیے امریکہ کو بھی یہ تشویش لاحق ہے کیونکہ آپ کو پتہ ہی ہوگا سی آئی اے کے سابقہ ڈائریکٹر این جمس نے آفیشلز میٹنگ میں مفصل رپورٹ پیش کی تھی۔ جس میں اس بات پر اعتراض کیا گیا تھا کہ اس پروجیکٹ پر اربوں ڈالرز خرچ کرنے کے باوجود ابھی تک ہم مطلوبہ ہدف یعنی اجتماعی گروپ پر ایم کے الٹرا کا سو فیصد ٹھیک استعمال نہیں کر پا رہے اس رپورٹ کے بعد مجھے سمن جاری کیا گیا جس کے مطابق مجھے اپنی ٹیم کے ہمراہ چھ ماہ ایم کے الٹرا پر کام کرنا تھا۔ چھ ماہ ہم نے اس کی ناکامی پر گہری سرچ کی ہے۔"

"آپ کی سرچ ہم سننا چاہیں گے۔ ویل ڈیورنٹ!"

"ضرور پروفیسر لیلک!" ویل نے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ چند ساعتیں خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"انسانی دماغ جسم کا کنٹرول روم ہے۔ یہ نہ صرف باہر کی اطلاعات، تجربات اور مشاہدات کو اندر وصول کرتا ہے بلکہ اس کی روشنی میں جسم کے مختلف اعضاء کو حکم دیتا ہے اور جسم کے کئی حصوں سے کام بھی کرواتا ہے۔ دماغ اپنے اندر بہت بڑی میموری رکھتا ہے۔ جس میں بیک وقت کئی چیزیں محفوظ رہتی ہیں اور کئی چیزوں کا نزول ہوتا ہے اور کئی کا خروج۔ اگر ہم انسانی دماغ پر ریسرچ کریں تو ہمیں علم ہوگا کہ یہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ یعنی دائیں اور بائیں۔ دایاں حصہ شکلوں وصورتوں کو یاد رکھتا ہے، جذبات واحساسات کی لہروں کو جذب کرتا ہے۔ بایاں حصہ دائیں حصے سے زیادہ اہمیت والا ہے۔ کیونکہ دایاں حصہ ہی انسان کو سائنسدان، پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر اور بہت سی اضافی صلاحیتوں کا مالک بناتا ہے مگر یہ حصہ دوسرے حصے کا محتاج رہتا ہے۔ کیونکہ دونوں کے درمیان ایک اسکرین ہوتی ہے۔ باہر سے دی گئی اطلاعات بایاں حصہ وصول کرتا ہے۔ یہی حصہ اسے پرکھتا ہے جانچتا ہے اور پھر آگے دائیں حصے کو منتقل کرتا ہے۔ اس پر باقی تمام تر کام دایاں حصہ ہی کرتا ہے۔ ایم کے الٹرا کی ہائی فریکوئنسی مائیکرو بیمز بائیں حصے کو چھیڑتی ہے اور چونکہ یہ جسم کے آلات آنکھ اور کان کے ذریعے دماغ میں نہیں پہنچتی بلکہ براہ راست داخل ہوتی ہیں اس لیے دایاں حصہ اس کے ذریعے بھیجے جانے والے حکم کو قبول کرنے میں کشمکش کا شکار رہتا ہے۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے یہ کوشش مختلف انسانوں کے دماغوں میں مختلف نوعیت کی ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر انسان کا اپنے دماغ میں مذہب، عقائد، یادداشت اور رجحانات ہوتے ہیں۔ اس لیے کچھ دماغ اس کشمکش میں ہی مبتلا رہتے ہیں۔ کچھ اسے ابتدائی حصے میں ہی رد کر دیتے ہیں اور کچھ قبول کر کے آگے بڑھا دیتے ہیں۔ اس لیے ہمارے ٹرانس شدہ افراد میں سے کچھ درست کام کرتے ہیں کچھ نہیں کرتے یا آدھا کرتے ہیں۔" ویل ڈیورنٹ نے رک کر حاضرین محفل کو دیکھا تمام افراد کی دلچسپی برقرار تھی۔

"بات جاری رکھیے مسٹر ویل۔" ڈاکٹر وائٹ نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

ویل ڈیورنٹ سر ہلاتا ہوا پھر سے گویا ہوا۔

"ایم کے الٹرا کے سو فیصد نتائج حاصل کرنے کے لیے ہم نے مائیکرو چپ کا سہارا لینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"مائیکرو چپ؟" ڈاکٹر وائٹ نے متفکر انداز میں زیر لب کہا۔ ویل ڈیورنٹ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"جیسا کہ آپ تمام حضرات کو معلوم ہے نیو ورلڈ آرڈر کے لیے مسٹر ڈیوڈ نے برقی ٹیگ اور مائیکرو چپ ایجاد کی ہیں جو کرہ ارض کے ہر فرد پر سورس سگنل پیدا کرتی ہے۔ ان برقی ٹیگ اور مائیکرو چپ کے سگنل سب سے نچلے مدار پر موجود ہمارے سیٹلائٹ پکڑ لیتے ہیں پھر یہ برقی ٹیگ جہاں بھی ہوتی ہے وہ ایریا یا وہ شخص ہماری مکمل نگرانی میں ہوتا ہے۔"

ایسی برقی ٹیگ یا مائیکرو چپ تو آج کل اسمارٹ کارڈ، کریڈٹ کارڈ، فون کارڈ، موبائل سم، نیشنل آئی ڈی کارڈ میں فٹ ہو چکی ہیں۔"

آپ کا کہنا درست ہے بل کیری۔ اس لیے ہم نے ان مائیکرو چپ کا استعمال ضروری سمجھا ہے۔"

"ہوں......" ڈاکٹر وائٹ نے ایک طویل ہنکارا ابھرا۔ "میں آپ کی بات بہت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔"

"تھینک یو ڈاکٹر وائٹ! چونکہ ایم کے الٹرا کا یہاں باقاعدہ پروجیکٹ چل رہا ہے اس لیے مجھے بھیجا گیا ہے کہ میں آپ لوگوں کے ساتھ مل کر ایم کے الٹرا کا برقی ٹیگ اور مائیکرو چپ کے ساتھ امتزاج کا تجربہ کروں۔ مسٹر تھامس کی ڈیوٹی مجھے یہاں پہنچانے تک تھی۔ انہیں کل کی فلائٹ سے جانا ہوگا۔"

"ہماری کوشش ہوگی مسٹر ویل! کہ اس بار ہم اپنے تجربے میں سو فیصد کامیاب ہوں۔ میرے خیال میں اب ہمیں کچھ آرام کی ضرورت ہے۔" ڈاکٹر وائٹ نے کہتے ہوئے کرسی چھوڑ دی۔



شدید فائرنگ نے حافظ قمر کو ابتدائی لمحات میں ہی موت کی وادی میں اتار دیا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ہونے کی وجہ سے وہ نیچے جھک نہیں سکا تھا۔ طارق، شانی اور بروج بروقت نیچے جھک گئے تھے تاہم فرنٹ سیٹ کا ازالہ طارق کو کرنا پڑا۔ نیچے جھکتے ہوئے اس کے دائیں کان سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا۔ اس نے سسکتے ہوئے کان پر ہاتھ رکھا تو پتہ چلا گولی نے کان اڑا دیا ہے۔ گاڑی کی ونڈو اسکرین کرچیوں میں بدل گئی تھی۔ فرنٹ سیٹوں کے بالائی حصے روئی کی طرح اڑ رہے تھے۔ شانی اور بروج نے نہ صرف جھک کر جان بچائی تھی بلکہ فوراً دروازے کھول کر باہر سرک گئے۔ وہ لیٹے لیٹے کرالنگ کرتے ہوئے کھیتوں میں گھس گئے تھے۔ فرنٹ دروازہ بھی کھلا تھا طارق باہر نکل چکا تھا۔ حملہ آوروں نے گاڑی کی تیز روشنی میں شانی کو دیکھ لیا تھا۔ کیونکہ کھیتوں میں فائرنگ کی گئی تھی۔ لیکن شانی اپنی جگہ بدل چکا تھا۔ شانی نے لیٹے لیٹے جائزہ لیا۔ ان کی گاڑی سے تقریباً تیس چالیس میٹر دور حملہ آوروں کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ شانی نے اس پر فائرنگ کھول دی۔ مگر یہ قیاساً کی گئی فائرنگ تھی۔ گاڑی کے اندر مکمل اندھیرا تھا۔ کوئی بھی شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید وہ پہلے سے ہی اوٹ میں چلے گئے تھے۔ بروج شانی کی مخالف سمت کے کھیتوں میں اتری تھی۔ جبکہ طارق کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ شانی کرالنگ کرتا ہوا حملہ آوروں کی گاڑی کے عقب میں پہنچ گیا تھا۔ گاڑی کے عقبی حصے کی اوٹ سے ایک شخص جھانک رہا تھا۔ اس کی پشت شانی کی طرف تھی اور وہ ان کی گاڑی کو جھانک جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پسٹل اور انداز انتہائی چوکنا تھا۔ تاہم شانی اسے بے خبری میں بڑے سکون سے ابدی نیند سلا سکتا تھا مگر شانی کو وہ زندہ چاہیے تھا۔ اس لیے اسے عقب سے جا کر دبوچ لیا۔ ساتھ ہی اس کی کلائی کو جھٹکا دیا جس سے پسٹل نیچے گر گیا تھا۔ اسے بے ہوش کرنے کے لیے شانی انگلی کی ہک بنا کر کنپٹی پر مارنا چاہ رہا تھا مگر مخالف نے پھرتی دکھائی تھی۔ اس نے کہنی کی ضرب شانی کی پسلیوں میں اتنی زور سے رسید کی تھی کہ شانی کی گرفت بے اختیار ڈھیلی پڑ گئی۔ گرفت ڈھیلی ہوتے ہی وہ شخص چکنی مچھلی کی طرح اس کے بازوؤں سے نکل گیا لیکن شانی نے سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ جیسے ہی دو قدم پیچھے ہٹا شانی نے لات گھما دی تھی۔ مگر وہ شانی کی توقع سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا تھا۔ اس نے شانی کی ٹانگ پکڑ لی تھی۔ یہ چند سیکنڈز کی بات تھی۔ جیسے ہی اس نے ٹانگ پکڑی شانی ایک ہاتھ

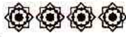
گاڑی کی چھت پر رکھتے ہوئے اس کے زور پر اچھلا اور دوسری ٹانگ کے بوٹ کی ضرب اس کے منہ پر جڑ دی۔ وہ شخص سسکی لیتا ہوا پیچھے جا گرا۔ شانی کی ٹانگ اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ شانی کسی ممکنہ چھوٹ سے بچنے کے لیے زمین پر گرتے ہی قلابازی کھاتا ہوا کھڑا ہو گیا تھا۔ ایسا ہی عمل اس کے مخالف نے بھی دہرایا تھا۔ مخالف شخص گاڑی کے بالکل سامنے کھڑا تھا اور شانی ڈرائیونگ سائیڈ کی طرف اس بار بھی حملے میں شانی نے پہل کی اور اڑتا ہوا اس پر جا پڑا۔ دونوں گاڑی کی تیز روشنی میں گتھم گتھا تھے۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس ہنوز جل رہی تھی۔ جس رفتار سے دونوں گرے تھے اسی رفتار سے اٹھے بھی تھے۔ شانی کے مخالف نے اٹھنے میں کچھ سیکنڈ پہل کی تھی اور اٹھتے ہی شانی کے چہرے پر بھرپور ٹکر دے ماری۔ شانی اوغ کی آواز کے ساتھ دو قدم پیچھے کولڑ کھڑایا۔ وہ شخص حد درجہ لڑاکا تھا۔ ٹکر مارتے ہی اس نے فلائنگ کک شانی کے سر پر ماری یہ انتہائی کاری ضرب تھی۔ جس کے لگتے ہی شانی بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ گرتے وقت اس کی باڈی جھٹکے سے گھوم گئی تھی۔ اور وہ منہ کے بل 90 ڈگری میں کار کی ڈگی پر گرا تھا۔ شانی کے مدمقابل نے چند لمبی سانسیں خارج کیں ایک نظر شانی کو دیکھا اس کی بے ہوشی کا اطمینان کر کے وہ پلٹا ہی تھا کہ اسے شانی کی گاڑی سے ہیڈ لائٹس کے ساتھ ہلکا سا ہارن دیا گیا۔ اس نے چونک کر گاڑی کی طرف دیکھا گاڑی پہلے ریورس ہوئی پھر ایک جھٹکے سے پوری رفتار کے ساتھ اس کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ سمجھ گیا تھا گاڑی میں اس کا ساتھی موجود ہے۔ جس کا ارادہ یقیناً بے ہوش پڑے شانی کو کچلنے کا تھا۔ اس نے ایک طرف چھلانگ لگا دی جس طرف اس نے چھلانگ لگائی تھی وہاں بروج موجود تھی۔ جس نے اسے دبوچ لیا تھا۔ وہ شخص اس ناگہانی آفت سے قطعی بے خبر تھا۔ بروج نے اس کی گردن سختی سے ہاتھوں میں جکڑ لی تھی۔ اس کے بازوؤں میں اتنی طاقت تھی کہ وہ شخص ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا تھا۔ بروج اس سے پہلے ایک آدمی کو بے ہوش کر چکی تھی اور شانی کی طرف مدد کے لیے بڑھ رہی تھی۔ مگر اس شخص نے شانی کو بے ہوش کر دیا تھا۔ اب وہ بروج کے آہنی ہاتھوں میں تڑپ رہا تھا۔ بروج نے چند لمحوں میں ہاتھ کو زور سے جھٹکا دیا۔ شدید جھٹکے سے کٹک کی آواز کے ساتھ اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔ اسے آواز نکالنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ وہ ابدی نیند سو چکا تھا۔ جسے شانی جیسا مرد آہن زیر نہ کر سکا اسے نازک مزاج بروج نے چند سیکنڈ میں موت کے حوالے کر دیا تھا۔

گولی سے نہ صرف طارق کا کان اڑا تھا بلکہ باہر نکلتے سمے گولیوں نے اس کا کندھا بھی لہولہان کر دیا تھا۔ دو گولیاں کندھے میں لگی تھیں۔ جس سے کندھا اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ کان اور کندھے سے خون کا رساؤ تیزی سے جاری تھا اور وہ بڑی مشکلوں سے باہر نکلا تھا۔ اس طرف ڈھلوان تھی جس پر وہ خود بخود لڑھکتا ہوا کھیتوں میں جا پہنچا تھا۔ اس کے کندھے میں درد کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ شاید کوئی گولی اندر رہ گئی تھی۔ اس کے لیے حرکت کرنا ناممکن ہو چکا تھا۔ چہرے پر شدید کرب کے آثار واضح تھے۔ اس نے سختی سے دوسرے ہاتھ کے ساتھ کندھا پکڑا ہوا تھا۔ بروج بھی اس کی سائیڈ پر نکلی تھی اور اس کے پاس سرگوشی کرتی ہوئی گزری تھی۔

”طارق یہاں حرکت مت کرنا۔“ وہ کرالنگ کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ضرور ہو گئی تھیں مگر طارق کے انتہائی زخمی ہو جانے کا بروج کو اندازہ نہیں ہوا تھا۔ بروج نے ایک آدمی کو دیکھ لیا تھا۔ طارق حرکت کرنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ بس دیکھ رہا تھا۔ راستے میں دونوں گاڑیاں آمنے سامنے کھڑی تھیں۔ دونوں کے بیچ میں شانی ایک آدمی کے ساتھ دوبدو لڑ رہا تھا طارق اس وقت بری طرح چونکا جب شانی بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا وہ اس کی مدد کے لیے جانا چاہتا تھا مگر حرکت کرنے سے تکلیف کی شدت دوچند ہو گئی تھی۔ وہ سختی سے ہونٹ دبائے بحالت مجبوری رک گیا۔ معاً اس نے اپنی گاڑی کے پاس ایک شخص کو کھڑے دیکھا۔ اس نے دروازہ کھول کر حافظ قمر کی لاش کو باہر گھسیٹا اور خود ڈرائیونگ

سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جب اس نے گاڑی شانی کی طرف دوڑائی تو طارق کے جسم میں سنسنی دور گئی۔ اس کے ذہن میں دھماکے ہونے لگے۔ تیز رفتار گاڑی شانی کا سرمہ بنا سکتی تھی۔ وہ کوئی بھی بروقت حرکت کرنے سے قاصر تھا۔ وہ بے بسی سے آنکھیں بند کرنا چاہتا تھا تبھی اس نے بروج کو شانی کے سامنے کھڑا پایا۔ طارق حیران و پریشان تھا بروج بجائے شانی کو وہاں سے ہٹانے کی کوشش کرتی وہ اس کے سامنے کار پر نظریں جمائے کھڑی ہوگئی تھی۔

''اوہ نو!'' طارق کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس طرح تو دونوں کا گاڑیوں کے درمیان کچومر نکل جائے گا۔ وہ اس سے آگے نہ کچھ سوچ پایا تھا اور نہ کچھ کہہ پایا۔ گاڑی بروج کے بالکل قریب پہنچ گئی تھی۔ مگر اس لمحے طارق نے ناقابل الفہم منظر دیکھا تھا۔ جس سے اس کے چودہ طبق روشن ہوگئے تھے۔ گاڑی جیسے ہی شانی کے پاس پہنچی بروج نے اسے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں پر یوں اٹھایا جیسے کوئی بچہ کھلونا کار کو اٹھالیتا ہے طارق نے سر کو جھٹکا دیا وہ اپنی تکلیف ہی بھول گیا تھا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ گاڑی بروج کے ہاتھوں پر سر کے اوپر اٹھی ہوئی تھی۔ طارق نے آنکھوں کو مسل کر ناقابل یقین منظر دیکھا۔ گاڑی کی چھت نیچے کی طرف اور ٹائر آسمان کی طرف تھے۔ جو بڑی تیزی سے گھوم رہے تھے۔ شاید ڈرائیور خوف، دہشت اور بدحواسی میں ایکسیلیٹر سے پاؤں ہٹانا بھول گیا تھا۔ بروج نے گاڑی کو چند لمحے اوپر اٹھایا اور پھر گھما کر دور کھیتوں میں پھینک دیا۔ گاڑی کھلونے کی طرح اڑتی ہوئی دس پندرہ میٹر دور جا گری۔ گرنے کے بعد گاڑی نے تین چار قلابازیاں کھائیں اور پھر الٹ رک گئی۔ طارق انگلش فلمیں نہیں دیکھتا تھا مگر دوستوں سے سن رکھا تھا۔ ایسے مناظر فلموں میں بکثرت دکھائے جاتے ہیں۔ مگر وہ حقیقت میں دیکھ چکا تھا۔ وہ ابھی تک ناقابل یقین حالت میں تھا۔ بروج جیسی نازک اندام لڑکی سے ایسی توقع کیسے کی جاسکتی تھی۔ بروج اب شانی کو ہوش میں لارہی تھی۔ جبکہ طارق کا ذہن سائیں سائیں کررہا تھا۔ وہ خود کو یقین دلانے میں ناکام ہورہا تھا۔ دفعتاً زوردار دھماکہ ہوا اور جہاں گاڑی گری تھی وہاں آگ کا شعلہ آسمان کی طرف بلند ہوا۔ گاڑی کا فیول ٹینک پھٹ گیا تھا۔ آگ بڑی تیزی سے کھیت میں پھیلنے لگی تھی۔



امجد بخاری کا پروقار چہرہ پریشانیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ہر گزرتا لمحہ تشویش کی نئی تہہ جمارہا تھا۔ نصف گھنٹہ قبل پاکستان کے چند محب وطن اعلیٰ آفیسرز انہیں میزبانی کا شرف بخشنے کے بعد رخصت ہوئے تھے۔ یہ وہ مہربان آفیسرز تھے جن کی خاص محبت امجد بخاری کے گروپ کو فعال بنا رکھا تھا۔ دشمنان پاکستان کا قلع قمع کرنے کے لیے درپردہ یہی مہربان ان کے معاون تھے۔ ان کی مدد کے طفیل ہی فنانس، جدید اسلحہ، انسٹرکٹر اور محب وطن نوجوان گروپ کو ملتے تھے۔ آج ان سے چار گھنٹے طویل میٹنگ ہوئی تھی۔ میٹنگ میں ان سب کو پاکستان کی بتدریج بگڑتی صورت حال پر تشویش لاحق تھی۔ پاکستان کے حالات انتہائی نازک موڑ پر پہنچ چکے تھے۔ خفیہ ہاتھ پاکستان کو توڑنے کے درپے تھے۔ پاکستان کے اندرونی حالات عجیب صورت حال اختیار کررہے تھے امیر، امیر سے امیر تر ہورہے تھے اور غریب، غربت کی نچلی سطح پر پہنچ کر دو وقت کی روٹی کو ترس رہا تھا۔ معیشت کا بیڑہ غرق ہو چکا تھا۔ قومی خزانے پر قرضوں کا بوجھ بڑھ رہا تھا۔ صنعتیں بند ہورہی تھی۔ صنعتی اور معاشی بحران حدوں کو چھو رہا تھا۔ پانی، بجلی، گیس کا بحران بھی شدید ترین تھا۔ ادارے پستی کی طرف گررہے تھے۔ انتشار، بدنظمی، افراتفری، مذہبی فرقہ واریت، دہشت گردی ہمہ وقت منہ پھاڑے عوام الناس کو نگلنے کے درپے تھے۔ عدالتیں اور ادارے ٹکراؤ کی پوزیشن میں کھڑے تھے۔ عوامی مسائل حل کرنے اور ملک کو معاشی ترقی پر چلانے کا کسی کو خیال نہیں بلکہ افراتفری کا دور دورہ تھا۔ حکمران کرسیاں بچانے کے لیے سب کچھ کررہے تھے۔ مفاد پرستی اور مادی حاجات نے انہیں انسان سے بھیڑیا بنادیا تھا۔ ایسے بدترین حالات

میں بیرونی خفیہ طاقتوں کی سازشوں کا انکشاف کسی بھی محب وطن پاکستانی کو پریشانی میں مبتلا کر سکتا تھا۔

شانی، طلحہ اور حمزہ تینوں کو امجد بخاری نے بلڈنگ میں بلوالیا تھا۔ ان کے پہنچنے تک امجد بخاری فکر و اندیشوں میں گرا رہا۔ مصافحہ کرتے ہوئے تینوں نے ان کی غیر معمولی سنجیدگی اور چہرے کی پریشانی کو نوٹ کیا تھا۔ شانی بیٹھتے ہی بولا۔

''ایم سوری سر جی۔ ہم ناکام لوٹے ہیں۔ تاہم، ہم ایک بندے کو اٹھا لائے ہیں جس سے پوچھ گچھ جاری ہے۔''

''وہ بات نہیں ہے شانی! بلکہ بات کچھ اور ہے۔''

''خیریت ہے سر جی؟'' حمزہ نے فوراً پوچھا۔ اس کے لہجے میں بے چینی دوڑ گئی تھی۔ یہی حالت طلحہ اور شانی کی بھی تھی۔

''خیریت نہیں ہے حمزہ۔'' ان کا لہجہ مزید اداسیوں میں ڈوب گیا تھا۔ انہوں نے گہری سانس کھینچتے ہوئے کہا۔

''وطن کے خلاف سازشوں کا طویل جال ہے جو مسلسل بُنا جا رہا ہے۔'' طلحہ نے کچھ کہنا چاہا رتھا مگر امجد بخاری کو بولتے دیکھ کر خاموش ہو گیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

''ابتدا میں، میں سمجھا تھا بلوچستان کے چند علاقوں بشمول نثار پور پر خفیہ طاقتوں کی نظریں گڑھی ہوئی ہیں کیونکہ بلوچستان معدنی ذخائر سے مالا مال صوبہ ہے۔ مگر مجھے ایسی اطلاعات پہنچی ہیں جس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے ہیں۔ بات میرے اندازے اور توقع سے بہت آگے کی ہے.....'' امجد بخاری نے لحظہ بھر رک کر تینوں کو دیکھا۔ تینوں کے چہروں پر غم و فکر کی پرچھائیاں واضح ہو چکی تھی۔

''فاروق بلوچ کے بتائے گئے اڈوں کو جس طرح ہمارے پہنچنے سے پہلے اڑا دیا گیا ہے اس بات نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا ہے۔ یہ معمولی کارروائی نہیں ہے۔ اس کارروائی سے دشمنوں کے مضبوط نیٹ ورک، دیدہ دلیری اور پھیلاؤ کا اندازہ ہوتا ہے۔''

''میں نے تو اس بات پر سوچا ہے سر جی۔ یہ عام گروپ کا کام نہیں ہے۔'' حمزہ نے امجد بخاری کی تائید میں کہا۔

''کسی بھی عمارت کو طاقتور بم سے راکھ کا ڈھیر بنا دینا یقیناً مضبوط نیٹ ورک کی دلیل ہے۔''

''ہمیں جلد سے جلد اس نیٹ ورک کو ختم کرنا ہوگا۔'' طلحہ نے امجد بخاری کو دیکھتے ہوئے کہا۔ شانی پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

''سر جی! آپ کی باتوں سے لگتا ہے پاکستان میں کوئی ایک گروپ متحرک نہیں۔''

''اسی بات نے مجھے زیادہ پریشان رکھا ہے شانی! مجھے پختہ یقین ہے کہ ایک سے زیادہ گروپس میدان میں موجود ہیں۔ ہر گروپ کا اپنا الگ مشن ہونے کے باوجود مقصد مشترکہ ہے۔'' سر جی کے لہجے کی اداسی جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

''یعنی پاکستان کی تباہی۔''

''سر جی! نثار پور کی پہاڑیوں سے میں نے جس گروپ کا خاتمہ کیا تھا۔ اس میں بلیک واٹر اور موساد کے ایجنٹ شامل تھے کیونکہ ان کے علاوہ بھی کوئی بین الاقوامی تنظیمیں یہاں متحرک ہیں۔''

''انڈین را اور روس کی کے جی بی کو بھی ان میں شامل کر لو۔ اگر ہوم منسٹر عبدالبارق کو قتل نہ کیا جاتا تو ہم نثار پور کی پہاڑیوں سے بھاگے گئے لوگوں تک پہنچ سکتے تھے مگر فاروق بلوچ کی موت کے بعد انہوں نے مستعدی دکھاتے ہوئے نہ صرف اڈے تباہ کر دیئے بلکہ عبدالبارق کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔''

''سر جی! جس آدمی کو ہم بے ہوشی کی حالت میں ساتھ لائے تھے۔''

''ہاں شانی! اس آدمی سے کچھ معلومات ضرور ملی ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ سابقہ موضوع پر پلٹ آئے۔

''پوری دنیا میں چند خفیہ ہاتھ ہیں جو ایک نیا نظام متعارف کرانے میں محو ہیں۔''

''نیا نظام سر جی؟''

''نیا نظام نیو ورلڈ آرڈر ان کے خفیہ ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ انہیں دنیا کے بیشتر ممالک پر دسترس حاصل ہو چکی ہے۔ جن ممالک کی تنظیموں کا میں نے ذکر کیا ہے وہ ممالک بھی انہیں کے ہاتھوں کے کھلونے ہیں۔ ان خفیہ ہاتھوں اور دماغوں پر یہ بات واضح ہے انہیں اگر دنیا پر حکمرانی کرنی ہے تو اسلام کو صفحہ ہستی مٹانا ہوگا۔ پاکستان اسلامی دنیا کا بہت اہم ملک ہے اس لیے یہ بھی ٹارگٹ پر ہے۔''

سر جی۔'' طلحہ نے بیچ میں بولنا چاہا مگر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے چپ رہنے کی تلقین کی۔ طلحہ خاموشی سے ان کی باتیں سننے لگا۔

''الحمدللہ ہمارا دفاعی نظام بہت اعلیٰ اور مضبوط ہے۔ بہت سارے سازشی عناصر اس مضبوط دفاعی نظام کے ہاتھوں کچلے جاتے ہیں۔ مگر کئی مقام ایسے بھی آتے ہیں جہاں ہمارے ادارے بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہیں سے ہمارا کام شروع ہوتا ہے۔'' امجد بخاری نے رک کر تپائی پر پڑا ہوا گلاس اٹھایا۔ حمزہ، شانی اور طلحہ شدید مضطرب اور بے چین تھے۔

''تم لوگوں کو بہت اچھی طرح علم ہوگا۔ دنیا میں سب سے خطرناک بیماری ایڈز ہے۔ ایڈز 1970ء کی دہائی میں نمودار ہوئی تھی ایڈز ایک ایسی بیماری ہے جس نے آج تک پوری دنیا میں تہلکہ مچا رکھا ہے۔ ایڈز نے صرف موت کا رقص دکھایا ہے۔ اس جان لیوا بیماری کا محرک افریقہ کے سبز بندر کو قرار دیا گیا ہے۔ دنیا میں اب تک جتنی بھی رپورٹس آئی ہیں وہ ایک ہی واقعہ کے گرد گھومتی ہیں کہ افریقی باشندے کو سبز بندر کے کاٹنے سے ایڈز کی وبا پھوٹی ہے۔ ایسی تمام رپورٹس جھوٹ پر مبنی ہیں اور یہ دنیا کو دھوکا دینے کے لیے من گھڑت کہانی بنائی گئی ہے۔''

''تو کیا سر جی! اصل حقائق کچھ اور ہیں؟'' طلحہ نے ایڈز کے بارے میں بہت کچھ پڑھا تھا۔ اس کے علم میں وہی باتیں تھیں جو اب تک سر جی نے بیان کی تھیں۔ ماسوائے من گھڑت کہانی کے۔

''اگر ایڈز کے وائرس سبز بندر کے کاٹنے سے ہی افریقی باشندے میں منتقل ہوئے تھے تو یہ وبا افریقہ میں پھوٹی اور دھیرے دھیرے باقی ملکوں تک پہنچی جبکہ ایڈز بیک وقت افریقہ، امریکا، برازیل، ہیٹی اور جنوبی جاپان میں پھیلا تھا۔ ایڈز کا بیک وقت کئی ممالک میں جنم لینا اس بات کا ثبوت ہے کہ سبز بندروں کی کہانی من گھڑت ہے۔ جو انسانیت کے دشمن اور انسان نما درندوں نے گھڑی ہے۔ اس کہانی کے پیچھے سفاکی اور بے رحمی کی ایسی سازش کارفرما ہے جس نے انسانیت میں موت کے پنجے گاڑے ہیں۔ 1970ء میں امریکی صدر جمی کارٹر نے عالمی رپورٹ برائے 2000 تیار کرنے کا حکم شاہی صادر فرمایا۔ رپورٹ میں کرہ ارض میں بڑھتی ہوئی آبادی کو خطرناک قرار دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح بتایا گیا کہ تیسری دنیا کی آبادی بڑی تیزی سے یورپ کے مقابلے میں بڑھ رہی ہے۔ اگر آبادی بڑھنے کا تناسب یہی رہا تو بہت جلد سفید فام یورپین کی آبادی انتہائی کم ہو جائے گی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی پر یا تو روک لگا دیا جائے یا پھر اسے کم کر دیا جائے۔ سنگدل اور انسانیت دشمن قوتوں نے مختلف حیلے بہانوں سے نہ صرف آبادی پر روک لگایا بلکہ اس میں کمی کرنے کے لیے ایڈز اور ہیپاٹائٹس سی جیسے مہلک جان لیوا وائرس تخلیق کیے۔''

''خدا کی پناہ سر جی! انسانیت کے ساتھ اتنی بڑی سفاکی اور درندگی۔'' طلحہ اندر سے دہل کر رہ گیا تھا۔

''جی ہاں ایڈز کے قاتل وائرس دنیا میں تباہی کا موجب بنے تو بہت سے رحمدل انسان دوست سائنسدان میدان میں اتر آئے۔ انہوں نے اس پر تحقیق شروع کر دی۔ ان میں ڈاکٹر تھیوڈر اسٹریکر بھی ایسے ہی شخص ہیں۔ ڈاکٹر اسٹریکر نے عرق ریزی اور باریک بینی سے ایڈز کے

وائرس پر تحقیق کی اور اپنی تحقیق کا نچوڑ یہ نکالا کہ ایڈز کے وائرس سبز بندر سے کسی صورت نہیں ملتے۔ بلکہ یہ وائرس انسان کے تخلیق کردہ ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے بہت زیادہ کام کیا کئی مقالے لکھے اور متعدد دستاویزی ثبوت بھی پیش کیے۔ حتیٰ کہ انہوں نے اپنی رپورٹ میں برملا کہہ دیا نیشنل کینسر انسٹیٹیوٹ اور عالمی ادارہ صحت نے مشترکہ طور پر فورڈ ڈیٹرک کی تجربہ گاہوں میں دو مہلک وائرسز یونین لیکومیا وائرس اور شیپ وسنا وائرس کو باہم ملا کر اسے تخلیق کیا اور یہ خود انسان کے ہاتھوں میں بذریعہ انجکشن پہنچا کر مطلوبہ ہدف حاصل کیا۔"

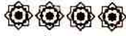
"سر جی! امریکا جیسی سپر پاور، روشن خیال اور دنیا کے اہم ترین ملک کا سائنسدان اتنی چونکا دینے والی رپورٹ مرتب کرتا ہے تو کیا اس پر کوئی ردعمل نہیں آیا۔"

"ڈاکٹر اسٹریکر کے ساتھ کیا ہوا شانی! یہ ایک الگ کہانی ہے۔ میں اتنی لمبی تمہید کا مقصد بتانا چاہتا ہوں انسانیت کے قاتل یہ خفیہ ہاتھ آج تک اپنے اس مشن میں گامزن ہیں وہ مختلف طریقوں سے تیسری دنیا کے باشندوں کو موت کے حوالے کر رہے ہیں۔ یہاں بھی پاکستان کی بدقسمتی ہے کہ یہ ان کے نشانے پر ہے۔ اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ یونی سیف جیسا ادارہ پاکستان کے معاملے میں بے رحمی اور سفاکی کا مظاہرہ کرتا ہے اور پاکستان کو پولیو کے جعلی اور ایکسپائر قطرے تھما دیتا ہے۔ اس پروجیکٹ پر حکومت کے لاکھوں ڈالرز صرف ہوتے ہیں وہ سرے سے جعلی ہوتے ہیں یا پھر ایکسپائر۔"

"اس پر کیا عجب مذاق ہے کہ ہم لوگ انسانیت کے ان دشمنوں کو مسیحا ماننے پر مجبور ہیں۔" طلحہ نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ سر جی نے اس کے اداس چہرے پر نگاہ ڈالی اور بولے۔

"اس وقت دنیا کے بیشتر ممالک میں ایڈز، کینسر اور ہیپاٹائٹس سی جیسے خود ساختہ گمبھیر مسائل پھیل رہے ہیں۔ ہمارے پاس اب وقت بہت کم ہے۔ ہمیں جلد سے جلد ان خفیہ چہروں کو بے نقاب کرنا ہے۔ جنہوں نے تہہ در تہہ چہروں پر کئی نقاب چڑھا رکھے ہیں اور بقول طلحہ کے ہم انہیں مسیحا کہنے پر مجبور ہیں کیونکہ ایک طرف یہ ہمیں موت کی طرف دھکیلتے ہیں اور دوسری طرف اس کے بچاؤ کی ادویات فروخت کر کے ہم سے لاکھوں کروڑوں ڈالرز کما رہے ہیں۔

"اس کے لیے کیا کرنا ہوگا سر جی؟" شانی کے پوچھنے پر امجد بخاری انہیں آئندہ کا لائحہ عمل سمجھانے لگے تھے۔



شانی بے حد اداس تھا اس کے جسم کے انگ انگ سے اداسی ہویدا تھی۔ چند لمحے قبل وہ ایک فائل کا مطالعہ کر کے ہٹا تھا۔ سر جی نے حمزہ، طلحہ اور اس کی سربراہی میں تین علیحدہ علیحدہ گروپ تشکیل دے دیئے تھے۔ تینوں اپنے اپنے گروپ کے خود مختار لیڈر تھے۔ گروپ کے تمام افراد انہیں جواب دہ تھے اور وہ امجد بخاری کو۔ جنہوں نے انہیں مشن کے متعلق چند فائلیں سونپ دی تھیں۔ کس نے کس مشن پر کام کرنا ہے سب کچھ واضح کر دیا تھا۔ امجد بخاری نے شانی کو تین سوگز کا خوبصورت گھر بھی الاٹ کر دیا تھا۔ گاڑی اس نے اپنے پیسوں سے پہلے ہی خرید لی تھی۔ حمزہ اور اس کے گھر والے تب بہت خفا تھے جب شانی، ممی اور منزہ کو وہاں سے اپنے گھر شفٹ کر رہا تھا۔ حمزہ کی فیملی میں بہت ہی مخلص اور پیار نچھاور کرنے والے لوگ تھے۔ بیگم کلثوم اور منزہ نے جتنے بھی دن وہاں بسر کیے تھے کسی ایک پل میں بھی انہیں بیگانگی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ بیگم کلثوم ان سے بہت متاثر تھیں۔ کامران اور اذان تو انہیں بھول ہی گئے تھے۔ نہ کبھی انہوں نے انہیں تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ نہ ہی بیگم کلثوم نے ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے بیگم کلثوم نے انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ تاہم شانی نے چند بندے ان کی نگرانی میں ضرور چھوڑے تھے اسے ڈر تھا کہ ساجد اور اس کا ایم این اے باپ انہیں نقصان پہنچائیں گے۔ مگر ساجد کے غبارے سے ہوا نکل چکی تھی۔ اس کا ایم این اے باپ فاروق بلوچ کیفر کردار تک پہنچ گیا تھا۔ شانی

اب مطمئن تھا۔ تھانے کے مہربانوں سے بھی امجد بخاری نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے جان چھڑا دی تھی۔ اس پر لگائے گئے الزامات کی فائل بند ہوگئی تھی۔ کیونکہ یہ بات بھی یکسر تبدیل ہوگئی تھی کہ جس پولیس والے کو شانی نے مارا تھا اور جو زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے اسپتال میں دم توڑ چکا تھا۔ اسے دراصل ڈاکٹر کی ملی بھگت سے باقاعدہ قتل کیا گیا تھا۔ اس میں فاروق بلوچ کا ہاتھ تھا۔ جس کا مقصد شانی کو قاتل قرار دے کر پھانسی کے پھندے پر لٹکانے کا تھا۔ مگر فاروق بلوچ کی موت کے بعد ہی یہ بھید کھلا تھا۔

اب حالات ایسے سٹیج پر چل نکلے تھے کہ شانی کو مستقل پنجاب میں رہنا پڑا تھا۔ بیگم کلثوم اور منزہ شانی کے آدمیوں کے ساتھ نثار پور کا چکر لگا لیتی تھیں۔ شانی کے یہ آدمی ان کے ساتھ ڈرائیور اور ملازم کی حیثیت سے جاتے تھے۔ بیگم کلثوم کو شانی کے بارے میں سب کچھ پتہ تھا اس لیے نثار پور کی زمینوں اور کوئٹہ شہر کی مارکیٹوں کو اس نے خود سنبھال رکھا تھا۔ نثار پور میں ان کا گھر بم دھماکے میں تباہ ہو چکا تھا اس لیے انہوں نے فارم ہاؤس کو رہائش کے لیے سیٹ کرلیا تھا۔

شانی فائل پڑھنے کے بعد محسوس کررہا تھا کہ اسے جو بھی کرنا ہے جلد از جلد کرنا ہے۔

''شانی! تم حد سے زیادہ پریشان ہو رہے ہو۔ حالات ابھی اتنے بھی نہیں بگڑے ہم دشمنوں کو بہت جلد ٹھکانے لگادیں گے۔'' عاصم نواز نے شانی کو اداس دیکھ کر کہا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ ہم نواز اور روشن نواز بھی شانی کی ڈھارس باندھیں۔

''عاصم نواز! مجھے اس سلسلے میں تم تینوں کی مدد چاہیے۔''

''ہم نے کب انکار کیا ہے شانی۔ ہم ازل سے تمہارے ساتھ ہیں اور ابد تک رہیں گے۔'' روشن نواز نے فوراً جواباً کہا۔

شانی ہم نواز سے بولا۔

''ہم نواز! تمہاری ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے کی کم و بیش حد اور رفتار کتنی ہے؟''

''شانی! میں حدوں سے پار بے حد ہوں۔ محدود نہیں لامحدود ہوں۔ تم جہاں کہو جب کہو جا سکتا ہوں۔ بس اس میں یہ دھیان رہے کہ میں تمہاری دیکھی بھالی جگہ جا سکتا ہوں۔ یا پھر ایسی جگہ جس کے بارے میں تم مکمل معلومات رکھتے ہو میں از خود کسی جگہ کو با آسانی نہیں ڈھونڈ سکتا۔ جہاں تک رفتار کی بات ہے تو کائنات میں روشنی تیز ترین شے ہے یہ ایک لاکھ ستاسی ہزار میل کی حیران کن رفتار کے ساتھ سفر کرتی ہے۔ اس رفتار کے ساتھ روشنی ایک سیکنڈ میں دنیا کے چھ بار چکر لگا سکتی ہے اور شانی میں روشنی سے زیادہ تیز رفتاری سے کام کرسکتا ہوں۔''

''ویری گڈ۔ اور تم روشن نواز؟''

''شانی! میں تمہیں سنگلاخ راستوں پر چلا سکتا ہوں۔ سمندروں کی تہوں میں اتار سکتا ہوں اور پہاڑوں کی بلندیوں پر چڑھا سکتا ہوں۔ میں اتنا سخت جان ہوں کہ موت کے منہ میں جا کر تمہیں موت سے بچا سکتا ہوں۔'' روشن نواز کے بعد عاصم نواز نے مختصراً کہا۔

''شانی! اس سفر میں' میں تمہیں غلط اور صحیح کی تمیز کروا سکتا ہوں۔ جو بحیثیت مسلمان تمہارے لیے از حد ضروری ہے۔''

''میرے رفیقو! تم تینوں نے میرے غم اور اداسی کو تھام لیا ہے۔ مجھے ان باتوں سے خوشی اور نیا حوصلہ ملا ہے۔ ہم نواز تم نے کہا ہے کہ جگہ کا محل وقوع بتایا جائے تو تمہارا وہاں جانا ممکن ہے۔''

''ہاں شانی۔''

''دسکس روڈ پر ایک بہت بڑا میری انٹرنیٹ کیفے ہے۔ اس کے مالک کا نام مہران ہے۔ مجھے مہران کو اغواء کروانا ہے تم پتہ کرو مہران اس وقت کہاں ہے۔'' شانی نے کہتے ہوئے مہران کا حلیہ بیان کیا۔

شانی کو ہم نواز نے چند لمحوں میں بتادیا کہ مہران اس وقت نیٹ کیفے میں موجود ہے۔ شانی یہ سنتے ہی موبائل

پر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ سعد سکس روڈ پر میری کیفے کا مالک مہران ظفر اب سے ایک گھنٹہ بعد گھر کے لیے روانہ ہوگا۔

"اسے راستے میں اغواء کرلو۔ اغواء کے دو تین گھنٹوں بعد اس کے گھر کال کر کے ایک کروڑ کا تاوان طلب کرنا تا کہ یہ واردات اغواء برائے تاوان میں چلی جائے۔"

"ٹھیک ہے شانی' ایسا ہی ہوگا۔"

"کام دھیان سے کرنا۔ مہران ظفر کے بارے میں اطلاعات ہیں کہ وہ انٹرنیٹ کیفے کی آڑ میں پراسرار سرگرمیوں میں ملوث ہے۔ میں سمجھ گیا شانی بھائی۔ آپ بے فکر رہیں۔ انشاءاللہ جب آپ اسے ملیں گے وہ اپنی اصلیت فرفر بتائے گا۔" سعد کا جواب سننے کے بعد شانی نے رابطہ کاٹ دیا۔ چند ساعتیں سوچنے کے بعد بروج کا نمبر ڈائل کیا۔ بروج علیحدہ فلیٹ میں رہتی تھی۔

"کیا کر رہی ہو بروج؟" رابطہ ملتے ہی شانی نے پوچھا۔

"مجھے کیا کرنا ہے شانی جب سامنے ہوتے ہو تو تمہیں دیکھتی رہتی ہوں اور جب نہیں ہوتے ہو تو سوچتی رہتی ہوں۔"

بروج کا محبت بھرا لہجہ سن کر شانی کے اداس چہرے پر رونق دوڑ گئی تھی۔

"اس کا مطلب ہے محبت محبوب کو دیکھنے اور سوچنے تک محدود ہے۔" شانی کا موڈ یک دم خوشگوار ہوگیا تھا۔

"میں محبت کو محدود نہیں لامحدود سمجھتی ہوں شانی۔"

"مگر مجھے تمہاری محبت وصال میں دیکھنے اور مذاق میں سوچنے تک سمٹی ہوئی لگتی ہے۔" شانی کا بروج کو چھیڑنے کا مکمل موڈ بن چکا تھا۔

"دیکھنے اور سوچنے کو تم محدود نہیں کہہ سکتے شانی۔ محبوب کو تکتے رہنا محدود ہوسکتا ہے مگر سوچنا کہاں محدود ہے۔ سوچیں حدیں نہیں رکھتی۔" بروج کے جواب پر شانی کو خوشی بھی ہوئی تھی اور حیرانی بھی وہ بروج کو زیادہ بولنے کا موقع دینے کے لیے خاموش رہا۔ بروج کی آواز آئی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"سوچ رہا ہوں دو پیار کرنے والے دل میں ہی کیوں خوش ہوتے ہیں۔"

"اس لیے کہ عشق و محبت کی یہ بھی ایک خوبی ہے کہ یہ وصال کا سبب بنتے ہیں۔ تنہائی کو دور کرتے ہیں اور قربتوں کو جنم دیتے ہیں کیونکہ عشق کی منزل بہرحال وصال ہی ہے۔"

"وصال کی خواہشیں دل میں پال کر عشق کرنا خود غرضی کے زمرے میں آتا ہے۔"

"خود غرضی نہیں شانی' یہ عشق کا حق ہے۔ خود غرضی وہ ہے جب بندہ خود سے عشق کرے۔"

"خود سے عشق کرنے والا کبھی دوسرے بندے سے پیار نہیں کرسکتا بروج۔ کیا اللہ سے محبت کرنے کے لیے کسی چہرے سے محبت کرنا ضروری ہے۔ شانی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"یعنی عشق حقیقی کے لیے عشق مجازی ضروری ہے۔"

بروج نے پوچھا تو شانی بولا۔

"ہاں میرا یہی مقصد ہے۔"

"عشق حقیقی کی بات مت کرو شانی' بات عشق حقیقی پر آجائے تو یہاں مولوی اور صوفیاء بھی بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔"

"وہ کیسے......؟" شانی کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ وہ بروج کے پاورفل جواب پر حیران ہورہا تھا۔

"مولوی کہتا ہے خدا بہت بڑا ہے اور وہ کائنات کے اوپر آسمانوں میں کہیں رہ کر اسے کنٹرول کرتا ہے اور حکم صادر فرماتا ہے۔ صوفی کہتا ہے ربّ دل کے اندر رہتا ہے کائنات اور خدا دونوں دل میں زندہ رہتے ہیں۔" بروج نے اس بار بھی شانی کو محو حیرت کردیا تھا۔ وہ ابھی کچھ بول ہی رہا تھا کہ بروج بولی۔

"ایک بات پوچھوں۔ اللہ کی اطاعت اس کے خوف کی وجہ سے کرنی چاہیے یا اس کی محبت کی وجہ سے؟"

"دونوں کی وجہ سے۔ اللہ تعالیٰ سے خوف اور ڈر ہونا چاہیے اس لیے کہ وہ ہمارا خالق و مالک ہے وہ سزا و جزا پر قادر

ہے اور اس سے محبت ہونی چاہیے کہ وہ غفور اور رحیم ہے اور معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔"

"مجھے تمہارے جواب سے اختلاف ہے۔ خوف اور ڈر جابر اور ظالم سے کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو کریم، رحیم ہے وہ انسان کو اس کی ماں سے ستر گناہ زیادہ محبت کرتا ہے پھر......" بروج چند لمحے رکی تو شانی نے ان پڑھ بروج کے سامنے خود کو بے بس پایا۔ جو بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"تم کہتے ہو وہ بخشنے والا اور معاف کرنے والا ہے۔ اس لیے اس کی اطاعت کرنی چاہیے جبکہ ایک گنہگار کو گناہ سے روکنے کی تلقین کرو تو وہ کہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہت رحیم و کریم ہے خود ہی بخش دے گا۔"

"بروج! مجھے تو اس وقت ایک ہی سوچ کھائے جا رہی ہے کہ کیا تم وہی گوریا بستی کی ان پڑھ بروج ہو؟"

"نہیں شانی! میں گوریا بستی والی بروج نہیں ہوں۔ وہاں میں سہیلیوں کے ساتھ کھیل کود میں مگن رہتی تھی اور بابا کو کام کرتے دیکھتی تھی جبکہ اب میں شانی کے ساتھ رہتی ہوں۔ اس سے سیکھتی ہوں اور اس سے محبت کرتی ہوں......" بروج سانس لینے کے لیے رکی تو شانی جھٹ سے بولا۔

"اور اس سے محبت سمیٹتی ہو۔"

شانی کے انداز پر بروج کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پائیل کی طرح چھن چھناتی ہنسی شانی کے کانوں میں رس گھول گئی تھی۔

"بروج! تمہاری محبت بھری باتوں میں، میں بھول ہی گیا تھا کہ تمہیں فون کرنے کا مقصد کیا ہے۔"

"اب یاد آیا کیا؟"

"ہاں ایک نمبر نوٹ کرو۔"

"ایک منٹ، بولو شانی!......" شانی نمبر نوٹ کروانے کے بعد بولا۔

"اس نمبر پر جو بھی بولے لڑکا یا لڑکی اس سے تمہیں دوستی گانٹھنی ہے۔"

"میں سمجھی نہیں شانی؟"

"یہ نمبر نت نئے دوست بنایئے کے اشتہار سے لیا گیا ہے۔ عین ممکن ہے کال لڑکی ریسیو کرے اس سے تم نے حسب موقع بات کرنی ہے۔ مجھے یقین ہے وہ خود ہی تمہیں کسی لڑکے سے بات کرا دے گی۔ یا پھر رابطہ نمبر دیدے گی۔ بہر حال تم اپنے مزاج کے مطابق انہیں ڈیل کرو اور مجھے بتاؤ۔"

"ٹھیک ہے بتا دوں گی۔ ویسے اس وقت تم کیا کر رہے ہو؟" بروج کا لہجہ ایک بار پھر رومانٹک ہو گیا تھا۔ شانی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ دانستہ انجان بنتے ہوئے بولا۔

"کیوں......؟"

"ملو گے نہیں؟"

شانی کے بولنے سے بیشتر روشن نواز بولا۔

"مل لو شانی کیوں بیچاری کو تڑپا رہے ہو۔" شانی روشن نواز کا مدعا خوب سمجھتا تھا۔ وہ بروج سے بولا۔

"ملوں گا نا تم سے ملے بنا رہ سکتا ہوں کیا؟"

"کیا آج کا ڈنر اکٹھا کریں؟"

"آج نہیں بروج، بہت بزی ہوں۔ شام کو طارق کے پاس بھی جانا ہے بیچارہ اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ کل کا پروگرام رکھ لو۔"

"کل......" بروج کی طویل سانس کے ساتھ آواز سنائی دی۔ لہجے میں مایوسی در آئی تھی۔ جیسے محسوس کرتے ہوئے شانی بولا۔

"سوسوری بروج، آج بہت کام ہے۔ مجھے آج ہی اپنا ہیپاٹائٹس سی کا ٹیسٹ بھی کروانا ہے۔"

"اوہ! کیا تم بیمار ہو؟ بروج بری طرح چونک پڑی تھی۔

"ڈاکٹر نے بتایا ہے...... یا خود علامات محسوس کر رہے ہو۔" بروج ایک ہی سانس میں بول رہی تھی۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" شانی نے تسلی آمیز لہجے میں جواباً کہا۔

''یہ میرے مشن کا حصہ ہے۔''

''تم کیا کرتے پھر رہے ہو۔ مجھے بھی کچھ پتہ چلے اور اس آدمی کا کیا ہوا؟ جس کی ہم لاش اٹھالائے تھے۔''

''وہ سرجی کی کسٹڈی میں دے دیا تھا۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں اس سے حاصل کی گئی معلومات کی روشنی میں کر رہا ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے ہم مکمل طور پر ناکام نہیں ہوئے تھے۔''

''ہاں بالکل۔ بس افسوس اس بات کا ہے کہ حافظ قمر کی شہادت کے باوجود وہ ہدف حاصل نہیں کر سکے جس کی توقع تھی۔''

''اوکے بروج! پھر کل ملتے ہیں' انشاءاللہ۔''



شام تک شانی کو حسب منشا خبریں سننے کو ملی تھی۔ سرکاری سول اسپتال میں ہیپاٹائٹس سی کا ٹیسٹ کرواتے وقت اس نے بڑی ہوشیاری سے وہ سرنج جس سے اس کا خون نکالا گیا تھا وہ کوٹ کے اندرونی جیب میں منتقل کر لی تھی۔ ساتھ ہی چند دوسری پیک سرنجیں اور دو چھوٹی شیشیاں جن میں خون محفوظ کیا جاتا ہے وہ بھی اس کی جیب میں جا چکی تھی۔ سعد کی طرف سے بھی اسے تسلی بخش خبر ملی تھی۔ مہران سے خود اسے ملنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ وہ عام سا بندہ تھا۔ تشدد کے پہلے مرحلے میں ہی چت ہو گیا۔ بروج نے شانی کے دیئے گئے نمبر پر کال کی تو اسے حسب توقع لڑکی ملی تھی۔ جس نے چند منٹوں میں تکلف کی ساری حدیں پار کر لی تھی۔ اسے فوراً ایک لڑکے سے ملوا دیا لڑکے کی تعریف میں اس کا کہنا تھا حسن اور دولت دونوں میں یکتا ہے، ملو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔ بروج نے مسکراتے ہوئے شکریہ ادا کرنا چاہا تو وہ بولی شکریہ ادا کرنے کی بجائے میرا ایک کام کر دو۔ کسی ہینڈسم خوبصورت لڑکے کا نمبر دے دو۔ بروج نے ہوشیاری دکھاتے ہوئے اسے شمس کا نمبر دے دیا۔ رابطہ کٹتے ہی شمس کو پوری تفصیل بھی سمجھا دی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ جس لڑکے سے بروج کی بات ہوئی تھی اس نے بڑی فراخدلی سے بروج کو اگلے دن لنچ پر ریسٹورنٹ میں مدعو کر دیا تھا۔ بروج نے تھوڑی سی حیل حجت کے بعد یہ آفر قبول کر لی تھی۔ شمس کو جوس کارنر پر ملنے کی آفر ہوئی تھی۔ اس نے بھی انکار نہیں کیا تھا۔ شانی نے دونوں کو ضروری ہدایات دے کر ان کی نگرانی میں بندے لگا دیئے تھے۔ بروج کو پرتکلف لنچ کھلانے والے میزبان کا نام نوید پرویز تھا۔ جو مردانہ وجاہت میں واقعی یکتا تھا کھانے کے بعد اس نے بروج کو لانگ ڈرائیو پر ملنے کو آمادہ کرنا چاہا تھا مگر بروج نے معذرت کر لی تھی۔ البتہ دوسرے دن جوس کارنر پر ملنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ یہ وہی جوس کارنر تھا جس پر شمس کو بلایا گیا تھا۔ شمس کی میزبان کا نام سمیرا تھا۔ وہ بھی حسن کی دیوی تھی۔ سمیرا اور نوید کا تعاقب کیا گیا تو شانی کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ دونوں کی رہائش ایک اپارٹمنٹ کے ایک ہی فلیٹ میں ہے۔ شانی نے سوچا دونوں ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں مگر جب ان سے تفتیش کی گئی تو یہ زنجیر لمبی ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کیونکہ مہران نے جس شخص کا نام لیا تھا وہی نام ان دونوں نے بھی بتایا تھا۔ جبکہ ریسٹورنٹ اور جوس کارنر کا مالک بھی ایک ہی تھا اور وہ بھی اس کام میں ملوث تھا۔ شانی کے لیے ضروری ہو گیا تھا ان حضرات میں سے ایک کو اٹھوا لیا جائے اور دوسرے کی خفیہ نگرانی کی جائے۔ شانی کو ان سے اہم کلیو ملنے کی توقع تھی۔

(باقی ان شاءاللہ آئندہ ماہ)



نقوشِ عبرت

ریاض حسین شاہد

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر
لہو پکارے گا آستیں کا

کچھ جرم ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی سراغ نہیں ملتا، مجرم اپنے طور پر مطمئن رہتا ہے کہ وہ قانون کی گرفت سے بچ گیا ہے لیکن بعض اوقات ان کی آستین پر لگا لہو آسیب بن کر ان کا سکھ چین چھین لیتا ہے۔
ایک خاندان کا احوال، مظلوموں کا خون ان کے لیے آسیب بن گیا تھا۔

جون کی جھلسا دینے والی گرمی عروج پر تھی۔ دن بھر سورج آگ برساتا اور رات حبس بھری گھٹن لیے شب بھر بستر پر کروٹیں بدلتے بے چین جسموں کو پسینے میں شرابور رکھتی۔ وہ شب بھی گرمی کی شدت کے باعث بہت بے چین کر دینے والی تھی۔

بستی چیتے والا کڑا نہر کے اس پار بارڈر ایریا میں واقع تھی۔ جس کے سردار فتح علی خاں کی حویلی پوری بستی میں بلند اور نمایاں مقام رکھتی تھی حویلی کے ساتھ اس کا ڈیرہ تھا۔ ڈیرے کے ساتھ بھینسوں اور گھوڑوں کا اصطبل بنا تھا جس میں کئی قیمتی گھوڑے اور بھینسیں موجود رہتیں نوکروں کی ایک فوج ان کی خدمت کے لیے وقف تھیں۔ اس بستی سے بارڈر لائن کوئی دو کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع تھی اور یہ سارا علاقہ چٹیل میدان تھا۔ زمین کلاٹھی اور پانی کڑوا تھا۔ اس لیے پینے کا پانی ہاکڑا نہر سے آنے والی ایک برانچ ندی سے حاصل کیا جاتا۔ بستی کے قریب بڑا سا جوہڑ تھا۔ جس کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ ایک حصہ جانوروں کو پانی پلانے کپڑے وغیرہ دھونے کے لیے وقف تھا اور دوسرا حصہ صرف پینے کے لیے استعمال ہوتا۔ بارڈر کے پار انڈین چوکی یہاں سے صاف دکھائی دیتی اور پاکستانی چوکی اس بستی سے مشرق کی طرف ایک کلومیٹر دور موجود تھی۔ اس بستی کو شہر سے ملانے والی سڑک کچی تھی جس پر اس دور میں گھڑ سوار اونٹ اور خچروں پر سفر کرنے والے لوگ آیا کرتے تھے۔

پاکستانی چوکی اور بستی چیتے والا کے شمال مشرقی حصے میں پرانا انگریز کے دور کے ریسٹ ہاؤس موجود تھے جو نہر کے کناروں پر چھ چھ میل کے بعد تعمیر کیے گئے تھے۔ ریسٹ ہاؤس سے جنوبی کونے پر قبرستان تھا جہاں بستی چیتے والا اور قریبی بستیوں کے لوگ اپنے مردے دفن کرتے تھے۔ قبرستان میں چند خاردار جھاڑیاں تھیں جبکہ ریسٹ ہاؤس کے اردگرد سبز درختوں کا جھنڈ موجود تھا۔ یہاں اب بھی محکمہ انہار کا دفتر واقع تھا۔ جس میں ضلع دار، پٹواری اور سگنلر کے دفاتر قائم تھے۔ بستی کے سردار فتح علی نے ایک خان دان میں شادی کی تھی جس سے تین بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئے اور پھر دوسری شادی اس وقت کی جب وہ نیل گائے کا شکار کھیلتے ہوئے بارڈر پار کے علاقے میں چلا گیا۔ اس دور میں نا تو بارڈر پر خاردار تاریں بچھی تھیں اور نا ہی بارڈر پار جانے پر اتنی سختی تھی۔

مقامی لوگ اور دونوں سرحدوں کے قریبی علاقوں کے وڈیروں کا آپس میں رابطہ رہتا۔ فتح خان اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھوڑوں پر نیل گائے کا تعاقب کرتے ہوئے بارڈر پار سردار مکھن سنگھ کے گاؤں چرنام سنگھ جا پہنچا اور نیل گائے کو مار گرایا۔ مگر جب وہ نیل گائے کو ذبح کر کے اٹھانے لگے تو مکھن سنگھ کے آدمی آ گئے اور انہوں نے نیل گائے دینے سے انکار کر دیا۔ فتح علی دانا آدمی تھا اس نے دیکھا کہ زبردستی کرنے سے معاملہ بگڑ جائے گا۔ لہٰذا اس نے شکار

چھوڑ دیا اور مکھن سنگھ کے آدمیوں کو پیغام دیا کہ اپنے سردار مکھن سنگھ کو میرا اسلام کہنا اور بتانا کہ بارڈر پار کی بستی چیتے والا کا سردار فتح علی خان اپنے شکار کے تعاقب میں آیا تھا اور تمہارے آدمیوں سے خون خرابہ کرنے کی بجائے خالی ہاتھ واپس چلا گیا ہے۔ اگر آپ کا کبھی ہمارے علاقے میں آنا ہو تو فتح علی خان کی حویلی کے دروازے تمہیں کھلے ملیں گے اور ہم آپ کی مہمان نوازی کر کے بہت خوشی محسوس کریں گے فتح علی خان یہ پیغام چھوڑ کر واپس لوٹ گیا۔

شام کو اس وقت وہ حیرت زدہ رہ گیا جب مکھن سنگھ کے آدمی فتح علی خان کی شکار کی ہوئی نیل گائے کا گوشت لیے اس کے ڈیرے پر آ پہنچے اور مکھن سنگھ کا پیغام دیتے ہوئے فتح علی سے کہا کہ مجھے بے حد دکھ پہنچا ہے کہ آپ میرے علاقے میں آئے اور مجھ سے ملے بغیر واپس چلے گئے آپ کو چاہیے تھا کہ میرے پاس آتے پھر اگر میں آپ کی مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا رکھتا تو پھر گلہ کرتے میرے جن آدمیوں نے آپ کے ساتھ بدتمیزی اور ناروا سلوک کیا اس کے لیے میں آپ سے معذرت خواہ ہوں اور ان ہی آدمیوں کے ہاتھوں آپ کی شکار ہوئی نیل گائے واپس بھیج رہا ہوں۔ اب ان کے ساتھ آپ کا جو دل چاہے سلوک کریں اور میری طرف سے کھانے کی دعوت قبول کرتے ہوئے اسی ہفتے میرے پاس تشریف لائیے اگر آپ نے انکار کر دیا تو میں سمجھوں گا کہ آپ نے ہمیں معاف نہیں کیا۔ مکھن سنگھ کا پیغام سن کر فتح علی خان بہت متاثر ہوا اور نا صرف اس کی دعوت کو قبول کر کے اپنے آنے کا سندیسہ دیا بلکہ اس کے آدمیوں کی خوب آؤ بھگت کر کے انہیں عزت سے واپس رخصت کیا۔ یوں فتح علی کی مکھن سنگھ سے دوستی ہوگئی۔ پرمتی نامی ایک عورت مکھن سنگھ کی حویلی میں رہتی تھی جو ایک دوسری بستی کے سردار کی بہو تھی اس کا شوہر قتل ہو چکا تھا اور اس کا دیور اس سے اپنے بھائی کی جائیداد حاصل کرنے کے لیے اسے قتل کرنا چاہتا تھا۔ تب پرمتی وہاں سے رات کے اندھیرے میں فرار ہو کر مکھن سنگھ کے پاس پناہ گزین ہو کر رہ گئی تھی کوئی چھ ماہ بعد یہ راز افشا ہو گیا کہ پرمتی تو مکھن سنگھ کے پاس ہے۔ لہٰذا اس کی بازیابی کے لیے بھرپور کوشش کی گئی مگر پرمتی نے واپس جانے سے انکار کر دیا اور اپنے حصے کی ساری جائیداد اپنے بھائی کے نام منتقل کر دی۔ وہ ایک دراز قد کی بہت خوب صورت عورت تھی۔ فتح علی خان نے اسے پہلی نظر میں دیکھا تو پسند کر لیا اور جب اسے اس کی ساری روداد سنائی گئی تو اسے پرمتی پر بہت ترس بھی آیا اور محبت بھی۔ تب اس نے مکھن سنگھ سے پرمتی کو مانگ لیا۔ مکھن سنگھ نے پرمتی سے بات کی تو کچھ پس و پیش کے بعد وہ نکاح کرنے پر آمادہ ہوگئی یوں اسے مسلمان کر کے فتح علی اپنی منکوحہ بنا کر اپنی حویلی میں لے آیا۔ فتح علی کی پہلی بیوی جس کے چار بچے تھے اپنی سوتن سے پہلے دن سے ہی نفرت کا اظہار کرنے لگی مگر چونکہ فتح علی پرمتی جس کا نام بدل کر زہرہ رکھ دیا گیا تھا سے بہت محبت کرنے لگا۔ یہ بات اس کی پہلی بیوی سکینہ بی بی کو بہت ناگوار گزرتی تھی۔ مگر وہ اپنی نفرت کا اظہار برملا نہیں کر سکتی تھی۔ ایک سال بعد زہرہ کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی۔ فتح خان علی کی محبت زہرہ اور اس سے پیدا ہونے والی بیٹی کی طرف اور زیادہ بڑھ گئی۔ فتح علی کی حویلی میں نفرت اور محبت کی سرد جنگ لڑی جا رہی تھی۔ سکینہ بی بی نے اپنی اولاد کے دل میں باپ اور زہرہ کے خلاف نفرت کا بیج بونا شروع کر دیا تھا۔ اس لیے اس کے بچے اپنے باپ سے دور دور رہنے لگے بڑا بیٹا جبار خاں اپنی سوتیلی ماں کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا اور باپ سے تلخ لہجے میں بات کرتا یہ بات فتح علی بھی محسوس کر چکا تھا کہ میری بیوی اور بچے زہرہ کے ساتھ ساتھ میرے لیے بھی اپنے دل میں نفرت رکھتے ہیں۔ شاید اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے فتح علی نے ایک مربع زرعی زمین اپنی زوجہ زہرہ کے نام کر دی۔ جس کا پانچ سال بعد انکشاف ہوا تو جبار خان

زہریلے ناگ کی طرح پھن پھیلا کر باپ کے سامنے اکڑ کر کھڑا ہوگیا اور گستاخانہ لہجے میں کہا کہ تم نے ہمارا حق مار کر اپنی بیوی کو دیا ہے اگر اس کی زندگی سلامت چاہتے ہو تو اس سے زمین ہمیں واپس دلا دو۔

فتح علی اپنے جوان بیٹے کے تیور دیکھ کر پریشان ہوگیا اور سمجھانے کے انداز میں بیٹے کو تحمل سے پاس بٹھایا اور بولے۔

''وہ میری بیوی ہے جس طرح میری جائیداد پر تمہارا اور تمہاری ماں کا حق ہے اسی طرح میری جائیداد میں زہرہ اور میری بیٹی بھی حقدار ہے۔ میں نے ان ماں بیٹی کے لیے ایک مربع زمین دی ہے جبکہ آپ کے پاس چار مربع زمین ہے پھر بھی آپ راضی نہیں ہو رہے۔

باپ کی بات سن کر جبار خان اور سیخ پا ہوگیا کہ ساری جائیداد پر ہمارا حق ہے میری ماں تمہاری خاندانی بیوی تھی۔ پھر تم نے کیوں ایک چلتی پھرتی عورت جو غیر مذہب تھی کو اپنی زوجہ بنا کر ہمارے حق پر ڈاکہ ڈالا۔ بیٹے کے منہ سے ایسی بات سن کر فتح علی کا غصہ بھی بھڑک اٹھا۔

''جبار خاں، وہ بھی تمہاری ماں ہے اور اپنی ماں کے بارے میں ایسی بات کرتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے میں اس گھر کا حاکم ہوں میں چاہوں تو تمہیں عاق کردوں اور تمہاری ماں کو طلاق دے کر حویلی سے باہر نکال دوں خبردار جو اب تمہاری زبان سے زہرہ کے متعلق کوئی نازیبا بات کا اظہار بھی ہوا تو......'' فتح علی نے بیٹے کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ وہ پیچ و تاب کھاتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا زہرہ یہ تمام گفتگو سن چکی تھی اس نے بڑے رقت بھرے لہجے میں اپنے مجازی خدا کے سامنے ہاتھ باندھ کر کہا۔

یہ دیکھو میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں تمہارے چرن تھام کر تم سے بنتی کرتی ہوں خدا کے لیے مجھے ابھی تحصیلدار کے پاس لے چلیے۔ میں اپنے حصے کی

ساری زمین جبار خان کے نام کرتی ہوں اسی جائیداد کی خاطر تو میں اپنے سسرال کی حویلی سے نکلی تھی۔ وہی جائیداد پھر میرے مقدر سے ٹکرانے میرے سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔ میں آپ کے گھر کا شیرازہ نہیں بکھیرنا چاہتی۔ آپ ہیں تو مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں میں نہیں چاہتی میری وجہ سے آپ اپنی اولاد اور بیوی سے جنگ کریں۔ مجھے اور میری بیٹی کو سر چھپانے کے لیے جگہ دی ہمارے لیے یہی کافی ہے۔ زہرہ کی باتیں سن کر فتح علی کو اس پر ڈھیروں پیار آنے لگا۔

میں ایسا نہیں کر سکتا زہرہ ہرگز نہیں کہ تمہیں جائیداد سے محروم کردوں اور اپنی اولاد کی بات مان لوں۔ البتہ اب تمہارا حویلی میں رہنا خطرناک ہوگا۔ میں شہر میں گھر ڈھونڈتا ہوں تم بیٹی کے ساتھ وہیں رہو گی اور جائیداد پر تمہارا حق ہے۔ میں نے ان کے ساتھ کوئی حق تلفی نہیں کی آپ پریشان نہ ہوں میں جلد ہی اس ساری صورت حال کو سنبھال لوں گا فتح علی نے زہرہ کا شانہ تھپتھپا کر اسے ڈھارس دی۔

☆......❀❀......☆

جون کی وہ سلگتی رات بہت بے رحم تھی۔ فتح علی اس رات بہاولپور گیا ہوا تھا جبار خان نے رات گئے زہرہ کے گلے میں دوپٹے کا پھندا ڈال کر موت کے گھاٹ اتارا۔ پھر اس کی معصوم بچی بانو کا گلا دبا کر اسے ابدی نیند سلا دیا پٹ سن کی بوری میں دونوں لاشیں بند کر کے اپنے گھوڑے پر لادا اور بستی چیتے والا کی خوابیدہ گلیوں کو گھوڑے کی ٹاپوں سے بیدار کرتا ریسٹ ہاؤس کی طرف چلا گیا۔ صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے زہرہ اور اس کی بیٹی گڑھے میں دفن ہو گئے اور اوپر مٹی برابر کر کے اس کھیت میں نہر کا پانی چھوڑ دیا گیا۔ اس سارے کام میں جبار خان کے دو مزارعوں نے حصہ لیا تھا جنہیں زبان بندی کا حکم دیا گیا تھا اور کسی کو کچھ بتانے کے جرم میں ان کا انجام بھی اسی طرح کرنے کا عندیہ دیا گیا تھا۔

زہرہ اور اس کی بیٹی کی پراسرار گمشدگی فتح علی کے لیے معمہ بن گئی اسے بتایا گیا کہ تمہاری بیوی اپنی بیٹی کو لے کر فرار ہوگئی ہے فتح علی کو بھی شک ہوا کہ ایسا ممکن ہے ہوسکتا ہے زہرہ نے سوچا ہو کہ میں اس کی بات مان کر زمین جبار خان کو واپس نہیں دے رہا اور جبار خان اسے قتل کرنے کی دھمکی دے چکا ہے اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے زہرہ نے یہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کرلیا ہو۔ مگر وہ جبار خان کو بھی مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا بارڈر کے اس پار اس نے مکھن سنگھ کو بھی زہرہ کی پراسرار گمشدگی کی اطلاع کردی۔ مگر زہرہ ادھر بھی نہیں پہنچ سکی تھی فتح علی نے ظہرہ کی کمی کو شدت سے محسوس کیا اسے دن رات ایک پل چین نہیں تھا۔ پورے گاؤں میں ہر طرح سے اس نے کھوج لگانے کی کوشش کر کے دیکھ لی مگر کہیں سے کوئی حوصلہ افزا بات سامنے نہ آ سکی۔ اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ ظہرہ کو قتل کر دیا گیا ہے اور یہ کام جبار خان کے سوا اور کوئی نہیں کرسکتا اس نے فیصلہ کن لہجے میں اپنے بیٹے سے ایک بار پھر پوچھ لینا ضروری سمجھا کہ میں زہرہ کی پراسرار گمشدگی اور اس کی بازیابی کے لیے قانون کے دروازے پر دستک دینے لگا ہوں اور مشکوک افراد میں سرفہرست تمہارا نام ہوگا۔

اس لیے بہتر ہے آپ بھی مجھے صحیح صورت حال سے آگاہ کردو ظہرہ کے فرار کی بات قطعی بے بنیاد ہے میں اس کی پوری چھان بین کر چکا ہوں۔ اسے قتل کیا گیا ہے اور یہ کام کرنے کا فیصلہ تمہارا تھا۔

"فتح خان یہ آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔ میں نے دھمکی ضرور دی تھی اور ممکن تھا کہ یہ کام سرانجام بھی دے دیتا مگر زہرہ تو پہلے ہی گھر سے راہ فرار اختیار کر گئی۔ اب بھی اگر آپ نے مجھ پر اس کے اغوا یا قتل کا کیس درج کرایا تو زمانے میں جہاں میری رسوائی ہوگی وہاں آپ کی عزت بھی خاک میں مل جائے گی وہ چلی گئی بات ختم ہوگئی بس......"

''بات رسوائی کی نہیں جبار خان، بات میری عزت اور غیرت کی ہے یہ آنے والا وقت فیصلہ کرے گا کہ اصل واقعات کی حقیقت کیا ہے فتح خان نے کہا اور اگلے دن نزدیکی پولیس چوکی میں زہرہ اور معصوم بچی کی پراسرار گمشدگی کی ایف آئی آر درج کرادی گئی جبار خان کا نام مشکوک افراد میں سرفہرست لکھا گیا۔

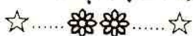
اسی روز پولیس نے جبار خان کو گرفتار کرلیا اور تفتیش میں جبار خان صاف انکاری ہوگیا کہ اس گمشدگی میں اس کا کوئی تعلق نہیں ہے کئی دن بعد گواہ نہ ملنے کی صورت میں جبار خان کو رہا کردیا گیا۔ فتح علی بیمار ہوگیا چند دنوں میں ہی وہ برسوں کا مریض دکھائی دینے لگا۔ پوری بستی کے لوگ چہ میگوئیاں کررہے تھے کہ زہرہ کی گمشدگی میں جبار خان کا پورا پورا ہاتھ ہے مگر اس بات کی گواہی دینے کے لیے کوئی بھی تیار نہ تھا۔ جبار خان کا سب پر رعب اور دبدبہ ہی اس قدر تھا کہ اس کے خلاف کوئی زبان حق بات کہنے کی جرأت نہ کرتی تھی۔

ظہرہ کی لاش کو ٹھکانے لگانے والے دونوں مزاروں کو جبار خان نے

دو انسانوں کا قاتل جبار خان جب جیل سے گھر پہنچا تو اس نے اپنے بیمار والد کی حالت دیکھ کر دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا اور تیسرے ہی دن دوا کے بہانے باپ کو جو گولی دی گئی اس نے فتح علی خان کو بھی ابدی نیند سلا دیا۔ فتح علی کی موت پوری بستی بلکہ پورے علاقے کے لیے ایک سانحہ تھا بہت بڑا جنازہ ہوا اور ایک بکھری ہوئی داستان کو خاک کے ڈھیر میں دفن کردیا گیا جبار خان نے باپ کی موت کا بہت سوگ منایا جنازے کو کندھا دیتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رویا مگر بہت سے چہرے جان چکے تھے کہ یہ مگرمچھ کے آنسو ہیں اصل حقیقت کچھ اور ہے۔

باپ کی رسم چہلم کے بعد جبار خان نے اپنی تمام جائیداد کا وراثتی انتقال کرایا اور اپنی بہن کا حصہ بھی اپنے نام درج کرواکر بہن کا انگوٹھا لگوالیا۔ خیر چند دن بعد اس نے اپنی سواری کے لیے جیپ خریدی اور جاگیر کا سارا نظام سنبھال لیا۔ زہرہ کے قتل کا واقعہ وقت کی اڑتی دھول میں گرد آلود تو ضرور ہوا مگر بستی بھر کے لوگوں کے دلوں سے محو نا ہوسکا۔

جبار خان نے باپ کی موت کے تین ماہ بعد ہی دوسرے گاؤں کی ایک غیر برادری سے اپنا اور اپنی بہن کا رشتہ وٹہ سٹہ کی صورت میں طے کر کے شادی کرلی۔ حالانکہ ان دونوں بہن بھائی کے رشتے ان کے باپ فتح علی کی بیوی سکینہ بی بی نے دل سے قبول کیے تھے اور نا ہی جبار خان نے پنو کا رشتہ سے دل سے قبول کیا تھا۔ رحمت علی نے آخری وقت تک کوشش کی تھی کہ خون کے یہ رشتے ہمیشہ کے لیے ختم نہ ہوجائیں۔ آپ غیروں میں ناجائیں مگر اس کی بات کو سختی سے رد کردیا گیا اور یوں فتح علی کے خاندان کا شیرازہ ہی بکھر گیا۔ جبار خان ہر معاملے میں اپنی من مانیاں کرتا چلا جارہا تھا اور ساری بستی کے لوگ دلی طور پر اس سے متنفر ہوتے جارہے تھے۔



ظالم کا ظلم جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو پھر خدا کی بے آواز لاٹھی حرکت میں آجاتی ہے جبار خان نے چند سالوں کے ہی اپنے اقتدار میں جہاں زہرہ اس کی بچی کا خون کیا اپنے باپ کو موت کی نیند سلایا اپنوں سے رشتے توڑے ایک مزارع کی بیٹی کی عزت کو پامال کیا کئی لوگوں پر تشدد کیے کام کرنے والوں کو بہت کم مزدوری دیتا۔ سب سے گالم گلوچ کے ساتھ پیش آتا زمانے بھر کے آوارہ اور شرابی دوستوں کے ساتھ دن رات محفلیں سجاتا۔ سب اس کے نام سے ہی خائف رہنے لگے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا غضب اس حویلی پر واقعات کی صورت میں وارد ہونے لگا پراسرار غیبی قوتوں نے سب سے پہلے سکینہ بی بی کو اپنے شکنجے میں لیا۔

وہ منگل کا دن تھا سکینہ بی بی نے صبح اپنی ملازمہ

سے بالوں میں مہندی لگوائی اور دوپہر کو غسل کر کے نیا سوٹ پہنا خوشبو لگائی ملازمہ نے ہی اس کی دراز زلفوں میں کنگھی کر کے اس میں پراندہ ڈالا۔

سکینہ بی بی کا حسن اب بھی پرکشش تھا دنداسہ کرنے اور تازہ مہندی لگانے سے وہ الھڑسی دوشیزہ دکھائی دیتی۔ دراصل وہ آج شام کو اپنے بھائی کے گھر اپنے بیٹے سلیم خان اور نور خان کا رشتہ لینے جا رہی تھی۔ اس لیے خوب سج دھج سے تیار ہوئی تھی وہ ذرا دیر سستانے کے لیے اپنے پلنگ پر دراز ہوئی۔ وہ جاگتی آنکھوں سے مستقبل کے حسین خواب دیکھ رہی تھی۔ دونوں کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں اور کنگن ذرا سی حرکت پر کھنک سے جاتے اچانک وہ یہ دیکھ کر چونک اٹھی کہ تین دراز قامت افراد اس کے سامنے جیسے زمین سے نکل کر کھڑے ہوگئے ہوں۔ دروازہ بند تھا کوئی آہٹ بھی نا ہوئی تھی سکینہ نے آنکھیں پھاڑ کر پوری توجہ سے انہیں دیکھا۔ پھر ان کی موجودگی کو یقینی پا کر اس نے چیخنا چاہا مگر وہ ایسا نہ کر سکی بلکہ وہ ان کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر سب کچھ دیکھتی بھی رہی محسوس بھی کرتی رہی مگر اس کی ہلکی سی سسکاری بھی لبوں سے نا پھسل سکی۔

اسے باقاعدہ برہنہ کیا گیا اور ان تینوں میں سے ایک نے اسے جنسی ہوس کا نشانہ بنایا سکینہ کو لگا جیسے اس کے سارے وجود کی قوت سمیٹ کر اس طرح نچوڑ لی گئی ہو۔ پھر تینوں اسی طرح پراسرار طور پر غائب ہوگئے۔ سکینہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں پڑی رہی۔ پھر اس نے اپنے حواس بحال کیے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ اپنے لباس میں موجود ہے حالانکہ اسے یاد تھا کہ اسے برہنہ کیا گیا تھا۔ وہ کمرے سے نکل کر واش روم کی طرف جانے لگی تو اسے پورے بدن میں درد اور بھرپور نقاہت کا سامنا کرنا پڑا وہ اس انوکھے اور قطعی غیر یقینی واقعہ پر حیران و پریشان تھی اب وہ کسی سے اس بات کا ذکر کرے بھی تو کیسے؟ وہ جان چکی تھی کہ یہ کوئی آسیبی مخلوق تھی کوئی جن اور بھوت تھا مگر جن انسانوں کے ساتھ ایسا بھی کر سکتے ہیں یہ بات اس کے لیے حیران کن اور عجیب تھی۔ یہ بات تو اس نے کئی بار سن رکھی تھی کہ جن عورتوں پر عاشق ہو جاتے ہیں ان عورتوں پر دورے پڑتے ہیں منہ سے جھاگ نکلتا ہے وہ چیختی اور چلاتی ہیں کسی کے قابو میں نہیں آتیں مگر ایسا تو کبھی نہیں سنا تھا کہ وہ پراسرار طور پر ظاہر ہوتے ہیں اور بیوی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ سکینہ نے نئے سرے سے غسل کیا وہ اتنی خوفزدہ بھی نا تھی اب چیخنا چلانا شروع کر دیتی مگر وہ فکر مند ضرور تھی کہ کہیں یہ واقعہ پھر سے تو نہیں دہرایا جائے گا۔ وہ اس بات پر بھی حیران تھی کہ اس گھر میں اس کی جواں سال خوب صورت بہو چندو بھی تو موجود ہے میں ایک پچاس برس کی ڈھلتی جوانی ہوں پھر یہ سب کچھ میرے ساتھ کیوں ہوا اس واقعہ نے اسے اس قدر متاثر کیا کہ وہ اگلے تین دن تک اپنے بھائی کے گھر نا جا سکی۔ چوتھے روز وہ ادھر جبار خان کی جیپ میں سوار ہو کر پہنچی رشتہ طے کیا مگر سکینہ اب وہ سکینہ نا رہی تھی ہر وقت کسی سوچ میں کھوئے رہنا رات کو ذرا سی آواز ابھرتی تو چونک اٹھتی بلکہ اس واقعہ کے بعد اس نے کمرے میں تنہا سونا ہی چھوڑ دیا کسی ملازمہ یا پھر بہو کو اپنے کمرے میں ساتھ رکھتی۔

مگر ایک ہفتے بعد پھر منگل کی رات کو جب وہ اپنی ملازمہ کے ساتھ کمرے میں سو رہی تھی شب کے نجانے کس پہر اسے بازو سے پکڑ کر جگایا گیا۔ وہ چونک اٹھی۔ وہی منظر نگاہوں کے سامنے تھا کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ اس نے ملازمہ کی طرف دیکھا جو بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے اسے جگانے کی کوشش کی مگر آواز گلے میں ہی دم توڑ گئی۔

اس کے ساتھ پھر وہی شیطانی کھیل کھیلا جانے لگا۔ سکینہ کو لگا جیسے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر دوڑ رہی ہے۔

اب سکینہ پریشان ہوگئی کہ اگر میں نے اب بھی سدباب نہ کیا تو ہر منگل کو یہ ناٹک رچایا جاتا رہے گا جو

مجھے جسمانی طور پر بہت کمزور کر رہا ہے۔ اس نے اپنے چھوٹے بیٹے سلیم خان سے بات کی کہ مجھے کسی عامل یا کسی اللہ والے بزرگ کے پاس لے چلو مجھے رات کو آسیب نظر آتے ہیں بیٹے نے ماں کی بات کو اتنی اہمیت نہ دی مگر چھوٹے بیٹے نور خان نے فوراً جبار خان سے بات کی کہ اماں کو آسیب رات کو پریشان کرتے ہیں۔ میں ان کو شہر کسی عامل کے پاس لے جانا چاہتا ہوں جبار خان نے بھائی کی بات سن کر پہلے تو کچھ حیرت کا اظہار کیا پھر خود ہی ماں سے تفصیل پوچھی ماں نے بتایا کہ پچھلے دو ہفتوں سے میں بہت پریشان ہوں ڈراؤنی چیزیں مجھے رات کو بیدار کرتی ہیں اور میں ڈر کے مارے سو نہیں سکتی۔

''یہ تمہارا وہم ہے اماں، ورنہ ایسا کچھ نہیں تم ڈاکٹر کے پاس جاؤ اور دوا وغیرہ لے آؤ۔'' جبار خان نے کہا اور اپنے بھائی نور خان کو اپنی گاڑی دے کر شہر ڈاکٹر کے پاس جانے کی اجازت دے دی۔ نور خان اپنی ماں کو لیے ڈرائیور کے ساتھ جیپ میں شہر پہنچا اور ایک معروف عامل کے گھر سکینہ کے بے حد اصرار پر جا اترے، عامل کے پاس بہت سے مرد اور عورتوں کی بھیڑ تھی بدرالدین ساٹھ سال کا تھا سر کے سارے بال سفید تھے گلے میں منکوں کی مالا اور ہاتھ میں لوہے کے کڑے پہنے ہوئے تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں اور آنکھوں سے عیاری نمایاں تھی۔ نور خان نے گلی میں ہی گاڑی رکوائی اور ڈرائیور کو اندر بھیجا کہ ہمارے مریض کو علیحدہ پردے میں بٹھا کر خصوصی توجہ سے دیکھا جائے۔ پھر جب بدرالدین کو پتا چلا کہ بستی چیتے والا کے سردار فتح علی کی بیوی علاج کے لیے لائی گئی ہیں تو وہ چونک اٹھا۔ فوراً علیحدہ کمرے میں سکینہ بی بی کو لایا گیا نور خان ماں کے ساتھ اندر پہنچا سکینہ بیگم نے سفید لٹھے کا بڑا سا برقع پہنا ہوا تھا کمرے میں پہنچ کر بھی اس نے خود کو پردے میں رکھا۔

بدرالدین عامل بہت خوش تھا کہ زمیندار کی بیگم آئی ہے اس سے مال اچھا ملے گا وہ اترانے کے انداز میں اندر پہنچا نور خان نے عامل کو بتانے کی کوشش کی کہ یہ میری ماں ہے اور پچھلے دو ہفتوں سے رات کو اسے آسیبی چیزیں پریشان کر رہی ہیں مگر بدرالدین نے سکینہ بی بی کو مخاطب کر کے کہا۔

''بی بی جی آپ خود اپنی زبانی بتائیں، آپ کو کیا دکھائی دیتا ہے وہ کیسے آپ کو ڈراتی ہیں۔'' سکینہ بی بی پریشان ہو گئیں کہ وہ عامل کو کیا بتائے شرمناک بات تھی اور جوان بیٹا پاس بیٹھا تھا وہ اسے باہر جانے کا بھی نہیں کہہ سکتی تھی اس کا چہرہ برقع کی قید میں تھا وہ بہت مضطرب ہو رہی تھی ایسے میں عامل نے پھر اس سے بولنے کو کہا تو وہ بری طرح گڑبڑا گئی پھر اس نے چپکے سے بیٹے کے کان میں سرگوشی کی۔

''نور بیٹا مجھے تم پانی لا دو۔'' نور خان فوراً اٹھا اور عامل سے پوچھا پینے کو پانی مل جائے گا۔

''ہاں، ہاں باہر برآمدے میں مٹکا رکھا ہے پیالہ بھی وہیں مل جائے گا۔'' نور خان فوراً باہر لپکا سکینہ بی بی نے موقع غنیمت جانا اور برقع کے پردے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جلدی سے عامل کو بتا دیا۔

''بابا جی وہ تین جن ہیں ہر منگل کی رات کو میرے پاس آتے ہیں ان میں سے ایک جو قامت میں بھی بڑا ہے میرے ساتھ......!'' وہ کہتے کہتے رک گئیں۔

''ہاں ہاں بولو۔'' بدرالدین نے سکینہ بی بی کے قریب سر جھکا کر تیزی سے پوچھا۔

''وہ...... میری عزت سے کھیلتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے جس سے مجھے بہت کمزوری ہو جاتی ہے۔'' سکینہ بی بی نے بمشکل اپنی بات مکمل کی۔ اسی لمحے نور خان پانی کا پیالہ لے کر اندر پہنچ گیا۔ سکینہ خاموش ہو گئی اور بدرالدین سوالیہ نگاہوں سے پردے میں چھپی سکینہ کی صورت دیکھنے کو بے تاب ہو گیا سکینہ نے برقع سے اپنا ہاتھ نکالا، نور خان سے پانی کا پیالہ پکڑا اور پیچھے دیوار کی طرف رخ کر کے چند گھونٹ پانی پیا بدرالدین اس

کی گوری گوری کلائی میں سونے کی چوڑیاں اور کنگن دیکھ کر باؤلا ہوگیا پھراس نے اداکاری کرتے ہوئے آنکھیں موندکر کچھ پڑھنا شروع کیا اوراپنے گلے میں پہنی مالا کے منکے تسبیح پڑھنے کے انداز میں دائیں سے بائیں ایک ایک کر کے دھکیلتا رہا نور خان دوسری کرسی پر بیٹھا حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا کوئی دس منٹ کی پڑھائی کے بعد عامل نے سکینہ کے وجود کے چاروں طرف انگلی گھماتے ہوئے دائرہ بنایا سر جھکا کر سکینہ کے چہرے پر پھونک ماری اور پھر بولنے لگا۔

''بی بی، تم پر جنوں کا سردار فریفتہ ہوگیا ہے جو بہت قوی ہے تم اس کے شکنجے میں آ گئی ہو وہ تمہیں بہت تنگ کرے گا۔ تمہیں ایسا لگے گا جیسے تمہارا سارا بدن ٹوٹ رہا ہے تم دن بدن کمزور ہوتی جاؤ گی۔'' وہ بول رہا تھا اور سکینہ اس کی ہر ہر بات کی تائید کرتے ہوئے ہاں، ہاں کررہی تھی اور اقرار میں سر کو جنبش بھی دے رہی تھی۔

''کیا میں اس کی قید سے آزاد ہو جاؤں گی۔'' سکینہ نے بے چین ہوکر پوچھا۔

''ہاں، مگر اس کے لیے مجھے اس سے جنگ کرنا پڑے گی۔ اس کی شرطوں کو ماننا ہوگا اس کے لیے آپ کو اچھا خاصا خرچہ بھی کرنا پڑے گا اور بار بار یہاں بھی آنا پڑے گا۔''

''کوئی بات نہیں، آپ جتنا مانگیں گے ہم دیں گے اور یہاں بھی آتے رہیں گے۔'' نور خان جواب میں بول اٹھا۔

''تو ٹھیک ہے دس ہزار روپے تو ابھی جمع کرا دو میں بڑے جانور کا صدقہ دے کر اس جن کو حاضر کروں گا۔ ایک ہفتے بعد آنا پھر جو معاملہ اس سے طے ہوا اس کے مطابق عمل کریں گے۔'' بدرالدین نے کہا تو نور خان پریشان ہوگیا۔

''اب اتنی رقم تو ہمارے پاس نہیں ہے، ہاں کل میں آپ کو لا کردے دوں گا۔'' نور خان نے کہا۔

''کوئی بات نہیں جتنے آپ کے پاس ہیں وہ اب دے جائیں باقی کل پہنچا دینا مگر یاد رکھنا جب تک پوری رقم میرے پاس نہیں آئے گی میں عمل شروع نہیں کرسکوں گا۔'' بدرالدین نے ان پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تین ہزار ہیں میرے پاس، یہ رکھو باقی رقم کل پہنچ جائے گی۔'' بدرالدین نے رقم اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی اس عرصے میں سکینہ نے اپنے ہاتھوں سے سونے کے دو قیمتی کنگن اتارے اور عامل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ رکھ لو اور انہیں فروخت کر کے آج ہی عمل شروع کرو۔''

''رہنے دیں اماں کیا کررہی ہیں آپ میں کل رقم پہنچا دوں گا۔'' نور خان نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر کہا جس میں کنگن پکڑے ہوئے تھے مگر تب تک کنگن عامل کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر گر چکے تھے۔

''کوئی بات نہیں آپ کل رقم لے آنا، ہم سنار سے یہ کنگن واپس لے لیں گے۔ کم از کم عمل تو آج شروع ہوسکے گا نا۔'' عامل نے یہ کہہ کر نور خان کو بے بس کردیا۔

''ٹھیک ہے مگر یاد رکھنا ہم نے کل یہ کنگن واپس لینے ہیں۔''

''ہاں، ہاں ضرور آپ بے فکر ہوجائیں۔'' عامل نے نور خان کو مطمئن کرتے ہوئے کہا اور کنگن لیے اپنے حجرے میں چلا گیا جہاں بہت سی عورتیں اس کی منتظر بیٹھی تھیں نور خان اپنی ماں کو لیے واپس گاؤں چل دیا۔

گھر پہنچ کر ماں نے ساری بات جبار خان کو بتائی کہ مجھے کوئی مرض لاحق نہیں ہے مجھ پر آسیب کا سایہ ہے جو بدرالدین عامل نے دور کرنے کا وعدہ کیا ہے مگر مگر اس کے لیے کافی رقم بھی درکار ہوگی اور ہم کو بار بار عامل کے پاس بھی جانا پڑے گا۔

''یہ سب فرسودہ باتیں ہیں زمانہ قدیم کے قصے

میں، میں ان باتوں کو نہیں مانتا جن بھوتوں کی کہانیاں پرانی ہو چکیں۔ سب ڈرامہ کر کے لوگوں سے دولت حاصل کرتے ہیں۔'' جبار خان نے بگڑتے ہوئے کہا۔

''مگر بیٹا ہم نے تو اس سے وعدہ کرلیا ہے کہ تین ہزار نقد لے لو۔ سات ہزار کی رقم کل ہم آپ کو پہنچا دیں گے۔'' سکینہ نے زیور کی بات ظاہر نہ کی۔

''اوہو، ایک تو تم عورتوں کا دماغ خراب ہوتا ہے بھلا کیا ضرورت تھی اسے اتنی رقم دینے کی میں کل جاؤں گا اس کے پاس، واپس لوں گا اس سے اپنے تین ہزار دیکھو گا جن ہمارا کیا کرتے ہیں۔'' جبار خان نے چلاتے ہوئے کہا اور باہر ڈیرے کو چل دیا۔ سکینہ بی بی سر تھام کر رہ گئی کہ اب کیا ہوگا اگر جبار خان کو پتا چلے گا کہ میں ہزاروں کی مالیت کے کنگن بھی عامل کو دے آئی ہوں تو وہ میرا کیا حشر کرے گا اس نے نور خان سے بات کی کہ اب کیا کیا جائے نور خان اپنی جگہ ماں سے ناراض ہوا کہ ایک تو آپ نے عامل کو کنگن دینے میں جلد بازی کا مظاہرہ کیا اور پھر رقم والی بات جبار خان کو بتانے کی کیا ضرورت تھی میں اس کا انتظام کر لیتا۔ اب کیا کیا جائے نور خان بھی پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ بالآخر طے پایا کہ کسی طرح جبار خان کو وہاں جانے سے روکا جائے اور سات ہزار کی رقم ہر حال میں عامل تک پہنچا کر اس سے کنگن واپس لیے جائیں۔

لہٰذا اگلے دن نور خان رقم لے کر گھوڑے پر شہر چلا گیا اور سکینہ نے جبار خان سے کہہ دیا کہ نور خان شہر گیا ہے وہ عامل سے تین ہزار کی رقم واپس لے آئے گا۔ لہٰذا اب تمہیں وہاں جانے کی ضرورت نہیں یوں جبار خان کو روک لیا گیا۔

مگر جب نور خان لوٹ کر آیا تو اس نے بتایا کہ کنگن تو سنار نے توڑ کر سونا بنالیا۔ عامل نے کل ہی اس سے رقم لے لی تھی جو دس ہزار سے کم تھی۔ لہٰذا ایک ہزار مجھے مزید اسے اور دینا پڑا ہے چار ہزار نقد اور چھ ہزار کے طلائی کنگن بیچ کر اس نے اپنی دس ہزار کی رقم پوری کرلی ہے۔''

''چلو کوئی بات نہیں، اس سال چنے کی فصل اچھی ہے اور کنگن بنوالوں گی اب وہ ہمارا کام تو کرے گا نا۔'' ماں نے تسلی چاہی۔

''ہاں وہ کام کرے گا۔ میں نے احتیاطاً اسے جبار بھائی کا بھی بتا دیا ہے کہ بڑے سخت مزاج کا بندہ ہے اگر وہ یہاں آئے تم سے کوئی بات کرے تو بس یہ کہنا کہ ایک دن وہ ماں بیٹا یہاں آئے تھے پھر کبھی نہیں آئے۔''

''یہ بتا کر تم نے بہت اچھا کیا بیٹا، مجھے بڑی فکر لاحق تھی کہ اگر جبار وہاں چلا گیا تو ضرور عامل سے کوئی پھڈا ڈال دے گا اور بیٹا ان عاملوں کے پاس جن اور بھوت قید ہوتے ہیں اگر ان سے دشمنی مول لے لی جائے تو یہ اس بندے کو بہت تنگ کرتے ہیں۔''

عامل بدرالدین نے پہلی ہی بار ان ماں بیٹے سے اچھی خاصی رقم حاصل کرلی تھی اور ایسی سونے کا انڈہ دینے والی مرغی وہ ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ لہٰذا رات ہی اس نے جبار خان اور اس کی بیوی چندو پر اپنا منتر پڑھ کر چلایا۔

صبح جب جبار خان ڈیرے سے نکل کر حویلی کی طرف آرہا تھا کہ اس پر جیسے کسی نے تازہ تازہ خون کی بالٹی اچھال دی ہو اس کا تمام چہرہ اور سارے کپڑے لہو سے تر بتر ہوگئے وہ چونک کر اچھل پڑا آس پاس کوئی بھی نہ تھا۔ وہ اسی حالت میں گھر پہنچا تو اس کی بیوی بھی لہو میں نہا کر بدحواسی سے سب کو دیکھ رہی تھی۔ دونوں میاں بیوی کی یہ حالت دیکھ کر سکینہ کو بی بی بات کرنے کا موقع مل گیا۔

''اب تو مان جاؤ کہ ہمارے گھر پر آسیبی قوتوں کا سایا آن پڑا ہے۔ میں جھوٹ تو نہیں کہتی تھی نا تمہاری وجہ سے عامل کو بھی ناراض کر دیا جو ہم نے اس سے رقم واپس لے لی۔

''ہاں یہ جنات کا کارنامہ ہے اب اس نے ہم کو

بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ لہٰذا ہمیں ابھی عامل کے پاس جانا ہوگا مجھے تو بے پناہ خوف آ رہا ہے۔ ہماری حویلی آسیب زدہ ہوگئی ہے۔'' جبار خان کی بیوی چندو کہہ رہی تھی اور جبار خان بھی سوچ میں پڑ گیا تھا کہ یہ سب کچھ خواب تو نہیں ہوسکتا۔ عامل کی خدمات حاصل کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔

لہٰذا دوپہر کو جبار خان کی جیپ شہر جانے والی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ جس میں سکینہ بی بی بھی موجود تھی چندو بھی اور جبار خان خود ان کو لے کر عامل بدر الدین کے پاس جا رہا تھا۔ پھر اس وقت تو وہ اور بھی حیران رہ گیا جب عامل نے ان کو علیحدہ کمرے میں ٹھہرایا اور ان کے کچھ بتانے سے پہلے سے ہی ان کو چونکا دیا۔

''تو تم ہو جبار خان بستی چیتے والا کے سردار۔'' عامل نے پوچھا۔

''ہاں، ہاں میں ہی جبار خان ہوں مگر تم مجھے کیسے جانتے ہو۔'' جبار خان نے حیرت سے پوچھا۔

''میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ تم نے اپنی ماں اور بھائی پر ناراضگی کا اظہار کیا ہے کہ تم عامل کے پاس کیوں گئیں تم تو آسیبی مخلوق کے وجود سے بھی انکاری ہو عامل اس پر اپنے غیبی علم کی دھاک بٹھا رہا تھا اور سکینہ بی بی بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی کہ عامل صاحب کو یہ باتیں جبار خان سے نہیں کہنا چاہیے جونور خان کل اسے بتا کر گیا ہے جبار خان اور اس کی بیوی حیرت سے منہ پھاڑے ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے تھے۔ تب عامل نے اسے اپنی سحر انگیز باتوں میں متوجہ کرلیا۔

''دیکھو جبار خان، جنات ایک حقیقی مخلوق ہے جن کا ذکر قرآن مجید میں بھی بار بار آیا ہے۔ صدیوں سے اس غیبی مخلوق کی انسانوں سے جنگ چلی آ رہی ہے۔ اب جیسے آپ کی حویلی ان کی زد میں آ گئی ہے اسی طرح کسی نہ کسی جگہ یہ فتنہ فساد ڈالے رکھتے ہیں ناحق لوگوں کو پریشان کرتے ہیں اب جس قوت نے تمہاری والدہ کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اس سے نجات حاصل کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے رات میں اس کی حاضری کی تھی وہ کسی طور بھی سکینہ بی بی کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہاں ایک شرط پر وہ اسے چھوڑ سکتا ہے مگر وہ شرط اتنی بھاری جس کو پورا کرنا ناممکن سی بات ہے۔''

''کیا مطلب، آپ اس کی شرط بتائیں ہم اسے پورا کریں گے جبار خان نے چیلنج قبول کرتے ہوئے چھاتی پر ہاتھ مار کر کہا سکینہ اور چندو نے بھی اس کی تائید کردی دیکھو جبار کام بہت مشکل ہے۔''

''تم بات تو کرو عامل صاحب، جبار خان کے لیے کوئی بات مشکل نہیں ہے۔''

''تو کیا قبرستان سے کسی عورت کی لاش لا کر مجھے دے سکتے ہو؟'' عامل نے پرتجسس انداز میں کہا تو جبار خان اپنی جگہ سے اچھل کر رہ گیا اور سکینہ بی بی کے ساتھ ساتھ چندو بھی لرز کر رہ گئی۔

''عورت کی لاش؟''

''ہاں عورت کی لاش بس ایک رات کے لیے مجھے اس پر عمل کرنا ہے صبح ہم اسے غسل اور نئے کفن کے ساتھ دفن کردیں گے اسی قبرستان میں یا کسی شہر کے قبرستان میں۔'' عامل نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''یہ کام مشکل تو ہے مگر ناممکن نہیں۔ جبار خان نے دھیمی سی آواز میں کہا اس کے دماغ میں زہرہ کی لاش گھوم رہی تھی۔ جو ابھی چند ماہ پہلے ہی اس کے کھیت میں دفن ہوئی تھی اور اس پر قبر کا نشان بھی موجود نہیں تھا۔

''تو پھر یہ کام کل ہی رات کو ہو جانا چاہیے لاش چھ ماہ سے زیادہ پرانی نا ہو عورت کی عمر کی کوئی قید نہیں خواہ جوان ہو یا بوڑھی اس پر بے پناہ خوشبو چھڑک کر اسے بڑی احتیاط سے یہاں لایا جائے۔ تین گھنٹے کا عمل ہے قبر پہلے سے تیار ہو تو سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے اسے دفن بھی کیا جاسکتا ہے۔ ٹھیک ہے شہر میں قبر کھدوانے کا کام تم کردو، لاش لے کر میں خود آجاؤں

گا۔'' جبار خان نے اس کی ہر بات مان لی تو عامل کا حوصلہ اور بڑھ گیا تو اس نے اپنی مکاری کا جال اس کے گرد اور تنگ کرتے ہوئے کہا۔

''اگر کل رات آپ لاش لے کر آتے ہیں تو اس سے پہلے پہلے ایک بار مجھے آپ کی حویلی میں جانا ہوگا ایک ایک کمرہ ایک ایک کونا دیکھنا ہوگا وہاں پڑھائی کرنا ہوگی اور وہاں جانے سے پہلے جو ہوائی چیزیں میرے حصار میں قید ہیں۔ ان کو کڑاہی دینا ہوگی جس پر دس ہزار کی رقم خرچ آئے گی جو آپ کو آج شام تک ادا کرنا ہوگی اور لاش والا عمل تو بہت بھاری ہے۔ پچاس ہزار کا خرچہ ہو جائے گا اس پر تمہارا۔''

''رقم تو بہت زیادہ مانگ لی تم نے مگر میں ادا کروں گا ہمارا کام ہونا چاہیے اگر آپ نے اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی ان آفتوں پر قابو نہ پایا تو میں سے تم سے ایک ایک پائی واپس وصول کروں گا اور اگر کام ہو گیا تو اس کے علاوہ انعام میں بھینس دوں گا۔'' جبار خان نے اس پر اپنی سرداری کا دبدبہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''سردار جی آپ بے فکر ہو جائیں تمہاری حویلی کو میں ان قوتوں سے ایسے پاک کر دوں گا جیسے دھوبی کپڑے کا میل صاف کر دیتا ہے۔ عامل نے جبار خان کو تسلی دلاتے ہوئے پرعزم انداز میں کہا۔ پھر چند تعویذ دے کر ان کو رخصت کر دیا پروگرام طے پایا کہ صبح نور خان تمہیں جیپ میں حویلی لے کر جانے لگا اور رات والا کام میں خود کروں گا دس ہزار کی رقم اس نے فوری جیب سے نکالی اور عامل کے حوالے کر دی رقم لیتے ہوئے عامل کے ہاتھ عجیب سی خوشی کے ساتھ کپکپا رہے تھے۔ پھر جب یہ لوگ واپس آ رہے تھے تو سکینہ بی بی سوچ رہی تھی کہ شکر ہوا عامل نے جبار خان سے میرے طلائی کنگنوں کا ذکر نہیں کر دیا۔ ورنہ بات بگڑ بھی سکتی تھی۔

اگلے دن نور خان عامل کو جیپ میں لے کر حویلی پہنچا۔ بدرالدین نے حویلی کی چھت کے چاروں کونوں پر دم کرتے ہوئے بڑے بڑے کیل پیوست کیے ایک ایک کونے میں کھڑے ہو کر جانے کیا کچھ پڑھتا رہا۔ دوپہر کو اسے پر تکلف کھانا دیا گیا جس میں بٹیر بھی شامل تھے پھر اسے نئے سرے سے کچھ رقم دے کر جیپ میں رخصت کیا گیا جبار خان نے شہر کے قبرستان سے دو کرائے کے گورکن حاصل کیے چند میٹر سفید کپڑا اور بہت سی خوشبو لے کر دس بجے شب کے قریب وہ گورکن کو لیے وہاں پہنچا جہاں زہرہ کو اس کی بچی کے ساتھ دفن کیا گیا تھا۔

ٹارچ کی روشنی میں پھرتی سے کام کیا گیا اکڑی ہوئی دونوں لاشیں برآمد کر کے بچی کو پھر سے وہیں دفنا دیا گیا جبکہ بدنصیب زہرہ کی لاش کو خوشبو سے تر کر کے سفید کپڑے میں کفن کی صورت میں لپیٹا گیا اور جیپ کے پچھلے حصے میں ڈال کر وہیں سے بستی کی بیرونی گلی پار کر کے بدرالدین کے گھر پہنچے لاش کو عامل کی ہدایت پر حجرے کے فرش پر لٹایا گیا۔ دونوں گورکن لاش وہاں کمرے میں چھوڑ کر قبرستان پہنچے اور زہرہ کی قبر تیار کی۔ عامل حجرے میں دروازہ اندر سے لاک کر کے اپنے عمل میں مصروف رہا اور جبار خان جسے علیحدہ کمرے میں بستر دیا گیا تھا وہاں بے چینی سے رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔

موذن نے فجر کی اذان دی تو دونوں گورکن قبر تیار کر کے لاش لینے وہاں آ پہنچے عامل اپنے کام سے فارغ ہو چکا تھا۔ لاش کو نئے سرے سے جیپ میں ڈالا گیا اور قبرستان پہنچ کر جبار خان نے اپنی زیر نگرانی اسے دفن کرایا اس کام کا بھاری معاوضہ ادا کیا اور گھر لوٹ گیا۔



صبح کا سورج اپنی سرخ کرنوں کے ساتھ جبار خان کی حویلی میں اترا جب بیرونی گیٹ کھولا گیا تو گھریلو ملازمہ کی چیخ نکل گئی کیونکہ گیٹ کھلتے ہی گلی سے بن

مانس کی قامت کے برابر بھورے رنگ کا بندر بے دھڑک حویلی کے اندر داخل ہوگیا اور خرخراتے ہوئے آنگن میں پہنچ کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

ذرا دیر بعد حویلی میں بھونچال سا آ گیا حویلی بھر کے مکین جاگ گئے جبار خان رات بھر گھر سے غائب رہا تھا جو ذرا دیر پہلے ڈیرے میں آ کر سو گیا تھا۔ چرواہے ڈیرے کے ملازم گھریلو ملازم سبھی ڈنڈے لاٹھیاں اور کلہاڑیاں لے کر حویلی میں داخل ہوگئے اور بندر کو گھیرے میں لے لیا بندر نے اپنے چاروں طرف کا جائزہ لیا اور صورت حال کو بھانپ کر پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر خطرناک انداز میں غرایا۔ اس کے نوکیلے ناخن اور سرخ آنکھیں دیکھ کر خوف آتا تھا وہ اس پوزیشن میں کھڑا تھا جیسے اپنا دفاع کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے قریب آنے والے پر حملہ بھی کر سکے سب اپنی اپنی جگہ سہم کر کھڑے تھے کسی کو آگے بڑھنے کا حوصلہ نہ ہو رہا تھا ایسے میں سلیم خان اپنے باپ کی بارہ بور کی رائفل لوڈ کر کے لے آیا اور ڈیرے کے نشانہ باز یاسین کو رائفل دے کر کہا کہ نشانہ لے کر اسے گولی سے اڑا دو بندر نے رائفل کو دیکھا تو غصے سے چیخنے چلانے لگا پھر جب یاسین اس کا ذرا پیچھے جا کر نشانہ لے رہا تھا سب کی توجہ ادھر تھی بندر نے اچانک زور دار چھلانگ بھری اور پانی سے بھرے گھڑے لکڑی کے جس بڑے اسٹینڈ (گھڑونجی) پر پڑے تھے چھلانگ لگا کر اس پر پہنچا وہاں سے جست بھر کر حویلی کی بیرونی دیوار پر چڑھا اور پھر چھت پر چلا گیا۔ حویلی کی عورتیں چیختی ہوئی کمروں میں چلی گئیں چیخ و پکار سن کر بستی کے بہت سے مرد وعورتیں وہاں جمع ہوگئے مگر سلیم خان اور نور خان نے سب کو خبردار کیا کہ بندر چھت پر موجود ہے وہ کسی لمحے بھی نیچے آ سکتا ہے اور کسی پر بھی حملہ کر سکتا ہے تب ڈر کے مارے سبھی حویلی سے باہر گلی میں آ کر تماشائی بن کر کھڑے ہوگئے سب پریشان تھے کہ یہ بندر صبح صبح کہاں سے چلا آیا اور اب اس سے کیسے نجات حاصل کی جائے۔ ایسے میں بندر حویلی کی چھت سے نیچے آنگن میں جھانکتا ہوا دکھائی دیا اب چھت پر جا کر اسے نشانے پر لینا مشکل کام تھا لہٰذا طے پایا کہ ڈیرے کی چھت پر جا کر اس پر فائر داغا جائے لہٰذا سبھی ملازم ڈیرے والے کمروں کی چھت پر پہنچے، بندر نے بھی ان کو دیکھ لیا کہ وہ چھت پر کیا کرنے والے ہیں۔ پھر وہ آنگن میں اتر گیا تب سبھی اسلحہ بردار ملازم حویلی کی طرف بھاگے بندر حویلی میں اترتے ہی آنگن کے جنوبی کونے میں کھڑے شیشم کے گھنے پیڑ پر چڑھ گیا اور گھنی شاخوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ سب اسے حویلی میں ادھر ادھر ڈھونڈ رہے تھے ایسے میں انہیں بستی کے ایک بزرگ نے مشورہ دیا کہ بندر انسان سے زیادہ ذہین اور چالاک جانور ہے یہ اس طرح تمہارے قابو میں نہیں آئے گا۔ اگر اس کا گھیرا تنگ کرو گے تو یہ کسی پر بھی حملہ کر کے اسے نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اسے گولی سے مارنا بھی مشکل ہوگا لہٰذا آپ اسے اعتماد میں لیں بندوق اور لاٹھیاں لے کر اس کے سامنے نہ جائیں بلکہ کوئی کھانے کی چیز اسے پیش کریں سب نے اس کی بات پر اتفاق کیا ساری حویلی چھان ماری مگر اس کا کہیں سراغ نا مل رہا تھا چھت بھی خالی تھی سیڑھیوں والا راستہ بھی صاف تھا ایسے میں ایک بچے نے شیشم کی گھنی شاخوں میں حرکت دیکھی تو سب کو ادھر متوجہ کیا بندر اوپر موجود تھا بوڑھے بابا کی ہدایت پر چنگیر میں روٹیاں رکھی گئیں اور چنگیر شیشم کے پیڑ تلے چارپائی پر رکھی گئی۔ لاٹھیاں وغیرہ چھپالی گئیں اور سبھی وہاں سے دائیں بائیں چھپ گئے۔ بندر اوپر بیٹھا نیچے کے سبھی حالات کو بغور دیکھ رہا تھا اسے یقین ہوگیا کہ نیچے کوئی نہیں ہے تو وہ بڑے محتاط انداز میں نیچے کودا چنگیر سے روٹیاں اٹھائی اور پھر بھاگ کر پیڑ پر چڑھ گیا۔

روٹیاں ختم کر کے وہ پھر کھسکتا ہوا نیچے آیا اور برتن دھونے کی جگہ بالٹی میں پانی بھرا تھا وہ انسان کی طرح

دو ٹانگوں پر چلتا ہوا بالٹی تک پہنچا اور اس میں منہ ڈال کر پانی پینے لگا۔ دو تین گھونٹ بھر کر وہ بالٹی سے سر نکال کر اپنے اطراف کا جائزہ لیتا اور پھر پانی پینے لگتا پھر وہ درخت کے پاس پہنچ کر رکا گھور گھور کر پیڑ کی شاخوں کا جائزہ لیا اپنے اطراف میں ذرا سی گردن جھکا کر بغور جھانکا پھر انسانوں کی طرح اپنے گھٹنوں کو بانہوں کے دائرے میں لے کر تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ دوپہر کو جبار خان نیند سے بیدار ہوا تو اسے بندر کی آمد اور اس کے خلاف کیے گئے تمام اقدامات کی تفصیل بتائی گئی تو وہ حیرت میں ڈوبا گھر پہنچا۔

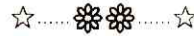
''یہ تو بہت بڑا اور خطرناک بندر ہے یہ کہاں سے آ گیا۔ آپ لوگ اسے فائر ہی نہیں مار سکے حیرت ہے، دیکھتا ہوں میرے ہاتھ سے کیسے بچ کر نکلتا ہے۔'' جبار خان نے غصے کی حالت میں کہا اور پاؤں پٹختا ہوا اپنی خوابگاہ میں پہنچا اور دیوار پر لٹکی ہوئی رائفل اتار کر اس میں کارتوس لوڈ کیے اور بڑبڑاتا ہوا باہر آیا۔

جبار خان نے اپنے تینوں ملازموں سے کہا کہ آپ لوگ پیچھے دیوار کے ساتھ چلے جائیں میں یہاں سے فائر کرتا ہوں ملازم پیچھے چلے گئے جبار خان نے برآمدے کے ستون کی آڑ لے کر بندر پر نشانہ باندھا اور عین اسی لمحے جب اس کی انگلی ٹائیگر دبانے کو تھی بندر کی نگاہ اس پر اٹھ گی پھر ادھر سے گولی چلی اور ادھر بندر خوفناک آواز میں دھاڑا اور پانچ فٹ سے زیادہ کی چھلانگ لگا کر جبار خان کی طرف لپکا گولی شیشم کے تنے میں پیوست ہوگئی اس کے کئی چھرے ادھر ادھر بکھر گئے اور بندر صحیح سلامت مجسم انتقام بن کر جبار خان پر حملہ آور ہوگیا اس کا یہ قدم اتنا غیر متوقع تھا۔ جبار خان کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا اور وہ بندر کی گرفت میں آ گیا۔ ملازم لاٹھیاں لے کر دوڑے بندر جبار خان کو اپنے شکنجے میں لے کر اسے جگہ جگہ سے کاٹ رہا تھا اور اپنے تیز ناخنوں سے اس کے جسم کو نوچ رہا تھا۔ ملازموں نے بندر پر ڈنڈے برسانے شروع کیے جبار خان چیختے ہوئے درد سے بلبلا اٹھا۔ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے اور لہو سے سرخ ہوتے جا رہے تھے۔ شور سن کر نور خان اور بستی کے بہت سے لوگ وہاں آ پہنچے۔ مگر تب تک بندر نے جبار خان کو زخموں سے چور کر کے نیم بے ہوش کر دیا اور اب وہ اپنے تحفظ کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا عورتوں کی چیخ و پکار مردوں کی آوازیں بندر کی کان پھاڑ چیخیں پوری حویلی میں قیامت صغریٰ کا منظر پیش کر رہی تھیں۔

لوگوں کا جمگھٹا دیکھ کر بندر نے راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش کی مگر ساری حویلی لوگوں سے بھر گئی تھی اور سب ہی اس پر ڈنڈے لاٹھیاں اور جوتے تک پھینک رہے تھے۔ بالآخر بندر نے جست بھری مگر صحیح طرح سے چھلانگ نہ لگا سکا۔ دو تین فٹ کی بلندی پر چند قدموں پر ہی گر گیا۔ شدید ضربوں سے اس کے بازو اور کمر پر چوٹیں آئی تھیں، اب اس نے کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں سے لوگوں پر حملہ کرتے ہوئے بھاگنے کی کوشش کی لوگ ڈر کر اسے رستہ دینے لگے مگر ڈنڈا بردار افراد نے اسے گلی تک آتے آتے بے بس کر دیا۔ اس کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی ریڑھ کی ہڈی بھی جگہ جگہ سے متاثر ہوئی اور ہاتھ بھی ٹوٹ سے گئے سر اور چہرے سے خون ٹپک رہا تھا۔ بندر کراہتے ہوئے گر گیا پھر اس پر اس وقت تک لاٹھیاں پڑتی رہیں جب تک وہ سرد نہ ہوگیا۔

زخمی جبار خان کو جیپ میں ڈال کر شہر کے اسپتال لے جایا گیا چہرے گردن چھاتی پر گہری خراشیں آئی تھیں مگر رات تک وہ ہوش میں آ گیا۔ اسے بندر کو ختم کرنے کی خبر دی گئی اس کی بیوی چندو کا برا حال تھا ماں بھی بیٹے کی تکلیف پر غم زدہ تھی۔

آس پاس کی بستیوں میں اس واقعہ کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور لوگ جبار خان کی عیادت کرنے اسپتال میں پہنچے اور بندر کی لاش تک دیکھنے والوں کے لیے ڈیرے میں حیرت کا باعث بنی رہی۔



پراسرار بندر کی آمد کا راز کیا تھا کوئی نا جان سکا مگر یہ بات سب جان چکے تھے کہ جبار خان پر اللہ کا غضب بے آواز لاٹھی کی طرح بندر کی صورت میں نازل ہوا ہے۔ شام کو بندر کی لاش گھوڑوں کے اصطبل کے پچھواڑے گڑھا کھود کر دفن کر دی گئی۔

اسی رات سکینہ بی بی کو پھر آسیبی قوت نے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ صبح جبار خان کے گھوڑوں والے اصطبل میں نوکروں کی چیخ و پکار سن کر پل بھر میں ساری بستی کے لوگ وہاں جمع ہو گئے بات ہی اتنی سنسنی خیز تھی کہ جو دیکھتا لرز کر رہ جاتا۔ دو گھوڑوں کے سر تن سے جدا کر کے اصطبل میں کھڑے شیشم کے پیڑ کی شاخوں سے رسیوں میں بندھے لٹک رہے تھے اور دونوں گھوڑوں کی سر بریدہ لاشیں نیچے اوپر ڈھیروں کی شکل میں پڑے تھے۔ یہ کسی انسان کا کام نہیں ہو سکتا۔ یہ آسیبی مخلوق کا کارنامہ ہے۔ پھر یہ بات عام ہو گئی کہ کل جس بندر کو مار کا یہاں دفن کیا گیا وہ بندر پراسرار تھا اور پھر یہ شک اس وقت یقین میں بدل گیا کہ بندر کو جس جگہ گڑھے میں دفن کیا گیا تھا۔ اس جگہ گھوڑوں کا لہو موجود تھا۔ سلیم خان اور نور خان بہت پریشان تھے بندر کا جبار خان کو زخمی کرنا گھوڑوں کی گردنیں کاٹ کر ان کو ہلاک کرنا یہ سب کیا ہو رہا تھا اور کیوں ہو رہا تھا؟

سکینہ بی بی اپنی جگہ مسلسل عذاب میں تھیں کہ میرے ساتھ یہ ناروا سلوک کب تک ہوتا رہے گا آخر کب تک، اب اس واقعہ نے انہیں نے بھی حیران کر دیا اس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ ہم یہ حویلی اور یہ گاؤں ہی چھوڑ کر کہیں نقل مکانی کر جائیں کیونکہ اب تو ہماری زندگیوں کو بھی خطرہ ہے کہ نجانے کس پل کیا ہو جائے۔

''ہاں اماں، لگتا ہے آسیبی طاقتوں کا گھیرا ہمارے اردگرد تنگ ہوتا جا رہا ہے سب خوفزدہ ہیں گھوڑوں کی پراسرار ہلاکت سے تمام نوکر حیران و پریشان ہیں۔ پوری بستی میں خوف کی لہر دوڑ رہی ہے۔ ہر بشر تجسس حیرانی کی حالت میں ہے ہمیں بندر کو نہیں مارنا چاہیے تھا ہو سکتا ہے وہ کوئی آسیبی قوت تھی جو بندر کے روپ میں ہمارے گھر آئی تھی اس نے جبار خان کو بری طرح زخمی کیا۔ کہیں گھوڑوں کے قتل سے بندر کی ہلاکت کا انتقام تو نہیں لیا گیا ہم سے۔'' بیٹے نے خدشہ ظاہر کیا تو ماں نے تصدیق کر دی کہ اس بات میں ذرا بھر بھی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

اب ہمیں فوری بدر الدین عامل سے رابطہ کرنا ہوگا۔ بلکہ اسے یہاں لانا ہوگا کہ وہ تمام مویشیوں پر بھی پھر کوئی حصار قائم کرے ماں نے کہا تو فوراً نور خان جیپ سے شہر چل دیا۔ سکینہ بی بی بھی ساتھ تھی۔

بدر الدین نے ساری صورت حال جان کو کچھ دیر اپنے حجرے میں جا کر پڑھائی کی پھر آ کر بتایا کہ وہ بندر ایک چڑیل کی گرفت میں تھا۔ جب آپ نے اسے مار ڈالا تو چڑیل نے انتقام لینے کی خاطر تمہارے قیمتی گھوڑوں کو ہلاک کر دیا اور ممکن ہے ابھی وہ مزید تمہارے مویشیوں کو موت کے گھاٹ اتارے لہٰذا تم فوراً کسی بیل کو ذبح کر کے اس کا گوشت اصطبل کی چھتوں پر ڈال دو، بدر الدین نے نور خان کو ہدایت جاری کی تو نور خان نے فوری گھر پہنچ کر بیل ذبح کرنے کی ہامی بھر لی، پھر سکینہ بی بی نے عامل کو اشاروں میں بات کرتے ہوئے بتایا کہ رات کو پھر مجھے اسی آسیبی قوت نے پریشان کیا۔

''تمہیں بھی انتقاماً ان کا نشانہ بننا پڑا ہے، پریشان نہ ہو جلد ہی ہم ان سے چھٹکارا حاصل کر لیں گے۔'' بدر الدین نے سکینہ بی بی کو ڈھارس دیتے ہوئے کہا اور چند تعویذ پینے کو دے کر بھاری معاوضہ وصول کیا پھر جب اسپتال میں جبار خان کو بتایا گیا کہ رات میں یہ المناک واقعہ پیش آیا ہے تمہارے قیمتی گھوڑوں کی گردنیں کاٹ کر درخت کی شاخوں میں لٹکا دیا گیا ہے تو جبار خان کی خوف سے گھگھی بندھ گئی اور چہرے پر پسینے کے قطرے

جھلملانے لگے نور خان نے اسے دلاسہ دیا کہ عامل بدر الدین نے گوشت کا صدقہ دینے کی ہدایت کی ہے آپ پریشان نہ ہوں ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ جبار خان کی بیوی چندو یہ سن کر چیخ اٹھی۔

''ہمارا سارا گھر آسیب زدہ ہو گیا ہے اب ہمیں وہ گھر چھوڑ دینا چاہیے۔ میری تو خوف سے جان جا رہی ہے۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ ہم ابھی عامل سے مل کر آ رہے ہیں اس نے ہمیں تسلی دی ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' نور خان نے کہا۔

''بکواس کرتا ہے وہ کمینہ ہزاروں روپے اس نے ہم سے وصول کر لیے اور بات ختم ہونے کے بجائے اور شدت اختیار کر گئی ہے جھوٹ بول رہا ہے وہ یہ اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اف خدایا میں کیا کروں۔'' جبار خان نہایت تکلیف کی حالت میں چیخ اٹھا۔

''حوصلہ رکھو بھائی اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔'' نور خان نے بے بسی سے کہا۔

''نور خان خدا کے لیے اس عامل کو دفع کرو، وہ جھوٹا ہے وہ صرف ہم سے دولت سمیٹ رہا ہے تم کسی درگاہ پر جاؤ کسی اللہ والے بزرگ سے ملو ورنہ یہ آسیبی طاقتیں ہمیں برباد کر دیں گی۔'' جبار خان نے نور خان سے کہا۔

''ٹھیک ہے بھائی ہم ابھی درگاہ حضرت سخی پیر پر جاتے ہیں۔ اور وہاں کے سجادہ نشین جو بہت بڑی ہستی ہیں ایک زمانہ ان کا مرید ہے ان کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ نور خان نے جواب میں کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا، ہم ابھی وہاں درگاہ پر حاضری دیتے ہیں۔'' ماں نے بھی بیٹے کی بات کی تائید کر دی اور پھر ذرا دیر بعد ان کی جیپ کچی سڑک پر دھول اڑاتی درگاہ حضرت سخی پیر کی جانب تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔

آستانہ عالیہ پر حاضری کے بعد وہ سجادہ نشین جو ستر برس کی بزرگ ہستی کے مالک تھے ان کے حضور نیچے چٹائی پر سر جھکائے بڑے ادب سے بیٹھے اپنی بپتا سنا رہے تھے۔

سکینہ بی بی بات کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہی تھی وہ سوچ رہی تھیں کہ کیسے بابا جی کو اپنے ساتھ پیش آنے والے شرمناک واقعات کی تفصیل بیان کروں مگر اس وقت وہ چونک کر رہ گئی جب اس کے لب کھولنے سے پہلے ہی بابا جی نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''بہن آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے میں آپ کی مشکل سمجھتا ہوں آپ یہ تعویذ اپنے گلے میں ڈال لیں۔ اب آپ کو کوئی آسیبی قوت چھو بھی نہیں سکے گی۔ ہاں یہ خیال رکھنا کہ تعویذ گم نہ ہونے پائے، نماز پڑھنا اور سورہ والناس کا ورد کرتے رہنا اور یہ تعویذ جانوروں کے اصطبل کا جو دروازہ ہے اس میں اونچی جگہ لٹکا دینا، گوشت کا صدقہ خیرات کر دو سب معاملات درست ہو جائیں گے۔ اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا اب اللہ کے حکم سے کچھ نہیں ہوگا۔'' بابا جی نے یقین سے کہا تو نور خان اور سکینہ بی بی کو اطمینان سا ہو گیا مگر دلی طور پر دونوں ماں بیٹا بابا جی کی بات پر کچھ مطمئن نہیں لگ رہے تھے۔

صرف ایک تعویذ دروازے ہی لٹکانے سے بھلا آسیبی طاقتیں چلی جائیں گی۔ شاید بابا جی نے ہمیں ٹالنے کی کوشش کی ہے واپسی پر لوٹتے ہوئے نور خان نے ماں سے بات کی۔

مگر سکینہ بی بی نے اسے کوئی جواب نہ دیا گھر پہنچ کر بیل ذبح کیا گیا کیونکہ گوشت کا صدقہ دینے کی بات تو بابا جی نے بھی کی تھی گوشت شام کو ہدایت کے مطابق چھتوں پر ڈال دیا گیا پوری بستی میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا ہر فرد پریشانی کی حالت میں تھا بلکہ شام تک آس پاس کی بستیوں میں بھی یہ خبر پھیل چکی تھی کہ بستی چھیتے والا میں سردار فتح محمد کی حویلی جنات اور چڑیلوں کے قبضے میں آ چکی ہے ان کے گھوڑوں کو ہلاک کر کے ان کی گردنیں، درختوں پر لٹکا دی گئی ہیں۔

تمام لوگ عجیب تذبذب کا شکار تھے اور اصطبل میں جانے سے خوف کھا رہے تھے سکینہ بی بی نے تو باباجی کا دیا ہوا تعویذ گلے میں پہن لیا گیا مگر نور خان نے اصطبل کے دروازے پر تعویذ لٹکانے میں کچھ سستی برتی اور نوکروں سے چھتوں پر گوشت ڈالنے کے کام کی نگرانی کرتا رہا اور پھر تعویذ باندھنا اسے یاد ہی نا رہا۔

شام کے سائے گہرے ہوتے چلے گئے اور پھر شب کی تاریکی نے ہر سو اپنی زلفیں بکھیر دیں۔ سلیم خان اور چندو اسپتال میں جبار خان کے پاس تھے نور خان اپنے نوکروں کے ساتھ باہر گلی میں چارپائیاں ڈالے براجمان تھا۔ بستی کے کئی لوگ بھی رات دیر تک وہاں موجود تھا۔ بڑے بڑے گیس کے ہنڈولے جلا کر اصطبل کی دیواروں پر رکھ دیے گئے تھے۔ ہر چہرے سے خوف اور ڈر کی جھلک صاف محسوس کی جا سکتی تھی کوئی گیارہ بجے شب نور خان اپنی حویلی میں سونے کے لیے پہنچا۔ ابھی وہ کروٹیں بدل رہا تھا کہ ڈیرے کی چھت پر بڑے بڑے گدھ نما پرندوں کی ڈار منڈلاتی ہوئی دکھائی دی۔ پھر ان کی عجیب و غریب ڈراؤنی آوازیں فضا میں ارتعاش پیدا کرنے لگی۔ نوکر خوف سے بھاگ کر گلی میں ادھر ادھر بکھر گئے وہ گوشت پر جھپٹ کر کرخت سی آواز بلند کرتے ہوئے گدھ تعداد میں بے شمار تھے۔ نور خان بھی بھاگ کر گلی میں آ گیا اور ذرا دیر بعد پوری گلی لوگوں سے بھر گئی۔ سبھی خاموشی سے یہ روح فرسا منظر دیکھ رہے تھے۔ یہ سلسلہ آدھ گھنٹے تک جاری رہا پھر کچھ توقف کے بعد بھینسوں کے زور سے ڈکرانے کی خوفناک آوازیں اصطبل سے برآمد ہوئیں جیسے کوئی کند چھری سے ان پر حملہ آور ہے اور وہ درد سے بلبلا رہی ہیں یہ کیفیت چند لمحوں تک طاری رہی پھر گہرا سناٹا چھا گیا تمام گدھ نجانے کہاں روپوش ہو گئے۔ ذرا انتظار کے بعد چند جواں مرد لوگوں نے آگے بڑھ کر بھینسوں کے باڑے کے قریب جا کر اندر جھانکنے کی کوشش کی مگر کسی نتیجے پر نا پہنچ سکے اصطبل کا دروازہ کھولا گیا تو خوف سے اندر جھانکنے والوں کی چیخیں نکل گئیں سامنے کا منظر بہت خوفناک تھا دو بھینسیں مردہ حالت میں پڑی تھیں اور آدھی سے زیادہ ان کی کھال اتری پڑی تھی وہ دونوں شخص بھاگ کر گلی میں آ پہنچے اور بتایا کہ اندر کی صورت حال نہایت دردناک ہے پھر رات بھر سب اسی انہونی پر تبصرہ کرتے رہے۔

صبح ہوئی تو اصطبل میں پہنچ کر جو کچھ دیکھا گیا اس کا اظہار لفظوں میں کرنا مشکل تھا دو دودھ دینے والی بھینسیں مردہ حالت میں نیچے اوپر پڑی ہوئی تھیں اور ان کی آدھی سے زیادہ کھال اتار کر گردنوں پر لحاف کی طرح ڈال دیا گیا تھا۔ ان کے دو بچھڑے شیشم کی موٹی شاخوں سے بندھے فضا میں اس طرح لٹک رہے تھے جیسے قصاب کی دکان پر صبح صبح بکرے لٹک رہے ہوتے ہیں۔

بستی بھر میں کہرام مچ گیا تو یہ استغفار کا ہر سو ورد ہو رہا تھا۔ نور خان اور اس کی ماں سکینہ بی بی بری طرح نڈھال تھے انہیں دلاسہ دینے والے بھی غمناک تھے جانے کیوں وہ مخلوق بے چارے جانوروں کی زندگیوں سے کھیل رہی تھی۔ سکینہ بی بی کا دم اکھڑ سا گیا تھا۔ نور خان اسے لیے شہر اسپتال پہنچا سکینہ بی بی کو ڈرپس لگائی جانے لگیں سلیم خان اور جبار خان نے سنا تو کٹ کر رہ گئے۔ جبار خان نے باباجی کی درگاہ پر جانے اور ان کے دیے ہوئے تعویذ استعمال کرنے کی وضاحت چاہی تو نور خان چونک کر رہ گیا اور صاف بتا دیا کہ جو تعویذ باباجی نے دروازے میں لٹکانے کے لیے دیا تھا وہ میں نہیں لٹکا سکا مجھے یاد ہی نہیں رہا۔

''یہ بہت برا کیا تم نے اب فوری پھر باباجی کے پاس جاؤ اور انہیں ہر حالت میں بستی لے کر جاؤ کہ وہ جا کر کوئی حصار بندی کریں جبار خان نے سختی سے حکم دیا نور خان باباجی کے پاس پہنچے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی منت سماجت کی کہ ایک بار آپ ہمارے گھر چلیں اور کوئی حصار بندی کریں باباجی کچھ

دیر خاموش رہے پھر ان کے ساتھ جانے کی رضامندی ظاہر کردی پھر پوری حویلی اور اصطبل کے اندر چکر لگایا شیشم کی ایک لمبی چھڑی سے کچھ پڑھ کر چھڑی لہراتے ہوئے دم کیا اور واپس لوٹ گئے اور جاتے جاتے نور خان سے کہہ گئے کہ اب تمہارا کوئی جانی و مالی نقصان اس مخلوق کے ہاتھوں نہیں ہوگا مگر تمہاری حویلی میں کوئی بہت بڑا ظلم ہو چکا ہے اور اس ظلم کرنے والے کو اپنے دردناک انجام سے بہت جلد دوچار ہونا پڑے گا۔ نور خان باباجی کی یہ بات سن کر چونک کر رہ گیا فوراً اسے جبار خان کا خیال آیا اور وہ سر سے پاؤں تک لرز کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ حویلی میں ہونے والا ظلم کیا تھا اور ظالم کون تھا۔ درگاہ پر پہنچ کر نور خان نے بمشکل باباجی سے یہ بات پوچھ لی تھی کہ ظلم کرنے والا کس طرح اپنے گناہ کا کفارہ کرسکتا ہے؟

''ہاں، جس کے ساتھ ظلم کیا گیا ہے اگر وہ اسے معاف کردے تو اس کے گناہ کا کفارہ ہوسکتا ہے۔''
اس سے آگے نا تو نور خان کو کچھ پوچھنے کا حوصلہ ہوا اور نہ ہی باباجی نے کوئی بات کی۔

اس سے اگلی رات جبار خان کی حویلی اور اصطبل میں تو کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا مگر جبار خان پر ایک نئی قیامت ٹوٹ پڑی۔ ہر رات وہ پانچ سالہ بچی اس کی چھاتی پر سوار ہوجاتی اور اس کی گردن کو ہاتھوں کے شکنجے میں لے کر اس سے سوال کرتی۔

''کس جرم میں تو نے میرا خون کیا میری ماں کو ناحق قتل اور میرا باپ جو تمہارا بھی باپ تھا اسے موت کی نیند سلایا تو نے اتنے ناحق خون بہائے مجھے میرے خون کا حساب دے دو میں بے گور و کفن پڑی ہوں۔''

جبار خان چیختے ہوئے نیند سے بیدار ہوجاتا اور اس پر موت کی کیفیت طاری ہوجاتی۔ یہ بات نا تو وہ اپنی بیوی کو بتا سکتا تھا اور نہ اپنے بھائی کو۔ بندر کے ہاتھوں لگے زخم تو پندرہ دن بعد مندمل ہوگئے۔ مگر ہر رات بانو نئے سرے سے اسے زخم زخم کردیتی۔ ابھی اس کی چھاتی اور گردن کا زخم پوری طرح نہیں بھرا تھا کہ جبار خان نے گھر جانے کی ضد کرلی اور اس کا اصرار دیکھ کر اسے ڈسچارج کردیا گیا۔

گھر پہنچ کر اس کی حالت پہلے سے بھی ابتر ہونے لگی وہ چند دنوں میں ہی سوکھ کر کانٹا ہوتا چلا گیا۔ اس کا ضمیر اسے زہریلے کانٹے چبھوتا اور رات کی رات کی نیند بانو نے اس کی آنکھوں سے چھین لی۔

بالآخر اس نے نور خان اور سلیم خان کو پاس بلا کر تنہائی میں ان سے بات کی اور انہیں بتایا کہ ہماری زمین میں فلاں مقام پر گڑھا کھود کر بانو کی لاش نکالو اور راتوں رات اسے غسل دے کر کفن دو اور جنازہ کی نماز ادا کر کے قبرستان میں دفن کردو، وہ مجھے نہیں سونے دیتی۔ دونوں بھائی اس راز سے پہلے ہی آشنا تو تھے مگر اب جبار خان کی زبانی اس گناہ کا اقرار ہوا تو ان کے دل بھی دہل سے گئے اور نہ چاہتے ہوئے بھی انہوں نے راتوں رات اپنے بھائی کے پاپ پر پردہ ڈالتے ہوئے بدنصیب بانو کو غسل، کفن اور جنازہ کی دعا سے نواز کر قبرستان میں ایک ننھی سی نامعلوم قبر کا اضافہ کردیا۔

اب جبار خان نیند کی گولیاں لے کر شب بسری کرتا۔ اس کا سارا جاہ و جلال اور شاہانہ زندگی مرگ بستر پر بسر ہونے لگی۔

اس کا ضمیر ہر وقت اس کا گریبان تھام کر اسے کچوکے لگاتا رہتا اس کی آنکھیں ندامت سے اشکبار رہتیں۔ سارا انتظام سلیم اور نور خان نے سنبھال لیا سات سال سے زائد کا عرصہ گزر گیا۔ جبار خان عبرت کا نشان بن کر پڑا اپنے لیے موت کی دعائیں مانگتا رہتا سکینہ بی بی کا بھی انتقال ہوگیا دونوں بھائی اپنے بیوی بچوں اور ڈیرہ داری میں مشغول ہوگئے بدنصیب چندو اپنے شوہر جبار خان کی زندہ لاش کی نگہداشت پر مامور تھی۔ ایک روز جبار خان نے اپنی بیوی چندو سے کہا۔

''چندو، تم نے میری بہت خدمت کی ہے میں تو

اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہوں تو ایسا کرنور خان کو کہہ کہ مجھے شہر لے جائے۔''

''شہر اسپتال جانا چاہتے ہو؟'' بیوی نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں، یہ بات میں تمہیں یہاں نہیں بتا سکتا۔تم میرے ساتھ جاؤ گی تو وہاں تمہیں بتاؤں گا۔'' جبار خان نے عجیب سے انداز میں کہا تو چندو تجسس اور حیرت میں ڈوب گئی پھر جب وہ اسے لے کر شہر جانے لگی تو جبار خان کی آنکھیں اشکوں سے لبریز ہوگئیں۔

اب اس گھر میں لوٹ کر میں واپس نہیں آؤں گا کبھی بھی نہیں اور ساتھ ہی شدت غم سے اس کی حالت غیر ہوگئی۔نور خان نے ڈرائیور کو گاڑی دے کر بھیجا تھا چندو اسے لے کر اسپتال پہنچی تو جبار خان نے کہا۔

''مجھے شہر کے مشرقی قبرستان لے چلو اگر ضرورت پڑی تو پھر اسپتال بھی آجائیں گے۔ابھی تم وہاں مجھے لے چلو۔''

چندو عجیب الجھن کا شکار تھی۔وہ اسے کچھ بتا بھی تو نہیں رہا تھا یو جب وہ مطلوبہ قبرستان پہنچے تو جبار خان نے ڈرائیور سے کہ کہا تم بشیر نامی گورکن کو یہاں بلا لاؤ ذرا دیر بعد بشیر گورکن اور ڈرائیور دونوں جبار خان کو سہارا دے کر اس قبر پر لے کر پہنچے۔جو بدنصیب بانو کی ماں بدنصیب زہرہ کی قبر تھی۔

جبار خان قبر پر گرا اور قبر سے لپٹ کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

''مجھے معاف کردے ماں، مجھے معاف کردے میں تیرا قاتل ہوں میں بانو کا قاتل ہوں، میں اپنے ابو کا بھی قاتل ہوں اب مجھے موت بھی گلے نہیں لگا رہی خدا کے واسطے اپنی معصوم بانو کی محبت کا واسطہ مان کر مجھے معاف کردے اگر تو نے مجھے معاف نہیں کیا تو روز محشر خدا بھی مجھے معاف نہیں کرے گا۔میں بڑی اذیت ناک سزا کاٹ چکا ہو، اب مجھ میں زندہ رہنے کی سکت نہیں رہی۔''

جبار کی زبانی یہ انکشاف جان کر اس کی بیوی چندو اور ڈرائیور حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس کی صورت دیکھ رہے تھے اور سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ کہہ رہا تھا۔

''مجھے میرے حال پر چھوڑ دو یہ میری ماں ہے اور اولاد جتنی بھی گناہ گار بدکردار ہو ماں معاف کردیا کرتی ہے۔ مجھے یقین ہے میری ماں بھی مجھے ضرور معاف کرے گی۔

اگر اسی لمحے میں یہاں مرجاؤں تو سمجھ لینا کہ میری ماں نے مجھے معاف کردیا ہے۔وہ چلاتا رہا پھر اس کی آواز ماند پڑتی گئی اور تمام اعضا ساکت ہوتے گئے اور ایک ماں نے اپنے قاتل بیٹے کو معاف کردیا۔بستی بھر کے لوگوں نے جبار خان کے جنازے میں شرکت کی اور رات کی تاریکی میں جبار خان زیرزمین سما گیا۔

ایک عبرت ناک داستان خاک میں مل گئی اگلی صبح جہاں نور خان اپنے بھائی جبار خان اپنے باپ اور اپنی ماں کی قبر پر پھول چڑھا رہا تھا وہاں معصوم سی بانو کی قبر پر بھی سرخ پتیاں اس کے لہو کو خراج پیش کررہی تھیں۔

بستی چیتے والا کی جبیں پر آج بھی اس عبرت ناک کہانی کے حروف درخشاں ہیں جو آنے والی کئی نسلوں تک ظالم اور مظلوم، جبر اور صبر کا درس دینے کے لیے نقوش بن کر چمکتے رہیں گے۔



راہِ انتقام

خورشید پیرزادہ

کہاوت ہے کہ اگر کوئی بے گناہ قتل ہوجائے تو اس کی روح انصاف کے لیے دنیا میں بھٹکتی رہتی ہے اور ہر شخص سے انصاف طلب کرتی ہے۔
ایک ایسی شاہراہ کا قصہ، جہاں اچانک حادثات جنم لیتے تھے ایک انسپکٹر کا احوال وہ ایک بھٹکتی روح کو انصاف دلانے کے لیے سات سمندر پار پہنچ گیا تھا۔
رونگٹے کھڑے کردینے والی ایک عجیب و غریب کہانی

اندھیری رات اور چاروں طرف گھنا جنگل' رات کے اس پہر یہ سنسان اور خطرناک نظر آنے والی اس جگہ ہوا اتنی تیز تھی کہ لگتا تھا سب کچھ اڑا کر لے جائے گی۔ جیسے یہ ہوا کسی حادثے کے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہو۔ ہر سو پھیلے اس سناٹے کو ایک کار کے غراتے ہوئے انجن نے ایک دم توڑ ڈالا۔ جیسے جھیل کے ٹھہرے پانی میں اچانک کسی نے پتھر پھینک کر جھل تھل مچادی ہو۔ کار ایک لڑکا ڈرائیو کررہا ہے اور اس دوران وہ اپنا سیل فون بھی استعمال کررہا تھا۔

''ارے یار! تم نے تو منع کیا تھا کہ اس راستے سے مت جانا' میں تو اس وقت یہاں سے گزر رہا ہوں' مجھے تو کوئی ڈر نہیں لگ رہا۔''

''سن میں نے تجھے کہا تھا نا کہ اس راستے سے مت جانا' تو پھر اس راستے سے کیوں جارہا ہے؟ تیرا دماغ خراب ہوگیا ہے کیا؟'' دوسری طرف سے اس کے دوست نے کہا۔

''یار! تو نے اس جگہ کے بارے میں جو کہا تھا' مجھے تو یہاں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ تیری وہ بدروحوں والی کہانی جھوٹی ہے۔'' اس نے کہا۔

''لیکن یار میں نے تو کئی لوگوں سے اس جگہ کے بارے میں سنا ہے۔ وہاں کسی عورت کا سایہ بھٹک رہا ہے۔'' فون پر بات سنائی دی۔

''ابے یار ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہ سب جھوٹی کہانی پھیلائی گئی ہے۔'' کار والے لڑکے نے کہا۔

''یار میں تجھے بعد میں کال کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے لائن ڈسکنکٹ کردی۔

تبھی اسے ایک عورت دکھائی دی۔ اس نے سوچا۔ کہیں تجھے سچ تو نہیں بول رہا تھا۔ نہیں نہیں شاید کوئی اس سنسان راستے پر بھٹک گئی ہے اور سوچنے لگا کہ یہ رات گئے اس سنسان جگہ پر کیا کررہی ہے جہاں ڈر کے مارے لوگ دن میں بھی آنے سے کتراتے ہیں۔ خیر کوئی بھی ہو' لگتا ہے راستے کی ہمسفر مل گئی۔

اس نے کار روکی اور عورت سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو کہاں جانا ہے۔''

''ہاں اس گھاٹی کے پاس۔'' اس عورت نے کہا۔

''آپ کا گھر ایسی سنسان جگہ پر ہے۔''

''ہاں مجھے ایسی جگہ پسند ہے۔''

اس نے دروازہ کھول دیا اور عورت اس کے برابر والی نشست پر بیٹھ گئی۔ ''آپ کا نام کیا ہے اور ایسی سنسان جگہ پر کب سے رہ رہی ہیں۔''

''میرا نام روزی ہے اور میں یہاں کئی سالوں سے رہ رہی ہوں۔''

لڑکے کو کچھ عجیب سا لگا کہ وہ عورت اٹک اٹک کر بول رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''آپ مجھے یہاں کی تو نہیں لگتیں؟ میرا مطلب ہے کہ آپ فارنر ہیں۔''

اس عورت نے کہا۔ پہلے میں یہاں آئی تھی لیکن مناسب جگہ نہ ملنے پر میں ایسی جگہ رہنے لگی۔''

''اوہ چلئے کوئی تو یہاں کی جگہ پر یقین رکھتا ہے کہ اس جگہ کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے۔'' لڑکے نے کہا۔

''تمہارا مطلب کیا ہے۔'' روزی بولی۔

''ارے آپ کو نہیں پتہ؟ میرا دوست' حتیٰ کہ شہر کے لوگ بھی کہتے ہیں کہ اس جگہ پر کسی روح کا سایہ منڈلاتا ہے۔''

روزی کافی دیر تک چپ رہی پھر اس نے کہا۔

''ہوں۔ لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہاں کسی کا سایہ ہے۔''

''کیا مطلب۔ کس کا سایہ۔'' لڑکے نے چونک کر پوچھا۔

''کئی سال پہلے کی بات ہے۔''

لڑکے نے بیچ میں بات کاٹ کر کہا۔ ''دیکھئے میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ آپ یہاں اکیلی رہتی ہیں یا آپ کے ساتھ کوئی ہے۔'' لڑکے نے ہنس کر کہا۔

''ہیں نا' خوبصورت وادیاں۔'' روزی نے بھی ہنس کر جواب دیا۔

''بہت خوفناک جگہ ہے' میں تو یہاں ایک سیکنڈ بھی نہ رہ سکوں۔ ایسی عجیب جگہ پر تو صرف جانور ہی رہ سکتے ہیں۔''

روزی کو غصہ آ گیا۔ ''اچھا تو کیا واقعی آپ روحوں سے نہیں ڈرتے۔''

''نہیں۔ جن کا وجود ہی نہ ہو ان سے کیا ڈرنا۔'' لڑکے نے بے خوفی سے کہا۔

''آپ نے کبھی پیار کیا ہے۔'' روزی نے اچانک بات کا رخ بدل دیا۔

''ہاں کافی لڑکیاں میری گرل فرینڈ رہ چکی ہیں لیکن ان سے میں صرف اپنا کام نکالتا ہوں۔'' لڑکا بولا۔

''اچھا' تب تو آپ کو پتہ ہی ہوگا کہ پیار میں کبھی اپنا فائدہ نہیں دیکھنا چاہئے۔ لڑکیوں پر بری نظر رکھنا نہایت غلط حرکت ہے۔''

''اوہ کم آن۔ میں نہیں مانتا' یہ سب بیکار کی باتیں ہیں۔'' لڑکے نے بیزاری سے کہا۔

''مان لیجئے' جس پریت کے بارے میں آپ کے دوست نے بتایا ہے' اگر وہ آپ کے سامنے آ جائے تو۔''

''میں تب بھی نہیں ڈروں گا۔'' لڑکے نے کہا اور ہنستے ہوئے کار ڈرائیو کرتا رہا۔

تبھی اسے کار کے بیک مرر میں لڑکی کا چہرہ دکھائی دیا' اس نے گھبرا کر روزی کی طرف دیکھا' وہ بولی۔ ''کیا ہوا' آپ تو ڈرتے ہی نہیں ہو اب ڈرو گے بھی اور مرو گے بھی۔ ہاہاہا۔'' کار میں روزی کے بھیانک قہقہے گونجنے لگے۔

گھبراہٹ کے مارے کار بری طرح لہرانے لگی اور بے قابو ہو کر پہاڑی سے نیچے جا گری۔ پہاڑیوں میں اس کی دلخراش چیخ کی بازگشت تھوڑی دیر تک پھیلی رہی پھر پہلے سا سناٹا چھا گیا۔

⁂

آصف خان دوسرے شہر سے تبادلہ ہو کر اس شہر میں ایس ایچ او مقرر ہوا تھا۔ اس وقت وہ ڈی آئی جی کے سامنے مؤدب کھڑا تھا۔

''تو انسپکٹر آصف خان۔ تم یہاں کراچی میں نئے ہو لیکن میں چاہتا ہوں تم آج سے ہی کیسز پر کام شروع کر دو۔''

''یس سر۔'' آصف خان نے سلیوٹ مارتے ہوئے کہا۔

آصف خان وہاں سے رخصت ہوکر پولیس اسٹیشن آ کر اپنے کیبن میں بیٹھ کر اور حوالدار بابو سے مخاطب ہو کے بولا۔ ”کیوں بابو آج کوئی کیس نہیں آیا۔“

”صاحب، کب کیا ہو جائے۔ کسی کو پتہ نہیں چلتا۔“ بابو نے کہا۔

اسی وقت ایک لڑکا بھاگتا ہوا تھانے میں آیا۔

”سر میرا ایک دوست کل سے غائب ہے۔“

”تمہارا نام کیا ہے۔“ آصف خان نے پوچھا۔

”میرا نام سنجے ہے، سر کل میرا دوست شہر سے باہر جا رہا تھا، میں نے اسے منع کیا تھا کہ کولا گھاٹی سے نہ جائے، مگر اس نے میری بات نہیں مانی اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنا موبائل سوئچ آف کر دیا۔“

”ہوسکتا ہے کہ وہ ابھی راستے میں ہو۔“ آصف خان نے خیال ظاہر کیا۔

”سر آپ نہیں جانتے، جو اس جگہ سے گزرا وہ زندہ نہیں بچا۔“ سنجے نے کہا۔

وہاٹ نان سنس۔ آخر اس جگہ میں ایسا کیا ہے۔“

”سر وہاں ایک بدروح کا سایہ ہے، جو ہر کسی کو جو رات کے اس پہر وہاں سے گزرتا ہے وہ اسے مار ڈالتی ہے۔“ سنجے نے جھرجھری لے کر کہا۔

”سر یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہاں جو بھی رات کے اس پہر گیا واپس نہیں لوٹا۔“

”سر آپ اس شہر میں نئے ہیں، مگر یہاں کے عام شہری تو کیا بڑے بڑے جغادری لوگ بھی اس جگہ سے گزرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ وہاں کئی حادثے ہو چکے ہیں اور ان میں کوئی نہیں بچا۔“ بابو نے سنجے کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

”چلو پھر اس کولا گھاٹی کے بارے میں معلومات کرتے ہیں کہ یہاں ایسا کیا ہے۔“ آصف خان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”یہاں ایسا کیا ہوا تھا کہ یہ لوگ اتنے سہمے ہوئے ہیں کہ وہاں کا نام لیتے ہی سب کے چہروں پر خوف چھا جاتا ہے۔“ اس نے حوالدار بابو سے پوچھا۔

”صاحب، لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ جن کے ساتھ ایسا حادثہ ہوا ہے......“

”دیکھو میں اس معاملے کی تہہ تک پہنچنا چاہتا ہوں۔“ آصف خان نے بابو کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”آپ کیوں ایک خطرناک کام میں پھنس رہے ہیں سر۔“ بابو نے اسے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس سے آپ کے لیے ہی مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔“

اور تب ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ انسپکٹر نے ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں وہاں سے کچھ ملا۔“

”سر! ہمیں یہاں ایک جلی ہوئی گاڑی ملی ہے اور اس میں ایک جلی ہوئی لاش بھی موجود ہے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”ٹھیک ہے میں وہاں آتا ہوں۔“ کچھ ہی دیر بعد آصف خان جائے حادثہ پر پہنچ چکا تھا۔

”بہت ہی عجیب جگہ ہے، ہاں تو تمہیں یہ جلی ہوئی لاش کہاں ملی تھی؟“ آصف نے اپنے جونیئر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”سر! ایسا لگتا ہے کہ یہاں کوئی ایکسیڈنٹ ہوا تھا، باڈی بالکل جل چکی ہے۔“ جونیئر نے بتایا۔

”تم سنجے کو فون کرو اور اسے یہاں بلاؤ، کہیں یہ باڈی سنجے کے دوست کی تو نہیں۔“ آصف نے رامو سے کہا۔

آصف خان کی ہدایت کے مطابق سنجے بھی اس جگہ پہنچ چکا تھا۔ ”سر یہ گاڑی تو میرے دوست کی

ہے۔ اوہ مائی گاڈ تمہیں اس راستے سے نہیں جانا چاہئے تھا۔" نجیے نے گاڑی پہچانتے ہوئے ہذیانی کیفیت میں کہا۔

"یہ قتل نہیں حادثہ بھی ہوسکتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قاتل یہیں کہیں چھپا ہوا ہو۔"

"نہیں سر! اگر یہ ذاتی دشمنی ہوتی تو وہ اسے شہر میں بھی مار سکتا تھا۔ اس ویرانے میں قتل کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی۔" جونیئر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو بھی قاتل ہے وہ اس علاقے کے لوگوں میں دہشت پھیلانا چاہتا ہے۔" آصف خان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"سر باڈی کا کیا کریں۔ جونیئر انسپکٹر نے پوچھا۔

"باڈی کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دو۔" آصف نے کہا اور نجیے سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"کہیں اس کا کوئی دشمن تو نہیں تھا۔"

"نہیں سر! یہ تو بکا پلے بوائے تھا۔ اسے تو لڑکیوں سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔"

شام کو اپنی ڈیوٹی سے واپس آ کر گھر میں بستر پر لیٹ کر ٹی وی دیکھتے ہوئے بھی آصف کا دماغ اسی جگہ کے اردگرد گھوم رہا تھا۔ "آخر اس پراسرار جگہ کا چکر کیا ہے۔"

دروازے پر بجنے والی بیل نے آصف کو اس کے خیالوں سے چونکایا۔ آصف نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور سامنے کھڑی لڑکی اس سے لپٹ گئی۔ "اوہ واؤ ہما تم کب آئیں؟"

"جب تم مصروف تھے۔ ساری باتیں یہیں کرو گے۔ اندر نہیں بلاؤ گے کیا۔" ہما نے اٹھلا کر کہا۔

"کیوں نہیں...... آؤ اندر آ جاؤ۔" آصف نے ایک طرف ہٹ کر اسے جگہ دیتے ہوئے کہا۔

"میں نے سنا ہے کہ تم یہاں ایس ایچ او کی پوسٹ پر ترقی پا کر آئے ہو۔"

"ہاں ہما۔"

"اور مجھے فون پر بتایا تک نہیں کہ تم اس جگہ نئے آئے ہو۔" ہما نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"چھوڑو ان باتوں کو چلو کسی ریسٹورنٹ میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" آصف نے کہا اور ہما کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر آ گیا۔

کچھ ہی دیر بعد اس کی گاڑی ایک ریسٹورنٹ کے باہر رک رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی آصف نے کہا۔ "ایک منٹ ہما! میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر آصف واش روم کی طرف بڑھ گیا' تب ہی اس کے موبائل کی بیل بجنے لگی۔

"ہیلو انسپکٹر آصف۔ میں فرانزک لیب سے ڈاکٹر فاروقی بول رہا ہوں۔ آدتیہ کی لاش میں سے ہمیں بہت کچھ ملا ہے۔ تم کل اس کی رپورٹ دیکھ لینا۔"

ڈنر سے فارغ ہونے کے بعد آصف نے ہما کو ڈراپ کیا اور گھر آ کر لباس تبدیل کر کے بیڈ پر دراز ہوگیا۔ نیند میں عجیب عجیب خواب آصف کو پریشان کرتے رہے۔ اس کے کانوں میں مدد مدد کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اسی شور میں اس کی آنکھ کھلی اس کا بدن پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ ان خوابوں کی وجہ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ جب کچھ سمجھ نہ آیا تو اس نے اپنے دماغ سے ان باتوں کو جھٹکا اور دوبارہ سونے کے لیے لیٹ گیا۔



صبح آصف خان لیب میں ڈاکٹر فاروقی کے پاس فرانزک رپورٹ دیکھ رہا تھا۔ "اس کی دونوں آنکھیں ایسے کھلی ہوئی ہیں جیسے اس نے کوئی بہت ہی دہشت انگیز چیز دیکھ لی ہو اور اس کا کھلا ہوا منہ بتا رہا ہے کہ اس نے چیخنے کی کوشش بھی کی ہوگی۔" ڈاکٹر فاروقی

نے آصف کو بتایا۔
"یہ ماجرا کیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے لیکن وہاں کوئی تو ہے جو ان سب کو مار رہا ہے اور مجھے اس راز سے پردہ اٹھانا ہی ہوگا۔" آصف نے پرسوچ انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ پتہ نہیں وہ ڈاکٹر فاروقی سے مخاطب تھا یا خود سے۔
ابھی وہ انہی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔ "سر! پھر ایک حادثہ ہوا ہے اور اس بار ایک لڑکی کی موت ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ایک سات سال کا بچہ بھی تھا جو سلامت ہے لیکن بہت زیادہ ڈرا ہوا ہے۔" دوسری طرف سے سب انسپکٹر نے بتایا۔
"میں ابھی آرہا ہوں۔" اسپتال پہنچنے میں آصف کو زیادہ دیر نہیں لگی۔
"سر یہ بچہ بالکل صحیح سلامت ہے لیکن لڑکی مر چکی ہے۔" آصف نے بغور لاش کا جائزہ لیا۔
"سر! اس کے پیٹ میں دھاری دار شیشہ پیوست ہے اور وہ چھوٹا لڑکا ایک کسان کا بیٹا ہے جس نے یہ لاش دیکھی اور چلاتا ہوا قریبی پولیس اسٹیشن پہنچ کر اطلاع دی۔" سب انسپکٹر نے کہا۔
"مجھے اس لڑکے سے ملنا ہے۔" آصف نے کہا اور رراموا سے لے کر لڑکے کے پاس آ گیا۔ آصف نے لڑکے کو چاکلیٹ دیتے ہوئے کہا۔ "کیا تم جانتے ہو کہ اس لڑکی کا خون کس نے کیا۔"
"میں نے اسے پیڑ سے جھولتے ہوئے پایا لیکن اسے نہیں دیکھ سکا جس نے اسے مارا۔" بچے نے چاکلیٹ کا مزا لیتے ہوئے کہا۔
آصف نے بچے کو ٹٹولنے کی کافی کوشش کی لیکن بچہ اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکا۔
"یہ سب کیا ہو رہا ہے......؟ یہاں روزانہ خون ہو رہے ہیں اور ہمارا ڈپارٹمنٹ کچھ نہیں کر پا رہا۔" آصف نے غصے سے کہا۔
"سر! یہ سلسلہ تو نہ جانے کتنے سالوں سے چل رہا ہے مگر کوئی آفیسر ڈر کے مارے وہاں تفتیش نہیں کرتا۔" حوالدار راموا نے کہا۔
"لیکن میں تو وہاں جا کر ہی رہوں گا اور پتا لگاؤں گا یہ ماجرا کیا ہے۔" آصف نے کہا۔
دن بھر کی تھکاوٹ کے باعث گھر آ کر بستر پر گرتے ہی آصف کو نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا اور پھر سے وہی خواب اسے پریشان کرنے لگے۔ مگر آج دہشت کی علامتیں کچھ زیادہ ہی تھیں اتنی کہ وہ خوف زدہ ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس کیس میں ضرور کوئی نہ کوئی تو گڑبڑ ہے اور مجھے اس معاملے کی تہہ تک پہنچنا ہوگا۔



آصف خان تھانے جانے کے لیے راستے میں ہی تھا کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے اسکرین پر دیکھا ایس پی صاحب کا نمبر تھا اور انہوں نے اسی وقت آصف کو اپنے دفتر میں طلب کیا تھا۔
ایس پی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی آصف نے سلیوٹ کیا۔ "سر! آپ نے مجھے یاد کیا۔"
"ہاں آصف خان! میں نے سنا ہے کہ تم ایک پرانے کیس پر کام کر رہے ہو اسی کولا گھاٹی والے کیس پر؟
"یس سر! مجھے اس جگہ کے بارے میں ایک بات بہت عجیب لگی' کئی لوگوں کا کہنا ہے کہ وہاں ایک روح بھٹکتی ہے جو رات کے وقت وہاں سے گزرنے والے انسانوں کو مار دیتی ہے۔"
"دیکھو آصف خان! میں جانتا ہوں کہ ہم ان سب باتوں پر یقین نہیں کرتے' لیکن یہاں کے لوگ خوف کے مارے اس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہیں کہ

وہاں کسی کا سایہ بھٹک رہا ہے۔ میری مانو تو تم اس لاحاصل کیس کو یہیں رہنے دو۔ تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا بلکہ ہوسکتا ہے کہ تم خود کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ۔'' ایس پی نے کہا۔

یہ بات سنتے ہی آصف کو ایک جھٹکا سا لگا کہ ایس پی صاحب یہ کیا کہہ رہے ہیں۔

''سر! پلیز' آپ ایسے نہ کہیں ہم پولیس والے ہیں اور ہمیں ہر کیس حل کرنا چاہیے۔ اگر ہم نے اس کیس پر دھیان نہیں دیا تو آئندہ کئی اور معصوم اپنی جان سے ہاتھ دھو سکتے ہیں۔ ہمیں پتہ لگانا ہوگا کہ یہ سب کیوں اور کس لیے ہو رہا ہے۔'' آصف نے ایس پی کی بات کو رد کرتے ہوئے کہا۔

''اس جگہ کے بارے میں کئی آفیسرز نے پتا لگانے کی کوشش کی لیکن کوئی اپنی جان نہیں بچا سکا۔ وہاں سب کو ایک چیز ملی اور وہ تھی موت' ایک بھیانک اور دہشت ناک موت۔ میں یہ تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ ہمارا ڈپارٹمنٹ تم جیسے قابل آفیسر سے محروم ہو جائے۔ آگے تمہاری مرضی۔'' ایس پی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''سوری سر! لیکن میں اس کیس پر کام کرنا چاہتا ہوں۔'' آصف خان نے ایک عزم کے ساتھ کہا۔

''اوکے...... جیسے تمہاری مرضی۔'' ایس پی نے افسردہ لہجے میں کہا۔ جیسے وہ جانتا ہو کہ آصف خان کا کیا انجام ہونے والا ہے۔

آصف خان نے وہاں سے نکل کر تھانے میں اپنی ذمہ داریاں نبھائیں اور شام کو ہما سے ملنے ریسٹورنٹ پہنچ گیا۔

''کیا بات ہے' تمہارے چہرے پر بارہ بلکہ ساڑھے بارہ کیوں بج رہے ہیں؟'' ہما نے اس کی اتری ہوئی شکل دیکھ کر پوچھا۔

''کچھ نہیں یار۔ ایس پی صاحب نے بلایا تھا۔''

''اور بلا کر یقیناً تمہاری نااہلی پر تمہیں جی بھر کر جھاڑا ہوگا۔ ہیں نا۔'' ہما نے مزے لیتے ہوئے کہا۔

''یہ بات نہیں۔ وہ مجھے منع کر رہے ہیں کہ میں کولا گھاٹی والے کیس پر مزید کام نہ کروں۔''

''آخر اس کیس میں ایسا کیا ہے؟'' ہما نے پوچھا۔

''کیا تم بھوت پریت پر یقین رکھتی ہو؟'' آصف نے الٹا اسی سے سوال کر دیا۔

''ہاں۔ مگر زیادہ نہیں۔''

''اس کیس میں یہی بات سب سے اہم ہے۔ کیا تم کولا گھاٹی کے بارے میں جانتی ہو۔''

''نہیں۔ مگر سنا ہے کہ وہ منحوس جگہ ہے' وہاں ہمیشہ کسی نہ کسی کا خون ہو جاتا ہے۔''

''میں اسی کیس پر کام کر رہا ہوں اور معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہے جو اتنی بے دردی سے انسانی خون بہا کر دہشت پھیلا رہا ہے۔'' آصف نے کہا۔

''جب ایس پی صاحب منع کر رہے ہیں تو تم اس کیس میں اپنا دماغ کھپانے کی کوشش کیوں کر رہے ہو۔ کتنے ہی آفیسروں نے کوشش کی ہوگی مگر کوئی بھی کامیاب نہیں ہو سکا۔''

''چاہے کچھ بھی ہو جائے میں اس کیس کی تہہ تک پہنچ کر رہوں گا۔'' آصف نے اپنا حتمی فیصلہ سناتے ہوئے کہا تو ہما اپنا سر کھجانے لگی' جیسے آصف کا یہ فیصلہ اس کے سر سے گزر گیا ہو۔

رات کو بستر میں لیٹے سوچتے سوچتے کب اس کی آنکھ لگ گئی اسے خود پتا نہیں چلا اور نیند میں ڈوبتے ہی وہی پریشان خواب اس کے دماغ میں ابھرنے لگے۔

❁❁❁

اپنے کیبن میں کرسی پر بیٹھے بھی آصف کو نیند کے جھونکے آ رہے تھے کیونکہ پریشان خوابوں نے اس کی نیندیں حرام کر کے رکھ دی تھیں۔ وہ اب بھی ان خوابوں کے بارے میں سوچ کر الجھ رہا تھا۔

"کیا ہوا سر؟ آج آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔" حوالدار رامو نے اس کے آگے چائے رکھتے ہوئے کہا۔

"سنو، مجھ سے پہلے اس کیس پر کون کام کر رہا تھا۔" آصف نے یکدم پوچھا۔

"سر! کام تو کئی افسروں نے کیا تھا لیکن بچا کوئی نہیں۔"

"تم اس بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"سر! میں نے کتنے افسروں کو اس کیس پر آتے جاتے دیکھا ہے۔ ایسے ہی ایک انسپکٹر تھے ان کا نام سلیم کور یجو تھا۔ ان کی موت پاگل پن سے ہوئی تھی۔ وہ کافی حد تک اس کیس میں آگے بڑھ گئے تھے لیکن معلوم نہیں ہو سکا کہ آخر ان کے ساتھ ہوا کیا تھا۔" رامو نے کہا۔

"تم ایسا کرو کہ وہ ساری فائلیں مجھے لا کر دو، ہو سکتا ہے اس سے کولا گھاٹی کے بارے میں مزید کچھ معلوم ہو سکے۔" آصف نے رامو کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

"جی سر! ابھی لاتا ہوں۔" رامو نے کہا اور تھوڑی ہی دیر میں فائلوں کا ایک ڈھیر آصف کی میز پر تھا۔

"سر ڈر کے مارے کئی افسروں نے اس کیس پر کام کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اسی لیے یہ کیس لاوارث اور بے نام ہو کر رہ گیا ہے اور میڈیا والوں نے وہاں کسی سائے کی موجودگی کی خبریں پھیلا کر لوگوں کو اور بھی ڈرا دیا ہے۔ ایسا سایہ جو ہر کسی کی جان لینے پر تلا ہوا ہے۔" رامو آصف سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"مجھے یہ کیس حل کرنے کے لیے کولا گھاٹی جانا ہی ہوگا۔" آصف نے ایک فائل کی گرد جھاڑتے ہوئے کہا۔

"سر! آپ ایک بار پھر سوچ لیں۔ وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔" رامو نے کہا۔

"ہم پولیس والے ہیں اور خطروں سے کھیلنا ہمارا کام ہے۔ اب میں ایسے ہی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کسی اور کی موت کی خبر کا انتظار کروں یہ مجھے منظور نہیں ہے۔ خیر اب مجھے یہ فائلیں چیک کرنے دو۔" آصف خان نے کڑے لہجے میں کہا۔

وہ ایک ایک کر کے فائلیں دیکھنے لگا اور ایک فائل میں کسی "رابرٹ ڈی سوزا" کے بارے میں لکھا ہوا تھا۔ اس نے آگے پڑھنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ سمجھ نہیں پایا۔

"ارے یہ آگے کی رائٹنگ سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی۔" آصف نے رامو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بہت پرانی فائلیں ہیں سر! آپ اپنا دماغ ہی خراب کر لیں گے پھر بھی کچھ نہیں ملے گا۔" رامو نے کہا۔

"کچھ بھی ہو، میں وہاں جانے کے لیے تیار ہوں۔" آصف نے کہا اور ایس پی کو فون کر کے اپنا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے کچھ دنوں کے لیے رخصت طلب کی۔

"ٹھیک ہے تم اس کیس کو ہینڈل کر سکتے ہو، میری طرف سے اجازت ہے لیکن اگر اس کیس پر کام کرتے ہوئے تمہیں کچھ ہو گیا تو میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ اس کیس پر کام کرنا تمہاری اپنی خواہش ہے جبکہ میں تمہیں منع بھی کر چکا ہوں۔ اگر تمہیں اب بھی اس کیس پر کام کرنا مناسب لگ رہا

ہے تو گو ہیڈ۔"

"تھینک یو سر۔" آصف نے یہ کہتے ہوئے لائن کاٹ دی۔

❁❁❁

اگلے دن آصف ایک بیگ میں اپنا سامان پیک کر رہا تھا کہ ہما نے چپکے سے اس کے پیچھے آ کر زور کی چیخ ماری اور آصف بری طرح سے اچھل پڑا۔ "ارے لڑکی، تم نے تو مجھے مار ہی دیا تھا۔" آصف نے اپنے دل کی دھڑکن پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"ارے کیسے پولیس والے ہو تم۔ اتنی سی بات پر ڈر گئے۔" ہما نے اسے چڑاتے ہوئے کہا۔

"پتا نہیں کچھ دنوں سے ایک عجیب سا خوف میرے اوپر سوار ہو گیا ہے، ایسا خوف جسے میں خود بھی نہیں سمجھ پا رہا۔" آصف نے کہا۔

"تم مذاق کر رہے ہو نا؟ پہلے تو تم بہت نڈر ہوا کرتے تھے، اب کیا ہو گیا ہے۔"

"پتا نہیں جب سے کولا گھاٹی والا کیس دیکھ رہا ہوں، تب سے ایسا ہو رہا ہے۔" آصف بولا۔

"کیا تم اب بھی یہ کیس ہینڈل کرنا چاہتے ہو۔" ہما نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"ضرور کروں گا۔ مجھے یہ کیس باقی کیسوں سے بالکل ہٹ کر محسوس ہو رہا ہے، اس کیس میں ایک چیلنج سا لگ رہا ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ اس جگہ کچھ نہ کچھ تو ہے، کچھ ایسا جس سے ہم سب انجان ہیں۔"

"تو اس کا کیا مطلب؟" ہما نے بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں جا رہا ہوں۔"

"بھوت سے ڈر کر شہر چھوڑ کر بھاگ رہے ہو۔" ہما نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"بھوت سے ڈر کر نہیں بھاگ رہا بلکہ بھوت کے ٹھکانے پر جا رہا ہوں۔ اس کیس کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے مجھے کچھ دن وہاں رہنا ہو گا۔" آصف اٹل لہجے میں بولا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم...... تم وہاں اس گھاٹی میں جاؤ گے۔ نہیں تم وہاں نہیں جاؤ گے، وہاں سے کوئی واپس لوٹ کر نہیں آتا۔ پلیز آصف، اپنا ارادہ بدل دو۔" ہما جلدی سے گھبرا کر بولی۔

"پلیز ہما! مجھے روکنے کی کوشش مت کرو۔ یہ میرے فرض کا تقاضا بھی ہے اور تم فکر مت کرو، میں وہاں سے صحیح سلامت زندہ واپس آؤں گا۔" آصف نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا اور بیگ کندھے پر لٹکا کر گھر سے باہر آ گیا۔ ہما بھی اس کے پیچھے نکل آئی۔

"وہ جگہ بہت خطرناک ہے۔ وہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تم وہاں مت جاؤ۔" ہما نے ایک بار پھر التجا کی مگر آصف پر کوئی اثر نہیں ہوا، اس نے بیگ کار کی پچھلی نشست پر پھینکا اور کار آگے بڑھا دی۔ ہما اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی، اس کے چہرے پر اداسی اور مایوسی پھیل گئی تھی۔

❁❁❁

کار تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی اور شہر سے باہر نکلنے کے بعد موت کے راستے پر دوڑ رہی تھی۔ ایک موڑ کاٹتے ہوئے آصف کو اس وقت جھٹکا سا لگا جب اسے محسوس ہوا کہ کار کے بریک فیل ہو چکے ہیں اور اس کے ساتھ ہی عجیب عجیب سی آوازیں اس کے کانوں میں گونجنے لگی تھیں۔ اسی کشمکش میں اس کی کار ایک درخت سے ٹکرائی اور توازن کھو کر پہاڑی سے نیچے کھائی میں گرنے لگی۔

❁❁❁

جب کار نیچے گر رہی تھی تب آصف کے ذہن

میں یہی بات گونج رہی تھی کہ کیا وہ اب نہیں بچے گا۔ کیا یہ اس کی زندگی کا آخری سفر ہے۔اس کے کانوں میں ایس پی صاحب اور ہما کی آوازیں آرہی تھیں جو اسے منع کر رہی تھیں کہ وہ کولا گھاٹی کیس کو بھول جائے۔خوابوں میں نظر آنے والا ڈر بھی اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔

کار آصف کے خیالوں سے بے خبر نیچے کے سفر پر رواں تھی' آصف نے اپنی آنکھیں بند کرلیں' یہ سوچ کر کہ کسی بھی پل یہ سب ختم ہوجائے گا۔آخر اس بار بھی وہ سایہ جیت گیا اور قانون اس تک پہنچنے سے پہلے ہی موت کے منہ میں جا رہا تھا۔ یہی سوچتے سوچتے آصف کے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا اور وہ بے ہوشی کی حدوں کو چھونے لگا۔

❂ ❂ ❂

آصف نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں تو اس نے خود کو ایک چھوٹے سے گھر میں پایا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ وہ یہاں تک کیسے پہنچا۔ اسی وقت سامنے سے آتے ایک بوڑھے کو دیکھ کر وہ پھر سے ڈر گیا۔

''تمہیں بہت چوٹیں آئی ہیں' لیٹے رہو' تم ابھی پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہوئے ہو۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔'' بوڑھے نے پرسکون لہجے میں کہا۔

''میں کہاں ہوں اور یہاں پر کیسے پہنچا۔'' آصف نے پوچھا۔

''میں جانتا تھا کہ تم یہ سوال ضرور پوچھو گے۔ چلو بتا دیتا ہوں' جب تمہاری کار کھائی میں گر رہی تھی تو دروازہ کھل جانے سے تم کار سے باہر گرے اور ایک جھاڑی میں اٹک گئے تھے جبکہ تمہاری کار نیچے کھائی میں جا گری تھی۔'' بوڑھے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن آپ یہاں ایسی جگہ پر کیسے رہتے ہیں۔ میں نے تو سنا ہے کہ اس کولا گھاٹی میں ایک سایہ بھٹک رہا ہے جو یہاں آنے والے کسی انسان کو زندہ نہیں چھوڑتا۔'' آصف نے اپنے دماغ میں ابھرتے سوال کو زبان پر لاتے ہوئے کہا۔

''ہاں رہتا ہے۔ بہت پرانا سایہ یہاں رہتا ہے۔لیکن وہ بیچاری تو صرف اپنے دشمن کو ڈھونڈ رہی ہے' جب کوئی کسی کے ساتھ دھوکا کرے تو کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔'' بوڑھے نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''آپ کو اس سائے کے بارے میں اتنا کچھ کیسے پتا چلا اور آپ شہر سے اتنی دور اس ویرانے میں کیا کر رہے ہیں؟'' آصف نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا کروں یہ اجاڑ وادیاں کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ مجھے کہتی ہیں کہ ہر مصیبت کی جڑ انسان ہے۔ ان شیطانوں سے دور ہی رہنا چاہیے' جو آپ کو کہیں کا نہیں چھوڑتے۔'' بوڑھا ہنستے ہوئے بولا۔

''دیکھیں بابا' میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔ آپ مجھے صاف صاف بتائیں کہ یہاں ہوا کیا تھا' آپ اس سنسان جگہ پر بنا کسی ڈر کے کیسے رہ رہے ہیں' کیا آپ کا کوئی عزیز رشتے دار نہیں' کیا آپ اس سائے کو جانتے ہیں؟'' آصف نے بوڑھے پر سوالوں کی بوچھاڑ کردی۔

''سب سوالوں کے جواب تمہیں بغیر کسی پریشانی کے مل جائیں گے۔تم اتنا کچھ کیوں جاننا چاہتے ہو؟ یہاں کوئی آتا جاتا نہیں۔ یہاں مجھے کس بات کا ڈر' تم یہی سوچ رہے ہو نا کہ کوئی جانور یا کوئی اور چیز میری زندگی کے لیے خطرہ بن سکتی ہے' میری زندگی تو ویسے بھی اسی دن ختم ہوگئی تھی جب میرے ساتھ وہ حادثہ ہوا تھا۔'' بوڑھے نے نہایت رسانیت سے کہا۔

آصف کو بوڑھے کی باتیں مزید الجھا رہی تھیں۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آخر بوڑھا کہنا کیا چاہتا ہے۔

''اب میں واپس کیسے جاؤں گا۔'' آصف نے

بوڑھے سے پوچھا۔

''یہاں بہت خطرہ ہے۔تم یہاں سے کہیں جانا بھی نہیں۔''بوڑھے نے کہا۔

''میں یہاں اس سائے کا پتا لگانا چاہتا ہوں۔ میں انسپکٹر آصف خان ہوں اور میں اس سائے کا پتا اس لیے لگانا چاہتا ہوں تاکہ میں جان سکوں کہ آخر وہ ہے کون؟ جو اس راستے سے گزرنے والے معصوم انسانوں کی جانوں سے کھیل رہا ہے اور میں یہ جان کر ہی رہوں گا۔'' آصف نے کہا۔

''جیسے تمہاری مرضی لیکن اب تم ہی وہ انسان ہو' جس سے اسے کچھ امید ہے۔ورنہ اس جہنم نما گھاٹی میں مزید خون بہتا رہے گا۔'' بوڑھا یہ بڑبڑاتے ہوئے گھر سے باہر نکل گیا۔

آصف نے سوچا اب کیا کروں؟ سب کچھ کار میں تھا' وہ تو کار کے ساتھ ہی جل چکا ہوگا۔ یہ میں کہاں آ کر پھنس گیا ہوں۔لیکن......لیکن اس سائے نے مجھے کیوں نہیں مارا؟ یہ سوال بار بار اس کے ذہن کو جھٹکے دے رہا تھا اور اس کا ذہن مزید الجھتا جا رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے لیکن کچھ بھی ہو اسے پتہ لگانا ہی تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا۔ایسے بیٹھے رہنے سے تو کام نہیں چلے گا۔اس ویرانے میں وہ کسی سے رابطہ بھی نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی کسی سے بات کر سکتا تھا۔

اسے اپنے موبائل کا خیال آیا۔اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو موبائل موجود تھا۔اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی مگر کچھ ہی لمحے بعد اس کے چہرے پر پھر مایوسی پھیل گئی کیونکہ موبائل کام نہیں کر رہا تھا۔شاید گرنے کی وجہ سے اس میں کوئی نقص پیدا ہو گیا تھا۔وہ بے بسی سے موبائل کو گھورنے لگا پھر کوئی فیصلہ کر کے وہ بوڑھے کی تلاش میں گھر سے باہر نکلا۔

''ارے یہ بابا کہاں چلا گیا۔اتنی جلدی......ضرور اس بابا کو ہی کچھ پتا ہوگا۔لیکن مجھے گھر میں بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ملے گا۔ میں اس سائے کو ڈھونڈ کر ہی رہوں گا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور ایک طرف کو چل پڑا۔کڑکتی دھوپ' سنسان وادی' دور دور تک کوئی نہیں تھا۔آصف کو رہ رہ کر یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ کہیں وہ کسی مایا جال میں تو نہیں پھنس گیا۔ اس نے کبھی بھوت پریت پر یقین نہیں رکھا تھا اور نہ ہی کبھی اس کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ ہوا تھا تو پھر یہ کیسا ڈر تھا جو اسے ہر پل ڈرائے جا رہا تھا۔ چلتے چلتے نقاہت کے مارے بے بس ہو کر آصف گر پڑا' زخموں' بھوک اور پیاس کی کمزوری کی وجہ سے وہ اب اٹھ بھی نہیں پا رہا تھا۔اسے ہر جگہ بس وہ سایہ ہی نظر آ رہا تھا جو کسی بھی پل اس کی جان لے سکتا تھا۔

آصف بار بار اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ہر بار واپس گر جاتا۔

کڑکتی دھوپ میں وہ خود کو مرجھایا ہوا محسوس کر رہا تھا۔پھر آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اس نے خود کو جگائے رکھنے کی کافی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔زخموں نے اسے لاچار کر دیا تھا۔ وہ زیادہ دیر خود سے نہیں لڑ سکا اور بے ہوشی کے قریب پہنچ گیا لیکن مدہوشی کے عالم میں بھی اس کے ذہن میں یہی چل رہا تھا کہ وہ کس عجیب صورت حال میں پھنس گیا ہے۔

اسی حالت میں اسے اپنے سامنے ایک بہت پرانی حویلی نظر آنے لگی۔اسے لگا کہ اسی حویلی سے اس کے ہر سوال کا جواب مل سکتا ہے۔اس نے اپنی پوری قوت صرف کر کے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھ نہیں پا رہا تھا۔

نیم وا آنکھوں سے اس نے ایک لڑکی کو اپنی

طرف آتے دیکھا تو کچھ گھبرا گیا کہ کہیں یہ وہی سایہ تو نہیں اور اس بار یہ ڈر اسے بے ہوشی کی منزلوں تک لے گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو حویلی کے اندر ایک قدیم طرز کے پلنگ پر لیٹے ہوئے پایا۔ ابھی وہ اس جگہ کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ ایک لڑکی اندر آئی وہ یک ٹک اس لڑکی کو دیکھنے لگا تب ہی اس لڑکی نے اپنی کھنکتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''آپ اس جگہ آ کر کیسے پھنس گئے' یہاں تو کوئی آتا جاتا ہی نہیں۔''

''نہیں' دراصل وہ میں ایک کیس کے سلسلے میں ایک خونی کو ڈھونڈ رہا ہوں جو کئی معصوم جانیں لے چکا ہے' جو یہیں آس پاس دیکھا گیا ہے لیکن آپ اور یہ محل تو میں نے پہلے نہیں دیکھا۔'' آصف نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

اور آصف کی بات سنتے ہی لڑکی کا کھنکتا ہوا قہقہہ کمرے میں گونجنے لگا۔ ''یہ محل نما حویلی تب سے ہے جب اینڈ ریوز اور لوہانہ یہاں آئے تھے۔''

''یہ لوگ کون تھے۔''

''ارے آپ کو نہیں پتا۔'' لڑکی نے حیرت سے پوچھا۔ ''انہوں نے ہی تو یہ محل بنوایا تھا۔ شہر سے دور اس جگہ پر کوئی آتا جاتا نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے اس جگہ کو اپنی رہائش کے لیے چُنا۔''

''تو آپ یہاں ایسی سنسان جگہ پر کیسے رہ رہی ہیں اور آپ ضرور اس بوڑھے آدمی کو بھی جانتی ہوں گی جس نے مجھے کھائی میں گرنے سے بچایا تھا۔'' آصف نے پوچھا۔

''کون بوڑھا آدمی؟ میں تو ایسے کسی آدمی کو نہیں جانتی جو یہاں رہتا ہو۔'' لڑکی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

آصف نے سوچا۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ اب اسے ہوشیاری سے ہی پتہ لگانا ہوگا۔ کچھ سوچ کر وہ بولا۔ ''آپ یہاں اکیلی رہتی ہیں یا آپ کے ساتھ اور کوئی بھی رہتا ہے؟''

''نہیں کوئی نہیں رہتا۔ میں یہاں اکیلی ہی رہتی ہوں اور اکیلے ہی ان نظاروں سے لطف اندوز ہوتی ہوں۔'' لڑکی نے کہا۔

''کیا آپ کے پاس فون ہے۔ مجھے ایک کال کرنی ہے۔'' آصف نے پوچھا۔

''نہیں وہ ڈس کنیکٹ ہے۔''

وہ اب بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اب جو بھی کرنا تھا اس نے خود ہی کرنا تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے لڑکی سے حویلی دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو لڑکی نے کھلے دل سے اسے اجازت دے دی۔ وہ پوری حویلی میں گھوم پھر کر دیکھنے لگا لیکن اسے کوئی تیسرا فرد نظر نہیں آیا۔ وہ بالائی کمرے کا جائزہ لے رہا تھا کہ وہ لڑکی دوبارہ آئی اور اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''آپ کھانے کے لیے نیچے آ جائیں۔''

وہ اب بھی پریشان تھا کہ یہ اکیلی لڑکی اس ویرانے میں کیا کر رہی ہے۔ کیا اسے اس سنسان جگہ پر رہتے ہوئے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا۔ یہی سوچتے ہوئے آصف نیچے ڈائننگ ٹیبل پر آ گیا۔ میز پر وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے اور طویل میز کے گرد لگی ہوئی باقی کرسیاں خالی پڑی تھیں۔

''کھانا تو بہت ہی لذیذ تھا۔'' آصف نے کھانے کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''شکریہ۔''

کھانے کے بعد وہ سٹنگ روم میں آ گئے جہاں ایک الماری میں لگی کتابیں دیکھ کر آصف نے کہا۔

"ارے آپ کے پاس تو کتابوں کا پورا خزانہ موجود ہے۔آپ تو یہ سب کتابیں پڑھ چکی ہوں گی۔"

"جی پڑھ چکی ہوں۔"

"تبھی تو ان سب پرانی گرد جمی ہوئی ہے۔ارے میں تو پوچھنا ہی بھول گیا کہ آپ کا نام کیا ہے۔" آصف کو جیسے اچانک کچھ یاد آ گیا۔

"اوہ۔میرا نام روزی فرنانڈیس ہے۔میں یہاں تیس سال پہلے اپنے باپ کے ساتھ آئی تھی لیکن یہاں آنے کے کچھ ہی دنوں بعد ان کا انتقال ہو گیا۔"

"اوہ افسوس ہوا یہ سن کر لیکن آپ مجھے غیر ملکی تو نہیں لگتیں۔آپ کہاں کی ہیں؟"

"میں نیوزی لینڈ کی ہوں اور میں یہاں اکیلی ہی رہتی ہوں۔" لڑکی نے کہا۔

"آپ اردو اچھی بول لیتی ہیں۔" آصف بولا۔

"تھینکس۔" روزی نے کہا اور باتوں کا رخ بدلتے ہوئے بولی۔"آپ کی کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے کیا۔"

"نہیں صرف ایک فرینڈ ہے۔ابھی ہم نے کچھ سوچا نہیں ہے۔آپ کے پاس تو کافی رومانوی کتابیں ہیں۔" آصف نے دوبارہ کتابوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ویسے یہ سن کر اچھا نہیں لگا کہ آپ جیسے جوان کی کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔" روزی بولی۔

"پیار کرنے والے کو پیار ڈھونڈنا نہیں پڑتا۔" آصف نے کہا۔"پیار تو خود بہ خود دل جاتا ہے۔"

"اور اگر وہ پیار بے وفائی پر اتر آئے تب کیا کرنا چاہیے۔"

"پہلے پیار کو سمجھنا چاہیے اسے جاننا چاہیے۔اندھے پیار سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔" آصف نے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا۔

روزی ہنس کر اپنے کمرے میں جانے لگی۔اس کے جانے کے بعد آصف کو بھیانک آوازیں سنائی دینے لگیں۔وہ کھڑکی کے پاس آ کر باہر جھانکنے لگا تب اسے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا۔اس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا تو روزی کھڑی تھی۔

"باہر جنگل میں خونخوار جانور ہیں کبھی بھی حملہ کر سکتے ہیں اور رات میں ان کی آوازیں نہایت ڈراؤنی محسوس ہوتی ہیں۔بہتر ہوگا کہ آپ باہر نہ جائیں۔" روزی نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔"تو کیا آپ کو یہاں اکیلے میں ڈر نہیں لگتا۔"

"نہیں میں تو یہاں کب سے رہ رہی ہوں مجھے کس بات کا ڈر۔میرے خیال سے آپ کو اپنے کمرے میں جا کر آرام کرنا چاہیے۔" روزی نے کہا۔

آصف نے سر ہلایا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔اسے اپنی طبیعت میں کچھ عجیب سا محسوس ہونے لگا اور اس پر مدہوشی سوار ہونے لگی۔اس نے روزی کو اپنے پاس آتے دیکھا۔روزی قریب آ کر پائنتی پر بیٹھ گئی اور آصف کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

"یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔" نیم مدہوشی کے عالم میں آصف نے پوچھا۔

"آپ نے میرا دل جیت لیا ہے اور آج کی رات میں یہیں رہوں گی آپ کے کمرے میں۔" یہ کہتے ہوئے روزی نے کمرے میں جلنے والی بڑی سی موم بتی بجھا دی اور کمرے کے ساتھ ساتھ آصف کو اپنے اندر بھی اندھیرا پھیلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔باہر رات دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔

❁❁❁

اگلی صبح جب آصف بیدار ہوا تو اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ کل رات اس نے کیا کر ڈالا۔وہ

حویلی میں لڑکی کو تلاش کرنے لگا لیکن وہ غائب تھی۔ وہ چکرا کر رہ گیا تھا۔ وہ جس کام کے لیے یہاں آیا تھا اس کا سر پیر ہی معلوم نہیں ہو رہا تھا۔

آصف کو یہ حویلی ایک کھنڈر سی لگ رہی تھی۔ اس نے سوچا لڑکی اور اس بابا کو ڈھونڈا جائے اور ان سے ایک بار پھر پوچھ تاچھ کی جائے کہ وہ اس ویرانے میں ایسے کیسے رہ رہے ہیں۔ یہاں اتنا کچھ ہو گیا ہے اور انہیں کچھ پتا ہی نہیں۔ یہ تو ناممکن سی بات لگتی تھی۔

آصف حویلی سے باہر آ کر ان دونوں کو تلاش کرنے لگا لیکن اسے کوئی نظر نہیں آیا اور یہ ایسی بات تھی جو اس کی سمجھ سے باہر تھی کہ آخر وہ دونوں کہاں غائب ہو گئے اور اسے اس بات پر بھی حیرت ہو رہی تھی کہ ایسی بھیانک جگہ پر وہ خود اب تک کیسے بچا ہوا ہے۔

اچانک اسے وہی بوڑھا جاتا دکھائی دیا اور آصف نے کوئی پل ضائع کیے بغیر اسے جا لیا۔ ”دیکھیں بابا میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کون ہیں؟ اور وہ لڑکی کون تھی جو غیر ملکی ہے، وہی لڑکی جس سے میں کل رات محل میں ملا تھا۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے یہاں؟“

”تم بہت قسمت والے ہو کہ تم اس کی منشا پوری کر سکتے ہو۔ وہ کب سے تمہارے ہی انتظار میں بھٹک رہی تھی۔ اب اسے کچھ انصاف ملے گا۔“

”مجھے پتا ہے کہ آپ اس لڑکی کو جانتے ہیں، اس لڑکی کو جس کا نام روزی فرنانڈیس ہے۔“

”ہاں میں اس بیچاری کو جانتا ہوں۔ اسے تو صرف انصاف چاہیے۔ جسے تم ہی دلا سکتے ہو۔“ بوڑھے نے کہا۔

”کیسا انصاف، آخر وہ روزی ہے کون، ایک بدروح یا کوئی قاتل ہے، وہ ایسے بھیانک محل میں اکیلی کیسے رہ رہی ہے؟ بابا آپ ذرا تفصیل سے وضاحت کریں۔“ آصف نے کہا۔

”تمہارے سارے سوالوں کے جواب تمہیں نہیں مل سکتے۔ تمہیں اس محل میں واپس جانا ہوگا تب جا کے تم اسے انصاف دے پاؤ گے۔“ بوڑھے نے کہا۔

”لیکن مجھے تو وہاں کچھ نہیں ملا۔“

”جو بظاہر نظر آتا ہے وہ ہوتا نہیں اور جو ہوتا ہے وہ بظاہر نظر نہیں آتا۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔

یہ کہہ کر بوڑھے نے ایک لمبی سانس لی اور وہاں سے غائب ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے تو آصف کے پورے بدن میں جھرجھری سی پھیل گئی لیکن پھر اس نے اپنی حالت پر قابو پا لیا۔ اوہ یہ بوڑھا بھی ایک بدروح ہے، مجھے پتا کرنا ہی ہوگا کہ یہاں کیا چکر ہے، نہیں تو پتا نہیں کتنے اور معصوم اس شیطان کے ہاتھوں مارے جائیں گے۔

محل میں دوبارہ جانے کا سوچ کر آصف کو ڈر بھی لگ رہا تھا۔ مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس تمام الجھے ہوئے معاملے کی کڑی وہیں سے مل سکتی ہے۔



رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا آصف ہمت کر کے محل میں واپس آ گیا، محل کی کھڑکیاں اور دروازے ایسے کھلے ہوئے تھے جیسے اپنی بے زبانی سے کچھ کہہ رہے ہو۔ مکمل اندھیرا پھیلنے سے قبل آصف ایک بار پھر محل کی تلاشی لینے لگا۔ مٹی کے بنے ہوئے مجسمے بے بسی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ کچھ کھوج کے بعد اسے ایک سرنگ دکھائی دی اور وہ اس سرنگ میں اترتا چلا گیا۔

اسی وقت ایک تیز آواز گونجی اور کتابوں کا ایک بنڈل اچانک آصف کے سامنے آ گرا وہ گھبرا گیا لیکن جلد اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پا لیا۔ اس نے

ایک کتاب اٹھا کر کھولی جس میں گوتھک ازم کے بارے میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ اس نے کچھ ورق الٹے تو اسے ایک جگہ ''روزی/رابرٹ سے پیار کرتی ہے'' لکھا ہوا نظر آیا اور اسے کچھ کچھ یاد آنے لگا۔

''ارے یہ تو وہی نام ہے جو میں نے کیس کی فائلوں میں دیکھا تھا۔ اس رابرٹ کا نام یہاں کیوں۔''

ابھی وہ ان ہی خیالوں میں گم تھا کہ اسے کسی کے رونے کی آواز آئی۔ وہ بھاگتا ہوا سرنگ سے باہر آیا۔ رونے کی آواز چھت سے آ رہی تھی وہ تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر پہنچا۔ وہاں ایک لڑکی رو رہی تھی۔ آصف اس کے پاس آیا اور تسلی دینے کے لیے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا' وہ لڑکی پلٹی اور زور زور سے مدد مدد کہہ کر چلانے لگی۔

آصف نے جب اس کی شکل دیکھی تو اس کے اوسان خطا ہو گئے' کیونکہ یہ وہی لڑکی تھی جس کی لاش وہ کنویں میں دیکھ چکا تھا۔ وہ گھبرا کر پیچھے کی جانب ہٹا اور اپنا توازن کھو کر چھت سے نیچے گرنے لگا۔ جس جگہ وہ گر رہا تھا اس کے عین نیچے ایک کنواں تھا' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کنویں میں اترتا چلا گیا۔ کچھ دیر کے لیے تو اس کے حواس گم ہو چکے تھے اور جب وہ ہوش کی دنیا میں واپس آیا تو اس نے اپنے سامنے ایک لڑکی کی لاش دیکھی۔ جسے دیکھ کر اس پر مزید گھبراہٹ سوار ہوگئی اور وہ کنویں سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ بڑی جدوجہد کے بعد وہ کنویں سے باہر آنے میں کامیاب ہوا تو اس نے چین کی سانس لی لیکن وہ بری طرح زخمی ہو چکا تھا۔ کچھ زخم اسے کھائی میں گرنے سے آئے تھے اور کچھ تازہ زخم اس کنویں میں گرنے سے۔

اس نے دونوں ہاتھ چہرے پر پھیر کر سامنے کی طرف دیکھا تو پھر ایک لڑکی کو کھڑے دیکھا۔

''کون ہو تم......؟ تم کسی انسان کو ہائی وے کراس کرنے کیوں نہیں دیتیں' کیوں......؟'' آصف نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''یہ میری زندگی کی ایک لمبی کہانی ہے۔ ایک ایسا پیار جس نے پیار کے نام پر مجھے دھوکا دیا بلکہ پوری زندگی میرے ساتھ دھوکا کرتا رہا اور اسی پیار کے نام پر میری زندگی برباد کر دی۔'' لڑکی دکھی لہجے میں بولی۔

''میں جانتا ہوں کہ تم غیر ملکی ہو' مگر یہاں سے گزرنے والے ہر انسان کو کیوں مار رہی ہو۔'' آصف نے پوچھا۔

''کیونکہ میرا دوست گوتھک تھا اور میں وہاں رہنے آئی تھی' جہاں کوئی نہیں رہتا تھا۔ میرے والد کا سلوک میرے ساتھ بہتر نہیں تھا کیونکہ میں ان کی سوتیلی بیٹی تھی۔ میری ماں مر چکی تھی۔ میرے والد نے کبھی میری پروا نہیں کی' کبھی مجھے باپ کی شفقت نہیں دی' ایسے میں مجھے ایک دوست ملی جس نے مجھے اکیلے پن سے نجات دلائی اور میں اس کے کہنے پر اپنے باپ کا گھر چھوڑ کر پاکستان آ گئی اور اس خطرناک جگہ آ کر رہنے لگی حالانکہ میں اور میری دوست اس جگہ رہنا نہیں چاہتے تھے اور پھر ایک آدمی میری زندگی میں آیا جو مجھے بہت پیار کرتا تھا اور میں بھی اسے ٹوٹ کر چاہتی تھی' وہ اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ اس جگہ گھومنے آیا تھا لیکن......'' یہ کہہ کر روزی رک گئی۔

''لیکن کیا......؟'' آصف نے بے صبری سے پوچھا۔

''لیکن میں جانتی ہوں کہ اس نے مجھے مار دیا۔ اس نے میرا اور میری دوست کا ریپ کر کے مجھے مار دیا۔ مجھے مارنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ میری جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے مار کر اس پرانے

کنویں میں ڈال دیا، جس میں تم نے میری لاش دیکھی تھی اور اس نے وہ تمام ثبوت مٹا دیئے جو اسے مجرم ثابت کر سکتے تھے اور میری روح اس حویلی میں اکیلی ہی رہ گئی۔ میرے دل میں مردوں کے لیے نفرت پیدا ہو چکی تھی، نفرت کی اس شدت نے میری روح کو بدروح بنا دیا اور میں اس حویلی کے پاس سے گزرنے والے ہر انسان کو مار کر اپنے غصے کی آگ ٹھنڈی کرنے کی کوشش کرنے لگی حالانکہ اپنی زندگی میں، میں نے کبھی ایک چیونٹی بھی نہیں ماری تھی۔'' یہ کہہ کر وہ دوبارہ رونے لگی۔

''میں جان چکا ہوں کہ تم بہت اچھی تھیں لیکن تمہارے ساتھ بہت برا ہوا مگر تمہارے دوست کا کیا ہوا؟ تمہاری موت کے بعد انہوں نے یقیناً اسی دن یہ شہر چھوڑ دیا ہوگا۔'' آصف نے پوچھا۔

''نہیں، میں اسے مارنا چاہتی تھی لیکن اسے صرف میرے پیسے سے پیار تھا۔ میں نے اس کے تمام دوستوں کو مار دیا لیکن وہ میری تمام رقم لے کر یہاں سے بھاگ گیا اور مجھے اس حویلی میں اکیلا چھوڑ دیا۔''

''تمہارے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے لیکن تم ایسے کب تک کرتی رہو گی، کب تک بے گناہوں کے خون سے کھیلتی رہو گی۔ کب تک لوگوں کی جانوں سے کھیل کر اپنی نفرت کی آگ کو ٹھنڈا کرتی رہو گی۔ اگر ایسا کرنے سے تمہیں سکون ملتا ہے تو آؤ مجھے بھی مار دو۔ آؤ...... آؤ، تمہیں بلاوجہ خون بہانے کا شوق ہے تو آؤ، میں تمہیں نہیں روکوں گا۔''

''میں تمہیں نہیں مار سکتی کیونکہ تم واحد انسان ہو جس پر میں نے بھروسہ کیا ہے۔ کیا تم میری مدد کرو گے؟''

''لیکن رابرٹ کا پتا تو لگانا ہی پڑے گا مگر وہ مجھے ملے گا کہاں؟ پتا نہیں وہ اب تک زندہ بھی ہے یا نہیں۔'' آصف نے کہا۔

''وہ زندہ ہے کیونکہ صرف میں ہی اسے مار سکتی ہوں۔''

''اور میں نہیں چاہتا کہ اس دوران تم بے گناہوں کو کوئی نقصان پہنچاؤ۔ مجھے تمہارے اور رابرٹ کے بارے میں جاننا ہوگا۔''

اسی وقت پو پھٹنے لگی تھی۔ ''میں جا رہی ہوں، ورنہ سورج کی کرنیں مجھے جلا دیں گی۔'' روزی نے کہا اور ہوا کے تیز جھونکے کے ساتھ وہاں سے غائب ہو گئی۔

روزی کے غائب ہونے کے بعد آصف سوچنے لگا کہ اب مجھے اس رابرٹ ڈی سوزا کا پتا لگانا ہی ہوگا، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے پاکستان چھوڑ دیا ہو کیونکہ اس واقعے کو کئی برس بیت چکے ہیں۔

جونہی آصف مڑا اسے وہی بوڑھا دکھائی دیا۔

''ارے تم وہی بابا ہو نا۔ مجھے جاننا ہے کہ یہ سب کیا ہے اور تم کون ہو اور اتنے سالوں سے یہاں کیوں بھٹک رہے ہو۔''

''بیٹا! یہ بہت لمبی کہانی ہے، بہت لمبی کہانی جب مجھے پتا چلا کہ ہمارے گیسٹ ہاؤس میں کچھ گوتھک لوگ آئے ہیں تو میں نے مہمانوں کی طرح ان کا استقبال کیا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ لوگ ہماری میم صاحب کو مار دیں گے، وہ خود بھی نہیں بچ سکے لیکن رابرٹ کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ تمام کیا دھرا رابرٹ کا ہی ہے۔ نہ وہ میم صاحب کو مارتا، نہ یہاں سے بھاگتا اور نہ میم صاحب کو ایسے......'' یہ کہہ کر بوڑھا رک گیا۔

''اور تم ہی یہ بتا سکتے ہو کہ تمہاری میم صاحب کو کیسے روکا جا سکتا ہے، ورنہ وہ نہ جانے کب تک لوگوں کی جان لیتی رہے گی، تم تو اس کے خدمت گار تھے کیا اس نے تمہیں بھی کچھ نہیں بتایا۔ مجھے بتاؤ بابا،

ورنہ موت کا یہ کھیل نہ جانے کب تک چلتا رہے گا‘ مجھے کچھ سوجھ ہی نہیں رہا کہ کیا کروں‘ کچھ تو سوچنا ہوگا ورنہ بہت دیر ہوجائے گی۔“

”صرف ایک ہی راستا ہے اور وہ ہے رابرٹ جس نے میم صاحب کے ساتھ بے وفائی کی اور اس بات کو روزی بھلا نہیں پائی‘ میں پتا لگاؤں گا۔“ یہ کہہ کر بوڑھا غائب ہوگیا اور آصف خلاؤں میں تکتا رہ گیا۔

”مجھے رات ہونے سے پہلے یہاں سے نکلنا ہوگا‘ ورنہ روزی کی روح مجھے ڈھونڈتے ہوئے پھر آجائے گی۔ اب کیا کروں‘ پیدل ہی چلنا پڑے گا۔ چلتے چلتے وہ مین سڑک پہنچ گیا اور رات کے واقعے کے بارے میں سوچتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

”آخر یہ رابرٹ ڈی سوزا کہاں ملے گا۔“ وہ انہی سوچوں میں تھا کہ اسے ایک ٹرک آتا نظر آیا تو اس نے لفٹ کا اشارہ کیا اور اس طرح لفٹ لے کر وہ شہر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا اور سیدھا اپنے تھانے کا رخ کیا۔

”ارے سر! آپ اتنی جلدی واپس آگئے کیا ہوا‘ آپ تو اس جگہ کو کھوجنے گئے تھے نا۔“ اسے دیکھتے ہی حوالدار رامو نے کہا۔

”مجھے رابرٹ ڈی سوزا کے بارے میں انفارمیشن چاہیے ورنہ بہت دیر ہوجائے گی۔“ آصف نے اس کی بات پر دھیان دیے بغیر کہا۔

”وہ کیوں سر......؟“

”یہ کیس اتنی ہی جلدی ختم ہوگا جتنی جلدی ہم رابرٹ کا پتا لگا پائیں گے۔ وہ تیس سال پہلے پاکستان آیا تھا اور اب وہ کہاں ہے؟ جلد سے جلد پتا کرنا ہوگا اور ہاں اس ہائی وے کا راستہ بند کروادو‘ وہاں سے کوئی آ جا نہ پائے۔“ آصف نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

رامو ابھی بتاتا ہوں سر کہہ کر سوچ میں ڈوب گیا اور جب وہ سوچوں سے واپس آیا تو رابرٹ کے بارے میں معلومات اس کے ساتھ تھیں۔ ”سر وہ پاکستان آیا تھا لیکن اکیلا نہیں۔ اس کے ساتھ اس کے کچھ دوست بھی تھے۔ سر وہ گوتھک تھے اور عجیب سا حلیہ تھا ان کا۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا۔“ آصف نے پوچھا۔

”میں اسے ذاتی طور پر بھی دیکھ چکا ہوں سر! ایک بار وہ اپنی کار کی چوری کی رپورٹ لکھوانے تھانے میں آیا تھا۔“

”ہوں...... تو کیا اس کی کار مل گئی تھی؟“

”نہیں سر! بہت تلاش کیا لیکن وہ کار کہیں نہیں ملی۔“

”تمہیں پتا ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا۔“

”سر! ہمیں پتہ چلا تھا کہ وہ سوئیزرلینڈ چلا گیا ہے لیکن سر‘ اس جگہ ایسا کیا ہوا ہے۔“ رامو نے تجسس سے پوچھا۔

”وہاں ایک بھوت بنگلا ہے جو کئی سالوں سے بند ہے۔ وہیں پر رابرٹ نے روزی نام کی ایک لڑکی کا قتل کیا تھا اور اب ہمیں اسے جلد سے جلد ڈھونڈنا ہے۔ چاہے اس کے لیے مجھے سوئیزرلینڈ ہی کیوں نہ جانا پڑے۔“

آصف اس بات سے بے خبر تھا کہ کوئی اور بھی ان کی باتیں سن رہا ہے‘ وہ ایک ریٹائرڈ پولیس والا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ پولیس والا ایک حویلی کے اندر داخل ہورہا تھا۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا‘ اس کا نام لے کر پکارا گیا۔ ”آؤ آؤ جمیل آؤ‘ مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ کب سے تمہاری راہ دیکھ رہا تھا۔ کچھ ملا کیا تمہیں۔“

”جی سر! میرے پرانے پولیس اسٹیشن سے بہت کچھ ہاتھ لگا ہے‘ اور ایسے راز معلوم ہوئے ہیں جو

میری بیس سال پرانی سروس میں بھی میرے سامنے فاش نہیں ہوئے تھے۔ سر! اس جگہ کے بارے میں مجھے کچھ خفیہ باتیں پتا چلی ہیں اور وہ بتانے کے لیے میں سیدھا آپ کے پاس چلا آیا۔" جمیل نے بھاری آواز میں کہا۔

"کہو...... کہو جمیل میں کب سے تمہاری زبان سے یہ سب سننے کے لیے بے چین ہوں' جلدی بتاؤ اس آدمی نے کیا کہا۔"

"سر! جس جگہ کو آپ لینا چاہتے ہیں' اس جگہ پر کسی لڑکی کی روح بھٹکتی ہے اور وہ اس راستے سے گزرنے والے ہر انسان کو موت کی نیند سلا دیتی ہے' وہ کسی کو وہاں ٹکنے نہیں دیتی۔" جمیل بولا۔

جمیل کے سامنے دبیز صوفے پر بیٹھا آدمی مسکرایا اور بولا۔ "کیا تمہیں ان باتوں پر یقین ہے۔ تم جانتے ہو کہ اس جگہ پر میری کب سے نظر ہے۔ میں اس جگہ پر ایک فیکٹری لگانا چاہتا ہوں کیونکہ اس طرف کی پہاڑیوں میں چونے کے ذخیرے پائے جاتے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ میرا اصل کام منشیات کی تجارت ہے' تمہارے ایک بڑے افسر نے مجھے گرفتار کرلیا تھا لیکن وہ بیچارہ بھول گیا تھا کہ میں اس کا کیا حشر کروں گا' الٹا میں نے اسے جھوٹا کیس بنانے کا الزام لگا کر پھنسا دیا۔ اس نے جان چھڑانے کی بہت کوشش کی لیکن اسے ملا کیا۔ صرف مجھ سے الجھنے کی سزا۔ اس کی وجہ سے میری فیکٹری بند ہوگئی تھی اور مجھے کافی نقصان برداشت کرنا پڑا لیکن اسے جو سزا ملی اس کے انعام کے طور پر میں نے تمہیں اے ایس پی کی پوسٹ دلوادی' کیوں صحیح کہا نا میں نے۔"

جمیل نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

"چلو چھوڑو یہ باتیں۔ میں نہ ہی کسی بدروح سے ڈرتا ہوں اور نہ ہی کسی بھوت پریت سے۔ میں جانتا ہوں کہ اس جگہ ایک حادثہ ہوا تھا' ایک قتل ہوا تھا لیکن میں نے خون' خون ہی رہنے دیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر پولیس کو تجسس ہوا تو وہ وہاں کی تلاشی ضرور لیں گے اور اس کے لیے وہ اس جگہ کو اپنی تحویل میں لے لیں گے' جو میں ہرگز نہیں چاہتا۔"

"لیکن سر! وہاں جو لوگ مر رہے ہیں ان کا کیا۔" جمیل نے پوچھا۔

"یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ اس طرح وہ جگہ بدنام ہوجائے گی اور کوئی وہاں کا رخ بھی نہیں کرے گا اور برطانوی دور کی وہ حویلی میری ہوجائے گی۔ اگر وہاں کوئی ہے بھی تو وہ میرا کام آسان کررہا ہے۔"

"نہیں سر ابھی نہیں۔ ایک نیا انسپکٹر آصف خان اس کیس پر کام کررہا ہے۔ وہ اس جگہ بھی گیا تھا اور وہاں کے بارے میں کچھ پتا چلا ہے لیکن اچھی بات یہ ہے کہ ایس پی صاحب کو اس کی باتوں پر یقین نہیں ہورہا ہے بلکہ وہ تو الٹا اسے یہ کیس داخلِ دفتر کرنے کا کہہ چکے ہیں۔"

"کہتے ہیں کہ دن بدل جاتے ہیں مگر انسان نہیں بدلتے۔ اب اس سے پہلے کہ یہ نیا انسپکٹر کوئی ثبوت تلاش کرلے ہم اس کے سارے راستے بند کردیں گے۔ ہاہاہا...... ہاہاہا۔" ہال نما کمرے میں اس کے قہقہے گونجنے لگے۔



آصف خان اور رامو سوئٹزرلینڈ کے شہر زیورخ پہنچ چکے تھے۔ وہاں کے نظارے دیکھ کر رامو کا دل مچلنے لگا۔ "سر! یہ تو بڑی حسین جگہ ہے۔"

"ہم یہاں گھومنے نہیں اپنا کیس حل کرنے آئے ہیں سمجھے۔" آصف نے کرخت لہجے میں کہا۔

"سر! ہم اس رابرٹ کو ڈھونڈیں گے کیسے؟ یہ تو ایسا ہی جیسے بھوسے میں سوئی تلاش کرنا۔" رامو

نے کہا۔

''دیکھو ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے تو یہ انسان کیا چیز ہے' اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر یہ خون کیا ہے' ہمیں اسے پکڑنا ہی ہوگا ورنہ روزی کی روح نہ جانے اور کتنے انسانوں کی جان لے لے گی۔''

''سر! میں نے اپنے گاؤں میں کئی بدروحوں کو دیکھا ہے لیکن کبھی ایسی بدروح نہیں دیکھی جو اپنا کیس حل کروانا چاہتی ہو۔'' رامو نے قدرے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''وہ اپنا انصاف چاہتی ہے' میں رابرٹ اور اس کے ساتھیوں کو ڈھونڈ کر ہی رہوں گا اور اسے انصاف ملنے تک میرے دل کو چین نہیں ملے گا۔''

وہ یونہی شہر میں چکراتے رہے مگر اس طرح کسی کا پتا کیسے لگ سکتا تھا' اجنبی ملک' اجنبی شہر' وہ کسی سے پوچھتے بھی تو کیا پوچھتے۔ آخر رامو نے ہی ایک حل پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''سر کیوں نہ ہم اس جگہ کا پتا لگائیں جہاں گوشکس آتے جاتے ہیں۔''

''چلو یہ کھوج بھی لگا کر دیکھتے ہیں۔'' آصف نے کہا اور معلوم کرکے وہ اس جگہ پر پہنچ بھی گئے لیکن نتیجہ وہی صفر' رابرٹ کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ مایوسی سے وہاں کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ ہی رہے تھے کہ ایک عورت ان کی طرف آئی۔

''کیا تم دونوں ایشیئن ہو؟''

''یس میم! ہم پاکستان سے آئے ہیں اور ایک کیس کے سلسلے میں کام کررہے ہیں' کیا آپ رابرٹ ڈی سوزا نامی کسی شخص کو جانتی ہیں اور روزی فرنانڈیس۔'' آصف نے پوچھا۔

روزی فرنانڈیس کا نام سن کر وہ عورت چونکی۔ ''ایک منٹ...... ایک منٹ...... کیا نام لیا تم نے......''

''روزی فرنانڈیس' کیا آپ اس نام کی خاتون کو جانتی ہیں۔'' آصف نے اس سے پوچھا۔

یہ سنتے ہی عورت رونے لگی' رامو گھبرا گیا۔ ''ارے سر! اسے کیا ہوا۔''

آصف نے تھوڑی دیر اسے رونے دیا پھر پوچھا۔ ''میم آپ رو کیوں رہی ہیں۔ کیا آپ اس لڑکی کو جانتی ہیں۔''

''ہاں' میں اس لڑکی کو کیسے بھول سکتی ہوں۔ وہ میری سب سے اچھی سہیلی تھی۔ ہم ایک ساتھ ہلا گلا کرتے تھے' پارٹیاں اٹینڈ کرتے تھے مگر پھر وہ پاکستان چلی گئی' میں اسے کافی مس کررہی ہوں۔ وہ اپنے گھر کی اکلوتی اولاد تھی مگر اس کا والد اس کی بالکل بھی پروا نہیں کرتا تھا' ویسے بھی سوتیلی اولاد کی کون پروا کرتا ہے۔'' وہ عورت بولی۔

''تو آپ نے رابرٹ ڈی سوزا کے بارے میں کچھ نہیں سنا' وہ اس کا فرینڈ تھا۔''

''نہیں وہ اس کا فرینڈ نہیں تھا۔ وہ مجھ سے ہر بات شیئر کرتی تھی مگر اس بارے میں اس نے کبھی کوئی بات نہیں کی اور اگر ہوگا بھی تو میں جانتی ہوں کہ وہ روزی کو کیوں چاہتا ہوگا کیونکہ روزی کے پاس کافی پراپرٹی اور پیسہ تھا۔''

''آپ ہمیں بتا سکتی ہیں کہ وہ کہاں رہتی ہے۔''

''میں نہیں جانتی کہ روزی کہاں رہتی ہے کیونکہ وہ کبھی ایک جگہ نہیں ٹکتی۔''

''لیکن تم اس آدمی کا گھر تو جانتی ہوگی' میرا مطلب ہے جہاں وہ رہتا ہے۔'' آصف نے پوچھا۔

''میں نے اسے آخری بار چرچ کے دروازے پر دیکھا تھا۔''

آصف نے اس عورت کا شکریہ ادا کیا اور رامو کے ساتھ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

''ہمیں ہمت نہیں ہارنی ہے رامو' کیسے بھی کر کے پتا لگانا ہی ہوگا۔'' آصف نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

تب ہی اس عورت نے دوبارہ آواز لگائی۔ ''ایک منٹ ٹھہرو۔ وہ اس وقت کہاں ہے۔''

''وہ جہاں بھی ہے میں اسے انصاف دلوا کر ہی رہوں گا۔'' دونوں وہاں سے آگے نکلتے چلے گئے۔ آصف کے دماغ میں صرف ایک ہی بات گونج رہی تھی کہ کیسے بھی کر کے اس مظلوم عورت کو انصاف دلوانا ہے تا کہ اس کی روح کو نجات مل سکے۔

''سر! بات کچھ الجھتی جا رہی ہے۔ اس عورت کا قتل پاکستان میں ہوا اور قاتل یہاں سوئٹزر لینڈ میں ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ رابرٹ کی نظر شروع سے ہی روزی پر تھی اور جب اسے پتا چلا کہ روزی پاکستان چلی گئی ہے تو وہ بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ پاکستان چلا آیا تا کہ وہاں وہ محبت کا ڈراما رچا کر روزی کو اپنے بس میں کر لے اور جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو کسی طرح سے اس نے روزی کی پراپرٹی کے کاغذات حاصل کر لیے اور اس کی تمام دولت ہتھیا کر اسے قتل کر کے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا اگر وہ یہ سب یہاں کرتا تو شاید اس کے لیے کافی مشکلات کھڑی ہو سکتی تھیں۔'' رامو نے کہا۔

''کچھ بھی ہو رامو' ہمیں انصاف کے تقاضے پورے کرنے ہی ہوں گے۔'' آصف نے کہا۔

''سر! ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی ہوگی کہ یہ تیس سال پرانی بات ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ رابرٹ اب کافی عمر رسیدہ ہو چکا ہوگا۔''

''یہ تو ہے۔ رابرٹ ہی مرکزی کڑی ہے وہ مل گیا تو سمجھو کہ اس کے باقی ساتھیوں کا بھی پتا چل جائے گا۔'' آصف نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

انہی باتوں میں وہ اس چرچ کے سامنے نکل آئے جس کے بارے میں عورت نے بتایا تھا۔ دونوں گیٹ سے اندر آ گئے' سامنے ہی ایک پادری کو دیکھ کر آصف اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''چلو شاید ان سے کچھ معلوم ہو سکے۔''

پادری انہیں دیکھ کر رک گیا اور استفہامیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ ''ایکسکیوز می سر! ہم دونوں پاکستانی پولیس آفیسر ہیں اور ایک کیس کے سلسلے میں یہاں آئے ہیں اور اس میں آپ کی مدد چاہتے ہیں۔'' آصف نے کہا۔

''کیسی مدد؟'' فادر بولا۔

''سر! کیا آپ کسی رابرٹ ڈی سوزا نامی شخص کو جانتے ہیں؟''

''یس یس یہ نام کچھ سنا ہوا سا لگ رہا ہے۔''

''سر رابرٹ اور روزی آپس میں محبت کرتے تھے۔''

''اوہ ہاں' روزی میں نے یہ نام بھی سنا ہوا ہے۔ وہ اور اس کا بوائے فرینڈ ایک بار میرے پاس آئے تھے دعا کے لیے۔ انہی سے پتا چلا کہ وہ آج کل پاکستان میں رہ رہے ہیں اور سوئٹزر لینڈ اپنی پراپرٹی کے سلسلے میں آئے ہیں۔''

''سر! کیا آپ یاد کر کے بتا سکتے ہیں وہ کس سال آئے تھے۔''

''شاید یہ ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔'' فادر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا پھر آگے بولا۔ ''وہ اب گھوسٹ ہنٹر بن چکا ہے۔'' پھر اس نے پتا بھی بتا دیا کہ وہ کہاں مل سکتا ہے۔

''سر! اب ہمیں اسے ڈھونڈنے قبرستان جانا ہوگا۔''

”وہ تو ہے‘ چلو۔“ آصف نے کہا اور تھوڑی دیر بعد دونوں مطلوبہ قبرستان کے احاطے میں پہنچ چکے تھے۔ انہیں ایک جگہ کافی بھیڑ نظر آئی۔

”سر! لگتا ہے کسی کے کفن دفن کی تیاری ہو رہی ہے۔“

آصف اور رامو بھیڑ کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک پچاس سالہ شخص کسی لاش سے چھیڑ چھاڑ کر رہا ہے۔

آصف نے ایک آدمی سے پوچھا۔ ”یہ کیا کر رہا ہے۔“

”یہ بہت مشہور گھوسٹ ہنٹر ہے۔ وہ اس لاش میں سے بدروح نکال رہا ہے۔“ اس آدمی نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں کام ختم ہوگیا اور سب اپنی اپنی راہ چل دیئے۔ وہ بھی اٹھ کے جانے لگا تو آصف نے پیچھے سے آواز دے کر اسے روکا۔ ”کیا آپ ہی رابرٹ ڈی سوزا ہیں؟“

اس نے غور سے آصف کو دیکھا اور بولا۔ ”نہیں‘ میں نہیں ہوں۔“

آصف نے گردن جھٹک کر کہا۔ ”تم ہی رابرٹ ہو جس نے اپنی گرل فرینڈ کو مار دیا اور اب وہ بدروح بن کر انتقامی طور پر لوگوں کو مارتی پھر رہی ہے۔ رابرٹ۔“

”جانے دیجئے سر! اگر یہ وہ نہیں ہے تو ہمیں اپنی تلاش جاری رکھنی ہوگی‘ کولا گھاٹی کا کیس ختم کر کے ہی چین ملے گا۔“ رامو بولا۔

”تم میرے بارے کتنا جانتے ہو؟ یا یہ کہ میں ہی وہ آدمی ہوں۔“ وہ آدمی پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم نے صرف پراپرٹی اور پیسے کے چکر میں اس معصوم لڑکی کو قتل کر دیا۔“

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔ ”میں نے اسے قتل نہیں کیا۔“

”تو پھر کون تھا۔ اس کی روح آج بھی کولا گھاٹی میں موجود ہے اور خون کی پیاسی ہو رہی ہے۔ اس کی موت کے بعد پکڑے جانے کے ڈر سے تم نے اپنی نئی پہچان بنالی ہے لیکن انسان کب تک اپنی غلطیاں چھپا سکتا ہے۔“

”نہیں......نہیں‘ میں نے اسے نہیں مارا۔ میں تو اس سے محبت کرتا تھا‘ سچی محبت۔ رابرٹ نے غصے سے کہا۔

”تو کیا وہ روح جھوٹ بول رہی ہے جو آج بھی اس حویلی میں چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ تم نے ہی دولت کے لالچ میں اس کا خون کیا۔ میں تمہیں روزی فرنانڈلیس کے قتل کے جرم میں گرفتار کر رہا ہوں۔“ آصف نے کہا۔

”اگر تم مجھے جیل میں ڈالنا چاہتے ہو‘ پھانسی پر چڑھانا چاہتے تو کر دو لیکن میں نے اسے نہیں مارا۔ میں واقعی میں اس سے سچی محبت کرتا تھا۔ میرا یقین کرو‘ میں جھوٹ نہیں بول رہا اور اگر تمہیں پھر بھی یقین نہیں تو میں پوری سچائی بتاؤں گا۔“ رابرٹ نے کہا۔

”تو وہ روح جھوٹ کیوں بولے گی۔“

”تم میرے ساتھ آؤ۔“ رابرٹ نے کہا اور کچھ ہی دیر میں وہ ایک بڑے سے گھر میں پہنچ گئے۔ دونوں کو آرام دہ صوفوں پر بٹھا کر رابرٹ بولا۔ ”میری دنیا تو اسی دن ختم ہوگئی تھی جس دن روزی کا خون ہوا۔“

”چلو مان لیا کہ تم نے اسے نہیں مارا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی روح بھی جھوٹ بول سکتی ہے۔ یا پھر اسے تمہارے دوستوں نے مارا۔“

”روزی کے ختم ہونے کے بعد مجھے کال آئی کہ میری ماں بیمار ہے۔ میں اپنی ماں کو دیکھنے آیا تھا‘

انہوں نے قسم دی کہ تم روزی سے شادی کر لینا لیکن جب تک میں اپنی ماں کو روزی کی موت کے بارے میں بتا تا اس کی سانسوں کی ڈور کٹ چکی تھی۔ میں خود کو بے بس محسوس کرنے لگا' ایسا لگ رہا تھا جیسے پوری دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے' میں ایک گو تھک تھا' تو میں نے خود کو گھوسٹ ہنٹر بنالیا اور ہر بری اور اچھی روح کو اس دنیا سے نجات دلانے لگا لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ روزی کی روح ابھی بھی وہاں بھٹک رہی ہے۔'' رابرٹ نے کہا۔

''اگر تم نے روزی کو نہیں مارا تو پھر کون ہوسکتا ہے' اس کا جواب ہے تمہارے پاس۔''

''اس دنیا میں اچھائی کم اور برائی زیادہ ہے۔ ایک آدمی کی بری نظر تھی روزی پر اور وہ کوئی اور نہیں روزی ہی کا گہرا دوست اسٹیورٹ تھا' اسی نے روزی کو مارنے کا منصوبہ بنایا کیونکہ کسی بھی طرح سے وہ روزی کی جائیداد ہڑپ کرنا چاہتا تھا' میں تو وہاں صرف روزی کے ساتھ اپنے نئے پیار کی شروعات کر رہا تھا۔ ایک دن کافی تیز بارش ہورہی تھی' روزی نے مجھ سے کہا کہ تم شہر سے جلدی آجانا' تب تک میں کھانا بناؤں گی' میں شہر چلا گیا مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے پیچھے کیا قیامت ٹوٹ پڑے گی' ان کمینوں نے میری محبوبہ کو گلا دبا کر مار دیا اور کنویں میں پھینک دیا۔ جب میں واپس آیا تو حقیقت جان کر میں ان سے بھڑ گیا لیکن وہ کئی تھے انہوں نے مجھے مار کر بے حال کر دیا اور وہاں سے بھاگ گئے۔ بعد میں' میں بھی واپس یہاں آگیا اور اس کے دو دوستوں سے انتقام لے لیا اور ان کی لاشیں دبا دیں اور خود کو چھپانے کے لیے ایک نئی پہچان بنالی۔ کچھ ہی دنوں میں' میں نے اسٹیورٹ کو بھی ڈھونڈ نکالا لیکن اس وقت تک وہ پاگل ہو چکا تھا۔ اس نے میرے چہرے کا ماسک پہن کر روزی کو مارا تھا تاکہ سارا الزام مجھ پر آجائے' میں نے اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہا لیکن کہتے ہیں نا کہ انسان اپنی غلطیوں سے نہیں بھاگ سکتا' وہ پاگل پن میں بھاگا اور سڑک پر ایک گاڑی کے نیچے کچلا گیا۔ اس کی دوست کو بھی خواب میں روزی دکھائی دیتی تھی۔''

''تو تم نے روزی کی لاش کو کنویں سے نکال کر باعزت طریقے سے دفن کیوں نہیں کیا۔''

''تب مجھے پتا نہیں تھا کہ روزی کی لاش کنویں میں ہے اور پھر مجھ پر ایک جنون سا سوار تھا' روزی کی موت کا بدلہ لینے کا۔''

''اب میں اس روح کو نجات دلا سکتا ہوں' وہ تو صرف تمہیں ہی اپنا قاتل سمجھ رہی ہے۔'' آصف نے کہا۔

''ہمیں اسے حقیقت بتانی ہوگی اور اسے نجات دلانی ہی ہوگی اور مجھے پتا ہے کہ یہ کیسے کرنا ہے لیکن ہم اس وقت تک اسے نجات نہیں دلا سکتے جب تک کہ اس کے دل کا مقصد پورا نہ ہوجائے۔ وہ یہ سمجھتی ہے کہ اس محبت میں دھوکا ملا ہے۔ اس کے ساتھ بے وفائی کی گئی ہے لیکن اصل بات کیا ہے۔ یہ تو میں ہی جانتا ہوں۔ اور میں تمہارے ساتھ وہاں جاؤں گا' ضرور جاؤں گا۔''

آصف خان نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ کہانی اس طرح نیا موڑ لے گی' وہ تو دل سے رابرٹ کو ہی روزی کا قاتل سمجھ بیٹھا تھا اور روزی کی روح بھی یہی سمجھ رہی تھی' اب وہ روزی کی روح کو حقیقت کیسے بتا پائے گا' ایسے کئی سوال آصف کے ذہن میں امنڈ رہے تھے۔

''سر! اب تو لگتا ہے کہ روزی کا خون ان ہی کے دوستوں نے کیا تھا لیکن اب تو وہ لوگ ہی زندہ نہیں

رہے۔“ رامو نے کہا۔

”لیکن ہمیں ایس پی صاحب کو اتنی انفارمیشن تو دینی ہی پڑے گی۔“

”کیا پتا سر! ایس پی صاحب ہماری باتوں پر یقین کریں گے بھی یا نہیں۔ سر! آج کے دور میں بدروحوں اور بھوت پریت پر کون یقین رکھتا ہے۔“ رامو نے پھر ایک خیال ظاہر کیا۔

”جو بھی کرنا ہے ہمیں ہی کرنا ہوگا۔“ آصف نے کہا۔ اس کے موبائل کی بیل بجنے لگی اس نے دیکھا ہما کی کال تھی۔ ”ہاں ہما! بولو کیسی ہو؟“

”واہ وہاں جاتے ہی مجھے بھول گئے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ تم کولا گھاٹی سے لوٹ آئے ہو اور مجھے بتایا تک نہیں۔“

”بتانے کا وقت ہی نہیں ملا۔ میں ابھی بھی اسی کیس میں الجھا ہوا ہوں۔ جب آؤں گا تو سب بتا دوں گا۔“



اگلی صبح وہ تینوں پھر ناشتے کی میز پر جمع تھے۔ آصف بولا۔ ”تم چلنے کو تیار ہو رابرٹ اور کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ روح تمہاری بات کا یقین کر لے گی۔ مجھے تو ایسا نہیں لگتا کہیں تم کو کچھ ہو نہ جائے۔“

”مجھے اپنی محبت سے ملنا ہی ہوگا جسے میں کئی سال پہلے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اس کے دل میں میرے لیے جو نفرت ہے وہ نکالنا ہی ہوگی۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔“ آصف نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

یہاں آصف اس کہانی کے اصلی مہرے رابرٹ کو پاکستان جانے کے لیے راضی کر چکا تھا اور وہاں پاکستان میں ایک نئی کہانی چل پڑی تھی۔



”جمیل بس کرو اور کتنی پیو گے۔“

”سر! ایس پی صاحب تو بھوت پریت پر یقین ہی نہیں رکھتے لیکن وہ آصف کا بچہ اس کیس کو حل کرنے کے چکر میں لگا ہوا ہے۔“

”اسے کچھ نہیں ملے گا چاہے وہ کچھ بھی کر لے اس کیس نے اسے پاگل سا کر دیا ہے لیکن اس پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔

”چلو اب ہم کمشنر سے مل کر وہ جگہ اپنے نام کرواتے ہیں۔ اس کام کے لیے میرے پاس ایک قابل وکیل ہے وہ تمام قانونی ہیر پھیر جانتا ہے اور پھر تم جانتے ہو کہ میرے پاس اتنا پیسہ ہے کہ میں وہ پوری گھاٹی خرید سکتا ہوں۔“ اس آدمی نے کہا۔

”تو پھر چلیں سر! کمشنر صاحب ہی تمام مسئلوں کی کنجی ہیں۔“ جمیل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں کمشنر صاحب کے آفس میں موجود تھے۔

”جی میں کیا کر سکتا ہوں آپ کے لیے۔“ کمشنر صاحب نے پوچھا۔

”کمشنر صاحب! آپ نے شاید پہچانا نہیں میں آپ کا پرانا دوست ہوں۔“

”منشیات کا دھندہ کرنے والے میرے دوست نہیں ہو سکتے۔“ کمشنر نے روکھے لہجے میں کہا۔

”آپ نے غلط پہچانا میں تو اس شہر کا ایک معزز شخص ہوں۔ لاکھوں روپے خیرات کرتا ہوں ہر کوئی میرا نام اچھے الفاظ میں لیتا ہے۔ میرا نام ولیا ہے۔ تو اب میں آپ کو بتا دوں کہ میں وہ کولا گھاٹی خریدنا چاہتا ہوں چاہے جو بھی قیمت ہو میں وہ جگہ ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی۔ کیا تم نے مجھے کوئی پراپرٹی ڈیلر سمجھا ہوا ہے۔ نکل جاؤ میرے آفس سے

نہیں تو میں تمہیں رشوت دینے کے جرم میں اندر کروا دوں گا۔'' کمشنر نے غصے سے کہا۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ اس طرح سے پیش آئیں گے۔ میں تو بس آپ لوگوں کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ آگے جیسی آپ کی مرضی اور وہ زمین تو میں لے کر ہی رہوں گا۔'' یہ کہہ کر ولیا اور جمیل وہاں سے نکل گئے اور کمشنر اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔



وطن واپس آتے ہی آصف سیدھا ایس پی صاحب کے آفس پہنچا اور ساری بات انہیں بتانے کا ارادہ کیا لیکن رامو نے اسے روک لیا۔ ''سر! ایس پی صاحب کو کچھ مت بتائیے گا ورنہ وہ پہلی فرصت میں رابرٹ کو گرفتار کرلیں گے۔''

آصف کو بھی اس کی بات سے اتفاق کرنا پڑا اور پھر وہ رابرٹ کو لے کر اس کولا گھاٹی والی حویلی پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر رابرٹ ماضی کی یادوں میں کھو گیا......

''یہ جگہ ویسی ہی اجاڑ ہے' جیسے یہاں کچھ ہوا ہی نہ ہو' یہاں کوئی بے چین روح ہے جو ہمیں گھور رہی ہے مگر وہ اس وقت کچھ نیند میں ہے۔'' رابرٹ نے کہا۔

''لیکن اس نے مجھے زندہ کیسے چھوڑ دیا۔'' آصف نے کہا۔

''شاید وہ تمہیں پیار کرنے لگی ہے اور تم اس کی بہت مدد کر سکتے ہو' یہ بھی وجہ ہو سکتی ہے' چلو مجھے اندر لے چلو۔'' رابرٹ بولا۔

تینوں اندر جانے لگے' رامو کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ کہیں اس کے ساتھ کچھ برا نہ ہو جائے۔ اندر آنے کے بعد رابرٹ نے کہا۔ ''آپ

دونوں یہاں اس جگہ بیٹھ جائیں۔ انسپکٹر صاحب' اندھیرا ہونے میں ایک گھنٹہ باقی ہے اس کے بعد یہاں کی ہر چیز تمہیں ایک ڈراؤنی اور بھیانک دکھائی دے گی۔"

"میں یہاں پہلے بھی آ چکا ہوں' اب بس یہ دیکھنا ہے کہ تم روزی کو نجات دلا سکتے ہو یا نہیں۔" آصف نے کہا۔

دھیرے دھیرے اندھیرے کی چادر پھیلنے لگی اور چاروں طرف بھیانک آوازیں گونجنے لگیں۔

"سر! مجھے ڈر لگ رہا ہے' کچھ ہو نہ جائے۔" رامو نے ڈری ہوئی آواز میں کہا۔

"تم آرام سے بیٹھے رہو' کچھ نہیں ہوگا۔" آصف نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

اس سناٹے میں رابرٹ کی آواز ابھرنے لگی۔

"روزی فرنانڈیس تم جیسی بھی بے چین روح ہو' مانتا ہوں کہ تمہارے ساتھ دھوکا ہوا' تمہیں جس نے مارا وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ روزی...... روزی میں تمہارا رابرٹ ہوں۔"

وہ تینوں جس دائرے پر انگلیاں رکھے ہوئے تھے اس کے نام پر چلنے لگیں۔ رابرٹ نے پھر پوچھا۔ "تمہیں نجات کیسے مل سکتی ہے؟"

اس کا اشارہ تھا۔ "انتقام"۔

اور تب ایک تیز ہوا کے جھونکے اور آواز کے ساتھ وہ سامنے آ گئی۔ اس کی آنکھیں آگ برسا رہی تھیں۔ زلفیں کالی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھیں۔ ماحول اتنا بھیانک ہو چکا تھا کہ رامو کو لگا کسی بھی وقت اس کا پیشاب خطا ہو سکتا ہے۔ وہ خود پر قابو پانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔

"تم......" روزی نے رابرٹ کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم نے میری جائیداد کے لیے مجھے مار دیا اور اب میں تمہیں مار دوں گی۔"

"نہیں روزی' رابرٹ تمہارا دشمن نہیں ہے۔ یہ تمہارا قاتل نہیں ہے۔ جو ڈر ہم سب کے اندر ہے وہ اب بھی موجود ہے ہم تمہیں انصاف دلانا چاہتے ہیں۔ تم میری بات کا یقین کرو۔" آصف نے کہا۔

"نہیں یہی میرا قاتل ہے۔ میں نے خود اس کا چہرہ دیکھا تھا۔" روزی نے تیز لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے اگر تم صحیح کہہ رہی ہو کہ میں نے ہی تمہیں مارا ہے تب بھی میری وجہ سے دوسروں کی جان لینے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے اور میں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں کہ میں نے تمہارے ساتھ کوئی بے وفائی نہیں کی اور تمہارا قاتل میں نہیں اسٹیورٹ تھا' مگر وہ بھی اب مر چکا ہے اور اس کے دیگر ساتھی بھی جہنم واصل ہو چکے ہیں۔ میری بات کا یقین کرو۔"

"میں تم پر کیسے بھروسہ کرلوں۔" روزی بولی۔

"تمہیں بھروسہ کرنا ہی پڑے گا' تمہیں پتا ہے جب میں ایک کام کے سلسلے میں سوئٹزرلینڈ گیا تھا' وہاں میری ماں بیمار تھی اور ان کی آخری خواہش تھی کہ میں تم سے شادی کرلوں' جب میں واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ اسٹیورٹ نے میرا ماسک پہن کر تمہیں مار دیا ہے تو مجھے بہت غصہ آیا پھر میں نے اسٹیورٹ کے ساتھیوں کا پتا لگا کر انہیں اوپر پہنچا دیا اور اسٹیورٹ میرے سامنے ہی ایک گاڑی کے نیچے آ کر کچلا گیا۔ اس کے بعد میں گھوسٹ ہنٹر بن گیا' اس کے بعد بھی اگر تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں ہے تو اس سے اچھا ہے کہ تم مجھے مار ہی دو۔"

"میری بات سنو روزی' جن لوگوں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی تھی وہ آج اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اس طرح تمہارا انتقام پورا ہو چکا ہے' تمہیں اس

شیطانی طاقت سے نجات حاصل کرنی ہوگی۔'' آصف نے کہا۔

''مجھے افسوس ہے روزی کہ میں تمہیں انصاف نہیں دلا سکا' اب بھی وقت ہے اپنی روح کو آزاد کرلو اس دنیا سے۔ مجھے اجازت دو کہ میں تمہاری یہ الجھن دور کردوں۔'' رابرٹ نے کہا۔

''لیکن کیسے......؟ روزی نے پوچھا۔

''میں ابھی پڑھائی شروع کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر رابرٹ مدھم آواز میں کچھ پڑھنے لگا اور روزی کی روح دھواں بن کر ایک بوتل میں سما گئی۔

''اب ہمیں اس کی لاش کو جلد از جلد پوری شان سے دفنانا ہوگا' اس طرح اس کی روح کو ہمیشہ کے لیے سکون مل جائے گا۔'' رابرٹ نے کہا۔

ابھی وہ یہ باتیں کر رہی رہے تھے کہ ولیا اور جمیل اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں آ گیا۔

''کون ہو تم لوگ؟'' آصف خان نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''ارے تم کیسے پولیس والے ہو۔ شہر کے سب سے بڑے ڈان کو نہیں پہچانتے۔'' جمیل نے اس کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔

ولیا کے اشارے پر اس کے آدمی ان تینوں پر ٹوٹ پڑے۔ آصف نے کئی غنڈوں کو زمین کی خاک چٹوا دی اور اسے حاوی آتا دیکھ کر ولیا نے پیچھے سے آصف پر گولی چلا دی۔ گولی آصف کی بائیں ران پر لگی اور وہ لڑکھڑا کر گر گیا۔

''اب ہم ان کی روحوں کے ساتھ ساتھ اس بھوت بنگلے کو بھی بند کر دیں گے۔'' ولیا نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''سر جی! یہ بوتل۔'' جمیل نے اس کی توجہ بوتل کی جانب کراتے ہوئے کہا۔

ولیا نے بوتل اٹھا کر دیکھی اور غصے سے ایک طرف پھینک دی' بوتل فرش سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی اور ایک روشن ہالے کے ساتھ روزی کی روح باہر آ گئی' ولیا اور جمیل اسے دیکھ کر ڈر گئے۔

''روزی ان لوگوں نے رابرٹ کو مارا ہے' اسے زخمی کیا ہے۔'' آصف نے اپنے زخم پر ہاتھ جماتے ہوئے نقاہت سے کہا۔

''ہمیں کوئی جدا نہیں کرسکتا۔'' روزی نے یہ کہتے ہوئے ہاتھ اوپر کیا اور ایک تیز دھار آری اس کے ہاتھ میں چمکنے لگی لیکن تھوڑی ہی دیر میں اس آری کی چمک جمیل کے کٹے ہوئے گلے کے خون سے ماند پڑ چکی تھی۔ یہ دیکھ کر ولیا چیختا ہوا باہر کی جانب بھاگا۔

''بھاگ اور تیز بھاگ۔ آج تجھے پتا چلے گا کہ کسی روح سے ٹکر لینے کا کیا انجام ہوتا ہے۔'' روزی نے اپنے ہاتھ کو جھٹکا اور آگ کے گولے نے ولیا کو اپنی لپیٹ میں لے کر اسے جلا کر خاک کر دیا۔ پھر روزی نے ایک پھونک ماری اور اس کی راکھ اڑ کر حویلی کے گٹر میں بہنے لگی۔

آصف اور رامو نے مل کر کنویں سے روزی کی لاش نکال لی' لاش دیکھ کر ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کی موت ابھی چند لمحے پہلے ہی ہوئی ہو۔

''اب وقت بدل چکا ہے آصف خان' اب اسے دفنانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا' ہمیں اسے جلد سے جلد جلا دینا ہوگا۔ اب یہی ایک راستہ رہ گیا ہے۔'' رابرٹ نے کہا۔

آصف نے ایک نظر اسے دیکھا اور جیب سے لائٹر نکال کر روزی کی لاش کو جلا دیا۔ ایک چیخ کے ساتھ روزی کا ہیولہ دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہونے لگا۔

''تھینک یو آصف خان' اگر تم نہ ہوتے تو مجھے کبھی

نجات نہ ملتی۔“

”رکو روزی، میں تمہیں تنہا نہیں جانے دوں گا۔“ یہ کہہ کر رابرٹ چھت کی طرف بھاگا۔

”یہ..... یہ کیا کر رہے ہو رابرٹ، رکو..... رک جاؤ، اپنی جان مت دو۔“ یہ دیکھ کر آصف بوکھلا گیا۔

”اب میں اپنی محبت سے اور دور نہیں رہ سکتا، مجھے اس کے ساتھ جانا ہی ہوگا۔ میرے مرنے کے بعد میری لاش کو بھی جلا دینا اور روزی کی راکھ کے ساتھ ملا کر ایک یادگار بنا دینا۔ تمہارا شکریہ دوست، اگر تم نہ ہوتے تو شاید آج میں بھی یہاں نہ ہوتا، بے سکونی اور بے چینی سے روز قطرہ قطرہ مرتا رہتا۔“ رابرٹ نے ایک لمبی سانس لی اور چھت سے کود گیا۔ نیچے سنگلاخ چٹانوں پر گرتے ہی اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

روزی نے ایک بار پھر آصف کو حریری لمس دیا اور بولی۔ ”تم مجھے بہت پسند تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ اس رات میں بہک گئی تھی۔ مجھے کبھی مت بھولنا۔ اب میں چلتی ہوں۔“

رابرٹ کی روح بھی روزی کی روح کے برابر میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ پھر رابرٹ نے روزی کا ہاتھ تھاما اور وہ اوپر کی طرف پرواز کرنے لگے۔

اسی اثناء میں صبح کا سویرا پھیلنے لگا اور بھیانک نظر آنے والی وادی زندگی سے بھرپور نظر آنے لگی۔

رامو جو ڈر کے مارے اندر ہی کہیں دبکا ہوا تھا۔ دن کی روشنی پھیلتے دیکھ کر باہر نکلا اور آصف سے بولا۔ ”سر وہ رابرٹ اور روزی کا کیا ہوا۔“

”ان دونوں کو نجات مل چکی ہے اور سچا پیار بھی پالیا ہے۔ چلو اب یہاں سے چلتے ہیں اور تمہارا وہ مشورہ مجھے یاد ہے کہ اس بارے میں ایس پی صاحب سے کوئی بات نہیں کریں گے کیونکہ وہ کسی بھی صورت میں ان باتوں پر یقین نہیں کریں گے۔“

”سر! میں نے ایسا خوفناک کیس اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔“ رامو نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

آصف نے دونوں کی راکھ جمع کی اور ایک ہی قبر میں دفنا کر اس پر جنگلی پھول چڑھائے اور پیچھے مڑا تو اسی بوڑھے کو کھڑا دیکھا۔

”آپ یہاں کیا کر رہے ہیں.....؟“

”میم صاحب کو تم نے نجات دلا دی اور میری روح کو بھی سکون مل گیا، آج مجھے میری برسوں کی خدمت کا پھل مل گیا اور تمہاری ہی وجہ سے مجھے یہ خوشی ملی ہے۔ الوداع بیٹا۔“



اسی دن دوپہر کو آصف ایک ریسٹورنٹ میں ہما کے ساتھ بیٹھا ہوا اسے پوری کہانی سنا رہا تھا۔ کہیں کہیں ہما کو جھرجھری سی آ جاتی لیکن پورے انہماک سے سنتی رہی اور جب آصف نے اپنی بات ختم کی تو اس نے آصف کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم مجھ سے شادی کرو گے۔“

آصف نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور بولا۔

”تمہارے خیال سے میرا جواب کیا ہونا چاہئے۔“

”وہی جو میرے دل میں ہے۔“ ہما نے مسکراتے ہوئے کہا۔ آصف بھی مسکرایا۔ پھر اس نے چونک کر ریسٹورنٹ کی شیشے والی دیوار سے اوپر آسمان کی طرف دیکھا تو اسے ایسا لگا جیسے روزی اور رابرٹ کی روحیں اس نئے ملن پر خوشی سے ہاتھ ہلا رہی ہوں۔ بے خودی میں وہ بھی ہاتھ ہلانے لگا اور ہما حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی کہ اس کے دماغ کی کون سی چول ڈھیلی پڑ گئی ہے۔



پراسرار خزانہ

خلیل جبار

ہاتھ آئی دولت کسے بری لگتی ہے خاص طور پر ایسی دولت جو اچانک من و سلویٰ کی طرح گھر میں اتر آئے۔
ایک گھر کے تہہ خانے سے ملنے والے خزانہ کی روداد، جو نجانے کتنے لوگوں کی جان لے چکا تھا۔
دولت کی ہوس میں بہہ جانے والوں کا احوال، ایک دلچسپ کہانی

امتیاز علی کا پانچ کروڑ کا پرائز بونڈ کھل جانے پر وہ بہت خوش تھے، دو کروڑ کا ایک شاندار بنگلہ لے لیا تھا۔ باقی رقم کاروبار میں لگا دی تھی، کہاں وہ ایک ہارڈ ویئر کی دکان پر نوکری کیا کرتے تھے اور اب اپنی دکان کھول کر بیٹھ گئے تھے۔ گھومنے کے لیے ان کے پاس سائیکل بھی نہیں تھی اور اب وہ کار میں گھوم رہے تھے۔ ہارڈ ویئر کے کام میں ان کا وسیع تجربہ تھا اور پھر دکان بھی ایسی جگہ مل گئی تھی جہاں ہر وقت گاہک آتا رہتا تھا۔ دن بھر وہ کام میں ایسے مصروف رہتے تھے کہ کان کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی، ایک رات جب وہ گھر لوٹے بیگم نسیم نے بتایا۔

''یہ بنگلہ آسیبی لگ رہا ہے۔''

''یہ تم کیسے کہہ رہی ہو؟''

''میں جب دوپہر میں چھت پر کپڑے سکھانے گئی تھی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے چھت پر کوئی ہے۔''

''بیگم ایسا اکثر لوگوں کو وہم ہو جاتا ہے۔''

''مجھے وہم نہیں ہوا، حقیقت ہے خوامخواہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''تمہیں کچھ نظر آیا نہیں پھر کس طرح کہہ رہی ہو، کیا اس نے تمہیں چھوا تھا یا آواز دی جس سے محسوس ہوا کہ اس بنگلہ میں کچھ ہے۔'' امتیاز علی نے مسکراتے ہوئے بیگم کی طرف دیکھا۔

''ہاں مجھے کسی کے چھت پر چلنے کی آواز سنائی دی تھی جب کہ وہاں کوئی بھی نظر نہیں آیا۔''

''بیگم! اللہ تعالیٰ کی زمین پر بے شمار مخلوق ہیں، جنات بھی اس مخلوق میں سے ہیں جو انسانوں سے زیادہ تعداد میں ہیں۔ وہ ہمیں نظر نہیں آتے لیکن کبھی کبھار ان کی موجودگی محسوس ہو جاتی ہے۔'' امتیاز علی نے کہا۔

''پھر ہم کیا کریں؟''

''ہمیں کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے جیسے ہم رہ رہے ہیں ایسے ہی وہ بھی رہتے رہیں، جب کوئی شے ہمیں پریشان نہیں کر رہی پھر ہم اس کو خوامخواہ کیوں پریشان کریں۔''

''اگر اس مخلوق نے ہمیں تنگ کیا تو ہم کیا کریں گے؟''

''ان کے تنگ کرنے پر ہی سوچیں گے ابھی فضول میں سوچ کر کیوں اپنا قیمتی وقت برباد کریں۔'' امتیاز علی نے کہا۔

ان کی بات میں واقعی وزن تھا، اس لیے بیگم نسیم خاموش ہو گئیں اس بنگلے کے نیچے ایک تہہ خانہ بھی تھا جس کا امتیاز علی کو علم نہیں تھا۔ بنگلے کی صفائی کے دوران ایک جگہ بھاری الماری رکھنے پر زمین دھنس گئی، الماری کو اس جگہ سے ہٹا کر جب زمین کی صفائی کی تو اندر ایک لکڑی کا دروازہ نظر آیا جو کچا ہونے پر سب سے بھاری الماری رکھے جانے سے ٹوٹ گیا تھا اور جو مٹی دروازے کو چھپانے کے لیے ڈالی گئی تھی وہ اندر کی طرف دھنس گئی تھی۔ تہہ خانے کی سیڑھیاں نہ ہونے پر الماری اندر گر جاتی، سب گھر والے حیرت سے تہہ خانے کو دیکھنے لگے سب ہی ایک بات سوچ رہے تھے

کہ تہہ خانے کے اندر جا کر دیکھیں یا نہیں کہ تہہ خانے میں کیا ہے۔ زیادہ تر کہانیوں اور فلموں میں انہوں نے یہی پڑھا تھا کہ ایسے تہہ خانوں میں خزانہ دفن ہوتا ہے بالآخر یہی فیصلہ ہوا کہ تہہ خانے کے اندر اتر کر دیکھا جائے ہوسکتا ہے کہ وہ جو سوچ رہے ہیں ایسا نہ ہو۔ تہہ خانے خالی ہونے کی صورت میں وہ فالتو کاٹھ کباڑ اس کے اندر رکھ دیں گے۔ تہہ خانے میں ان سے پہلے بنگلے میں رہنے والوں کا فالتو کا سامان بہت تھا' وہ سب نکال کر باہر پھینک دیا گیا آخر میں ایک صندوقچی بچی تھی ابھی وہ اس کی طرف بڑھنے ہی والے تھے کہ ایک سیاہ رنگ کی ناگن صندوق کے پاس سے نکلی اور تیزی سے ایک سوراخ میں داخل ہوکر غائب ہوگئی۔ امتیاز علی کے دونوں بیٹوں مبشر اور اعجاز نے کچھ سوچا اور پھر صندوقچی کی طرف بڑھ گئے' صندوقچی کھولنے پر ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ صندوق جوہرات اور سونے چاندی سے بھری ہوئی تھی' امتیاز علی بھی ایک لمحے کو چونکے بغیر نہ رہ سکے تھے۔

''ابو یہ......'' مبشر نے کہنا چاہا۔

''ہاں میں بھی دیکھ رہا ہوں لیکن ان پر ہمارا حق نہیں ہے' سابقہ مالک مکان کی ملکیت ہیں۔''

''یہ بنگلہ ہم اس سے خرید چکے ہیں اس کی ہر چیز پر ہمارا حق ہے۔'' اعجاز نے کہا۔

''ہاں ہر چیز پر حق ہے' بنگلے کا سودا کرتے ہوئے یہ بات معاہدے میں شامل نہیں تھی کہ صندوقچی کے جواہرات بھی ہمارے ہوں گے' ہوسکتا ہے کہ بنگلے کے مالک کے باپ دادا نے بُرے وقت کے لیے تہہ خانے میں چھپائے ہوں اور پھر ان کو نکالنے کا موقع نہ ملا ہو۔ تم اسے واپس سے بند کردو' میں کل ہی بنگلے کے پرانے مالک بشیر احمد سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔'' امتیاز علی نے کہا۔

ابو کی بات سن کر وہ دونوں تلملا کر رہ گئے' گھر آئی اتنی ساری دولت کو خود ٹھکرا رہے تھے انہوں نے صندوق کو بند کردیا۔ رات کو سونے سے قبل اعجاز کو اپنے کمرے سے باہر کسی سانپ کے پھنکارنے کی آواز صاف طور پر سنائی دی تھی اس نے فوراً کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا لیکن باہر کچھ بھی نہیں تھا۔ اعجاز نے اپنا وہم سمجھا اور بستر پر لیٹ گیا' رات میں کئی بار اس کی آنکھ کھلی اور ہر بار اسے سانپ کے پھنکارنے کی آواز سنائی دی' وہ دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ کہیں تہہ خانے والی ناگن کمرے میں داخل ہوکر ڈس نہ لے لیکن ایسا ہوا نہیں۔ صبح بیدار ہونے پر اس کی طبیعت بوجھل بوجھل سی تھی۔

دوسرے دن امتیاز علی نے بشیر احمد سے ملاقات اور تہہ خانے والی بات بتائی' وہ ان کی بات سن کر بولے۔

''تمہیں تہہ خانے کے بارے میں کیسے پتا چلا حالانکہ ہم نے تہہ خانے کے دروازے پر مٹی ڈال کر زمین کو اس طرح سے ہموار کیا تھا کہ کسی کو بھی تہہ خانے کے بارے میں پتا نہ چلے۔''

''زمین کو مسلسل پانی ملنے سے دروازہ گھل گیا ہے' اس لیے بھاری الماری کا وزن برداشت نہ کرسکا اور وہ ٹوٹ گیا۔'' امتیاز علی نے بتایا۔

''ہاں ایسا ہی ہوا ہوگا' لکڑی کا دروازہ میرے بچپن سے لگا کر اس پر مٹی ڈالی گئی تھی' میں بھی وقت کے ساتھ ساتھ بوڑھا ہوگیا ہوں پھر وہ تو لکڑی کا دروازہ ہے' اتنا عرصہ گزر جانے پر اس کا گھل جانا یقینی ہے۔'' بشیر احمد نے کہا۔

''میرا مقصد یہاں آنے کا یہ بتانا مقصود نہیں ہے کہ تہہ خانہ ہے بلکہ یہ بتانا ہے کہ تہہ خانے کے اندر ایک صندوقچی ہے جو جواہرات اور سونے چاندی سے بھری ہوئی ہے۔ ہم نے بنگلے کا معاہدہ کیا تھا اس صندوق کا نہیں لہٰذا وہ صندوق تمہاری امانت ہے اس پر ہمارا کوئی اختیار نہیں ہے۔'' امتیاز علی نے کہا۔

''میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں' ایماندار لوگ ایسا ہی کرتے ہیں' میں چاہنے کے باوجود بھی وہ صندوق

نہیں لے سکتا۔“
”وہ کیوں؟“ امتیاز علی چونکے۔
انہیں حیرت ہو رہی تھی کہ لوگ جواہرات اور سونے چاندی پر جان دے دیتے ہیں اور میں ان کو وہ دے رہا ہوں اور وہ صندوق لینے سے انکاری ہو رہے ہیں۔
”میری بات سن کر یقینی طور پر تمہیں حیرت ہو رہی ہوگی اور بات بھی حیرت کی ہی ہے کہ میں نے پوری زندگی کام کرتے گزار دی ہے لیکن اتنی دولت جمع نہیں کر سکا۔ ایسے میں میری جگہ کوئی بھی شخص ہو وہ آئی دولت کو نہیں جانے دے گا۔“ بشیر احمد نے امتیاز علی کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔
”میری بات کو سمجھنے کے لیے پورا واقعہ سننا پڑے گا مگر تمہارے پاس اتنا وقت ہو۔“
”ہاں میرے پاس اتنا وقت ہے کہ تمہاری بات تفصیل سے سنوں۔“ امتیاز علی نے بشیر احمد کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
ان کے پاس وقت نہیں بھی ہوتا تو وہ بشیر احمد کے پاس موضوع کو چھیڑ دینے پر وقت ضرور نکالتے۔ بات ہی ایسی تھی کہ ایک شخص مفت میں آئی دولت کو ٹھکرا دینا چاہتا تھا۔
”امتیاز صاحب بات یہ ہے کہ میرے چچا نذیر احمد کو شکار کا بہت شوق تھا‘ وہ اکثر شکار پر جاتے رہتے ہیں‘ ہمیشہ ان کے ساتھ شکار پر تین دوست خالد‘ راحیل اور تنویر ضرور جاتے ہیں۔ ایک دفعہ وہ شکار کے لیے گئے تو ان کے ساتھ ایک عجیب و غریب واقعہ ہوا‘ رات میں وہ ایک اونچے درخت پر مچان بنا کر بیٹھے ہوئے تھے چودھویں کے چاند کی روشنی میں پورا جنگل نہایا ہوا تھا‘ ہر طرف گویا سفیدی سی چھا گئی تھی۔ ایسے میں انہوں نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر ایک سانپ کا جوڑا رقص میں مصروف ہے‘ میرے چچا اور ان کے دوستوں نے ایسا منظر کبھی نہیں دیکھا تھا اس لیے انہیں حیرت ہو رہی تھی اچانک ناگن نے انسانی روپ بدلا اور اپنے نزدیک

عظیم ہستی

ایک انگریز نے علامہ اقبال سے پوچھا۔ ”کہتے ہیں کہ سارے پیغمبر آپ کے براعظم ایشیا میں پیدا ہوئے ہیں کیا یہ سچ ہے؟ اقبال نے جواب دیا۔ ”ہاں یہ ٹھیک بات ہے۔“ انگریز نے پھر پوچھا۔ ”پھر یورپ کو کیوں چھوڑ دیا گیا ہے۔“ اقبال نے فرمایا۔ ”یورپ میں بھی ایک عظیم ہستی پیدا ہوئی ہے۔“ سوال کیا گیا ”کون سی ہستی؟“ جواب ملا۔ ”حضرت ابلیس۔“
(مرسلہ: **برکت اللہ احمد**...... نواب شاہ)

پڑے ایک صندوق کو کھولا‘ صندوق کے اندر پڑے ہیرے جواہرات کی روشنی دور دور تک دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ کچھ دیر انہیں الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی پھر اس نے صندوق کو بند کر دیا‘ اتنی دولت دیکھ کر تنویر کے دل میں لالچ پیدا ہوا اور اس نے بلا سوچے سمجھے اس عورت پر فائر کر دیا‘ وار خالی گیا اس عورت نے غصے سے تنویر کی طرف دیکھا اور ناگن کے روپ میں تبدیل ہو کر غائب ہوگئی‘ سانپ بھی اس کی دیکھا دیکھی ایک جھاڑی میں گھس گیا۔
”تنویر! یہ تم نے کیا کر دیا؟“ چچا نذیر نے غصے سے کہا۔
”دیکھ نہیں رہے اس صندوق میں کتنی دولت ہے؟“ تنویر نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”وہ ہماری نہیں اس لیے اس دولت پر ہمارا کوئی حق بھی نہیں۔“ چچا نذیر نے کہا۔
”یہ دولت ان سانپوں کے کس کام کی‘ ہم لوگ پھر بھی اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔“ تنویر نے کہا۔
”یہ صحیح کہہ رہا ہے یہ سانپ ان جواہرات کا کیا کریں گے۔ ہم لوگ آپس میں بانٹ کر گھر آئی اس دولت سے خوب عیاشی کر سکتے ہیں۔“ خالد نے کہا۔
”کہیں یہ سانپ ہمیں نقصان نہ پہنچا دیں۔“ راحیل نے کہا۔
”تم ہمیشہ کے ڈرپوک ہی ہو‘ ارے بھئی یہ ہتھیار

ہمارے کس کام آئیں گے۔ گولیوں سے بھون کر رکھ دیں گے ذرا یہ ہمارے قریب آ کر تو دیکھیں۔'' تنویر نے کہا۔

چچا نذیر اور راحیل کا یہ مشورہ تھا کہ وہ اس دولت کو چھوئیں بھی نہیں' ایسے ہی چھوڑ جائیں مگر وہ دونوں بضد تھے کہ دولت لے کر جانی ہے اس لیے انہیں خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ صبح ہونے پر جیپ میں وہ صندوق رکھ دیا گیا اور شکار کا پروگرام ملتوی کر کے گھر کا رخ کر لیا گیا تھا' جیپ مشکل سے دو میل دور ہی گئی تھی کہ اچانک ایک سانپ جیپ سے نکلا اور اس نے تنویر کی گردن کے گرد گھیرا ڈال کر اس کی گردن پر ڈس لیا' یہ سب اتنا آناً فاناً ہوا کہ وہ تینوں تنویر کو بچانے میں اس کی کوئی مدد نہ کر سکے اس سے پہلے کہ وہ سانپ جیپ میں موجود کسی اور شخص کو نقصان پہنچائے خالد نے شکاری چاقو سے سانپ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

وہ تنویر کی طرف جب متوجہ ہوئے وہ دم توڑ چکا تھا سانپ بہت زہریلا تھا اس کے زہر نے منٹوں میں کام کر دکھایا تھا۔ جیپ میں سانپ کی موجودگی نے سب کو پریشان کر دیا تھا انہوں نے جیپ سے اتر کر جیپ کی تلاشی لی' جب اطمینان ہو گیا کہ سانپ کی ساتھی ناگن جیپ میں موجود نہیں ہے وہ جیپ میں بیٹھے' انہیں تنویر کی اس طرح ہلاکت پر افسوس ہو رہا تھا لیکن وہ کر بھی کیا سکتے تھے جو بھی ہوا وہ اچانک ہوا تھا۔

جیپ پھر تیزی سے چل پڑی وہ یہ اطمینان کر چکے کہ جیپ میں ناگن نہیں ہے پھر بھی وہ خوف زدہ تھے۔ وہ بات کرنا ہی بھول گئے تھے' ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ تینوں انجان آدمی ہیں' پانچ گھنٹے جیپ مسلسل چلتی رہی پھر جنگل سے نکل کر سڑک پر آ گئی تھی۔

دوپہر کا وقت تھا دھوپ میں تیزی آ گئی تھی اچانک ٹائر پنکچر ہونے پر انہیں جیپ روکنا پڑی' جیپ سے نیچے اترنے کو کوئی بھی تیار نہ تھا اور جیپ سے اترے بغیر ٹائر تبدیل نہیں ہو سکتا تھا۔ آخر چچا نذیر ہی ہمت کر کے جیپ سے اترے اور ٹائر تبدیل کرنے لگے۔

وہ ٹائر تبدیل کرتے ہوئے اِدھر اُدھر بھی دیکھ رہے تھے۔ اچانک جیپ میں سے خالد کی چیخ بلند ہوئی' چچا نذیر نے گھبرا کر جیپ میں دیکھا ایک ناگن خالد کی گردن میں ڈس چکی تھی۔ راحیل گھبرا کر جیپ سے چھلانگ لگا کر کود گیا تھا' چچا نذیر ابھی کچھ کرنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ناگن پلک جھپکنے میں غائب ہو گئی۔ راحیل خوفزدہ حالت میں چچا نذیر سے آ کر لپٹ گیا۔

''گھبراؤ نہیں کچھ نہیں ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے چچا نذیر نے ٹائر اور سامان جیپ میں رکھ کر خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ڈرتے ڈرتے راحیل بھی ان کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ خالد کا بھی وہی حشر ہوا تھا جو تنویر کے ساتھ ہوا تھا' دونوں کی لاشیں پیچھے کی طرف رکھی ہوئی تھیں۔

شہر پہنچ کر چچا نذیر نے دونوں کی لاشیں ان کے گھر پہنچائیں' راحیل بھی اتنا خوفزدہ تھا وہ شہر آتے ہی اپنے گھر کو لوٹ گیا' گھر پہنچ کر جب چچا نذیر کی صندوق پر نظر پڑی وہ چونکے کہ اس کا وہ کیا کریں کیوں کہ جنہوں نے اس کی چاہت کی تھی وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ راحیل اور انہوں نے اس صندوق کی چاہت نہیں کی تھی اس لیے وہ بچے ہوئے تھے چچا نذیر نے فی الحال یہی بہتر سمجھا کہ اس صندوق کو تہہ خانے میں رکھوا دیں۔ خالد اور تنویر کی تدفین کے بعد اس مسئلے پر غور کیا جائے گا کہ اس کا کیا کرنا چاہیے۔

اس واقعہ کا چچا نذیر نے کسی سے بھی ذکر نہیں کیا تھا' دراصل وہ خود بھی اس واقعہ سے دل ہی دل میں خوف زدہ تھے جب ان کا خوف کم ہوا تو سب سے پہلے انہوں نے دادا جان کو یہ قصہ سنایا۔

''نذیر بیٹے! تم نے یہ اچھا نہیں کیا اس منحوس صندوق کو جنگل ہی میں پھینک آتے۔'' دادا جان نے واقعہ سن کر کہا۔

''ابا جان میں اس واقعے سے بہت خوف زدہ ہو گیا

تھا اس لیے مجھے صرف اپنی جان بچانے کی فکر لگی ہوئی تھی' میرا اس طرف دھیان ہی نہیں رہا کہ اس صندوق کو وہاں پھینک دوں۔"

"جو ہوا سو ہوا تم اب ایسا کرو اپنے دوست راحیل اور مرنے والے دوستوں کے لواحقین کو یہ واقعہ سنا کر یہ دولت ان میں برابر تقسیم کر دو اگر وہ راضی نہ ہوں تو تم بھی اس صندوق کو بھول جانا اور تہہ خانے میں اس پر کباڑ ڈال دینا تاکہ کسی اور کی نظر نہ پڑ سکے ورنہ جو بھی اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا وہ اپنے آپ کو مشکل میں ڈال دے گا۔" دادا جان نے کہا۔

چچا نذیر نے دادا جان کی بات پر عمل کرتے ہوئے ان لوگوں کو یہ واقعہ سنایا' وہ صندوق کے خزانے کو لینے سے انکاری ہو گئے۔ راحیل پہلے ہی اس واقعہ سے خوف زدہ تھا' اسے اپنی جان زیادہ عزیز تھی اس نے بھی اس خزانے کو لینے سے انکار کر دیا اب صندوق پوری طرح سے چچا نذیر کے قبضے میں آ گیا تھا وہ اس سے جس طرح سے فائدہ اٹھانا چاہیں اٹھا سکتے تھے مگر وہ فی الحال خزانے سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے صندوق کو بھول کر اپنے کاروبار میں مگن ہو گئے تھے۔ کاروبار میں اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے ایسا ہی چچا نذیر کے ساتھ بھی ہوا' انہیں کاروبار میں زبردست نقصان ہوا اور عرش سے فرش پر آ گئے تھے ایسے میں انہیں اس صندوق کا خیال آیا اور وہ کسی سے مشورہ کیے بغیر تہہ خانے میں اتر گئے۔ صندوق کو کھول کر دیکھا' صندوق کا خزانہ ابھی تک جوں کا توں ہی رکھا تھا' اس خزانے کو دیکھ کر خوشی سے ان کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں اور وہ خوشی کے مارے چیختے ہوئے کہنے لگے۔

"اب یہ سب خزانہ میرا ہے' میں خزانے کا مالک ہوں۔ یہ خزانہ کسی کو نہیں دوں گا' سارا کا سارا خزانہ اپنے استعمال میں لوں گا۔" وہ خوشی کے مارے زور زور سے چیخ رہے تھے اور ان کی آواز تہہ خانے کا دروازہ کھلا ہونے پر باہر تک آ رہی تھی۔ ابا جان نے بھی ان کی

زندگی

میں نے ساحل سمندر پر ایک بچے کو دیکھا جو ایک کشتی پر نظریں جمائے ریت کے گھروندے بنانے میں مشغول تھا۔ اچانک لہریں سی اٹھیں۔ کشتی ڈگمگائی۔ بے چین صدائیں بلند ہوئیں۔ بچہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اس کے گالوں پر پڑتے ڈمپل دیکھ کر میں نے سوچا۔

"یہی تو زندگی ہے۔"

اتنے میں ایک لہر سی اٹھی اور گھروندا بہہ گیا۔ بچے کی موٹی موٹی آنکھوں میں پانی کی لہریں ابھر آئیں۔ تب میں نے سوچا۔

"نہیں۔ زندگی تو یہ ہے۔"

(محمد ندیم...... کراچی)

آواز سن لی تھی' وہ تیزی سے تہہ خانے کے اندر لپکے' وہ چچا نذیر کو اس ارادے سے باز رکھنا چاہتے تھے۔ وہ جیسے ہی اندر پہنچے چچا نذیر کی زوردار چیخ بلند ہوئی' ابا جان نے جو غور سے انہیں دیکھا وہ دھک سے رہ گئے' ایک ناگن ان کے جسم سے لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے چچا نذیر کی گردن میں ڈس لیا تھا' ناگن نے ابا جان کو اندر داخل ہوتا دیکھا تو فوراً سے ایک سوراخ کے ذریعے تہہ خانے سے باہر نکل گئی۔ وہ بہت زہریلی ناگن تھی جب ابا جان چچا نذیر کے پاس پہنچے وہ دم توڑ چکے تھے۔ ابا جان اور دادا جان کو چچا نذیر کی موت سے بہت صدمہ پہنچا تھا' انہوں نے چچا نذیر کی تدفین کے فوراً بعد ہی تہہ خانے میں کاٹھ کباڑ ڈال کر دروازے پر مٹی ڈال کر اس طرح ہموار کر دیا تھا کہ کسی کو پتا نہ چلے کہ یہاں تہہ خانہ کا دروازہ ہے۔ یہ کہانی سن کر یقیناً میری بات سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ میں کیوں صندوق والا خزانہ لینے سے انکار کر رہا ہوں۔"

"ہاں واقعی بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ جو بھی اس خزانے کی چاہت کرے گا اسے وہ ناگن ڈس لے

گی۔" امتیاز علی نے کہا۔

وہ بشیر احمد کے پاس سے چلا آیا اس کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ اسے پہلے کی طرح تہہ خانے کو بند کردینا ہوگا اسی میں بھلائی ہے۔

امتیاز علی کے بنگلے سے چلے جانے پر مبشر اور اعجاز سمجھ گئے تھے کہ یہ دولت ان کے ہاتھ سے جانے والی ہے ان کے آنے سے پہلے پہلے وہ کچھ کر سکتے تھے۔ وہ اس دولت سے محروم ہونا نہیں چاہتے تھے اس لیے وہ کسی کو بتائے بغیر ہی تہہ خانے میں داخل ہوگئے۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے صندوق کی طرف بڑھے' دونوں نے ایک دوسرے دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھا اور صندوق کو کھول دیا۔ ہیرے جواہرات اور سونے چاندی کی چمک دمک دکھ کر ان کی خوشی سے باچھیں کھل اٹھی تھیں۔

"ابا جان بھی ناجانے کس دور کے آدمی ہیں' کوئی اس طرح بھی گھر میں آئی ہوئی دولت ٹھکراتا ہے۔" مبشر نے کہا۔

"ہم زندگی بھر کما کر بھی اتنی دولت اکٹھی نہیں کر سکتے۔" اعجاز نے کہا۔

"دل چاہ رہا ہے کہ یہ ساری کی ساری دولت ابا جان سے چھپا کر رکھ دوں مگر ایسا ممکن نہیں ہے وہ ہم سے دولت نکلوا کر ضرور اس بوڑھے کھوسٹ بشیر احمد کو دے دیں گے۔ اس لیے کچھ دولت چھپا دیتے ہیں پھر موقع ملتے ہی اس دولت سے فائدہ اٹھا لیں گے۔" مبشر نے کہا۔

"اتنی آسانی سے تم یہ دولت ہڑپ نہیں کر سکتے' یہ میری دولت ہے جب میں اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتی تو پھر دوسرا کیوں اس سے فائدہ اٹھائے۔" ایک خاتون کی آواز آئی۔

دونوں نے پلٹ کر دیکھا ایک خوب صورت عورت ان کے پیچھے کھڑی انہیں غصے سے دیکھ رہی تھی۔

"تت...... تت...... تم کون ہو؟" وہ بوکھلاتے ہوئے بولے۔

"میں اس دولت کی مالکن ہوں' یہ دولت جہاں بھی جائے گی میں وہیں پہنچ جاؤں گی اور جس نے اس دولت کو اپنی عیاشی کا ذریعہ بنانے کا سوچا میں اسے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ہلاک کردوں گی۔" وہ بولی۔

"وہ دراصل ہم...... وہ......" مبشر نے کہنا چاہا۔

"مجھ سے کچھ مت چھپاؤ' مجھے سب پتا ہے تمہاری بھی یہ دولت دیکھ کر نیت خراب ہوگئی ہے۔ مفت ہاتھ آئی دولت کسے بُری لگتی ہے۔" اس عورت نے ان کو گھورتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں بُری طرح سے خوفزدہ تھے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔

"یہ دولت بہت بُری شے ہے' میں نے بھی بچپن سے گھر میں غربت دیکھی تھی کیونکہ میں ایک کمہار کے گھر میں پیدا ہوئی تھی گھر میں ہر وقت کھانے کے لالے پڑے رہتے تھے۔ ہمارے گاؤں میں ایک سادھو بابا رہتا تھا' لوگ ان کے پاس اپنی اپنی مرادیں پانے کے لیے جاتے رہتے تھے۔ وہ کالے علم کے ایسے منتر بتاتا تھا کہ ان کی مرادیں پوری ہوجاتی تھیں' میں بھی دولت حاصل کرنے کو سادھو بابا کے پاس پہنچ گئی تھی' سادھو بابا نے مجھے جو منتر بتایا وہ مشکل ضرور تھا لیکن ناممکن نہیں تھا۔ میں روزانہ صبح سویرے گھر سے دریا کنارے نکل جاتی تھی' ایک روز میں سورج کے نکلنے پر وہ منتر پڑھ رہی تھی کہ مجھے مہاراجہ نے دیکھ لیا میں اسے پسند آ گئی تھی اور وہ مجھے اٹھا کر اپنی حویلی میں لے گیا اور زبردستی بغیر نکاح کے مہارانی بنالیا' وہ انتہائی عیاش قسم کا آدمی تھا۔ پچپن سال کی عمر میں بھی اس کے نوجوانوں والے شوق تھے' میرے ابا و کرم کے احتجاج کرنے پر مہاراجہ نے کچھ رقم دے کر اس کا منہ بند کردیا تھا۔ میرا ابا ایک غریب آدمی تھا وہ مہارانہ کا مقابلہ بھلا کیسے کرتا' غصے میں آ کر وہ اپنے غنڈوں کے ذریعے میرے والد سمیت پورے گھرانے کو ختم بھی کرا سکتا تھا۔ اس کے ظلم و ستم کی داستانیں گاؤں میں مشہور تھیں

اس لیے گاؤں کے لوگ اس سے دشمنی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ میں حویلی میں جلتی کڑتی رہتی تھی میں جوان تھی اور مہاراجہ بوڑھا میرے دل میں بھی ارمان تھے کہ میری کسی جوان سے شادی ہو۔ میں چوری چھپے سادھو بابا سے ملی اور اسے ساری بات بتائی' میری بات سن کر سادھو بابا کچھ دیر سوچتا رہا پھر وہ بولا۔

"تو غم نہ کر میں جو اب تجھے منتر بتا رہا ہوں وہ پڑھتی رہ' تیرا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ہاں ایک بات کا خاص خیال رکھنا تجھے مہاراجہ کی دولت پر نظر رکھنی ہے کہ وہ کہاں رکھتا ہے' اس میں سے تھوڑی تھوڑی دولت چرا کر رکھتی رہنا۔ میرا منتر پڑھتے ہوئے تجھے ایک ماہ ہو جائے گا تو ایک سانپ تیرے کمرے میں روزانہ آیا کرے گا' تم اسے دودھ پلاتی رہنا۔ نویں دن تم چرائی ہوئی دولت کسی محفوظ جگہ صندوق میں بند کر کے چھپا دینا۔ دسویں دن تم مہاراجہ کی قید سے آزاد ہو جاؤ گی۔"

میں نے ایسا ہی کیا ایک ماہ مکمل ہو جانے پر ایک کالا سانپ میرے کمرے میں آنے لگا اور میں اسے ایک کٹورے میں دودھ پلانے لگی تھی' نویں دن میں نے رات میں وہ صندوق ایک نوکر وشنو کو بھاری رشوت دے کر جنگل میں ایک محفوظ جگہ پر رکھوا دیا۔ دسویں دن سانپ نے دودھ پیا اور مہاراجہ کے کمرے میں داخل ہو گیا اور مہاراجہ کو اپنے دفاع کا موقع دیئے بغیر ڈس لیا۔ مہاراجہ نے زور سے چیخ ماری' حویلی کے نوکر اور دیگر لوگ اس کے کمرے کی طرف بھاگے' ان لوگوں کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر سانپ تیزی سے کھڑکی سے باہر نکل گیا' تقریباً سب نے ہی سانپ کو باہر جاتا دیکھا تھا۔ مہاراجہ کی گردن پر سانپ کے ڈسے جانے کا نشان موجود تھا' سانپ کے زہر نے اثر دکھایا اور مہاراجہ چند منٹوں میں ہی ہلاک ہو گیا۔

اس سانپ کو حویلی کے لوگوں نے دس دنوں کے اندر آتے جاتے دیکھا تھا اور مجھے منتر پڑھتے ہوئے بھی دیکھا کرتے تھے اس وقت انہوں نے مجھے کچھ نہیں کہا مگر مہاراجہ کی تدفین ہو جانے پر میرے بارے میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں کہ میں کوئی جادوگرنی ہوں اور میں نے کوئی خاص منتر پڑھ کر مہاراجہ کو مروا دیا ہے۔

مجھ تک بھی یہ بات پہنچی تھی مگر میں نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا جب میں نے اس طرح کی باتیں سنی تھیں مجھے حویلی سے غائب ہو جانا چاہیے تھا اور کسی گاؤں میں جا کر اپنی زندگی کا آغاز کر دینا چاہیے تھا لیکن میں ایسا نہ کر سکی اور حویلی کے لوگوں کو موقع مل گیا' انہوں نے ایک رات موقع پا کر ہلاک کر دیا۔ میں مر کر بھی منتر کی بدولت ناگن کی صورت میں زندہ ہو گئی تھی وہ سانپ میرا ساتھی بن گیا تھا' ہم دونوں نے مل کر حویلی کے ایک ایک فرد کو جو میرے قتل کی سازش میں ملوث تھا۔ انہیں ڈس کر ہلاک کر دیا' اپنا انتقام پورا ہو جانے پر میں اس سانپ کے ساتھ جنگل میں رہنے لگی تھی۔

یہ دولت میرے کسی کام نہیں آ سکتی تھی اس لیے میں نے دل میں عہد کر لیا تھا کہ یہ دولت کسی انسان کے بھی کام نہیں آنے دوں گی جو بھی اس دولت کو حاصل کرنے کا ارادہ کرے گا میں اسے ہلاک کر دوں گی۔ میں چاندنی راتوں میں ضرور اس صندوق کو پہاڑی کی کوہ سے نکال کر دیکھتی جب رات ڈھلنے لگتی ہے اور صبح ہونے کو ہوتی ہے میں دوبارہ سے صندوق کو بند کر کے پہاڑی کی کوہ میں چھپا دیتی ہوں۔ کئی برس ہوئے میرے ساتھی سانپ کو ایک شکاری نے اپنے ساتھی پر حملہ کرنے پر ہلاک کر دیا تھا لیکن میں بھی اسے ڈس کر ہلاک کر چکی ہوں۔ اس دن سے تنہا زندگی گزار رہی ہوں' آج بڑے عرصے بعد تم دونوں کو بھی میں ڈس لوں گی کیونکہ تم نے مجھ سے میری دولت چھیننے کی کوشش کی ہے۔"

"ہم...... ہمیں...... مم...... معاف کر دو...... ہم...... پھر کبھی اس...... دولت کا خیال بھی دل میں نہ لائیں گے۔" مبشر نے کہا۔

''اس گھر میں جب تم آئے تھے تمہیں یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہاں کچھ ہے لیکن تمہارے ابو نے بہت اچھی بات کی تھی کہ جو کوئی مخلوق یہاں رہتی ہے وہ ہمیں تنگ نہیں کر رہی تو ہم کیوں اسے تنگ کریں۔ میں نے بھی تمہیں تنگ نہیں کیا اب تم نے میری دولت لوٹنے کا پروگرام بنالیا ہے تو میں بھی تمہیں نہیں چھوڑوں گی، تم مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میرا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا، اسے مرنے کو بس چند منٹ درکار ہوتے ہیں۔''
یہ کہتے ہوئے وہ عورت ناگن میں تبدیل ہوگئی۔
وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہی تھی اور ان دونوں کے قدم زمین میں ایسے گڑ گئے تھے کہ زمین نے پکڑ لیا ہو۔ وہ وہاں سے بھاگنا چاہ رہے تھے مگر بھاگ نہیں پا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ناگن اتنی لمبی ہوگئی تھی کہ اس نے مبشر اور اعجاز کے بدن اس طرح سے جکڑ لیے تھے کہ جیسے وہ کوئی لمبی سی رسّی ہو، ان کے ہاتھ پاؤں اور جسم ناگن کے قابو میں تھے وہ معمولی سی بھی حرکت نہیں کر پا رہے تھے۔ کسی بھی لمحے ناگن ان دونوں کو ڈس کر ہلاک کر سکتی تھی، موت کے خوف سے دونوں کی آنکھیں باہر کو اُبلنے کو تھیں، لمحہ بہ لمحہ موت ان کے نزدیک ہوتی جا رہی تھی۔ ناگن نے جیسے ہی مبشر کو ڈسنا چاہا، تہہ خانے میں آواز پیدا ہوئی، چند لمحے کو ناگن رک گئی اور آواز کی طرف دیکھا۔ امتیاز علی تہہ خانے میں داخل ہو چکا تھا یہ منظر دیکھ کر ایک لمحے کو ان کے چہرے پر گھبراہٹ طاری ہوئی اور پھر وہ سنبھل کر بولے۔
''بہن! یہ دونوں ناسمجھ ہیں ان سے غلطی ہوئی جس کی میں تم سے معافی مانگتا ہوں اور تم سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ تم جہاں کہو گی یہ خزانہ وہاں پہنچا دوں گا۔'' امتیاز علی نے باقاعدہ ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔
ناگن نے غصے سے ان دونوں کو دیکھا اور ان کے جسموں سے خود کو دور کر لیا اور صندوق پر جا کر بیٹھ گئی۔
''کل صبح تیار رہنا میں اپنے دوست کی جیپ لے کر آؤں گا اور اس صندوق کو اس میں رکھ دوں گا تم بھی جیپ میں سوار ہو جانا جہاں کہو گی اتار دوں گا۔'' امتیاز علی نے کہا۔
مبشر اور اعجاز دونوں بُری طرح سہمے ہوئے تھے انہیں بڑی حیرت ہو رہی تھی، موت سے کس طرح وہ بچ گئے۔ تہہ خانے سے باہر آنے پر امتیاز علی نے انہیں خوب ڈانٹا اور وہ چپ کر کے سنتے رہے، غلطی انہی کی تھی وہ لالچ نہ کرتے اور نا اس مصیبت میں گرفتار ہوتے۔
دوسرے دن وعدے کے مطابق امتیاز علی اپنے دوست کی جیپ لے آئے تھے جب انہوں نے صندوق جیپ میں رکھا، وہ ناگن بھی اچانک کہیں سے نمودار ہوئی اور جیپ کے اندر بیٹھ گئی۔
شہر سے نکلتے ہی جنگل شروع ہو گیا تھا ایک جگہ پہنچنے پر ناگن عورت کے روپ میں آ گئی۔
''بس یہیں جیپ روک دو اور یہ صندوق سڑک سے کچھ فاصلے پر رکھ دو۔'' اس نے کہا۔ امتیاز علی نے وہ صندوق جنگل کے اندر رکھ دیا اور جیسے ہی وہ جانے کو مڑے ناگن بولی۔
''تم بڑے خوش نصیب ہو، جو میں نے تمہارے بیٹوں کو چھوڑ دیا ورنہ آج تک جس نے میرے خزانے سے دولت چرانے کی کوشش کی ہے، میں نے اسے زندہ نہیں چھوڑا، جانتے ہو کیوں؟''
''نہیں؟'' امتیاز علی نے نفی میں سر ہلایا۔
''اس لیے کہ تم نے مجھے بہن کہہ دیا تھا اور بہن کس طرح بھائی کے بچوں کو ڈس سکتی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ دوبارہ سے ناگن میں تبدیل ہوگئی۔
امتیاز علی نے جیپ میں بیٹھتے ہوئے ایک نظر ناگن پر ڈالی اور جیپ کو سڑک پر دوڑانے لگے۔

پراسرار بنگلہ

جاوید احمد صدیقی

اس دنیا میں انسانوں کے علاوہ ایسی مخلوق بھی آباد ہے جو وجود رکھتے ہوئے بھی ہمیں نظر نہیں آتی البتہ ہمیں اپنی موجودگی کا احساس ضرور دلاتی ہے اشرف المخلوق حضرت انسان کا کردار اور ایمان جب بھی کمزور پڑتا ہے یہ مخلوق اسے اپنے زیر اثر کرلیتی ہے۔

ایک نوجوان کا احوال، وہ اچانک اپنے گھر سے پر اسرار طور پر غائب ہوگیا تھا۔

یوں تو میرے والد صاحب (مرحوم) ریلوے میں انجینئر تھے مگر انتہائی سخت ایمانداری کی وجہ سے افسران ان کو ہر دو تین سال کے بعد کسی دور دراز یا کم اہمیت کے اسٹیشن پر ٹرانسفر کردیا کرتے تھے یعنی مین لائن کے بجائے برانچ لائن کے اسٹیشنوں پر...... اس لیے میں بھی (بلکہ ہم سب بہن بھائی اور والدہ) مختلف جگہوں پر قسم قسم کے وسیع و عریض بنگلوں میں رہتا رہا۔

ان دنوں ہم لوگ سندھ کے علاقے دادو اور لاڑکانہ کے درمیان چھوٹے سے اسٹیشن پر بنگلے میں رہا کرتے تھے۔ یہ بنگلہ ریلوے کالونی کے ذرا آخر میں تھا اور ایک ہی قطار میں 16 فٹ اور 20 فٹ کے رقبہ میں 8 کمرے بنے ہوئے تھے اور شروع میں بڑا سا ڈائننگ ہال اور پھر ماسٹر بیڈ روم وغیرہ...... اردگرد کمروں کے دونوں طرف کشادہ برآمدے تھے اور اندر کی سائیڈ میں وسیع کمپاؤنڈ جس کے شروع کے حصہ میں بڑا سا باورچی خانہ بھی تھا اور اُدھر ہی سے باہر کام کرنے والوں کے گھروں کو دروازے بھی تھے۔ باہر کی سائیڈ میں بہت بڑا لان گراسی اور گیٹ اس کے آخر میں تھا۔ پیپل، برگد کے پرانے اور بڑے بڑے درخت ایستادہ تھے اس کے علاوہ باغ لگا ہوا تھا، ہر قسم کے پھول، پودے اور ساتھ میں وسیع زمین تھی جس پر مختلف سبزیاں، موسم کے حساب سے خوب کام آتی تھیں۔ دو مالی سب جگہ کی دیکھ بھال کرتے تھے، دن کے وقت تو کوئی بھی ایسا ویسا ڈر نہ لگتا تھا اور پھر میں تو خاصا نڈر تھا۔ کئی دفعہ امی جان نے منع بھی کیا رات کو اندر کے برآمدے کے آخر تک نہ جایا کرو مگر میں ٹھہرا نڈر اور میرے بہن بھائی بھی میرے ساتھ ہی لگے رہتے تھے اور وہیں اسکولوں میں تھے۔

پرانہ زمانہ تھا اور پھر ٹاٹ والے اسکولوں کی ہی بدولت ہم نے بڑی بڑی پڑھائیاں کیں، فرق صرف یہ تھا کہ استاد صاحبان، ٹیوشن کی لعنت سے پاک تھے اور سچے اور کھرے جذبے سے پڑھاتے تھے۔

پہلے کمرے میں امی ابو ہوتے تھے بعد کے کمرے میں تینوں بہنیں اور اس کے بعد ہم تین بھائیوں کا کمرہ تھا۔ اس کے ساتھ والا کمرہ ڈرائنگ روم تھا۔ ساتھ کے دو کمرے کچھ سامان اور اسٹور ٹائپ تھے، آخری دو کمرے کے ساتھ باتھ بھی تھا اور یہ ہم بھائیوں کا تھا۔

ان کا کیا بُرا ہونے کے ناتے زیادہ میرے ہی تصرف میں رہتا تھا، میں چونکہ الیکٹرونکس کا دلدادہ تھا اور دسویں میں تھا تو بہت سی چیزیں بنایا کرتا تھا۔ خاصے اوزار اور ٹیسٹ چیزیں بھی میرے پاس تھیں۔

ہمیں اس جگہ آئے ابھی چھ ماہ ہوئے تھے کہ ایک رات میرا چھوٹا بھائی بارہ بجے کے قریب باتھ استعمال کرنے گیا اچانک میری آنکھ کھل گئی اور مجھے محسوس ہوا کہ بھائی کو گئے دیر ہوگئی چنانچہ میں نے فوراً اٹھ کر باتھ کے پاس آ کر ہلکی آواز میں اسے پکارا' دوسری آواز پر بھاری اور خوف زدہ آواز میں اس نے جواب دیا۔ میں نے دروازے پر ہاتھ رکھا تو کھلتا چلا گیا' اندر بھائی شیشے کے سامنے کھڑا تھا اور بے حد خوفزدہ۔ میں نے بازو سے پکڑا اور کمرے میں لے آیا' پانی وغیرہ پلا کر پوچھا کیا ہوا تھا' کہنے لگا۔

''بھائی وہاں تو روشنی ہونے لگی اور مکمل سفید اور مجھے معلوم نہ ہوسکا کہ کدھر سے آ رہی ہے۔ میں نے فارغ ہونے کے بعد قل اور آیت الکرسی کا ورد شروع کیا تو ہوش ٹھکانے آئے' ہر چیز صحیح ہوگئی۔'' خیر بات آئی گئی ہوگئی۔

میرے دسمبر میں ٹیسٹ شروع تھے' راتوں کو صبح تک اکثر تیاری کرتا رہتا تھا اور ساتھ ساتھ تھوڑا بہت الیکٹرونکس کی چھوٹی موٹی چیزیں بھی بناتا رہتا اور آزماتا رہتا تھا۔ چند روز ہی گزرے تھے کہ میں نے ایک رات زیرو کے بلب کو ایسی ڈیوائس بنا کر لگایا کہ ہاتھ میں بازو پر ایک پلاسٹک کی چوڑی ڈیوائس بنا کر پہنی۔ اب ہوتا یہ تھا کہ اگر مجھے اونگھ آ جائے اور پڑھتے پڑھتے دماغ یکدم ساتھ چھوڑ دے کہ بس کرو بھئی بہت ہوگیا تو زیرو کا بلب پوری روشنی سے جلنا بجھنا شروع ہوجاتا۔

دوسرے تیسرے دن رات کے تین بجے میں پڑھ رہا تھا کہ میرے جاگتے ہوئے بلب نے اسی طرح بلنگ شروع کردی' میں حیران ہوگیا' اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے باتھ کے دروازے پر پڑی تو مزید پریشان ہوگیا کہ بلب کے ساتھ ساتھ باتھ میں بھی سفید دودھیا روشنی جل بجھ رہی ہے' میں تھا نڈر وہ پلاسٹک کی ڈیوائس اتاری اور بھاگتے ہوئے باتھ میں گھس گیا' یکدم سب نارمل ہوگیا۔ خیر میں آ کر مطالعے میں مشغول ہوگیا' صبح نماز کے بعد میں سویا اور دو تین گھنٹے کے بعد اٹھا چوں کہ اتنی امتحانات تیاری کے لیے چھٹیاں تھیں' ناشتہ وغیرہ کر کے پھر کمرے میں میز پر آ کر پڑھائی شروع کردی۔ اس دن میں نے فزکس کی تیاری مکمل کر لی تھی اور ایک دو چیپٹر باقی تھے' کتاب کھولی اور حیرانی ہوئی کہ اس کے اندر سے ایک سفید کاغذ تہہ کیا ہوا نکلا فوراً کھولا اور اردو میں لکھا تھا کہ ''جوان تم نے یہ بڑے کام کی چیز بنائی ہے' ایسی کم از کم 5 ڈیوائسیں بنا کر باتھ کے باہر ایک چھوٹے سے اندھیرے کمرہ میں رکھ دینا' اس کا صلہ ہم تمہیں دیں گے۔''

چند دن بعد میں نے مطلوبہ چیزیں بنا کر بتائی ہوئی جگہ پر رکھ دیں اور میرے بعد میں دیکھنے پر وہ غائب تھیں۔ اسی طرح میں نے ایک ٹارچ میں ایسی تبدیلی کہ کوئی بھی ان نیچرل چیز سے ٹکراؤ ہو تو وہ ٹارچ سفید کی بجائے سرخ روشنی دینا شروع کردے' یہ سب میگنیٹک فیلڈ اور ان نیچرل چیزوں کی حرارت کو خاص طریقے سے ناپنے سے ہوتا تھا' یہ بڑی ہی ان تھک محنت کے بعد بنی تھی۔

ایک دن آدھی رات کو مجھے اندر صحن میں جانا پڑا اور میں آخری کونے تک چلا گیا' ٹارچ میرے ہاتھ میں تھی۔ جہاں میں نے کچھ چیزیں لینی تھیں ان کے قریب آتے ہی مجھے پہلے تو زور کا جھٹکا لگا اور گرتے گرتے بچا مگر میں لاحول پڑھ کر آگے بڑھ گیا حالاں کہ ٹارچ سرخ روشنی دے رہی تھی اور

بدبو بھی پھیلی ہوئی تھی' میں نے ہمت کی اور بول پڑا۔

''بدبختو کیوں مسلمانوں کو تنگ کرتے ہو' یہ ٹارچ کی روشنی ہی تمہیں بھسم کردے گی۔'' اچانک روشنی بھی سفیدی میں تبدیل ہوگئی' اگلے دن میں ویسی دوسری ٹارچ رات کو آن کرکے محفوظ جگہ پر رکھ دی اور پھر کسی ان نیچرل چیز نے تنگ نہ کیا۔

ادھر میری تیاری شروع تھی اور چھٹا ساتواں دن تھا کہ میں ٹارچ پکڑے رات دو بجے کے قریب غسل خانہ کے اندر گیا اور نا معلوم کیا ہوا کہ ٹارچ کی روشنی سرخ ہوکر زبردست تیز اور گرم ہوگئی اور پھر یکدم نیلی' نیلگوں روشنی اچانک ٹارچ کا رخ میری طرف ہوگیا یہ روشنی مجھ پر پڑی اور پھر جیسے میرے ہوش حواس غائب ہوگئے اور اب میں ایک بڑے سے کمرے میں تھا۔ نہایت اچھا خوب صورت کمرہ' ہر چیز سیٹ کی گئی تھی اور عجیب وغریب منظر شروع ہوگئے۔ لوگ آنے لگے' مجھے ملتے اور حال پوچھتے۔ پھر خوب صورت عورتوں نے آنا شروع کردیا۔

کئی گھنٹے اس طرح کی بات چیت جاری رہی اور پھر منظر بدل گیا۔ مجھے ایک نہایت ہی خوب صورت اور عجیب سے خدوخال والی نوجوان لڑکی سے بیاہ کرنے کی رسومات پوری کرنے کو کہا گیا۔

میں پریشان تھا کہ کہاں پھنس گیا ہوں' بڑے لوگ عجیب غریب حلیوں میں آئے اور مجھے کہنے لگے۔

''تم کام کا بندہ ہے' ہم اور ہماری قوم نے تمہیں پسند کرلیا ہے اور پہلے پلاسٹک کی ڈیوائس اور پھر یہ ٹارچ ہمارے بڑے کام کی ہیں۔ تم اور بھی زبردست ریسرچ کرو' یہاں تم کو تمام سہولتیں میسر ہوں گی۔ ایک کارخانہ ٹائپ بلڈنگ ہم نے پہلے ہی بنا کر رکھ دی ہے' جہاں تم کام کروگے۔''

اب میں کیا کرسکتا تھا بڑی منت سماجت کی کہ میرے والدین تو میری گمشدگی میں زندہ نہ رہ سکیں گے اور تم لوگوں کا پلان تو کم از کم دو تین دہائیوں پر کھڑا لگ رہا ہے۔ مگر ہر منت' ہر بات رائیگاں گئی۔

اور پھر میری زندگی کا پراسرار ترین وقت گزرنے لگا' یہ عجیب بات ہوئی ان لوگوں کے بڑوں نے مجھے انسان جیسی نہایت حسین وجمیل لڑکی سے نارمل انسانوں کے رواج کے مطابق رشتۂ ازدواج سے باندھ بھی دیا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ اس طرح یہ دل بھی لگائے گا' کام بھی توجہ سے کرے گا اور خوامخواہ بھاگنے کے لیے تنگ بھی نہ کرے گا۔

اب فیکٹری میں مجھے عجیب وغریب اور انتہائی مفید قسم کے پلان بنا کر دیئے جاتے اور خاص طور پر شمسی توانائی کو سولر پینلز کے بغیر قابو کرکے کیسے بجلی بنائی جاتی ہے۔ سولر پینلز کی جگہ ہم لوگوں نے عجیب قسم کی سلوپکا سے ڈیوائس بنائی اور پھر چند گھنٹے سورج کی روشنی کے ساتھ اسٹوریج کے لیے بھی مٹی سے ٹینک بنایا اور زبردست کامیابی حاصل کی۔

یہ لوگ چوں کہ آگ سے بنے ہوتے ہیں اس لیے میں کئی ڈیوائسس اور ان کے استعمال کی چیزیں خالص (خاص قسم کی مٹی) سے بنائیں۔

ٹارچ کی جو روشنی تھی وہ بھی Clay کے ہی پرزوں اور پھر اس کے لیعنی روشنی کو خاص طرح کی مٹی کی خصوصیات میں تبدیل کرنے کا عمل بنایا یہ مفید ترین چیز تھی کہ یہ کسی کی طرف کرکے آن کی جاتی تو یہ آگ سے بنے لوگوں کو وہیں پتھر کی طرح بے حس بنا دیتی تھی۔

برس ہا برس گزرتے چلے گئے اور میں ان کے

خاص لوگوں کے ساتھ مل کر بے شمار چیزیں بنا چکا تھا۔ ہر روز ہی ان کی پراسرار، محیر العقول عقل دنگ رہ جانے والے رسم و رواج، حرکات، رسومات اور رشتہ داریاں دیکھ دیکھ کر پریشان ہوتا رہتا تھا۔ آپ لوگ حیران ہوں گے کہ ان دس، بارہ سالوں میں میرے تین بیٹے بھی ہو گئے مگر واپسی کی کوئی تدبیر نہ تھی۔ ایک دن میری مسلسل درخواست پر جو اپنی بیوی سے کئی سالوں سے کر رہا تھا کہ واپس بھجوا دو، اتنے سالوں میں تو غم و رنج سے میرے والدین ختم ہو چکے ہوں گے اور دوسروں کا کیا حال ہوگا، اس نے ایک ترکیب مجھے بتا ہی دی۔

اس دن صبح صبح یہ مجھے ایک بہت اونچے پہاڑ کے پیچھے لے آئی اور چند پتھر بھی دیے اور ساتھ ہی ایک عجیب دھات کی انگوٹھی پہنا دی، کہنے لگی۔

''اس کی وجہ سے آپ یہاں کسی کو نظر نہیں آ رہے اور ہاتھ میں جو پتھر ہیں ان کی بدولت آپ پلک جھپکتے اپنے گھر کے سامنے جا اتریں گے۔'' اس کے کہنے کے مطابق میں نے آنکھیں بند کیں اور پھر ایسے لگا جیسے کسی نے کہا ہو، آنکھیں کھول لیں۔

اور حیرت ناک منظر دیکھا گھر کے سامنے کھڑا ہوں اور پھر کپڑے بھی وہی ہیں، اتنے میں ہمارے گھر کا دروازہ کھلا اور اتفاق سے میری امی نے باہر دیکھا اور بے اختیار مجھے دیکھ کر گلو گلو کہہ کر گلے لگا لیا اور گھسیٹتی ہوئی اندر لے آئیں۔ یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ گلو واپس آ گیا ہے اور جب اصل قصہ میں نے سنا تو حیران ہونے کی انتہا ہو گئی کہ سب کہہ رہے تھے کہ تین دن سے غائب ہو اور ہم سب کتنے پریشان تھے۔ اللہ کا شکر ہے کہ صحیح سلامت آ گئے ہو اور پھر یہ تمام واقعات میں نے دل میں ہی رکھے کہ کون یقین کرے گا کہ ادھر بارہ سال گزار کر آیا ہوں اور ادھر صرف تین دن ہی گزر رہے ہیں۔

آپ لوگ حیران ہوں گے کہ یہ سب کیا تھا، میرا اپنا خیال ہے کہ یہ ایک پراسرار اور محیر العقول واقعہ تھا اور جس سے میں نے بے انتہا سبق سیکھا اور جب میں نے انجینئرنگ میں پڑھنا شروع کیا تو تیسرے سال میں آ کر وہ عجیب و غریب چیزوں کے بلیو پرنٹس، ابتدائی ڈرائنگ اور پورے پروجیکٹ کی تفصیل بنا بنا کر میں نے اپنے نہایت ہی لائق فائق استاد سے ڈسکس کرنے کے لیے دے دی اور وہ تو ان آئیڈیاز کو سن کر، پڑھ کر دنگ رہ گئے۔ خاص طور پر سولر انرجی، بغیر سولر پینلز کے بنانے والا پروجیکٹ اس پر کام شروع کر دیا اور کئی اور بھی پروجیکٹ فائنل ائیر میں مکمل کیے۔

اور بعد میں مجھے ان ایجادات کی وجہ سے نوبل انعام بھی ملا۔ عزت، قدر منزلت اور دولت تو بے تحاشہ...... مگر میں نے اپنی اس جہاں والی بیوی اور بچوں کے ساتھ کبھی بھی شکر گزاری، اللہ تعالیٰ کو نہیں چھوڑا، دین ہی ہمیں صحیح راہ سکھاتا ہے۔

ان تمام ایجادات اور دوسری چیزوں کا محرک کیا تھا؟ کیسے آپ کو خیال آیا؟ بے شمار سوالات کیے جاتے تھے مگر اب میں اپنی زندگی کے وہ پراسرار اور عجیب و غریب بارہ سال کی تفصیل کیسی بتاتا؟ پھر اعتبار کون کرتا اور یہ بات مرتے دم تک راز ہی رہے گی۔

بہرحال یہ پراسرار واقعہ ایک حقیقت ہے اور میرے لیے تو قسمتِ محترکہ...... اللہ تعالیٰ سب کو محفوظ رکھے، آمین۔



قسط نمبر 18

قلندر ذات

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الٰہیٰ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو نات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندر' ریچھ اور کتے نچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آہن کی ہے جو نات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنے تئیں دنیا تسخیر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسائیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے۔ کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔

میں اور سندو، باہر جانے والے مرکزی گیٹ کی جانب بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ہم گیٹ سے باہر آگئے۔ وہاں آکر میں نے طویل سانس لی اور چاروں طرف دیکھا۔ محل نما اس عمارت کے آگے کافی دور تک میدان تھا۔ کافی فاصلے پر گھنا جنگل دکھائی دے رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہر طرف سے اس محل نما عمارت کو جنگل نے گھیرا ہوا ہے۔ میں جائزہ لے رہا تھا کہ سندو نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں یقین ہے کہ تم اس گھنے جنگل سے گزر کر ساحل تک پہنچ جاؤ گے؟''

''تم میرے ساتھ کیوں آئے ہو؟'' میں نے جواب دینے کی بجائے سوال کردیا۔

''میرا دل کہتا ہے کہ میں تم پر بھروسہ کرلوں۔ حالانکہ میں تمھارا نام تک نہیں جانتا۔'' اس نے خوشگوار لہجے میں کہا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو پھر تم اپنا بھروسہ قائم رکھو۔ ہم نہ صرف ساحل تک جائیں گے بلکہ ساحل سے بھی آگے جائیں گے۔ باقی رہی نام کی بات تو مجھے جمال کہتے ہیں۔''

''مطلب مسلمان ہو اور پاکستانی۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے یوں کہا جیسے وہ بہت کچھ سمجھ گیا ہو۔

''چلیں پھر؟'' میں نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے قدم بڑھا دیئے۔

اسے میں سمجھاتا بھی تو میری بات اس کی سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔ کیونکہ میں نے اپنا مقصد دیکھ کر سمجھا تھا۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ میرے مقصد کا تعین ہوگیا تھا۔ اب میری زندگی میری نہیں رہی تھی۔ میں مشاہدہ کرچکا تھا۔

وہ لوگ جو موت سے بھاگتے ہیں، موت ان کے تعاقب میں رہتی ہے اور جو لوگ موت کا تعاقب کرنے لگیں، زندگی خود اس کی حفاظت کرنا شروع کردیتی ہے۔ ایسا انہی لوگوں کا مقدر ہوتا ہے جو اعلیٰ مقصد لے کر چلتے ہیں۔ پھر کائنات کے تمام ذرائع اس کے مددگار بن جاتے ہیں۔ یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں، تاریخ کے اوراق ایسی بے شمار مثالوں سے بھرے پڑے ہیں۔ زندگی وجود کے ساتھ ختم نہیں ہوتی۔ اس کا تعلق اعمال کے ساتھ ہے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم گھنے جنگل میں داخل ہوچکے تھے۔ ہمارے پاس ہتھیار نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ جس طرح صحرا کی اپنی مخصوص آواز ہوتی ہے، اسی طرح جنگل کی بھی اپنی ایک مخصوص آواز ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ جنگل میں پرندے بولتے ہیں اور ہوا کی سرسراہٹ سے آواز بدل جاتی ہے۔ مختلف پرندوں کی مختلف بولیاں سماں

باندھ دیتی ہیں۔ اگر خوف کو خود پر مسلط کرلیا جائے تو یہی آوازیں قدم قدم پر ڈرا دینے کا باعث بن جاتی ہیں۔ یہی حال ہمارے معاشرے کا ہے۔ کوئی بھی مقصد لے کر چلو، وہ مقصد کتنا ہی اعلیٰ اور پاکیزہ کیوں نہ ہو، ابتدائے سفر ہی سے مختلف بولیاں سنائی دینے لگ جائیں گی۔ منفی، مثبت بولیاں، جن میں اگر بندہ اُلجھ گیا تو مقصد کی راہ کھوئی ہو جاتی ہے اور وہ لوگ جو اپنے مقصد پر نگاہ رکھتے ہوئے بولیاں تو سنتے ہیں لیکن ان پر توجہ نہیں دیتے، وہی اکثر کامیاب ٹھہرتے ہیں۔

خوف انسانی صلاحیتوں کو نگل لیتا ہے۔ دشمن اسی ہتھیار سے ختم کرنے کی ابتدا کرتا ہے۔ لیکن اگر بندے کے پاس اعلیٰ مقصد ہو تو دشمن کا پیدا کیا ہوا یہی خوف ایک ہتھیار بن جاتا ہے۔ دشمن سمجھتا ہے کہ ڈر گیا، اس وقت وہ پوری طرح اپنی خباثت ظاہر کرتا ہے۔ یہاں تک کہ منافقین بھی پوری طرح ننگے ہو جاتے ہیں۔ یہاں مقصد کی نہ صرف جیت ہوتی ہے بلکہ اسے زندگی مل جاتی ہے اور دشمن کا پھیلایا ہوا خوف دشمن ہی کی موت بن جاتا ہے۔ یہیں معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کی اوقات کیا ہے۔

ہم جنگل میں داخل ہو کر اس کے ٹیڑے میڑھے راستوں پر چلتے چلے جا رہے تھے۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ عمارت سے ساحل تک کا کتنا سفر ہے۔ اس لیے معلومات لینے کی خاطر اور وقت گزاری کے لیے میں نے سندو سے پوچھا کہ شاید اسے معلوم ہو تو اس نے کہا۔

"میں نے یہیں سے سنا ہے کہ ہر طرف سے چھ کلو میٹر ہے۔ مطلب بارہ کلومیٹر محیط کا یہ جزیرہ ہے۔"

"اور کیا سنا ہے اس کے بارے میں؟" میں نے مزید معلومات کے لیے پوچھا۔

"وہی جوان لوگوں نے بتایا۔ خونخوار جانور، وحشی جنگلی اور یہ بھیانک جنگل۔" یہ کہہ کر وہ ہنس دیا

"اگر راستے میں کوئی نہیں آیا تو ہم دوپہر سے پہلے ساحل تک پہنچ جائیں گے۔" میں نے کہا اور ایک زوردار قہقہہ لگا دیا۔ یہ میرا پاگل پن نہیں تھا بلکہ میں سندو کو حوصلہ دے رہا تھا اور شاید وہ بھی ایسا ہی سوچ رہا تھا۔

ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ ہم کتنا سفر طے کر آئے ہیں۔ ایک جگہ تالاب بنا ہوا تھا۔ اس میں شفاف پانی تھا۔ پانی کو دیکھتے ہی پیاس ابھر آئی۔ میں ایک تنے کے ساتھ بیٹھ گیا۔ سندو نے تالاب کے پانی کو چکھا اور پھر سیر ہو کر پی لیا۔ میں اس وقت پانی پینے کے لیے اٹھ گیا تھا، جب ایک تیر میرے سر کے اوپر درخت میں لگا۔ ایک دم سے میری ساری حسیں بیدار ہو گئیں۔ سندو بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ بھی چوکنا ہو گیا۔ مجھے یہی اندازہ کرنا تھا کہ یہ تیر آیا کس طرف سے تھا۔ میں محتاط نگاہوں سے ہر طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک سات آٹھ جنگلی ہمارے سامنے نمودار ہو گئے۔ ان کے ہاتھوں میں نیزے، بھالے اور تلوار نما ہتھیار تھے۔ مختلف عمروں کے کالے سیاہ ننگ دھڑنگ جنگلی جنہوں نے اپنے اردگرد جین یا مختلف کپڑوں کے شارٹس پہنے ہوئے تھے۔ اس پر انہوں نے پتے اور پَر باندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں گھیر لیا تھا۔ میں اور سندو نے ایک دوسرے کے ساتھ کمریں جوڑ لی تھیں۔ ہم بھی ایک دوسرے کو نظروں ہی نظروں میں تول رہے تھے۔ میں ان کے پینترے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ محتاط انداز میں قدم بہ قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہم پر اکٹھے ہو کر حملہ کرتے میں نے سامنے والے جنگلی پر حملہ کی جھکائی دے کر بالکل دائیں جانب والے پر جا پڑا۔ وہ بلاشبہ اس پینترے میں تھا کہ میں سامنے والے پر حملہ کردوں گا تو مجھ پر ٹوٹ پڑے گا لیکن ایسا نہیں ہوا، اس کی لمحہ بھر کی غفلت کا میں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اسے لیتا ہوا زمین پر جا پڑا۔ میں وہیں ٹکا نہیں رہا۔ اس کے ہاتھ میں نیزہ تھا۔ میں نے وہ چھینا اور وہاں سے چشم زدن میں ہٹ گیا۔ اسی لمحے وہاں تلوار اور بھالے کے وار ہوئے۔ میں نے دیکھا ان کا دائرہ ٹوٹ چکا تھا۔ تین جنگلی نہتے سندو کو گھیرے ہوئے تھے۔ اسی لمحے میں نے ایک چیخ ماری اور نیزہ سیدھا کر کے ان کی جانب بھاگا۔ چیخ سے وہ میری جانب متوجہ ہو گئے۔ سندو نے اس کا

فائدہ لیا اور ان کے گھیرے سے باہر آ کر ایک جانب بھاگ گیا۔ میں نے نیزہ اس کی جانب پھینک دیا، جیسے اس نے پکڑ لیا۔ وہ جنگلی کچھ قدم پیچھے ہٹ گئے تھے۔ پہلا بھرپور حملہ ان پر نفسیاتی دباؤ ڈال گیا تھا۔

ہم آمنے سامنے تھے۔ وہ سب ایک طرف اور ہم دونوں ایک جانب تھے۔ وہ بھی ایک جان ہو کر ہم پر حملہ آور ہوئے۔ میں ذرا سا ترچھا ہوا اور ایک جانب بھاگ نکلا۔ وہ آدھے بٹ کر میری جانب آ گئے۔ میں وہیں گھومتے ہوئے انہیں اپنے پیچھے لگا کر بھاگتا رہا، پھر اس وقت جب کہ میں نے انہیں خود کو پکڑنے کا موقعہ دے دیا، اور وہ میرے قریب آ گئے تو میں ایک دم رُک گیا۔ وہ مجھ سے آ لگے۔ میرے ذہن میں تھا کہ کس کے پاس تلوار ہے اور کس کے پاس بھالا۔ وہ میرے اوپر سے آگے جا گرے۔ اسی وقت میں نے ایک سے تلوار چھینی اور لیٹے ہوئے ایک جنگلی کی گردن پر رکھ دی۔

''اپنے ساتھیوں سے کہو وہ ہتھیار پھینک کر دور ہٹ جائیں۔'' میرے یوں کہنے پر اس وہ آنکھیں پٹپٹا کر مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے اسے میری بات کی سمجھ نہ آئی ہو۔ تاہم باقی ٹھٹک گئے تھے۔ میں چند لمحے انتظار کیا، پھر بولا ''میں جانتا ہو کہ تم لوگ انگریزی سمجھتے ہو۔ میں تین تک گنوں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے تلوار کی نوک اس کی گردن میں چبھو دی۔ وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے تیزی سے انگریزی میں اپنے ساتھیوں سے وہی کہا جو میں اسے کہہ چکا تھا۔ انہوں نے ہتھیار پھینک دیئے۔

سندو نے جلدی سے وہ سب ہتھیار اکٹھے کر لئے۔ تب میں نے سب کو زمین پر لیٹ جانے کا کہا تو وہ لیٹ گئے۔ تبھی سندو نے زور سے پنجابی میں پوچھا۔

''تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ یہ انگریزی جانتے ہیں۔''

تب میں نے انگریزی ہی میں جواب دیا

''یہ جنگلی نہیں ہیں، بلکہ اس جزیرے کے وہ مقامی لوگ ہیں، جنہیں انہوں نے اپنی سیکورٹی اور لوگوں کو ڈرانے کے لیے رکھا ہوا ہے۔''

''تمہیں پتہ کیسے چلا؟''

''ان کے شارٹس، اور پھر ان کے پینترے دیکھ کر، ممکن ہیں ان کے آباءاجداد جنگلی ہوں، مگر یہ نہیں ہیں۔'' میں نے کہا اور تلوار اس کی گردن پر رکھ کر بولا ''بتاؤ، میں سچ کہہ رہا ہوں؟''

جس پر اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ہاں کا اشارہ کر دیا۔ پھر ذرا مشکل انگریزی میں بولا

''تم ہم سے تو بچ جاؤ گے لیکن، آگے کیا کرو گے۔ جنگل کے درندے ہیں اور گن بردار سیکورٹی گارڈ۔''

''یہ ہماری قسمت ہے، ہم تمہیں بھی کچھ نہیں کہنا چاہتے، نہ مارنا چاہتے ہیں اور نہ کوئی تکلیف دینا چاہتے ہیں۔ اگر تم ہمارے راستے سے ہٹ کر چلے جاؤ۔'' میں نے لہجے میں ہمدردی بھرتے ہوئے کہا۔

''ہم چلے جاتے ہیں۔'' اس نے کہا تو میں نے فوراً تلوار اس کی گردن سے ہٹالی۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ باقی بھی اٹھ گئے۔ وہ ایک ساتھ ہو کر کھڑے ہوئے اور ہمارے آگے جھکے، اس لمحے انہوں نے ہم پر چھلانگیں لگا دیں۔ میں اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں غیر محتاط تھا، سندو کچھ زیادہ تھا۔ وہ ہم پر ٹوٹ پڑے۔ چار میری طرف اور تین سندو کی جانب۔ انہوں نے ہمیں مکوں اور ٹکوں پر رکھ لیا۔ تلوار میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ میں مار کھاتے ہوئے یہی کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح مجھے موقعہ مل جائے۔ ایک کے مکے سے میرے گال کی جلد پھٹ گئی تھی، جس سے لہو بہنے لگا تھا۔ ان کی رفتار ذرا سی ڈھیلی ہوئی تو میں نے ایک کی گردن پر ہاتھ ڈال دیا۔ ہلکی سی آواز آئی وہ تڑپنے لگا۔ میں نے اسے چھوڑا تو وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ باقی تو مجھے مار ہی رہے تھے، میں نے دوسرے کی گردن کو قابو کیا، اور اس کی گردن کی ہڈی توڑ کر اسے پھینک دیا۔ باقی دو مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔ یہی لمحہ مجھے چاہئے تھا۔ میں نے اپنا گھٹنا ایک کی ٹانگوں کے درمیان مارا وہ دہرا ہوا تو اس کی گردن

میرے ہاتھ میں تھی۔ اگلے چند لمحوں میں وہ بھی زمین پر تھا۔ یہ دیکھ کر چوتھا بھاگ اٹھا۔ باقی تینوں سندو کو بے دردی سے مار رہے تھے۔ وہ لہولہان ہو رہا تھا۔ میں نے تلوار اٹھائی اور ان کی طرف بھاگا۔ میں نے جاتے ہی ایک کی کمر میں تلوار گھسا دی۔ اس کی لرزا خیز چیخ فضا میں پھیل گئی۔ باقی دونوں رُک گئے۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں موقعہ نہیں دیا۔ ایک کے چرکا لگا تو وہ بلبلا اٹھا۔ تب تک سندو بھی سیدھا ہو گیا تھا۔ اس نے تلوار مجھ سے پکڑی تو ایک بھاگ نکلا، مگر سندو نے اسے جانے نہیں دیا۔ اس نے بھاگتے ہوئے اس جنگلی کو پکڑا اور تلوار اس کے پیٹ میں گھسا دی۔

''سندو، یہاں سے فوراً نکلو، ان کی چیخیں بہت دور تک گئی ہوں گی۔ ممکن ہے ان کے مزید لوگ آجائیں۔'' میں نے کہا تو اس نے ایک بھالا اٹھایا، باقی ہتھیار تالاب میں پھینکے اور میرے ساتھ چل دیا۔ اس دوران ہم نے دو چار چلو پانی پی لیا تھا۔ اگلے چند لمحوں میں وہاں سے نکل گئے تھے۔

کافی دور جانے کے بعد ہم ایک ایسے گھنے درخت کے نیچے رُک گئے، جس کی شاخیں زمین سے لگ رہی تھیں۔ مجھے میرا زخم تکلیف دے رہا تھا۔ اس وقت مجھے شدت سے احساس ہوا کہ مجھے ان جڑی بوٹیوں کے بارے میں بھی معلوم ہونا چاہئے، جو زخموں کو فوراً آرام دے دیتی ہیں۔ میں نے اس حوالے سے سندو سے کہا تو وہ کراہتے ہوئے بولا۔

''بھائی جی میں کئی بار ایسے مرحلوں سے گذر چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ لیکن ابھی مجھے وہ بوٹی دکھائی نہیں دی۔''

''چلو پھر چلتے ہیں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو اس نے نگاہوں ہی نگاہوں میں ستانے کا کہتے ہوئے بولا۔

''بہت مارا ہے ظالموں نے۔''

''مجھے تو اب یہی معلوم ہے کہ ہر لمحہ دشمن سے خبردار رہو، اب بھی وہ ہر آنے والی رکاوٹ جو ہمارا رستہ روکے گی وہی ہماری دشمن ہے، حالات اور نوعیت کے ساتھ دشمن بھی بدل جاتا ہے۔'' میں نے کہا تو وہ سر ہلانے لگا۔ جیسے وہ میری بات سے اتفاق کر رہا ہو۔ ہم وہاں کچھ دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ متوقع دشمن سے کیسے نپٹنا ہے، یہ ہم نے طے کر لیا تھا۔



جسپال سنگھ اور رونیت کور کے سامنے گرباج سنگھ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ان تینوں کے درمیان خاموشی تھی۔ گرباج سنگھ پر تشدد کے واضح نشان موجود تھے۔ جسپال نے اس کی حالت دیکھی اور پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''گرباج۔! اگر تم چاہو تو ہم تمہارے ساتھ ایک ڈیل کر سکتے ہیں۔''

''حقیقت یہ ہے کہ میں تم لوگوں کا قیدی ہوں، میری پوزیشن ہی نہیں ہے کہ میں تم لوگوں سے ڈیل کر سکوں۔ ویسے اگر تم کوئی بات منوانا چاہتے ہو تو بولو۔'' اس نے دھیمے سے لہجے میں بے بسی سے کہا۔

''دیکھو۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرنا، ہمیں صرف سندو سے مطلب ہے، وہ مل جائے تو اس کے عوض تم نے جو سندو کی دولت اکٹھی کی ہے، ہم وہ تمہیں دے دیں گے اور اپنی حفاظت میں تجھے کینیڈا روانہ کر دیں گے۔'' جسپال نے تحمل سے کہا۔

''میں پھر وہی کہوں گا کہ وہ یہاں نہیں ہے، وہ ایک ایسی جگہ پر ہے۔ جہاں وہ کسی کی قید میں ہے۔ وہ اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتا ہے، میں نہیں جانتا، میں اسے اپنی مرضی سے یہاں نہیں لا سکتا۔'' گرباج نے احتجاجاً کہا۔

''تو پھر تم ہمیں اس کا پتہ بتا دو، ہم اسے خود لے آئیں گے۔ تجھے تب تک ہمارے پاس رہنا ہوگا۔'' رونیت نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ اس وقت بھارت میں نہیں ہے۔ وہ ایک ایسی جگہ پر ہے جہاں جانے کے فقط دو راستے ہیں۔ ایک فضائی اور دوسرا سمندر میں سے ہے۔'' اس نے کہا تو

جسپال نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''فضائی مطلب؟ اور سمندر......؟''

''فضائی مطلب وہاں پر کوئی ائر پورٹ نہیں ہے۔ وہ ایک جزیرہ ہے۔ ہیلی کاپٹر سے جایا جا سکتا ہے یا پھر سمندر سے اس کے ساحل تک۔ آگے بہت دشوار گزار راستہ ہے اور......'' گرباج نے کہنا چاہا۔

''مطلب سندو کو ہیلی کاپٹر کے ساتھ اٹھایا اور جزیرے پر لے گئے۔ کیا تم اس کی لوکیشن بتا سکتے ہو؟'' جسپال نے تیزی سے پوچھا۔

''اگر تم کہتے ہو تو بتا دیتا ہوں۔ تب تک مجھے یہاں رہنا ہوگا، کیوں نا میں ان لوگوں سے بات کرلوں، اگر کوئی صورت نکل آئے؟'' گرباج نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، کرو رابطہ۔'' جسپال نے کہا اور اس کا فون میز پر رکھ دیا، جسے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اس نے تیزی سے نمبر تلاش کیے اور پھر پش کر کے رابطے کا انتظار کرنے لگا۔ جسپال نے فون پکڑ کر اس کا اسپیکر آن کر دیا اور اسے میز پر رکھ دیا۔ جس سے آواز ابھری

''ہاں گرباج تم کینیڈا کے لیے نکلے نہیں ہو؟''

''شاید اب میں نہ جا سکوں، میں پکڑا گیا ہوں۔'' اس نے افسردگی سے کہا۔

''وہاٹ نان سینس، یہ کیسے ممکن ہے، اتنا فول پروف پلان اور تم پکڑے گئے۔ وہ کوئی آسمانی مخلوق ہیں؟'' دوسری طرف سے کہا گیا

''لگتا تو ایسے ہی ہے کہ جیسے وہ آسمانی مخلوق ہیں۔ مجھے انہوں نے پکڑ لیا۔'' گرباج نے کہا۔

''کیا کہتے ہیں وہ؟'' دوسری طرف سے تحمل بھرے لہجے میں پوچھا گیا

''یہی کہ سندو کو چھوڑ دیا جائے۔ اس کے عوض وہ مجھے......'' گرباج نے کہنا چاہا مگر اس کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ فون سے آواز ابھری

''یہ تم ڈرامہ کر کے ہمارے ساتھ کوئی گیم تو نہیں کر رہے ہو؟''

''بہت افسوس ہے باس، مجھ پر تمہیں اعتماد ہی نہیں۔'' گرباج نے دبے دبے غصے میں کہا۔

''بات اعتماد کی نہیں، حقائق کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سندو اس وقت جزیرے سے باہر نکلنے کی کوشش میں ہے۔ وہ ایک سر پھرے پاکستانی کے ساتھ موت کے منہ میں جا رہا ہے۔ ہم اس کا کچھ نہیں کر سکتے، اب چاہے وہ جزیرے سے نکل بھی گیا تو ہم اسے مار دیں گے۔'' فون سے کہا گیا

''اور یہ لوگ مجھے مار دیں گے۔'' وہ بولا۔

''مر جاؤ اور انہیں اگر ہمارا راستہ دکھایا تو ہم ان کے ساتھ تجھے بھی مار دیں گے۔'' دوسری طرف سے سفاکانہ لہجے میں کہا گیا۔ اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ جسپال نے وہ فون اٹھایا اور کوئی بات کیے بنا وہاں سے اٹھ گیا۔

اس نے باہر نکلتے ہی کسی نامعلوم جزیرے پر موجود کسی باس کا نمبر روہی والوں کو دے دیا تاکہ اس کی لوکیشن کے بارے میں معلوم ہو سکے۔

''اب کیا خیال ہے جسپال۔؟'' رونیت نے پوچھا۔

''خیال کیا، ہم اس کی لوکیشن دیکھ کر اس جزیرے پر جا رہے ہیں۔'' جسپال نے حتمی لہجے میں کہا۔

''لوکیشن کا تو گرباج کو بھی نہیں معلوم؟'' وہ بولی۔

''پتہ کرتے ہیں نا۔'' جسپال نے کہا ہی تھا کہ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا فون بج اٹھا۔ اسکرین پر کوئی نمبر نہیں تھا۔ اس نے کال رسیو کی تو دوسری طرف سے اسی باس کی طنزیہ آواز ابھری

''میری کھوج سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میں اگر جزیرے میں بیٹھا ہوں نا تو اسے اپنا مضبوط قلعہ بنا کر، اب میں سمجھ گیا ہوں کہ گرباج کو تم لوگوں نے کیسے ٹریس کیا ہوگا۔ عقل مندی اسی میں ہے کہ خاموشی سے سندو کو بھول جاؤ۔''

''کیوں چھوڑ دیں سندو کا خیال اور کیوں بھول جائیں اسے ہم۔''جسپال نے کہا۔

''پہلے اس کے بچ جانے کی امید تھی میں اسے بہت بڑی آزادی دینے والا تھا لیکن وہ احمق نکلا، اس نے اپنی موت خود چن لی ہے۔ وہ اب مر جائے گا۔''

''کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم تم تک نہیں پہنچ پائیں گے؟'' جسپال نے غصے میں کہا

''آؤ، سو دفعہ آؤ، مجھ تک پہنچو اگر ہمت ہے تو لیکن میری کھوج تم لوگوں کو بہت مہنگی پڑے گی۔ میں صرف ایک دفعہ سمجھاتا ہوں، دوسری بار صرف موت ملتی ہے۔''

اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ جسپال اور رونیت ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔



میں اور سندو ایک گھنے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ سندو کچھ جنگلی بیر لے آیا تھا۔ ہم وہ کھا رہے تھے۔ دراصل وہ بوٹی تلاش کرنے گیا تھا جس سے زخموں کو آرام ملتا تھا، اس کے ساتھ وہ بیر بھی لے آیا۔ اس بوٹی سے ہمیں کافی افاقہ ہوا تھا اور ہم اچھا محسوس کر رہے تھے۔

''بائی جی دیکھنا، شام تک اس بوٹی کا کمال، زخم یوں سل جائے گا جیسے تھا ہی نہیں۔''

''ہاں یار میں نے درد اور جلن میں کافی آرام محسوس کیا ہے۔''میں نے اسے بتایا

''کہا نا شام تک درد کیا زخم بھی ختم۔'' یہ کہہ کر وہ مجھے اپنے بارے میں بتانے لگا کہ اس نے یہ کیسے سیکھا تھا۔ وہ کہہ چکا تو پوچھا''یار۔! یہ چھ کلو میٹر کہیں بہت زیادہ نہیں ہو گئے؟''

پتہ نہیں ہم نے ساحل کی طرف کتنا سفر کیا ہے، اس طرف بڑھے بھی ہیں یا یہیں کہیں گھوم رہے ہیں۔''میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں ہمیں رات ہونے سے پہلے ساحل تک پہنچ جانا چاہئے۔''اس نے اپنی رائے دی

''اور میرا خیال ہے کہ ہم سفر ہی رات کو کر سکیں گے۔'' میں نے کہا تو تیزی سے بولا۔

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''اس جنگل میں ہمیں تلاش کیا جائے گا بلکہ کیا جا رہا ہو گا۔ جو اس جنگل سے واقف ہو گا، وہ رات کو نہیں نکلے گا۔ مطلب وہ جنگلی، وہی نکلیں گے، جو پوری تیاری سے ہمیں مارنے کے لیے ہمیں تلاش کریں گے۔''میں اپنے طور پر اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

''اور وہ جدید اسلحے سے لیس ہو سکتے ہیں۔'' سندو نے یوں کہا جیسے مجھے یاد دلا رہا ہو۔

''اتنا تو مجھے بھی معلوم ہے یار، رات کے وقت انہیں چکمہ دینا آسان ہو گا۔''میں نے اس سمجھایا تو اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے ہمیں چلنا چاہئے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گیا۔ ناچار مجھے بھی اس کے ساتھ چلنا پڑا۔

ہم پھر سے ایک خاص سمت کا تعین کر کے چلنے لگے۔ کیونکہ اس جنگل میں کوئی واضح راستہ تو تھا نہیں۔ جنگلیوں سے چھینا ہوا بھالا اور تلوار ہمارے پاس تھی۔ گھنے درختوں میں سے سورج کا اندازہ کیا تو لگا کہ دوپہر ڈھل رہی ہے۔ ہم دونوں جنگل میں سے آتی آوازوں پر کان دھرے محتاط ہو کر آگے پیچھے چلتے چلے جا رہے تھے۔ ہم نے تھوڑا فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک ہمیں ایسی سرسراہٹ محسوس ہوئی جس میں غراہٹ ملی ہوئی تھی۔ ہم دونوں ایک دم سے رک گئے اگر ہم محتاط نہ ہوتے تو ہم اس شیر کی جھلک نہ دیکھ سکتے جو ہم سے ذرا فاصلے پر شست باندھے ہوئے تھا۔ میں نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

''سندو۔! ڈرنا نہیں، شیر طاقتور ہونے کے ساتھ ساتھ احمق بھی ہوتا ہے۔ اسے اپنی طاقت کا غرور ہوتا ہے۔ اسے طریقے سے قابو کرنا ہے۔''

''کیسے۔''اس نے سرسراتے ہوئے پوچھا۔

''الگ الگ ہو کر، توجہ بانٹ دو اس کی۔''میں نے تیزی سے کہا اور دائیں جانب سرکنے لگا

''ٹھیک ہے۔''اس نے کہا اور دوسری طرف بڑھا،

اس دوران شیر پوری طرح ہمارے سامنے آ گیا۔

میرے ہاتھ میں تلوار تھی۔ شیر ہمیں یوں دیکھنے لگا جیسے کوئی اجنبی مخلوق اسے دکھائی دے گئی ہو۔ وہ ہمیں دیکھ کر غصے میں غرانے لگا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔ اچانک وہ چاروں پنجے مارتے ہوئے ایک دم سے اٹھا اور اس نے مجھ پر چھلانگ ماری۔ میں پوری طرح محتاط تھا، اس لیے ایک طرف ہو گیا۔ وہ سامنے جا گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ پلٹتا، میں نے پوری قوت سے تلوار اس کی گردن پر مارنا چاہی لیکن وار ذرا سا اوچھا پڑا اور اس کے سر پر لگی۔ وہ دھاڑا اور تڑپ کر پلٹا۔ اس کے زخم آ گیا تھا۔ جیسے ہی شیر کی توجہ میری جانب ہوئی، سندو نے بھالا اس کی کمر میں اُتار دیا۔ وہ اس کی جانب پلٹا تو میں نے تلوار کا وار کر دیا۔ یہاں اس کی توجہ بٹ گئی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس پر وار کرے۔ وہ شدید زخمی ہو چکا تھا۔ شاید اسے ہماری پلاننگ سمجھ آ گئی تھی۔ اس نے اپنا رخ میری جانب کر لیا۔ وہ پوری قوت سے اٹھا اور مجھ پر چھلانگ لگائی۔ لاشعوری طور پر میں نے اپنے بچاؤ کے لیے تلوار آگے کر دی، جو اس کے سینے میں پوری اتر گئی۔ میں تلوار واپس نہ کھینچ سکا۔ وہ ایک طرف زمین پر جا گرا اور میں دوسری جانب۔ اس دوران سندو غافل نہیں تھا۔ اس نے بھالا اس کی آنکھ میں اتار دیا۔ وہ دھاڑنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ زمین پر ڈھیر ہو چکا تھا۔ وہ شاید مر گیا تھا یا بے ہوش تھا، ہم اسے ویسے ہی چھوڑ کر آگے بڑھنے لگے۔ تبھی مجھے خیال آیا کہ ایک تلوار ہی تو میرے پاس ہتھیار ہے۔ میں نے اسے نکالنا چاہا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ تلوار میں نے نکال لی۔ ہم آگے بڑھ گئے۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ ہم نے شیر کو مار لیا۔ میں اکیلا ہوتا تو اس کے ہتھے چڑھ چکا ہوتا۔'' سندو نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

''کوئی اور درندہ بھی ہمارے سامنے آ سکتا ہے۔ بہت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔

''مثلاً کوئی دوسرا درندہ؟'' اس نے سنجیدگی سے کہا لیکن میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر اس پر بات کرنے لگا کہ دشمن کی توجہ بٹ جائے تو کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ ہم یہی باتیں کرتے ہوئے چلتے چلے گئے۔

اس وقت شام ہو رہی تھی، جب ہمیں یوں محسوس ہوا کہ ہم ساحل کے قریب ہیں۔ لہروں کا مخصوص شور ہمیں سنائی دے رہا تھا۔ ہم تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے کہ ایک دم سے ہمارے سامنے کچھ فاصلے پر تین سیاہ پوش یوں اتر آئے جیسے کسی درخت سے گرے ہوں۔ انہوں نے گنیں تھامی ہوئی تھیں اور ہمیں نشانے پر لیا ہوا تھا۔

''ہتھیار پھینک کر یہیں زمین پر لیٹ جاؤ۔'' صاف انگریزی میں حکم دیا گیا۔

''بھاگو۔'' میں نے سندو سے کہا اور ایک دم سے قریبی درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ ایک دم سے فائرنگ ہوئی، جس سے جنگل جھنجھنا اٹھا۔ سندو نے عقل مندی یہ کی تھی کہ وہ میری مخالف سمت میں بھاگا تھا۔ ان کی گنیں خاموش ہو گئیں۔ میں نے لکڑی کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور دور پھینک دیا۔ آواز کے ساتھ ہی ادھر فائرنگ ہونے لگی۔ سندو میری طرف دیکھ رہا تھا اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ وہی ہوا، اس طرف بھی فائرنگ ہونے لگی۔ میری کوشش تھی کہ ان تینوں کو الگ الگ کر لیا جائے تو پھر مقابلہ ہو سکتا تھا، ورنہ ایک ساتھ وہ تینوں ہم پر حاوی تھے۔

جنگل کے خاص شور میں ان گن برداروں کی طرف سے خاموشی تھی۔ میں نے اوٹ میں سے سر نکال کر دیکھا، وہ تینوں سامنے تھے، اس کے ساتھ ہی فائر ہوا اور جو درخت میں لگا۔ مجھے اب ہر حال میں وہاں سے ہٹنا تھا۔ میں نے پھر ایک لکڑی کا ٹکڑا اٹھایا اور پوری قوت سے ان کی طرف پھینکا۔ اسی لمحے میں اس درخت سے اگلے درخت کی اوٹ میں چلا گیا۔ سندو مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ شاید وہ سمجھ چکا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ ایک گن والا وہیں کھڑا رہا، باقی دو ہماری سمتوں کا

تعین کر کے محتاط انداز میں آگے بڑھے۔
میں یہی چاہتا تھا۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ آگے آ رہے تھے۔ تیسرا ان کے کور پر تھا۔ میں ایک بڑا رسک لینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ میری طرف جو آ رہا تھا، میں نے اس کی آہٹ کا انداز لگایا۔ وہ اسی درخت کی جانب جا رہا تھا، جہاں میں پہلے تھا۔ وہ جیسے ہی مجھ سے سات آٹھ قدم کے فاصلے پر رہ گیا، میں ایک دم سے نکلا اور پوری قوت سے تلوار اس کی جانب پھینک دی، وہ گھومتی ہوئی گئی اور اس کے سینے پر جا کر لگی۔ وہ ایک لمحے کو ہل گیا، اس کا ہاتھ ٹرائیگر پر تھا، فائر نجانے کس سمت ہوئے، لیکن میں اس کی بوکھلاہٹ کا فائدہ لینا چاہتا تھا، میں نے اپنے ہاتھ زمین پر رکھ کر قلابازی کھائی اور اس کے سامنے جا کھڑا ہو۔ اس کا اور میرا دو فٹ کا فاصلہ تھا، وہ میری طرف گن سیدھی نہ کر سکا اور میں نے اس کی گن ایک جھٹکے سے چھین لی۔ وہ اپنے زور میں آگے کی طرف دہرا ہوا تو میں نے اس کے منہ پر گھٹنا مارا۔ اس کے منہ سے چیخ ابھری۔ میں نے گھما کر گن اس کے سر پر ماری۔ چٹاخ کی آواز آئی وہ زمین بوس ہو گیا۔ اس کے ساتھ میں زمین پر جا پڑا۔ گولیوں کی ایک بوچھاڑ میرے اوپر سے گذر گئی۔
اب وہ دونوں میرے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ میں نے تاک کر کور دینے والے کے ماتھے کا نشانہ لیا، اگلے ہی لمحے وہاں سوراخ ہوا اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی مانند زمین بوس ہو گیا۔ تیسرا جو سندو کو تلاش کر رہا تھا، وہ چھپ گیا تھا۔ میں نے اونچی آواز میں سندو کو پکارا۔ اس نے جواباً میرا نام لیا۔
''تیسرا کدھر ہے، دو ختم ہیں۔''
''وہ یہیں چھپ گیا ہے، میں نکالتا ہوں اسے۔'' میں جانتا تھا کہ یہ اس کا دھوکا تھا۔ اس لمحے فائر ہوا۔ وہ اس نے سندو کی آواز پر کیا تھا، میں اس کی لوکیشن سمجھ گیا۔ میں نے برسٹ مارا۔ اگلی ہی لمحے ایک چیخ بلند ہوئی۔ میں فوراً ہی اس کی طرف نہیں بڑھا۔ بلکہ رکا رہا۔ سندو نے مجھے دیکھ کر سر نکالا ابھی اس گن بردار نے بھی سر اٹھایا۔ اس نے گن سیدھی کی، لیکن میں نشانہ لگا کر فائر کر چکا تھا، وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔
ہم نے تینوں کی گنیں اٹھائیں۔ ان کی تلاشی لینے پر فاضل راونڈ بھی ملے۔ ایک کے پاس پسٹل بھی تھا۔ وہ ہاتھ آتے ہی مجھے ایک گونہ تسکین مل گئی۔ اس کے علاوہ ان کی جیبوں سے کچھ کام کی چیزیں بھی ملیں، جیسے چاقو منی ٹارچ وغیرہ۔ ایک کی جیب سے فون ملا۔ میں نے پہلے تو اسے وہیں چھوڑ دینا چاہا، پھر ایک خیال کے تحت اسے بھی لے لیا۔
ہم آگے بڑھ گئے تھے۔ ہاتھ میں اسلحہ آ جانے سے کافی اعتماد آ گیا تھا۔ سندو تیز چل رہا تھا کہ میں نے اس سے کہا۔
''آہستہ چلو، اور بہت دھیان سے۔''
''یار ساحل پر پہنچ جائیں، پھر......''
''وہاں تمہاری پھوپی بیٹھی ہوئی ہے روٹیاں پکا کے، اوئے، یہ درختوں سے اتر سکتے ہیں تو ہمارے استقبال کے لیے وہاں بھی لوگ ہو سکتے ہیں، اس سے پہلے راستے میں بھی کوئی مل سکتا ہے۔'' میں نے سختی سے کہا تو ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا اور بولا۔
''بات تو تمہاری ٹھیک ہے، ساحل پر تو ہم سامنے ہوں گے، جنگل سے فائر کرنا آسان ہو سکتا ہے، اور پھر کون سا وہاں کوئی کشتی ہمارے انتظار میں ہو گی۔''
''کشتی بھی مل جائے گی، لیکن آہستہ چلو۔'' میں نے کہا اور قدم بڑھاتا چلا گیا۔ سندو بھی پرسکون انداز میں چلتا چلا گیا۔
اس وقت سورج غرب ہونے کو تھا، جب ہم جنگل کے سرے پر پہنچ گئے۔ وہاں سے آگے بھوری مائل سفید ریت تھی۔ کافی آگے جا کر نیلگوں سمندر تھا۔ تا حد نگاہ پانی، جس پر ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعیں اداس کر دینے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔
انسان بھی بڑا عجیب ہے، سمجھتا ہے منظر اس کے اندر کو بدل دیتے ہیں، حالانکہ وہ خود اپنے اندر کی اداسی کو خود

محسوس کر کے اسے خود پر طاری کر لیتا ہے۔ چاہے تو اگلے ہی لمحے اپنے اندر پڑے کسی انہونے جذبے کو طاری کرے اداسی کو ختم کر سکتا ہے۔

"کتنا حسین منظر ہے یار۔ ایسی کئی جگہوں پر عیاشی کے نجانے کتنے منظر میری یادوں میں محفوظ ہیں۔" سندو نے کہا تو میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ اپنے اندر کو بدل لیا۔ میں ایک دم سے خوشگوار ہو گیا۔ میں نے سندو کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

دیکھو۔ رات گزارنے کے لیے، ہمیں اس جاتی ہوئی روشنی کا فائدہ لے کر کوئی مچان بنا لینی چاہئے۔"

میرے یوں کہنے پر مجھے لگا کہ میں نے اسے یادوں سے نکال دیا ہے۔ وہ سر جھٹک کر میری طرف دیکھنے لگا۔

"ہاں۔ میں سمجھ رہا ہوں، ہمیں ایسا ہی کچھ کرنا ہوگا۔ میری پھوپھی تو آنے والی نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگا دیا۔ پھر چند لمحوں بعد بولا۔"یار۔ روٹی کیا یاد آئی، بھوک محسوس ہونے لگی ہے۔"

"اپنے آپ کو تیار کر لے ممکن ہے ہمیں ایک دو دن بھوکا رہنا پڑے۔" میں نے کہا۔

"نہیں کل صبح تک، دن کے وقت میں جنگلی پھل تلاش کر لوں گا اور اگر کوئی شہد کا چھتا......" یہ کہتے ہوئے وہ ایک طرف دیکھتے ہوئے رُک گیا۔ میں نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔

وہاں تھوڑے فاصلے پر ایک تالاب تھا۔ جہاں کچھ ہرن پانی پی رہے تھے۔

"روٹی نہ سہی لیکن پیٹ بھرنے کا سامان تو ہو سکتا ہے۔ یہ ہرن......" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔"تم کھا لو گے؟"

"بھوک کے لیے کیا نہیں ہو سکتا۔" یہ کہہ کر اس نے میری جانب دیکھا۔ ہم دونوں دبے پاؤں آگے بڑھ گئے۔ سندو ایک طرف چلا گیا۔ اس نے وہاں جا کر فائر کر دیا۔ وہ ہرن انتہائی تیزی سے میری جانب بڑھے۔ میں چھپا ہوا تھا۔ ایک ہرن میرے قابو آ گیا۔ باقی نکل گئے۔ سندو ہنستا ہوا میرے پاس آ گیا۔

"دیکھو، اسے بناؤں گا میں۔ تم لکڑیاں اکٹھی کرو اور آگ جلاؤ، میں اتنے میں......" لفظ میرے منہ ہی میں رہ گئے۔ سندو نے ایک طرف اشارہ کیا، تو میں نے اس جانب دیکھا۔

ساحل کی طرف کافی فاصلے پر ایک جیپ آ کر رکی ہوئی تھی۔ وہ بند جیپ تھی، جسے سفاری یا جنگل کے لیے بنایا گیا ہو۔ وہ رکی رہنے کے بعد ایک دم سے یوں مڑی کہ اس کا رخ سیدھا ہماری جانب تھا۔ اگلے ہی لمحے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ فون ہماری نشاندہی کر رہا تھا۔ جو میں نے اس سیکورٹی والے کی جیب سے لیا تھا۔ میں نے تو یہ سوچ کر فون لیا تھا کہ اس سے پاس کے ساتھ بات کروں گا، جب بھی اس نے رابطہ کیا لیکن وہی فون اب ہمارے لیے پھندا بن جانے والا تھا۔ میں نے جیب سے فون نکالا اور سندو سے کہا۔

"سندو جلدی سے کوئی کپڑا دو یا......"

یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی قمیص پھاڑ دی۔ کپڑے کی ایک دھجی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے تیزی سے مضبوطی کے ساتھ وہ فون اس میں باندھا اور پکڑے ہوئے ہرن کے گلے میں باندھ دیا۔ میں نے اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد کہ وہ کہیں گر نہ جائے اس ہرن کو چھوڑ دیا۔ وہ ہرن قلانچیں بھرتا ہوا جنگل کی طرف چلا گیا۔

"آؤ درخت پر۔" میں نے کہا اور قریب کھڑے ایک بڑے درخت پر چڑھنے لگے۔ میرے پاس دو گنیں تھیں۔ کچھ دیر بعد میں نے ایک ٹہنی پر اپنے آپ کو جما لیا۔ وہ جیپ جنگل کے اندر چلی گئی تھی۔

"نہ مچان ہی بنی اور نہ ہی کھانے کا بندوبست ہوا۔ لگتا ہے یہ رات یونہی گزارنی پڑے گی۔" سندو نے کہا تو میرا قہقہہ نکل گیا۔"اچھا ہوا وہ ہرن ہمارے کام آ گیا، ورنہ وہ جان سے جاتا اور ہمارے پاس آگ جلانے کو ماچس نہیں تھی اور نہ ہی چقمق۔" میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تو چند لمحوں بعد بولا۔"ایسے ہی موقعے کے لیے کہتے ہیں

ہاتھ نہ پہنچے تھوکوڑی یا وہ کیا کہتے ہیں......'' سندو نے جل کر کہا پھر وہ خود ہی ہنسنے لگا۔

''اب تو ساری رات اس درخت پر گزارنا پڑے گی۔'' میں نے کہا تو ہماری باتیں شروع ہو گئیں۔

وہ پوری رات ہم سو نہیں سکے۔ شاید ہماری آنکھ لگ جاتی لیکن ایک تو یہ ڈر تھا کہ نیند میں ہم درخت سے نیچے گر سکتے ہیں اور دوسرا رات بھر کئی جیپیں وہیں ساحل پر گھومتی رہیں۔ ممکن ہے وہ ایک یا دو ہی ہوں اور بار بار چکر لگا رہی ہوں۔ وہ رات جس طرح درخت پر کٹی، اس کی اذیت میں ہی جانتا ہوں۔

اس وقت دن کی نیلگوں روشنی ہر طرف چھائی ہوئی تھی، جب ساحل سے کچھ فاصلے پر ایک اسٹیمر آن رکا۔ کچھ دیر تک مجھے یہی لگا کہ یہ میرے لاشعور کا کرشمہ ہے جو مجھے دھوکا دے رہا۔ جس طرح صحرا میں سراب دکھائی دیتا ہے اس طرح شاید جنگل کی اس صورت حال میں یہی کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہو، مگر جب سندو نے بھی تصدیق کی تو مجھے یقین ہو گیا۔ مگر یہ اسٹیمر کس کا ہو؟ کیا انہوں نے ہمیں پکڑنے یا مارنے کے لیے کوئی نفری منگوالی ہے؟ یا پھر یہ کوئی دوسرے لوگ ہیں؟ اس سے پہلے کہ ہم اس کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرتے، میری نگاہ ان چار جیپوں پر پڑی جو کچھ فاصلے پر دائیں جانب ساحل پر کھڑی تھیں۔ ان میں سے کئی سارے لوگ نکلے اور کچھ ہی دیر میں انہوں نے پوزیشنیں لے لیں۔ جیسے آنے والے ان کے دشمن ہوں۔

صورت حال کافی دلچسپ ہو گئی تھی۔ آنے والے نجانے کون تھے اور ان کا سامنا کرنے والے یقیناً باس کے لوگ تھے۔ جو کل سے اس ساحل پر گھوم رہے تھے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ دشمن ہیں یا دوست، ہمیں اس صورت حال میں کیا کرنا ہوگا؟ اس کے لیے ہمیں ابھی رُکنا تھا۔ میں نے سندو کو ساتھ لیا اور درخت سے نیچے اُتر آیا۔ ہم ایک ایسی جگہ پر آن چھپے، جہاں سے سامنے کا منظر بالکل واضح تھا۔

کافی وقت گذر گیا۔ سورج کی روشنی پھیل رہی تھی۔ تبھی اسٹیمر سے انگریزی میں اعلان کیا گیا۔

''ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارا راستہ روکنے کے لیے تم لوگ آ گئے ہو، ہماری تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے، ہم جنگل میں بالکل داخل نہیں ہوں گے اگر تم لوگ ہمارے دو آدمی سندو اور جمال واپس کر دو۔ ہم واپس چلے جائیں گے۔ ہمیں اس کے علاوہ کوئی غرض نہیں۔''

ہم دونوں ہی اپنا نام سن کر اچھل پڑے تھے۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ اعلان جسپال کر رہا ہے۔ ممکن ہے وہ ہم تک اپنی آواز پہنچانا چاہ رہا ہو۔

''لے بھئی سندو، اپنے دوست پہنچ گئے۔'' میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''یہ جو اسٹیمر پر آئے ہیں، تمہیں کیسے پتہ وہ ہمارے دوست ہیں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا، پھر خود ہی بولا۔ ''کوئی بھی ہوں یار، یہاں سے تو نکلیں گے۔''

''سمجھو، اب نکل گئے۔'' میں اعتماد سے کہا۔

اس نے دوبارہ پھر اعلان کیا۔ اس کا اعلان ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ ساحل کی طرف سے فائر ہونے لگے، کئی گنیں سیدھی ہو چکی تھیں۔ یہ اسٹیمر والوں کو پیغام تھا کہ موت ان کے استقبال کے لیے موجود ہے۔

''جمال! یہاں پیچھے سے ہم نہ فائر کر دیں، سینڈوچ بنا دیں سالوں کو؟'' وہ نفرت سے بولا۔ مجھے لگا اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا

''صبر کرو، دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔'' میں نے کہا اور غور سے اس سارے ماحول کو دیکھنے لگا۔ ساحل کی طرف سے فائرنگ ہونے لگی تھی۔ لیکن اسٹیمر کی طرف سے خاموشی تھی اور وہ ابھی تک ساحل کے قریب نہیں آیا تھا۔ جیپوں کی آڑ میں کچھ لوگ کھڑے تھے اور ان کا رُخ سمندر کی جانب تھا، ان لوگوں کی پشت ہماری طرف تھی۔ آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت گذر گیا۔ اکا دُکا فائرنگ ہوتی رہی۔ اس دوران میں نے تینوں گنوں کو لوڈ کر کے اپنے پاس رکھ لیا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ میں نشانہ لوں اور ایک

ہی گولی میں ایک بندہ نہ پھڑکے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میرے پاس بلٹ زیادہ تھیں اور وہ بندے بہت کم۔

وہ لوگ شاید اُکتا گئے تھے۔ اس لیے انہوں نے اسٹیمر کی طرف مسلسل فائرنگ شروع کر دی۔ میں سمجھ گیا تھا، وہ ان کی فائرنگ کی رینج میں نہیں تھا، ورنہ وہ اب تک اسٹیمر کو نقصان پہنچا چکے ہوتے، اسٹیمر والوں نے عقل مندی کی تھی کہ اب تک فائر نہیں کیا تھا، وہ اپنا اسلحہ ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اب جو کچھ کرنا تھا ہمیں ہی کرنا تھا۔ میں نے ایک گن سندو کو دے کر کہا۔

''دیکھ۔! تو نے ہر فائر ایک نئی جگہ سے کرنا ہے، یہ اتنی تیزی سے ہو کہ وہ یہی سمجھیں کہ ہم دونوں فائرنگ کر رہے ہیں۔''

''میں سمجھ گیا، لیکن تم؟'' اس نے سر ہلاتے ہوئے پوچھا تو میں نے کہا۔

''تم صرف یہ دیکھنا کہ وہ گرتے کیسے ہیں۔''

سندو گن لے کر مجھ سے کافی فاصلے پر چلا گیا۔ تیز روشنی میں ہر شے واضح دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے نشانہ لیا اور ایک بندہ گر گیا۔ پھر میں رکا نہیں، مسلسل فائر کرتا رہا۔ میرے سامنے ہلچل مچ گئی۔ وہ اس اچانک اُفتاد پر وہ بوکھلا گئے تھے۔ شاید انہیں یقین نہیں تھا کہ ہم یہاں بھی ہو سکتے ہیں اور ان پر فائر بھی کر سکتے ہیں۔ وہ جیپوں کے اندر چھپ گئے۔ اندر سے جوابی فائر ہونے لگا۔ جو بلاشبہ اندھا دھند فائرنگ تھی۔ سندو اپنا کام کر رہا تھا۔ جس سے انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ فائر ہو کہاں سے رہے ہیں۔ میں نے جیپوں کے ٹائروں کا نشانہ لیا۔ جیسے ہی ٹائر پھٹے، انہوں نے جیپیں بڑھا دیں۔ لیکن وہ زیادہ دور نہیں جا سکے، کوئی کچھ فاصلے پر اور کوئی زیادہ فاصلے پر ریت میں دھنس گئیں۔ ساحل پر لاشیں بکھری پڑی تھیں۔

مجھے پورا یقین تھا کہ اسٹیمر سے یہ سارا منظر دیکھا جا رہا ہوگا۔ کیونکہ جس لمحے وہاں سے گاڑیوں نے حرکت کی وہاں سے راکٹ فائر ہوا، جو سیدھا ایک جیپ میں لگا تو اس کے پرخچے اڑ گئے۔ ایسی صورت حال میں جو بھی دوسری جیپوں کے اندر تھے، وہ نکل کر بھاگے۔ اسی اثنا میں ایک دوسرا راکٹ فائر ہو گیا۔ دوسری جیپ کے ساتھ ہی تیسری کو بھی آگ لگ گئی۔ ساحل پر بھاگنے والے چار لوگ تھے۔ میں نے تین کو ہی گرایا تھا کہ ایک کو سندو نے مار گرایا۔

اب ہمارے پاس چھپے رہنے کا وقت نہیں تھا۔ میں محتاط انداز میں نکلا تو سندو بھی میرے پیچھے لپکا۔ ہم تیزی سے سمندر کی جانب بھاگے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اسٹیمر سے ایک کشتی ساحل کی جانب آنے لگی تھی۔ تقریباً دس منٹ میں ہم سمندر کی لہروں میں تھے، کشتی ہمارے قریب آ گئی اور میری توقع کے مطابق اس میں جسپال تھا۔ ہم بھاگتے ہوئے کشتی میں سوار ہوئے تو اس نے مجھے گلے سے لگاتے ہوئے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔

''تو ٹھیک تو ہے نا۔''

''میں ٹھیک ہوں، تو دیر مت کر جسپال، ہم اب مزید خطرے میں ہوں گے، جلدی کر'' میں نے جواب دیا تو اس نے فوراً ہی بوٹ کا رخ پھیرا اور واپس اسٹیمر کی جانب تیزی سے چل دیا۔

میں اسٹیمر کے عرشے پر کھڑا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ بوٹ اٹھالی گئی تھی اور اسٹیمر واپسی کے لیے مڑ چکا تھا۔ ایسے میں ایک فربہ مائل، خوبصورت سی لڑکی میرے پاس آ کر بولی۔

''مجھے رونیت کور کہتے ہیں، آپ زخمی ہیں، نمی سے زخم خراب ہو سکتے ہیں، میں آپ کی ڈریسنگ کر دوں۔''

''وہ سندو، مجھ سے زیادہ زخمی ہے۔''

''میں نے اس کی ڈریسنگ کر دی ہے۔'' اس نے پرسکون لہجے میں کہا تو میں اس کے ساتھ چل دیا۔

اسٹیمر پر کافی لوگ تھے۔ عملے کے چند لوگوں کے علاوہ جسپال کے ساتھ آئے کچھ لوگ تھے۔ ڈریسنگ کے فوراً بعد ہمیں کھانے کو کافی کچھ مل گیا۔ کھانے کے دوران جسپال اور رونیت کور کے ساتھ سندو بھی تھا۔

''تم کس خطرے کی بات کرر ہے تھے؟'' جسپال نے پوچھاتو میں نے کہا۔

''ان کے پاس ہیلی کاپٹر ہیں۔ ممکن ہیں دو سے زیادہ ہوں ، میرا اندازہ ہے کہ وہ کھلے سمندر میں ......'' لفظ میرے منہ ہی میں تھے کہ ایک بندہ بھاگتا ہوا ہمارے پاس آیااور تیزی سے بولا۔

''ہماری رینج میں ہیلی کاپٹر آ رہا ہے۔ دو چار منٹ میں واضح ہوجائے گا۔''

''اسے اس وقت تک کچھ نہیں کہنا، جب تک اس کی طرف سے فائر نہ ہو، اگر ایک بھی فائر ہوتا ہے تو اسے تباہ کردو۔'' میں نے تیزی سے کہا۔ یہ سن کر وہ واپس چلا گیا۔ ہم نے کھانا وہیں چھوڑا اور کسی ممکنہ حملے کی جوابی کارروائی کے لیے تیار ہوگئے۔

ہمیں فضا میں ہیلی کاپٹر دکھائی دینے لگا تھا۔ عملے کا ایک بندہ راکٹ لانچر لیے تیار تھا۔ ویسے بھی اسٹیمر کا اپنا ایک حفاظتی نظام تھا۔ ہم پوری طرح تیار تھے۔ ہیلی کاپٹر ایک دائرہ میں گھوما اور دور چلا گیا۔ پھر جیسے ہی واپس ہوا تو اس میں سے ایک راکٹ فائر ہوا۔ جو سیدھا اسٹیمر کے اوپری اگلے حصے کو توڑتا ہوا سمندر میں جا گرا، تب تک نیچے سے تین راکٹ فائر ہوئے۔ دو عملے کے لوگوں نے فائر کیے تھے اور ایک اسٹیمر سے ہوا۔ دو فائر خالی گئے تھے لیکن تیسرا ہیلی کاپٹر کے درمیان میں لگا تھا۔ ایک دھماکا ہوا اور ہیلی کاپٹر گھومتا ہوا سمندر میں جا گرا۔

عملے کے لوگ جلدی سے فائر زدہ حصے کی جانب بڑھے۔ ایسا نقصان نہیں تھا کہ ہم سفر نہ کر سکتے۔

''ہم نے کتنی دیر کا مزید سفر کرنا ہے۔'' میں نے عملے کے بڑے سے پوچھا۔

''ایک گھنٹہ مزید لگ سکتا ہے۔''

''ایسا ہی حملہ مزید ہوسکتا ہے۔ ان کے پاس......'' میں نے کہنا چاہا لیکن وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''اب نہیں ہوگا، میں نے اپنی کمپنی کو بتادیا ہے، وہ اور سمندری نگرانی کرنے والے ہماری حفاظت کے لیے آ رہے ہیں، اب فضائی نگرانی ہوگی، آپ اطمینان رکھیں۔''

اس نے تسلی دی تو میں عرشے پر پڑی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ تبھی مجھے احساس ہوا کہ کم از کم میں یہاں غیر قانونی ہوں۔ مجھ سے تو بہت پوچھ گچھ ہوگی۔ یہی بات جب میں نے جسپال سے کہی تو رونیت کور تیزی سے بولی۔

''اس کی آپ فکر نہ کریں، یہ بات پہلے ہی اس بندے سے ہوچکی ہے، جو اس اسٹیمر کا مالک ہے اور وہ کمپنی چلاتا ہے۔ عملے کے ساتھ آپ کو نکال لیا جائے گا۔ آپ بےفکر ہوجائیں۔''

''تم یہاں تک پہنچے کیسے؟'' میں نے جسپال سے پوچھا تو اس نے سندو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''اس کی وجہ سے۔'' یہ کہہ کر اس نے ساری بات اختصار سے بتادی۔ تبھی سندو کے چہرے پر زندگی دوڑ گئی۔ وہ خوش ہوتا ہوا بولا۔

''یہ واہگرو کی مہر ہے کہ وہ پانچ پیارے بچ گئے۔ شاید اسی وجہ سے مجھے زندگی مل گئی۔'' یہ کہہ کر وہ چونکتے ہوئے بولا ''اس جزیرے کی لوکیشن کا پتہ کیسے لگا۔'' سندو نے پوچھا تو جسپال نے کہا۔

''میں خود حیران ہوں۔ یہ کسی نمبر پر ٹریس نہیں ہوا، پھر بس غیبی مدد ملی اور ہم یہاں پہنچ گئے۔'' اس نے کہا تو میں سمجھ گیا کہ اس کی غیبی مدد کون سی ہوسکتی تھی۔ اسے روہی سے بتایا گیا ہوگا۔ انہوں نے کیسے پتہ کیا، یہ بہرحال وہی جانتے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا، ''کل بارہ بجے کے قریب ہمیں پتہ چلا تھا۔ اور پتہ ہے یہ جزیرہ کہاں ہے، ممبئی کے قریب، ہم چندی گڑھ سے ممبئی رات پہنچے اور رات ہی کے آخری پہر بندرگاہ سے نکلے تھے۔''

''چندی گڑھ سے ممبئی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں میں وہیں تھا، میں، رونیت اور ابھیت تینوں، اڑھائی گھنٹے کا فضائی سفر تھا، اس دوران ساری بات چیت ہوگئی۔ ہم تم لوگوں تک پہنچنے کے لیے تیار ہوگئے۔'' جسپال نے بتایا تو سندو نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

''جمال ایک بات پوچھوں؟''

''جتنی مرضی پوچھو۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم نے اچانک اس جزیرے سے نکلنے کا فیصلہ کیسے کرلیا۔تم نے تو صرف اس باس سے ایک ملاقات ہی کی تھی اور میرے خیال میں تم یہاں کے بارے میں جانتے تک نہیں تھے، تمہیں تو اتنا بتایا گیا کہ یہ جزیرہ کس قدر خطرناک ہے اور ہم نے دیکھا بھی کہ خطرناک ہے، یہ سب کیسے سوجھا تجھے کہ تم یہاں سے نکل سکتے ہو؟'' اس نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

''تم نے میرے ساتھ آنے فیصلہ کیوں کیا؟'' میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''میں یہاں سے تنگ آچکا تھا، وہ آئے دن نئی کہانی سناتا تھا۔ مجھے اس کے کسی مقصد کا پتہ ہی نہیں چل رہا تھا، تم نے ہمت کی، تو میں نے بھی یہاں سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ بس ایک گمان تھا کہ تم یہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہے تو تم میں کچھ ہے؟'' اس نے پھر سے الجھتے ہوئے اسی لہجے میں کہا، جیسے اسے سمجھ نہ آرہی ہو کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے اور پوچھنا کیا چاہتا ہے۔

''دیکھ سندو! تمہیں تو صرف گمان تھا، لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ میں اس جزیرے سے نکل جاؤں گا۔'' میں نے کہا تو وہ سر ہلا کر رہ گیا، پھر تیزی سے پوچھا۔

''یہ یقین کیوں تھا؟''

''اس کا مجھے بھی نہیں پتہ۔'' میں نے اس سے چھپاتے ہوئے کہا۔

''آپ اس بندے سے پہلی بار ملے، پہلی ملاقات کے بعد ہی اس سے بغاوت کر دی، ایسا کیوں ہوا؟ آخر کیا دیکھا تھا کہ......'' رونیت نے پوچھا۔

''وہ انسانیت کا دشمن ہے رونیت، یہ بات مجھے پہلی ملاقات ہی میں معلوم ہوگئی تھی اور بس۔'' میں نے کہا تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

مجھے اس سے غرض نہیں تھی کہ وہ مطمئن ہوئی یا نہیں لیکن مجھے اطمینان تھا۔ جس وقت مجھ سے اس بندے نے، جو خود کو آزاد کہتا تھا، بات کی تو مجھے اس کے مشاہدہ کی ساری حقیقت سمجھ میں آگئی۔ جال میں پھنسے ہوئے جو کچھ میں نے دیکھا تھا، وہ سب آشکارا ہوگیا۔ وہ شیطان کا چیلا تھا۔ مجھے سمجھ آگئی تھی کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ جس وقت میں نے اس کی بات سن کر پورے اعتماد کے ساتھ اس جزیرے سے نکل جانے کا کہا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں یہی بات تھی کہ ابھی مجھ سے مزید کام لیے جانے ہیں۔ اب میں جو بھی ارادہ کروں گا، وہ ہو کر رہے گا۔ کیونکہ اب میرا ذاتی کوئی مقصد نہیں رہا تھا، میں نے اپنا آپ انسانیت کے لیے وقف کر دیا تھا۔

میں سندو اور رونیت کو سمجھانا بھی چاہتا تو نہیں سمجھا سکتا تھا۔ جب تک انسان اپنے بارے میں آگہی نہیں حاصل کر لیتا، اُس وقت تک اسے بہت سی سامنے کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ باتیں کرتے ہوئے، ہم ممبئی بندرگاہ تک آن پہنچے۔ وہاں ایک مرحلہ تھا جو طے ہوا۔ دوپہر کے بعد ہم وہاں سے نکل گئے۔



جوہو کے علاقے میں موجود اشوک نگر کالونی میں ایک پرانے بنگلے میں ہم سب آن ٹھہرے تھے۔ وہاں میں، جسپال، سندو، رونیت کور اور ہرپال سنگھ تھے۔ ہم سب وہاں سے نکل سکتے تھے لیکن ایک تو یہ مسئلہ درپیش تھا کہ میں کیسے جا سکتا ہوں۔ دوسرا ابھی آزاد اور جزیرے والا معاملہ ختم ہوا نہیں لگتا تھا۔ سب سے پہلے سندو نے وہیں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پھر سبھی نے چند دن وہیں رُک جانے کا فیصلہ کر لیا۔

میں ایک کمرے میں تھا۔ خوب آرام کر لینے کے بعد شام کے وقت جاگا تو بنگلے کے لان میں چند لوگ بیٹھے ہوئے دکھائی دیئے۔ میرے سامنے صوفے پر جین اور ٹی شرٹ پڑی ہوئی تھی۔ میرے سائز کے جوتے نیچے دھرے ہوئے تھے۔ میں نہا کر فریش ہوا اور کپڑے پہن کر نیچے ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ جسپال ایک طرف بیٹھا ہوا تھا اور سندو ایک نوجوان سے باتیں کر رہا تھا۔ ان کی باتوں سے یہی انداز ہوا کہ وہ اسی کے لوگ تھے، جو

گینگ ختم ہونے کے بعد ڈر کر ممبئی بھاگ آئے تھے۔ یہ سب کچھ اس کے مقامی دوست نے کیا تھا۔ وہ کون تھا ہمیں اس سے غرض نہیں تھی۔ سندو نے مہنگی شراب کی بوتل آدھی سے زیادہ چڑھائی ہوئی تھی۔ وہ پوری طرح مخمور تھا۔ تبھی وہاں کے ملازم نے کھانا لگا دینے کا کہا۔ رونیت اور ہرپال پہلے ہی وہیں موجود تھے۔ کھانے پر خاصا اہتمام کیا گیا تھا۔ کھانے کے دوران سندو پوری طرح سے خمار آلود تھا۔ تبھی میں نے پوچھا۔

''سندو، کیا تو نے یہ پتہ کیا ہے کہ یہ جزیرہ اب تک لوگوں کی، یا حکومت کی نظر میں کیوں نہیں آیا تھا، کیا کسی کو بھی نہیں پتہ تھا اس کا۔''

''یار ہم نے وہی دیکھا، جو اس نے ہمیں دکھایا، ایسے کئی جزیرے ہیں، جو کچھ لوگوں کی اپنی ذاتی ملکیت میں بھی ہیں۔ ہمیں یہی باور کرایا گیا کہ ہم دنیا کے پتہ نہیں کون سے خطے میں ہیں، تاکہ ہماری ہمت ہی نہ پڑ سکے وہاں سے بھاگ جانے کی۔'' اس نے بڑی پتے کی بات کی تھی

''اور وہاں پڑے لوگ شاید اب بھی یہی سمجھ رہے ہوں گے۔'' رونیت کور نے سمجھتے ہوئے کہا۔

''ممکن ہے، انہیں جانے دیا گیا ہو یا پھر وہ مار دیئے گئے ہوں، اب اس کی کوئی کھوج کرے گا تو پتہ چلے گا۔'' اس نے چڑھی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا۔

''یار وہ اتنا طاقت ور آدمی ہے کہ مجھے پاکستان سے اٹھا کر اس جزیرے تک پہنچایا اور کسی سرحد یا حکومت کا کوئی ردعمل نہیں ہوا۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اس کے طاقت ور ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا، لیکن وہ جو بھی تھا یا ہے، بڑے جرائم پیشہ لوگوں میں سے ایک تھا۔ یہ لوگ بہت بڑے بڑے پیمانے پر اسمگلنگ کرتے ہیں۔ یہ اس کی قسمت خراب تھی یا ہماری خوش قسمتی کہ ہم اس کے چنگل سے نکل آئے۔ ورنہ وہاں سے نکلنے کا کوئی چانس لگتا نہیں تھا۔'' سندو نے یوں کہا جیسے اسے بیتے ہوئے دن یاد آ گئے ہوں۔

''کون ہوسکتا ہے وہ شخص؟'' میں نے بالآخر وہ سوال کیا جس کے لیے میں نے اتنی تمہید باندھی تھی۔

''مجھے تھوڑا بہت شک تو ہے کہ وہ کون ہوسکتا ہے، وہاں پر دوسرے لوگوں کے اندازے تھے، اب ایک دو دن میں کنفرم ہو جائے گا، میں یہاں رُکا بھی اسی لیے ہوں، میں اسے چھوڑوں گا نہیں، جس نے میرا سارا سیٹ اپ تباہ کر کے رکھ دیا۔ وہ سالا گرباج، اسے بھی یہاں لایا جا رہا ہے، بائی روڈ، پتہ چل جائے گا۔ بس ایک دو دن میں، میرا مال ہڑپ کر جانے والا تھا نا، میں سکھاتا ہوں سالے کو سبق۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

مجھے لگا اسے کافی چڑھ گئی تھی۔ میں اسے ٹوکنا نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ نشے میں باتیں کرتا رہا۔ میں اور جسپال نے ڈٹ کر کھانا کھایا اور وہاں سے اٹھ گئے۔ رونیت کور پہلے ہی اٹھ گئی تھی۔ جبکہ ہرپال اس کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو گیا۔ ہمیں ایک دوسرے سے بہت ساری باتیں کرنا تھیں۔ ہم دوسری منزل کے ایک ایسے کمرے میں آ گئے جہاں بنگلے کا لان دکھائی دے رہا تھا۔

''یار جمال ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آئی، یہ رونیت کافی ماہر ہے، اس نے بہت کچھ ہیک کیا، لیکن جزیرے کے نمبر سے کچھ معلوم نہ کر سکی، اس نے بتایا تھا کہ جزیرے پر کوئی خاص لہروں کی سیکورٹی ہے، لیکن رو ہی والوں سے کچھ نہ چھپ سکا، یہ کیسے؟'' جسپال نے پوچھا۔

''یہ تو وہی بتا سکتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا

''یہ بات مذاق میں مت لو، ایسا کچھ ہے کہ ہم رو ہی والوں سے چھپ نہیں سکتے؟'' اس نے کہا۔

''کیا تم ان سے چھپنا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''اوئے نہیں اوئے، میں یہ پتہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ایسا ہے تو ہمیں اس کا پتہ ہونا چاہئے۔ تاکہ......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے کہا۔

''تم اپنا سر مت کھپاؤ، سمجھ لو کہ ایسا ہے، کیسے ہے، اسے چھوڑو، اگر ایسا ہے تو بہت اچھا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ایک دوسری بات ، اب جزیرہ تو گولائی میں تھا،ہمیں تو نہیں پتہ تھا کہ تم کہاں ہو۔ہم نے ایک چکر لگایا،دوسرے چکر پر روہی کی طرف سے تمہاری لوکیشن بتا دی گئی کہ تم کہاں پر ہو،اسی وجہ سے ہم ایک خاص جگہ پر رک گئے ، اور وہیں پر تم تھے ، یہ کیسے؟'' اس نے الجھتے ہوئے پوچھا تو میں نے کہا۔

''دیکھو، مجھے اس کا جواب معلوم نہیں ہے ، یا تو روہی فون کر کے پوچھ لو یا پھر جب ہم وہاں گئے تو پتہ کر لیں گے۔اب بتاؤ پروگرام کیا ہے؟'' میں نے پرسکون ہوتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''یار، بڑا دل کرتا ہے ہر پریت کو دیکھنے کے لیے ، میں نے تو سوچا تھا کہ چندی گڑھ سے سیدھا اوگی پنڈ جاؤں گا ، مگر یہاں تو ایک نیا ہی پھڈا ہو گیا ہے ، پتہ نہیں کب مل سکوں گا ہر پریت کور سے۔'' اس نے جذباتی لہجے میں کہا تو میں ہنس دیا

''کل شام تک کی بات ہے، اگر اس آزاد کے بارے میں کچھ پتہ چلتا ہے تو ٹھیک ، ورنہ ہم یہاں سے نکل چلیں گے۔اس بار تو میں بھی اوگی پنڈ جاؤں گا۔ جہاں کچھ عرصہ میرا باپ رہا تھا۔'' میں نے بھی کافی حد تک جذباتی ہوتے ہوئے کہا تو کچھ دیر تک ہم میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ پھر رات گئے تک ہم باتیں کرتے رہنے کے بعد سونے کے لیے لیٹ گئے۔

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔میں میلے والے میدان سے لیکر یہاں ممبئی آ جانے تک الجھا ہوا تھا۔اس میں بہت ساری باتیں ایسی تھیں جو مجھے سوچنے پر مجبور کر رہیں تھیں۔میں جب جال میں پھنسا ہوا تھا، اس دوران جو مشاہدہ مجھے ہوا، وہ کسی مقصد سے خالی نہیں تھا ، اس کا یقین مجھے اسی وقت ہو گیا تھا جب آزاد نے اپنی بات کی تھی۔ مجھے ابلیسی حربے سمجھنے میں ایک لمحہ بھی دقت نہیں ہوئی تھی۔اس کے ساتھ ہی مجھے باقی مشاہدے کی بھی سمجھ آ رہی تھی۔جزیرے سے نکلنے کا میرا اپنا فیصلہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے ارادہ کر لیا تو یہاں سے نکل بھی جاؤں گا، چاہے راستے میں جو بھی رکاوٹ آئی۔میرا یقین ہی میرے کام آیا۔ میں عام حالات میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں ایسا کر گذروں گا، جو میں نے کر دیا۔اس وقت میرے سامنے ایک ہی سوال تھا، کیا میرا یہاں آنا کسی مقصد کے لیے ہے؟ کیا مجھے اس پر سوچنا چاہئے یا پھر خود کو حالات پر چھوڑ دینا چاہئے؟ میں بے چین ہو گیا۔ میں اٹھ کر باہر آ گیا اور پھر چلتا ہوا اوپر چھت پر آ گیا۔نم دار ہوا میرے چہرے سے ٹکرائی تو ذرا سکون محسوس ہوا۔ مجھے لگا جیسے میری بے چینی مجھے سوچنے پر مجبور کر رہی ہے اور کوئی ہے جو میرے اندر سے مجھے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔بڑی ساری چھت پر میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔چند لمحے بعد مجھے لگا جیسے میں مراقبے میں ہوں۔ میرے اندر سے اٹھنے والی آوازیں خاموش ہو گئیں۔ پھر کوئی کہنے لگا

انسان کے لیے علم سب سے اہم شے ہے۔اسی باعث اسے اشرف المخلوق کا درجہ نصیب ہوا۔کیونکہ یہ علم ہی شعور پیدا کرتا ہے۔شعور کے ساتھ ہی انسان میں جذبہ پیدا ہوتا ہے جو اس کا ارادہ بنتا ہے۔یہی ارادہ جب پختہ ہو کر یقین میں بدلتا ہے تو پھر وہ عمل کی صورت اختیار کر لیتا ہے، جس سے انسان کی پہچان ہوتی ہے کہ وہ کیا ہے؟ علم سے عمل تک کا سفر، سوچ کے ذریعے طے ہوتا ہے۔وہ کون سی شے ہے جو علم سے عمل تک کا سفر طے کرواتی ہے؟ خوف، لگن، شوق، محبت، عشق، جنون ان میں سے جو بھی ہو، ویسا ہی عمل ہوگا۔کوئی بھی سوچ انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے۔یہ انسان ہی کی عظمت ہے کہ اس میں سوچ اٹھتی ہے۔اس کا مطلب ہے کہ اس میں سوچ پہلے کہیں پڑی ہوئی ہے جو اپنا اظہار کرتی ہے۔

انسانی سوچ کے دو پہلو ہیں۔ایک وہ اپنے بارے میں سوچتا ہے کہ وہ کیا ہے؟ وہ سامنے جو کچھ دیکھتا ہے وہ کیا ہے؟ وہ کیسے بنا؟ اس کے بنانے والا کون ہے؟ دوسری سوچ کا پہلو یہ ہے کہ وہ یہاں کیوں ہے؟ گویا وہ حال میں رہ کر ماضی اور مستقبل دونوں کے بارے میں

سوچتا ہے۔ دراصل یہی انسان کی عظمت ہے کہ وہ سوچتا ہے۔ یہی سوچ اسے اپنے رَبّ سے ملاتی ہے اور کائنات کی گتھیاں کھول کر اسے تسخیر کرتا چلا جا رہا ہے۔

انسانی سوچ جو اس کے اندر سے ابھرتی ہے دراصل اس کے خالق کا عطیہ ہے۔ جس سے انسان اپنی عظمتوں کو بھی چھو سکتا ہے اور پستیوں میں بھی گر سکتا ہے۔

خود انسان کو اس کا اپنا احساس دلانے والی قوت اس کے اندر ہی پڑی ہے۔ یعنی یہی سوچ، یہ سوچ صرف انسان ہی میں آسکتی ہے۔ سوچ، شعور اور شخصیت بھی ایک سفر ہے۔ جو انسان کے اپنے ہی اندر پڑا ہوا ہے۔ یہی عطیہ خداوندی ہے اور یہی یہی کن فیکون کا راز بھی ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ خالق اور مخلوق کا تعلق کوئی الگ نہیں کر سکتا۔ یہی سوچ ہے جو انسان کو اس کے اپنے مقامات، اس کی اپنی ہی صورت میں دکھائے جاتے ہیں۔ کیونکہ خود انسان میں نئے نئے مقامات پڑے ہیں۔ اسی صورت سے ان مقامات کا ظہور ہے۔ ظاہری مراتب کی حفاظت کے ساتھ مقام بھی اسی میں عیاں ہو جاتے ہیں۔ انسان اپنے مقام کا تعین خود کرتا ہے اور جب تک وہ ماضی اور مستقبل میں برابر دیکھتا ہے، وہ مقام انسانیت پر فائز رہتا ہے، صرف ایک طرف دیکھنا، انسانیت کے زمرے میں گناہ ہے۔

یہی ذرہ خاک، جب سوچتا ہے تو آسمانوں سے بھی ماورا ہو جاتا ہے، آسمانوں کا راز داں بن جاتا ہے، یہی وہ سوچ ہے جو کائنات کی تسخیر کے لیے روبہ عمل ہے۔ جب وہ اپنے مستقبل کو اپنے ماضی سے جوڑتا ہے تبھی وہ راز داں بنتا ہے۔ اس سارے معاملے کی وضاحت صرف ڈی این اے جیسے ذرے سے ہو سکتی ہے، پورا ماضی اس کے اندر پڑا ہوا ہے، اور مستقبل بھی۔ کن فیکون کا راز داں ہونے اور اپنے اصل مقصد کو پہچاننے کے لیے ماضی اور مستقبل میں برابر جھانکنا ہوگا۔ کیونکہ یہی رَبّ تعالیٰ کی منشاء ہے۔ کیونکہ کن فیکون ہو رہی ہے، یہ لامحدود ہے، اور لامحدود قوتیں ہی انسان کو نوازی گئی ہیں۔

یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے خالق کے بارے میں سوچتا ہے اور یہ بھی فطرت ہے کہ اگلی کئی صدیوں کے منصوبے بنا کر روبہ عمل ہے۔ جو اس کو برابر رکھتا، وہ اپنے مقام کا تعین کر سکتا ہے اور کائنات اس کی ہر طرح سے مددگار ہو جاتی ہے۔ انسان اپنے اندر بڑی صلاحیتیں یوں دیکھ سکتا ہے جیسے ہر طرح کے سامان سے بھرے ہوئے تاریک کمرے کو روشن کر دیا جائے۔ پھر جس وقت جس شے کی ضرورت ہو وہاں سے لے سکتا ہے۔ یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں۔

میرے اندر خاموشی طاری ہو گئی۔ میں کافی دیر بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر نیچے آکر جسپال کے ساتھ بیڈ پر سو گیا۔

اگلے دن دوپہر تک سوتے رہنے کے بعد ہم نے لنچ اکیلے ہی کیا۔ سندو صبح سے غائب تھا۔ اس کے ساتھ رونیت اور ہرپال بھی تھے۔ سہ پہر کے بعد وہ آیا۔ اس وقت چائے پیتے ہوئے اس نے بتایا کہ چندی گڑھ میں جو کچھ اس کے پاس تھا، وہ سب بھی جو گرباج اور نیہا اگروال کے ہتھے نہیں چڑھا تھا، سب کچھ اس نے پروفیسر کو دے دیا تھا۔ وہ لوگ سکھ دھرم کے لیے کام کر رہے تھے۔ سکھ دھرم کے نام پر اس نے اپنا سب کچھ دان کر دیا تھا۔ وہ ایک قریبی گردوارے ماتھا ٹیکنے گئے تھے۔ پھر کچھ لوگوں سے ملنے اور شاپنگ کرنے کے بعد آئے تھے۔ وہ میرے اور جسپال کے لیے بھی سامان لائے تھے۔ وہ ساری روداد سنا چکا تو میں نے پوچھا۔

”آزاد کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟“

”اس کے بارے میں ابھی کچھ پتہ نہیں چلا ہے۔ لیکن کچھ کڑیاں مل گئی ہیں۔ اس کا پتہ چل جائے گا۔“ سندو نے گہری سنجیدگی سے کہا، پھر ایک دم سے بولا۔ ”وہ ابھیت سنگھ آگیا ہے چندی گڑھ سے ممبئی بائی روڈ تقریباً پچیس گھنٹے کا سفر ہے جو اس نے کیا، گرباج کو لے کر پہنچ گیا ہے۔ اسے بے ہوشی کا انجکشن دے کر ایک لاش کے طور پر ایمبولینس میں رکھ کر لایا ہے۔“

”کہاں ہے وہ؟“ جسپال نے پوچھا۔

''ابھیت تو سو رہا ہے۔ نیچے، تہ خانہ ہے ادھر، وہیں رکھا ہے گر باج کو۔'' سندو نے کہا۔

سندو پتہ نہیں کیسے اس آزاد کے بارے میں پتہ کر رہا تھا، ایک دم سے میرے ذہن میں آیا کہ جسمیندر کو بہت زیادہ معلومات ہوتی ہیں، اس سے پتہ کیا جائے۔ چائے پی کر ہم اپنے کمرے میں گئے تو میں نے جسپال سے کہا۔ اس نے جا کر سندو کا فون لیا اور جسمیندر کو کال کی۔ اس نے ایسے کسی گینگ کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ سو شام ہونے تک کسی بھی قسم کی کوئی معلومات ہمیں نہ مل سکی۔ اب میرے پاس ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ روہی کا تھا۔ اس وقت اس بنگلے میں نہ تو نیٹ کی سہولت تھی اور نہ ہی کوئی کمپیوٹر تھا۔ میں اور جسپال باہر نکل گئے۔ جاتے ہوئے میں نے سندو کا بتا دیا تھا۔

ایک ہوٹل کے نیٹ کیفے میں سہولت دستیاب ہوگئی۔ میری میل میں بہت ساری معلومات پڑی ہوئی تھیں۔ فون نمبروں کی ایک فہرست کے ساتھ جو معلومات وہاں درج تھیں، اس کے مطابق وہ بظاہر ایک بین الاقوامی اسمگلرز کا گینگ تھا۔ خفیہ طور ان کا کیا کام تھا ابھی پوری طرح سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ بظاہر یہ ایک امپورٹ ایکسپورٹ کی بڑی فرم تھی جزیرے پر جو بندہ ہمارے سامنے آیا، وہ محض ایک مہرہ تھا۔ اس گروہ کے اصل لوگ کہاں پر ہیں، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ جن لوگوں کے یہ نمبرز تھے، وہ اگرچہ سامنے کے لوگ تھے لیکن اپنے اپنے علاقے کے طاقتور لوگوں میں شمار ہوتے تھے، جو ان کے ساتھ مل کر کام کر رہے تھے۔ ممبئی میں دو ہی لوگ تھے، اور باقی مختلف شہروں کے۔ انہی میں ایک نمبر ایسا تھا، جس کے ساتھ یہ سب رابطہ کرتے تھے۔ وہ نمبر ممبئی شہر کے علاقے دادر کا تھا۔ ان کے بارے میں مزید معلومات لینے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ہدایات دی گئی تھیں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ ممبئی ہی میں ایک بندے کا فون نمبر دیا گیا تھا اور اس سے رابطہ کرنے کی بابت کہا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کوڈ تھے، جس سے میری اور جسپال کی شناخت ہوتی۔ میں نے وہ سارے نمبر نوٹ کر لئے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرے اندر ایک نئی قوت بھر گئی ہے۔ میں جسپال کے ساتھ ہوٹل سے نکلا تو بہت پر اعتماد تھا۔

ایک پی سی او سے میں نے اسی نمبر پر فون کیا۔ کچھ دیر باتوں میں کوڈ کے تبادلے کے بعد وہ مجھے پہچان گیا۔

''جاسی گھبرانے کا نہیں بڑو، اپن ہے ادھر۔ جرا سا ٹائم دو، اپن خُد تیرے پاس ہوئیے گا۔'' اس نے خوشگوار لہجے میں کہا

''میں گھبرا نہیں رہا، بس جلد از جلد اس تک پہنچ جانا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تو چل پھر ایسن کر، اپنی لوکیسن بتا، پھر دس منٹ بعد مجھے پھون لگا۔ چل۔'' اس نے کہا تو میں نے ادھر ادھر دیکھ کر اسے بتا دیا۔

''کتنے لوگن ہیں تیرے ساتھ؟'' اس نے پوچھا۔

''میں اور میرا دوست۔'' میں نے کہا۔

''چل دس منٹ بعد۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ دس منٹ بعد میں نے فون کیا تو اس نے مجھے ایک ٹیکسی کا نمبر اور ساتھ ہی اسے کہنے کے لیے کوڈ بھی بتایا۔ میں نے فون رکھ کر اطراف میں دیکھا۔ اسی نمبر کی ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ میں اس طرف بڑھ گیا۔

وہ ہمیں مختلف سڑکوں، بازاروں کے بعد ایک پرانے سے علاقے میں لے آیا۔ تنگ گلیوں سے ہوتا ہوا وہ ایک جگہ رک گیا۔ وہاں سے ہم پیدل چلے۔ چھوٹی چھوٹی گلیوں میں سے ہوتے ایک پرانی طرز پر بنے مکان کے سامنے لے آیا۔ دیکھ بھال اس مکان کی اچھی تھی۔ لکڑی کے دروازے میں داخل ہونے کے بعد ایک لمبی ڈیوڑھی تھی۔ اس کے آگے بڑا سارا صحن تھا، ایک طرف سے سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔ وہ ہمیں لیتا ہوا چوتھی منزل کی چھت پر چلا گیا۔ چھت کے درمیان میں چار پرانی کرسیاں، لکڑی کے بینچ اور چارپائیاں پڑی تھیں۔ چند لوگ ادھر ادھر بیٹھے ہوئے تھے، کچھ منڈیروں کے ساتھ

کھڑے گپیں لگا رہے تھے۔ ایک چارپائی پر ایک پتلا سا، لمبے قد کا ادھیڑ عمر شخص بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر اٹھ گیا۔ اس نے کرتا شلوار پہنا ہوا تھا۔

''ارے جانی بھائی کے گھر میں ویلکم، آؤ۔'' یہ کہہ کر وہ ہم دونوں سے گلے ملا۔ اس کے سامنے دھری چارپائیوں میں سے ایک پر ہم بیٹھ گئے۔ تو اس نے پوچھا۔

''جمال بھائی، بولو، رم، وہسکی یا......''

''نہیں، ایسا کچھ نہیں، بس ہم باتیں کرتے ہیں۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

''چل چائے تو چلے گی یار۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک لڑکے کو اشارہ کیا اور پھر متوجہ ہو کر بولا ''اپن کو بتایا، ادھر کوئی بڑا اسمگلر ہے اور میرے مغز میں یہ بات نہیں گھس رہی، اکھا ممبئی میں کون اسمگلر ہے جیسے جانی بھائی نہیں جانتا، پر پھر بھی، جو کوئی بھی ہوئیں گا، ٹریس کرے گا اور تم جو ڈیمانڈ کرے گا، دے گا، اپن کے پاس لڑکا لوگ بہت ہے، خلاص کرنا ہے، وہ بولو۔''

''پہلے تو مجھے ایک فون دو، کچھ کرنسی، اور ادھر سے باہر جانے کے لیے کوئی بھی شناخت تاکہ اگر ضرورت پڑے تو فوراً نکل سکوں۔''

''یہ تو ہو گیا، اور بولو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اب ظاہر ہے جانی بھائی کوئی پلان کروں گا نا، تو بتاؤں گا، مجھے یہ گینگ کوئی چھوٹا موٹا نہیں لگتا، بہت پھیلا ہوا ہے، مجھے لگتا ہے یہ بھارت اور پاکستان میں دور تک پھیلا ہوا ہے۔'' میں نے اپنی رائے دی۔

''ارے یار، یہ جو ہم دونوں کا کنٹری ہے نا، یہ سالا میدان بنا ہوا ہے، وہ بول رہا تھا نا ادھر حکومت کرنے کا، وہ ٹھیک بولا، ورلڈ میں چند لوگن ہیں جو یہ سب سین پارٹ کر رہا ہے اور یہ سب ادھر لڑ رہا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں جانی بھائی۔'' میں نے اس کی بات کو سمجھنا چاہا۔ اسی دوران چائے آ گئی، جیسے پہلے ہی بنی ہوئی ہو۔ وہ ہم پینے لگے تو وہ بولا۔

''دیکھ۔ یہ سالا ورلڈ ہے نا چار حصوں میں ہے، ایک یورپی یونین ہے، دوسرا امریکہ اور اس کے ساتھ کے لوگن، تیسرا چین اور اس کے ساتھ والے، اور چوتھا ہمارا کنٹری، یہ سمجھو سب کانٹی نینٹ، پہلے تینوں، ادھر فائیٹ کر رہا ہے، سب پیسے کے لیے، اُن کے لوگن اتنا نہیں خلاص ہوتے جتنا ہمارا لوگن گاجر مولی بنے ہیں، یہ ہمارے کنٹری کے لوگ سمجھے نہیں ہیں، یہ اگر سمجھ گئے، خود کو پاورفل بنا لیا تو یہ بھی ان کے جیسا ہو جائے گا۔ اس میں یہ جو جیوش ہیں نا، یہ سب سے ڈرٹی ہیں، سارے ورلڈ میں ان کا گند ہے۔'' جانی بھائی خاصا جذباتی ہو گیا تھا۔ میں اس پر کچھ نہیں بولا، یہ بہرحال اس کی رائے تھی۔

''خیر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔'' میں نے ایسے ہی کہہ دیا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر حتمی انداز میں کہا۔

''تم ایسا کرو، اپن کے ہوٹل میں ٹھہرو، ادھر بہت کام کا لوگن ہے، جو ڈیمانڈ کرے گا، وہ ہی ہوئیں گا۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے ہی انداز میں سیاست اور سیاسی منظر نامے پر بھرپور گفتگو کرنے لگا، جس کی مجھے ذرہ برابر بھی سمجھ نہیں آئی تھی۔ اس دوران ہم نے چائے ختم کی تو میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اچھا جانی بھائی، چلتا ہوں، رابطہ رہے گا۔''

''ارے کہیں نہیں جا رہا، اپن کے پاس ہی تو، ڈونٹ وری۔'' اس نے میرے دونوں ہاتھوں کو دباتے ہوئے کہا۔ میں پلٹ گیا۔ گلی میں آئے تو وہی ٹیکسی والا ہمیں واپس لے کر چل دیا۔ مجھے ذرا بھی پتہ نہیں چلا کہ ہم کن بھول بھلیوں میں گئے تھے اور وہاں سے کیسے بڑی سڑک پر نکل آئے۔ وہ ہمیں لیتا ہوا ایک فائیو سٹار ہوٹل میں آ گیا۔ میں اس بھل بھلیوں والے مکان اور اس ہوٹل کو دیکھ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں اس کے مزید کتنے کاروبار ہوں گے۔ وہاں اس مکان میں وہ پتہ نہیں کس حیثیت سے رہ رہا ہوگا۔ میں نے اس بارے میں سارے خیال جھٹکے اور اس ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ لابی سے ہوتا ہوا کاؤنٹر پر چلا گیا۔ اس نے بس ایک دو جملے کہے۔ پھر مجھے سلام کیا اور باہر کی جانب چل دیا۔ اگلے

چند منٹ میں ہمارا وہاں اس طرح استقبال ہوا جیسے ہم وی وی آئی پی مہمان ہوں۔

تیسری منزل کے ایک سوئٹ میں ہمیں ٹھہرایا گیا۔ میں نے حسب عادت کھڑکی کھول کر دیکھا، سامنے سمندر تھا۔ اگرچہ وہاں خاصی روشنی تھی لیکن رات کے اندھیرے میں دور تک نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ تبھی مجھے خیال آیا کہ اس سارے دورانئے میں جسپال بالکل خاموش رہا تھا۔ اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے دیکھا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھا اپنی سوچوں میں گم تھا۔

''کیا بات ہے جسپال، تم اتنے خاموش کیوں ہو؟''

''یار، ہم کیا کر رہے ہیں، یہ جو تو نے جانی بھائی سے مدد لی ہے، اس کا کیا فائدہ، تو کرنا کیا چاہتا ہے۔'' وہ ایک دم سے جوش میں بولا، جیسے ناراض ہو۔

''میں اس آزاد کو ڈھونڈھ نکالنا چاہتا ہوں۔'' میں نے سکون سے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

''وہ ایک مہرہ تھا، وہ کہاں ملنے والا ہے۔ ابھی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اتنی جلدی میں ہم مار کھا سکتے ہیں، بہت سوچ سمجھ کر پلان کے ساتھ......''

''یہی کریں گے میری جان۔ ابھی ہم بیٹھیں گے تو سب سمجھا دوں گا۔'' میں نے کہا تو ایک طویل سانس لے کر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دروازہ بجا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ویٹر ٹرالی گھسیٹتی ہوئی اندر آ گئی۔ اس نے لبوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

''گڈ ایوننگ سر! یہ کھانا آپ کے لیے اور یہ فون۔'' یہ کہہ کر اس نے جیب میں سے ایک مہنگا سیل فون نکال کر جسپال کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے پکڑا اور مجھے دے دیا۔ تبھی وہ بولی۔ ''سر، میں آپ کی یہاں ہوسٹ ہوں۔ جو چیز بھی چاہیے مجھے بتا دیں۔''

''فی الحال تو کچھ نہیں۔'' جسپال نے کہا۔

''تو پھر آپ ایسا کریں کہ کھانے کے بعد تیار ہو جائیں۔ میں ابھی آپ کے لیے ڈریس لاتی ہوں۔ آپ کی تصویریں بنانے کے لیے ایک فوٹو گرافر آئے گا تو......'' اس نے بڑی ادا سے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ٹھیک ہے۔'' جسپال نے کہا تو وہ واپس مڑ گئی۔ اگلے دو گھنٹوں میں یہ سب ہو گیا۔ بلاشبہ میرے نقلی کاغذات تیار ہونا تھے۔ جسپال نے مجھ سے بات نہیں کی، وہ سکون سے سو گیا تھا۔ جبکہ میں جاگتا رہا۔

❁......❁......❁

وہ ایک روشن صبح تھی۔ ہم خوب سونے کے بعد بہت فریش اٹھے تھے۔ ناشتہ کر لینے کے بعد ہم وہاں سے جانے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ تھوڑی دیر وہ ویٹرس آئی، اس نے میرے کاغذات مجھے تھمائے، اس کے ساتھ چھوٹے بڑے پرانے نوٹوں کی چند گڈیاں مجھے دیں۔

''ہم ابھی یہاں سے نکل رہے ہیں۔'' میں نے اسے بتایا تو اس نے پوچھا۔

''کہاں جانا ہے، میں اس کے لیے بندوبست کر دوں۔'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے جسپال کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ تبھی میں نے فیصلہ کر لیا۔ اس لڑکی کو اپنے کاغذات دیتے ہوئے کہا۔

''دو ٹکٹ، امرتسر کے لئے۔''

میرے یوں کہنے پر جسپال نے چونک کر میری طرف دیکھا، پھر ایک دم سے ہنس دیا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا تو وہ اس لڑکی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ میں نے سندو کو بتا دیا کہ میں جا رہا ہوں۔ بعد میں رابطہ کروں گا۔

❁......❁......❁

شام کے سائے پھیل رہے تھے، جب ہم اوگی پنڈ کے نزدیک پہنچے تھے۔ امرتسر پہنچتے ہی میرا جی چاہا کہ میں رتن دیپ سنگھ سے ملوں، اُن کے پاس کچھ دیر ٹھہروں لیکن میں نے پھر کسی وقت ان سے ملنے کا سوچ کر ٹیکسی لی اور ترن تارن تک آئے۔ یوں تین جگہ سے ٹیکسیاں بدلنے کے بعد اوگی پنڈ آن پہنچے۔ سامان کے نام پر ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اس لیے سڑک ہی سے

ٹیکسی والے کو فارغ کیا اور پھراوگی سے باہر کھیتوں میں بنی سرخ رنگ والی کوٹھی کے باہر پیدل چلتے ہوئے آن رکے۔ باہر بنتا سنگھ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ جسپال کو دیکھ کر یوں چونکا جیسے کوئی جن دیکھ لیا ہو۔

''اُو بائی جی آپ، ایک دم سے، نہ کوئی پیغام نہ......
اور یہ آپ کے کیس......؟''

''چل یار بنتے آ گیا ہوں نا، تُو سنا ٹھیک ہے نا، باقی باتیں پھر کریں گے۔'' جسپال نے کیس والی بات گول کرتے ہوئے کہا تو اس نے گیٹ کھولتے ہوئے پوچھا۔

''سب ٹھیک ہے، واہ گرو کی مہر ہے، پر یہ کیس......''

جسپال نے اس کی نہیں سنی۔ ہم اندر چلے گئے۔ ڈرائنگ روم میں ایک ادھیڑ عمر خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک نگاہ ہم دونوں پر ڈالی، وہ یوں ہمیں دیکھنے لگی جیسے بے ہوش ہو جانے والی ہو۔

''اوہ پھپھو، رب کا نام ہے، چیخ نہ مار دینا، یہ میں ہی ہوں جسپال۔''

''یہ سنتے ہی وہ اٹھی اور بڑے ہی جذباتی انداز میں اسے گلے لگا لیا، وہ کافی دیر تک اُسے سینے سے لگائے رہی، پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔

''یہ ہونہ ہو جمال پتر ہے؟''

''جی پھوپھو، میں جمال ہی ہوں۔'' میں نے کہا تو اس نے مجھے بھی گلے سے لگا لیا

''یہ پتر اچانک، فون تو کیا ہوتا۔ انو جیت تجھے لینے......'' گلجیت کور نے کہنا چاہا تو جسپال جلدی سے بولا۔

''وہ ہے کدھر؟''

''وہ تو باہر ہی گیا ہے، ہرپریت......'' لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ ہرپریت کور کسی طوفان کی طرح آئی اور پھر ایک دم سے رک کر جسپال کو دیکھنے لگی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو

''یہ میں ہی ہوں پر یتو۔'' جسپال نے شوخی سے کہا۔

''پر تو وہ جسپال نہیں جو یہاں سے گیا تھا۔'' اس نے جس انداز سے کہا، اس سے وہ مجھے کٹر مذہبی لگی۔

''میں وہی ہوں، پتہ نہیں کس طرح اپنا آپ بچا کر لایا ہوں، چل، مجھے نہ مل، جمال سے تو مل لے۔'' جسپال نے جیسے ہی میرا تعارف کرایا وہ میری طرف یوں دیکھنے لگی جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو

''جمال ویرے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ میرے گلے لگ گئی۔ پھر الگ ہوتے ہوئے بولی۔ ''بہت یاد کرتے تھے ہم تمہیں۔ پر یہ اچانک......''

''ساری باتیں ابھی پوچھ لو گی یا بیٹھنے بھی دو گی۔'' جسپال نے مصنوعی غصے میں کہا۔

''تمہیں تو بے جی ہی بیٹھنے کو کہے گی، میں نہیں، جمال ویرے تُو بیٹھ، میں لسی لے کے آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اندرونی کمرے کی طرف چلی گئی۔ جسپال صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''بہت غصے میں لگتی ہے یار۔''

''چل منانے میں کون سا وقت لگے گا۔'' میں نے کہا تو گلجیت کور بیٹھتے ہوئے بولی۔

''رب کی بڑی مہر ہے پتر کہ تو آ گیا، روز پتہ نہیں کیسے کیسے خیال آتے تھے، بڑا سر کھاتی رہی ہے ہرپریت میرا، کبھی ادھر کی بات تو کبھی اُدھر کی بات۔''

''لگتا ہے پھوپھو، اب تو پیروں میں جیسے سفر بندھ گیا ہے، ایک دن بھی سکون سے نہیں گذرا۔ خیر آپ سناؤ، اُوگی میں سب ٹھیک ٹھاک ہے نا۔'' جسپال نے ایک لمبی سانس لے کر کہا

''سب ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اُٹھتے ہوئے بولیں ''تم بیٹھو، میں تمہارے کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔''

انہیں گئے ذرا سی دیر ہوئی تھی کہ ہرپریت کور آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی، جس میں کافی کچھ تھا۔ وہ ہمارے سامنے رکھ کر بولی۔

''جمال ویرے، یہ اچانک آنا، کوئی سامان نہیں جس سے باقاعدہ سفر کی پلاننگ کا احساس ہو، لگتا ہے کوئی معاملہ ٹھیک نہیں؟''

''یہ تُو جاسوس کب سے ہوگئی؟ اب آ گئے ہیں تو سب کچھ بتا دوں گا، کیوں پریشان ہوتی ہے۔'' جسپال نے شرارت بھرے غصے میں کہا۔

''میں تم سے بات نہیں کر رہی پھر تو جواب کیوں دے رہا ہے۔'' وہ منہ پھلا کے بولی۔

''اچھا چل، ختم کر دے غصہ، اور میرا ایک کام کر دے۔'' میں نے ہرپریت کی طرف دیکھ کر کہا۔

''بول ویرے کیا کام ہے؟'' اس نے جلدی سے پوچھا تو میں نے کہا۔

''ایک الگ تھلگ کمرہ، میں نے اس جسپال کے ساتھ نہیں رہنا، یہ بہت بور کرتا ہے۔'' میں نے کہا تو جسپال ایک دم سے ہنس دیا اور ہرپریت میری بات سمجھتے ہوئے ایک دم سے شرما دی، پھر اٹھتے ہوئے بولی۔

''آپ لسی پئیں، میں کمرہ ٹھیک کر دیتی ہوں۔''

وہ چلی گئی تو میں لسی پیتے ہوئے سوچ میں پڑ گیا۔ اگلے چند گھنٹے بہت اہم تھے۔

دوسری منزل پر کمرے کا ماحول بہت خوشگوار تھا۔ میں بیڈ پر بیٹھ گیا اور اپنے سامنے لیپ ٹاپ رکھ لیا۔ کچھ ہی دیر بعد میرا روہی سے رابطہ ہوگیا۔ روہی کے آپریشن روم میں سرمد کے علاوہ دو تین مزید لوگ بھی تھے۔ کچھ دیر اس معاملے پر بات ہوتی رہی۔ پھر میں نے اپنا خیال بتایا۔ وہ انہوں نے مان لیا۔ میں پوری طرح تیار ہوگیا۔

میرے سامنے پاکستان اور بھارت کے مختلف شہروں کے ان لوگوں کے نمبر تھے، جو وہ نام نہاد امپورٹ ایکسپورٹ کمپنی چلانے والوں کے بڑے تھے۔ بلاشبہ وہ کوئی عام لوگ نہیں تھے۔ میں نے ان میں سے آٹھ شہروں کے لوگوں کے نام چنے۔ میں نے سب سے پہلے جانی بھائی سے رابطہ کیا۔ میں نے جب اس سے مدد چاہی تو وہ ایک دم سے پرجوش ہوگیا۔ وہ میرے ساتھ رابطے میں رہا۔ ممبئی کے دو لوگوں کے بارے جانی بھائی کو کہہ دیا، اس نے ایک گینگ بنا کر مجھے اس کا نمبر دے دیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اسی مناسبت سے مجھے روہی سے ان لوگوں کے نمبر ملنے لگے جو مقامی طور پر ان کا وہاں مقابلہ کر سکتے تھے۔ جیسے جیسے مجھے ان لوگوں کے نمبر ملتے گئے، میں ان سے رابطہ کرتا گیا۔

پوری رات یہی سلسلہ چلتا رہا۔ جسپال کو پتہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں، اس لیے اس نے ہرپریت اور انوجیت کو اپنے ساتھ مصروف رکھا اور پھر اسے ہرپریت کو بھی منانا تھا۔ اس لیے مجھے کسی نے بھی ڈسٹرب نہیں کیا۔ رات کے آخری پہر جب میں نے اپنے طور پر سارے انتظام کر لیے اور ان لوگوں کے ذمے کام لگا دیئے تو مطمئن ہوگیا۔ لیکن نیند میری آنکھوں سے اب بھی کوسوں دور تھی۔ میں رات بھر ان کے ساتھ رابطے میں رہا۔

اگلی صبح، ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ میں نے اُوگی کی روشن صبح کا مزہ لیا۔ سب کے ساتھ ناشتہ کیا اور پھر سے کمرے میں آ گیا۔ میں نے ایک بار پھر سے رابطہ کرنا شروع کر دیا۔ سب نے ان آٹھوں کے بارے میں بتا دیا کہ وہ کون ہیں اور ان کے معمولات کیا ہیں، وہ کس وقت اپنے آفس جاتے ہیں۔ میں نے ان سب کو شوٹ کر دینے کا کہا تھا اور انہوں نے اسی مناسبت سے اپنا اپنا خیال دیا۔ دن کے دس اور گیارہ کے درمیان یہ کام ہونا تھا۔ سبھی نے گھر، آفس کے پاس یا راستے ہی کا پلان کیا تھا اور میں اس پر مطمئن تھا۔

دس بجے کے بعد مجھے سب سے پہلے چندی گڑھ ہی سے پروفیسر کے لوگوں نے بتایا کہ یہاں وہ بندہ پار کر دیا گیا ہے، جس کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ پھر آدھے گھنٹے کے اندر اندر آٹھوں جگہوں سے یہ خبر مل گئی۔ سب نے کامیابی سے وہ مشن پورا کر دیا تھا۔ تبھی میں نے روہی کی مدد سے ممبئی شہر کے علاقے دادر میں موجود اس بندے کا نمبر ملایا جن سے ان سب کے رابطے تھے۔ تھوڑی دیر بعد رابطہ ہوتے ہی میں نے کہا۔

''ہیلو، پریم ناتھ! کیسے ہو؟''

''کون ہو تم، اپنا تعارف کراؤ، اور کہاں سے بات کر رہے ہو۔'' اس کا لہجہ حقارت بھرا تھا

''اس خطے پر حکومت کرنے کا خواب تم لوگ دیکھ رہے ہو اور پوچھ مجھ سے رہے ہو کہ میں کہاں سے بات کر رہا ہوں، میں نے تم جیسے احمق لوگ نہیں دیکھے؟'' میں نے انتہائی طنز سے کہا۔

''کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟'' اس بار اس کے لہجے میں کافی حد تک تجسس تھا۔

''اتنی جلدی بھی کیا ہے، ابھی تو صرف آٹھ لوگ کام آئے ہیں، یہ تو شروعات ہے۔'' میں نے طنزیہ کہا۔

''کیا کہہ رہے ہو تم؟'' وہ وحشت سے بولا۔

''صرف میری سنو پیادے، چاہتا میں یہ ہوں کہ اپنے بڑوں سے میری بات کراؤ، یا اپنے جیسے اس پیادے کو میرے حوالے کرو، جو اپنا تعارف آزاد نام سے کرواتا ہے۔'' میں نے نفرت سے کہا۔

''اوہ! تم وہی تو نہیں ہو، جو اس کے جزیرے سے بھاگ گئے تھے۔ ہم خود تیری تلاش میں ہیں۔'' وہ تیزی سے بولا۔

''تو پھر آؤ، ملیں' کہاں ملنا ہے؟'' میں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب ہے تمہیں اپنی جان پیاری نہیں؟'' اس نے غصے میں کہا

''بالکل بھی نہیں پیاری، میں نے اپنا تعارف آٹھ لوگوں سے کروا دیا ہے، امید ہے کہ ان کے بارے میں اطلاعات مل گئیں ہوں گی، اپنے بڑوں سے بات کر کے مجھے بتاؤ، کہاں ملنا ہے یا اپنا سیٹ اپ ختم کر کے، برصغیر پر حکومت کرنے کا خواب پھر خواب ہی رہنے دینا ہے۔'' میں نے کہا۔

''دیکھو، ہم تمہیں اپنا حصہ بنانا چاہ رہے ہیں اور تم دشمنی کر رہے ہو، تم شاید جانتے نہیں، ہم شام سے پہلے تمہارا اور تمہارے ساتھ جڑے لوگوں کا اس دنیا سے خاتمہ کر دیں گے۔'' اس نے پھر سے کہا۔

''چلو پھر میں شام کے بعد تمہارے ساتھ رابطہ کرتا ہوں، اپنے باقی لوگوں کو الرٹ کر دو۔'' یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

فی الحال مجھے بس اتنا ہی کرنا تھا۔ ان کے سارے سیٹ اپ کی چولیں ہل گئی تھیں۔ انتقاماً وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ میں نے سرمد کو نور نگر کے بارے میں کہا تو اس نے وہاں کی سیکورٹی کے بارے میں مجھے تفصیل سے بتا دیا۔ وہاں ہر طرح سے خیریت تھی۔ کسی بھی ناگہانی صورت حال کے لیے نپٹنے کا پورا انتظام تھا۔ میں مطمئن ہو گیا۔

جانی بھائی کی بات کافی حد درست تھی اور وہ لوگ جو برصغیر پر حکومت کے خواب دیکھ رہے تھے، انہوں نے یہ خواب ایسے ہی نہیں دیکھ لیا تھا۔ اس سارے خطے پر جو لوگ حکومت کر رہے ہیں یا طاقت جن کے ہاتھوں میں ہے، وہ زیادہ تر موروثی ہیں۔ جتنی بھی سیاسی پارٹیاں ہیں، ان کے جو بڑے لیڈر ہیں، ان میں زیادہ تر موروثی خاندان ہیں یا پھر ان کے پروردہ لوگ۔ یہ سب نفرت کی سیاست کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو کچلنے اور نیست و نابود کر دینے کے سوا انہیں بات ہی کوئی نہیں آتی۔ لیکن ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جس سے انہیں کچھ ہوا ہو، ہاں مگر ان میں چند ایسی مثالیں ہیں، جنہیں بیرونی طاقتوں نے مقامی لوگوں کے تعاون سے ختم کیا۔ یہ بات کو سمجھنے کی واضح دلیل ہے کہ اس موروثی سیاست کو مضبوط سے مضبوط تر کیوں کیا جا رہا ہے؟ کوئی طاقت ایسی ہے، جو انہیں سہارا دیئے ہوئے ہے تا کہ ان کے ایجنڈے پر کام ہوتا رہے۔ دوسری طرف سارے خطے میں عوام کے وہی مسائل ہیں، غربت، بیماری، بے روزگاری، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، کرپشن ایسے ناسور اب تک قوموں کے بدن پر سے بہہ رہے ہیں۔ حکمرانوں اور عوام کے درمیان جو طبقہ ہے، وہ زیادہ ظالم ہے۔ وہ حکمرانوں اور عوام کے درمیان اپنا مفاد رکھ کر دونوں کو اندھا کیے ہوئے ہے۔ ذات پات، قوم پرستی، فرقہ واریت، مذہبی جنونیت، عصبیت، ان سب کو پروان کون چڑھا رہا ہے؟

ایسے میں بیرونی طاقتیں، اپنا اثر رسوخ انہی لوگوں پر استعمال کرتی ہیں جو طاقت ور ہوتے ہیں۔ انہی کے

ساتھ مل کر اپنے منصوبے پورے کرتے ہیں۔ایک چھوٹی سی مثال کے ذریعے بات سمجھی جا سکتی ہے کہ سن چوہتر میں اسلامی سربراہی کانفرنس لاہور میں اسلامی دنیا کے لیے جو پلان ترتیب دیا گیا تھا۔ بینکنگ سے لے کر نیوز ایجنسی تک، کاروباری معاملات سے لے کر کرنسی تک کو طے کر لیا گیا تھا۔مگر کچھ بھی نہ ہو پایا، سب کچھ کاغذوں میں رُل گیا اور حالات ہی بدل گئے۔وہ پلان آج یورپی یونین کی صورت میں دنیا کے سامنے ہے۔یہ سب کیسے ہوا؟ اس سوال کو لے کر چلیں تو بہت سارے معاملات سامنے کھلتے چلے جاتے ہیں۔یہ خطہ میدان کارزار بنا ہوا ہے، یہاں کی نسلیں اپنوں ہی کے تسلط میں ہیں،نفرت کی سیاست نے دماغوں کو ماؤف کر کے رکھا ہوا ہے اور سب سے زیادہ خون یہیں بہہ رہا ہے؟ یہیں سب سے زیادہ آلہ کار بھی پیدا ہو رہے ہیں۔جو اپنی طاقت کے لیے انسانیت کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔میر جعفر اور میر صادق تو آج کے منافقین کے سامنے بونے لگتے ہیں۔



جسپال کے کمرے میں ہرپریت بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔اس نے جو بھی اور جیسی بھی تھی، اپنی روداد سنا دی تو ہرپریت نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو اس لیے تو نے کیس کٹا دیئے؟“

”لیکن میرے اندر جو سکھ ہے، وہ تو ویسا ہی ہے نا؟“ جسپال نے جذباتی انداز میں کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تو اب بھی یہاں نہیں رہے گا، چلا جائے گا، میرا انتظار تو جیسے تھا، ویسا ہی رہے گا۔“ ہرپریت نے اپنی سوچ کے مطابق نتیجہ نکالتے ہوئے کہا۔

”یہ تیرے سامنے ہے، میں اب اس مشن سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔“ جسپال نے فیصلہ کن لہجے میں کہا

”تو پھر میں بھی سکھنی ہوں، میرا فیصلہ بھی سن لے، میں تیرا انتظار کروں گی، اور تیرے انتظار میں چاہے مجھے موت آ جائے۔“ اس نے بھی حتمی انداز میں کہہ دیا

”تو پھر، غصہ کس بات کا، آ،جو ذرا سا وقت ہمیں ملا ہے، اسے خوشی خوشی گزار دیں۔ پھر پتہ نہیں یہ لمحات دوبارہ ملیں گے بھی یا نہیں۔“ جسپال نے اس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ چند لمحے رکی رہی پھر اس کے سینے سے جا لگی۔نجانے کب کے رُکے آنسو تھے جو بہہ نکلے یا پھر آنے والے وقت کے احساس سے وہ رُو دی تھی۔ جو بھی تھا، وہ جی بھر کے روئی تھی۔ جب جی ہلکا ہو گیا تو اس سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔

”تو ٹھیک کہتا ہے جسپال، محبت قربانی مانگتی ہے اور میں قربانی دینے کو تیار ہوں۔“

”چل اب یہ جذباتی باتیں ختم کر اور تیار ہو جا، جالندھر چلتے ہیں، کچھ شاپنگ کریں گے، کچھ کھائیں پیئں گے پھر واپس آ جاتے ہیں۔“ جسپال نے کہا۔

”مجھے کوئی شاپنگ نہیں کرنی، کھانے پینے کو یہاں بہت کچھ ہے۔ہمیں پہلے دلبیر سنگھ سے ملنا ہے، پھر اس کے بعد ایڈووکیٹ گل سے۔یہاں کی تمہاری جائیداد کے بارے میں ابھی کچھ مسئلے ہیں، وہ حل ہونے والے ہیں۔“ ہرپریت نے اسے کہا تو وہ سر ہلا کر رہ گیا

”تیرے ساتھ جانا ہے تو جدھر لے جا۔“ جسپال نے شوخی سے کہا۔

”وہ جمال کو ساتھ......“ ہرپریت نے کہنا چاہا تو جسپال نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا

”اُو چھوڑ اُسے، اُسے سونے کی بیماری ہے، اسے سونے دے، ہم تب تک آ جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ ایک دم سے مان گئی اور نکودر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔انہوں نے جاتے ہوئے دلبیر سنگھ سے ملتے ہوئے جانا تھا۔



سورج ڈوب چکا تھا۔ کچھ دیر پہلے انوجیت میرے پاس سے اٹھ کر گیا تھا۔ میں کمرے میں پڑا تھا، پھر ہوا خوری کے لیے اوپر چھت پر چلا گیا۔ مغرب کی جانب اوگی پنڈ پھیلا ہوا تھا، جو قصبے کی صورت اختیار کر گیا تھا۔

میں کچھ دیر وہاں چہل قدمی کرتا رہا پھر ایک کرسی پر بیٹھ کر روہی کی مدد سے پریم ناتھ سے رابطہ کرنے کو کہا لیکن اس سے پہلے میں نے نورنگر کے بارے میں تسلی کرلی۔ وہاں بالکل سکون تھا۔ پریم ناتھ جیسے میرے ہی انتظار میں تھا۔

''جو ہونا تھا سو ہو گیا، ہم تم سے اب بھی دوستی چاہتے ہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کیا تمہارے بڑوں کا یہی فیصلہ ہے۔'' میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

''ظاہر ہے، یہ فیصلہ ہوا تو میں تمہیں آگاہ کر رہا ہوں۔''

''اب اپنے بڑے کے بارے میں تم مجھے بتاؤ گے یا میں اسے خود تلاش کرلوں۔'' میں نے پوچھا۔

''اسے تو ہم نے بھی نہیں دیکھا، اگر تم تلاش کر سکو تو شوق سے؟'' اس نے جواب دیا

''یہ بات تم خود کہہ رہے ہو یا پھر اپنے بڑوں کی مرضی سے۔'' طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے میں نے قہقہہ لگا دیا۔

''تم انہیں تلاش نہیں کر سکتے، اس لیے بات مذاق میں ٹال رہے ہو۔'' اس نے طنز کیا

''تمہارا وہ مہرہ آزاد، اس نے بھی مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا، کہاں ہے وہ، تاکہ وہ میرے ساتھ کیے ہوئے وعدے کو نبھائے۔'' میں نے پوچھا۔

''افسوس، وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا، خیر تم اگر ہمارے ساتھ دوستی کرتے ہو تو بات آگے بڑھائیں؟'' اس نے پوچھا۔

''تم لوگوں کی وجہ سے میرا اب تک دس ملین ڈالر سے زیادہ خرچ ہو چکا ہے، پہلے وہ دو، پھر بات کرتے ہیں۔'' میں نے کہا تو وہ اگلے ہی لمحے بولا۔

''بولو، کہاں دینے ہیں۔''

''کہاں دے سکتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''پاکستان اور بھارت میں کہیں بھی۔'' اس نے کہا۔

''تو ٹھیک ہے، ممبئی کے جوہو میں اشوک نگر کی اسٹریٹ تھری پر جو بنک ہے، اس میں رقم ڈال دو، کل دس بجے تک۔ اکاؤنٹ نمبر تم تک پہنچ جائے گا، باقی باتیں پھر کرتے ہیں۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ روہی والے بھی ہمارے درمیان ہونے والی باتیں سن چکے تھے۔

جس وقت میں بات کر رہا تھا، اس دوران جسپال کو رونیت کور کا فون آیا۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ اس وقت نکودر میں ایڈووکیٹ گل کے پاس تھا۔ اس کے بتانے پر میں نے رونیت کور کو فون کیا۔

''تم نے جس کمپنی کے بارے میں کہا تھا، میں نے اسے ہینک کر کے اس کے بارے میں ساری معلومات لے لیں ہیں۔ اس کے بارے میں ساری تفصیلات میں نے میل کر دی ہیں۔'' اس نے تیزی سے بتایا تو میں نے پوچھا۔

''رونیت، تم نے کبھی گاؤں کی زندگی دیکھی ہے، مطلب کبھی وقت گذارا ہے گاؤں میں؟''

''مجھے نہیں یاد کہ میں نے گاؤں میں کہیں ایک آدھ دن سے زیادہ وقت گذارا ہو۔'' اس نے حیرت بھرے انداز میں بتایا

''ٹھیک ہے، میں تفصیلات دیکھ کر بتاتا ہوں کہ تمہیں یہاں گاؤں میں آنا ہوگا یا پھر میں ممبئی آ جاؤں، کیسا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تم ہی یہاں آ جاؤ، یہاں موسم زیادہ اچھا ہے، انجوائے کرنے کا موقعہ زیادہ ملے گا۔'' اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو میں سمجھ گیا وہ کیا چاہتی ہے۔ کچھ دیر اس کے ساتھ مزید بات کر کے میں نے فون بند کر دیا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اگلے دن کے بعد کیا کرنا ہوگا۔ نجانے کیوں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ مجھے اب اپنے لیے زندگی نہیں گزارنی۔

میں چھت سے نیچے آیا تو جوتی دروازے میں کھڑی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا تو بولی۔

''بڑی بی بی، آپ کو کھانے کی میز پر بلا رہی ہیں۔''

''باقی لوگ؟'' میں نے پوچھا۔

''ان میں کوئی بھی نہیں ہیں، وہ اکیلی بیٹھی ہیں۔'' اس نے بتایا تو میں بجائے کمرے میں جانے کے اس کے ساتھ ہی چل دیا۔ راستے میں اس نے مجھے بتایا کہ انوجیت رات دیر سے آئے گا اور وہ دونوں ابھی نکودر سے ہی نہیں نکلے۔ انہیں بھی دیر ہو جائے گی۔ میں جب کھانے کی میز پر پہنچا تو کلجیت کور اکیلی بیٹھی ہوئی تھیں۔

''آ جا پتر، کھانا کھائیں۔ ان میں تو آج کوئی بھی نہیں۔'' انہوں نے کہا تو میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہر سکھ اپنے آپ کو سوا لاکھ کہتا ہے۔ آپ مجھے دو لاکھ سمجھ لو، آپ دو لاکھ کے ساتھ پرشادے شکھ رہے ہو۔''

میرے یوں کہنے پر وہ کھلکھلا کر ہنس دیں۔ کھانا مزے کا تھا۔ اس دوران کلجیت کور سے باتیں بھی چلتی رہیں۔ وہ ایک دردمند دل رکھنے والی تحمل مزاج خاتون تھیں۔

کھانے کے بعد میں دوبارہ کمرے میں آ گیا۔ اس وقت میں نے رونیت کور کی تفصیلات دیکھ لی تھیں، جب جوتی میری سائیڈ ٹیبل پر چائے رکھ گئی۔ ان تفصیلات میں کچھ نہیں تھا، سوائے ایک ایسی کمپنی کہ جو عام کاروباری ہوتی ہے۔ میں چائے پیتے ہوئے سوچتا رہا، میں ان لوگوں کی تلاش میں وقت ضائع کر رہا ہوں یا اس میں سے کچھ نکلے گا۔ بہت دیر سوچتے رہنے کے بعد مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے سب سمیٹ کر ایک طرف رکھا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

اگلی صبح میں جلدی بیدار ہو گیا۔ میں فریش ہو کر چھت پر گیا تو جسپال پہلے ہی سے وہاں موجود تھا۔

''ہم رات دیر سے آئے تھے، تم اس وقت سو گئے تھے۔'' اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کر رہا، ورنہ کیا کچھ ہو گیا ہے اس کا تمہیں پتہ ہی نہیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے اسے کہا تو اس نے پوچھا۔

''کیا ہو گیا، ذرا میں بھی تو سنوں۔'' تب میں نے اس اختصار سے سارے واقعات بتا دیئے۔ وہ سنجیدگی سے سنتا رہا۔ پھر ذرا دیر سوچتے ہوئے بولا ''تمہارے خیال میں اب یہاں ڈیڈ لاک ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''دیکھو۔ باقی ملکوں کا تو مجھے پتہ نہیں۔ لیکن ان ممالک میں سیاست دان وہ لوگ ہیں، پانی جن کے پلوں کے نیچے سے ہو کر گزرتا ہے۔ مطلب، ان کے سہارے کے بغیر یا ان کی معلومات میں ہوتا ہے کہ ان کے علاقے میں کیا ہو رہا ہے۔ تبھی ایسے گینگ پرورش پاتے ہیں۔ وہ ان سے پورا پورا مفاد لیتے ہیں۔''

''مگر ہم تو کسی سیاست دان کا سہارا نہیں لے رہے؟'' میں نے جواباً کہا۔

''ہم کون سا گینگ بنا کر باقاعدہ کوئی کام کر رہے ہیں اور پھر تم میری بات نہیں سمجھے، بڑے سیاست دان اپنا گروہ رکھتے ہیں اور کئی گروہ اتنے طاقت ور ہیں کہ وہ خود اپنے سیاست دان تخلیق کرتے ہیں تاکہ ان کی طاقت کا سکہ جما رہے اور وہ جو چاہئیں سو کریں۔'' اس نے پرزور انداز میں کہا

''میں اب بھی نہیں سمجھا کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' میں نے الجھتے ہوئے کہا۔

''دیکھو یہ جو آٹھ بندے ضائع ہوئے ہیں، یہ کوئی عام کیڑے مکوڑے تو تھے نہیں، اگر کل تم نے نیوز سنی ہوتیں تو تمہیں کسی حد تک پتہ چل گیا ہوتا کہ کون لوگ ردعمل دکھا رہے ہیں۔ ظاہر ہے انہیں کوئی تکلیف ہوئی ہو گی تو وہ ردعمل دکھا رہے ہوں گے، وہیں سے آگے راستہ نکلتا ہے۔'' جسپال نے بڑے پتے کی بات کہی تھی۔

''ان کے ساتھ تنظیمیں بھی احتجاج کر رہی ہوں گی، مطلب نیوز پیپر دیکھے جائیں، ان میں ان لوگوں کی تصویریں بھی ہوں گی۔'' میں نے کہا۔

''جمال۔! میں نے اب تک یہی سمجھا ہے، کوئی بھی طاقت، چاہے وہ چھوٹی ہے یا بڑی، اس کی کہیں نہ کہیں دلچسپی ضرور ہوتی ہے، یہ سامنے کی بات ہے۔ وہ اس دلچسپی کے لیے اپنی طاقت کا استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ جتنی

بڑی طاقت ہوگی وہ اتنی بڑی دلچسپی رکھے گی۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے کہا تو میں نے پوچھا۔

''تم اس کی کوئی مثال دے سکتے ہو؟''

''کیوں نہیں، مثال کے طور پر ایک اسلحہ ڈیلر، یہ چاہے گا کہ اس کا اسلحہ بکے، ظاہر ہے جہاں لڑائی ہوگی وہیں بکے گا، منشیات فروش ان جگہوں پر قبضہ کرے گا جہاں منشیات بنتی ہے یا بکتی ہے۔ کوئی تیل کی دولت پر قبضہ جمانا چاہتا ہے، اس کے لیے چاہئے جتنے لوگ مر جائیں۔ ایک سیاست دان کو عہدہ چاہئے، وہ اسے حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گا۔ اس طرح ایک طویل فہرست ہے۔ کہیں پر مفاد ایک ہو جاتا ہے اور کہیں پر یہ لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں۔ یہی جنگ پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔'' اس نے انتہائی دکھ سے کہا۔

''تمہارے خیال میں انسانی فلاح کے لیے کوئی بھی کچھ نہیں کر رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ایسا ہے، تبھی یہ دنیا بچی ہوئی ہے، ربّ کا اپنا ایک نظام ہے، وہ تو چلنا ہے، انسان چاہے جو مرضی کرتا رہے۔ سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ وسائل پر قبضے کی اس جنگ میں ربّ کا نام لے کر بھی انسانیت کو گمراہ کیا جاتا ہے۔'' اس نے دردمندی سے کہا۔

''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو، یہ شیطانی قوتیں ہیں نا'' میں نے کہا تو وہ سوچتا ہوا بولا۔

''اب دیکھو، پاک بھارت تو رہے ایک طرف، تھائی لینڈ کا ایک شہر ہے پتایا، جس کا نام تم نے سنا ہوگا، اس ملک میں بڑا امن تھا، جس طرح بھی انہوں نے ترقی کی، یہ الگ بحث ہے لیکن، جیسے ہی وہاں پر جی ایٹ کا اجلاس ہونے کی تیاریاں ہوئیں، معاملات ہی کچھ دوسرے ہو گئے، جی ایٹ کا اجلاس نہیں ہوا، لیکن تب سے ملک کے حالات خراب ہونے لگے۔ مجھے ان کے حالات میں دلچسپی نہیں، فقط یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ ایسی کون سی قوت ہے جو وہاں امن نہیں چاہتی؟ اور وہ دلچسپی کیا ہے جس کے لیے امن تباہ کر کے رکھ دیا گیا ہے؟''

''ہاں، یہی خفیہ طاقتیں اپنا ایجنڈا اس دنیا پر نافذ کرنا چاہتی ہیں، اور اس کے ردعمل میں بھی لوگ اپنا کام کر رہے ہیں۔ خیر، اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو......'' یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ کیونکہ ایسے میں ہر پریت ایک ٹرے میں چائے کے مگ رکھے وہیں آگئی۔

''یہ صبح صبح یہاں کیا میٹنگ چل رہی ہے؟'' اس نے مگ ہمیں تھماتے ہوئے پوچھا۔

''میں جسپال سے پوچھ رہا تھا کہ تم ہر پریت سے شادی کب کر رہے ہو؟'' میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ اس پر ہرپریت نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تو ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ چائے پینے کے دوران یونہی وہ نکودر جانے اور وہاں کے احوال کے بارے میں بتاتے رہے۔ پھر ہرپریت مگ لے کر نیچے چلی گئی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ جسپال اُس کے بارے میں بات کرے لیکن اس نے نیچے جا کر اخبار دیکھنے کو کہا تو میں اس کے ساتھ نیچے چلا گیا۔

وہ لیپ ٹاپ کھول کر مختلف اخبار پڑھتے ہوئے ردعمل نوٹ کرتا رہا۔ اس دوران میں نہا کر فریش ہو گیا تھا۔ ناشتے کی میز پر جانے سے پہلے اس نے بھارت اور پاکستان میں سے ایک ایک سیاست دان کا نام میرے سامنے رکھ دیا۔

''یہ ہیں وہ لوگ جنہیں سب سے زیادہ تکلیف ہوئی ہے۔ میرا یقین کرو، ان میں سے بہت کچھ نکلے گا۔'' اس نے پورے یقین سے کہا۔

بھارت میں اس نے جس سیاست دان کا نام لیا تھا وہ ممبئی ہی کا رہنے والا تھا۔ رامیش پانڈے اس کا نام تھا اور رُکن پارلیمنٹ ہونے کے ساتھ ساتھ حکومت میں بھی تھا۔ پاکستان میں ملک فرحان سیال تھا، جو ان دنوں اپوزیشن میں تھا اور بہت خاموش تھا۔ وہ بیان نہیں دیتا تھا اور نہ ہی وہ میڈیا کے سامنے اتنا آتا تھا۔ لیکن جیسے ہی وہ

لوگ صاف ہوئے اس نے بھرپور قسم کی احتجاجی بیان بازی کی تھی۔ بات میری سمجھ میں آرہی تھے۔ میں ان دونوں کے بارے سوچتا ہوا ناشتے کی میز تک جا پہنچا۔ اس دن انوجیت کے ساتھ خوب باتیں ہوئیں۔ وہ زیادہ تر مقامی سیاست کے بارے میں ہی بات کرتا رہا۔ اصل میں وہ جس سکھ تنظیم کے ساتھ جڑا ہوا تھا، اس کا اپنا طریقہ کار تھا۔ بہرحال خوشگوار ماحول میں ناشتہ ختم کیا گیا۔

میں، جسپال، ہرپریت اور انوجیت وہیں ڈرائینگ روم میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر باتوں کے بعد یہ طے ہوا کہ مجھے اوگی پنڈ دکھایا جائے۔ ہم چاروں ہی نکل پڑے تھے۔ وہ پرانا کنواں دیکھا، جہاں ہیرا سنگھ کی لالو قلندر سے ملاقات ہوئی تھی۔ اب وہاں بس برگد کا درخت تھا۔ کنواں ختم ہو چکا تھا۔ وہاں کافی وقت گذارنے کے بعد ہم گاؤں کی جانب چلے گئے۔ "ٹمیاں دی پتی" میں پرانے گھر دیکھے۔ چوپال اور وہ جگہ جہاں کبھی مسجد ہوا کرتی تھی۔ وہاں اب مسجد نہیں تھی۔ دل کافی دکھا۔ میں اسی کیفیت میں تھا کہ روہی سے فون آ گیا۔

مجھے یاد تھا کہ اس وقت ممبئی میں پریم ناتھ میرے فون کے انتظار میں ہوگا۔ مجھے صورت حال بتادی گئی۔ وہ پوری فیلڈنگ کے ساتھ تھا۔ فون اس سے ملایا جا چکا تھا۔

"اکاؤنٹ نمبر دیں۔" بلا کسی تمہید کے کہا گیا۔

"اب مجھے تمہاری رقم نہیں چاہئے۔ کیونکہ تمہاری نیت کچھ اور ہے۔" میں نے کہا تو وہ ہنس دیا

"لگتا ہے کچا کھلاڑی ہے تُو، ہمت ہے تو چھین لے مجھ سے رقم، میں تمہیں اب بل سے نکال کر ہی رہوں گا۔" اس نے انتہائی طنزیہ انداز میں کہا

"میں تیرے باپ کو بل سے نکالنے کے چکر میں ہوں، دیکھتے ہیں کب تک چھپتا ہے۔" میں نے کہا۔

"بہت بھولے ہو تم، بلکہ بے وقوف، پہلے مجھ سے تو نپٹ لو، پھر خواب دیکھنا۔ رقم تو مجھ سے لے نہیں سکے۔" اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"میں صرف یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ تم دوستی کرنا چاہتے ہو یا دشمنی، اتنا لاؤلشکر لا کر تم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تم لوگ دوستی نہیں کرنا چاہتے، صرف مجھے سامنے لانا چاہتے ہو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو پھر آجاؤ نا سامنے، کس نے روکا ہے۔" وہ پھر طنزیہ انداز میں بولا

"ٹھیک ہے، انتظار کرو۔" میں نے کہا، تب فون بند ہو گیا، روہی کا فون چل رہا تھا۔ انہوں نے مجھے وہاں کی صورت حال بتادی۔ میں نے اسی لمحے ممبئی جانے کا فیصلہ کرلیا۔

ہم مزید کچھ دیر اُوگی پنڈ گھومتے رہے۔ پھر واپس گھر آگئے۔ وہیں آکر میں نے جسپال کو بتایا کہ ابھی کچھ دیر بعد اُوگی سے نکل رہا ہوں۔

"یہ اچانک فیصلہ؟" اس نے مجھ سے پوچھا تو میں نے اختصار سے بتادیا

"مجھے بہرحال جانا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"نہیں میرا نہیں خیال کہ تمہارا یہ فیصلہ درست ہے، ہم اس میں الجھ کر رہ جائیں گے۔ ہم نے جو راستہ طے کیا ہے، ہمیں اسی پر چلنا ہوگا۔" اس نے سوچ بھرے لہجے میں کہا

"تو پھر یہ ممبئی،......" میں نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

"جب سانپ کی گردن پکڑ لی جائے تو پھر وہ سارے کا سارا ہاتھ میں آجاتا ہے، تب اُس کا ڈنگ نکالنا بہت آسان ہوتا ہے۔ ہمیں صرف وہاں تک پہنچنا ہے، جو یہ سارا انظام چلا رہا ہے اور یہ ہمیں رامیش پانڈے ہی بتائے گا۔"

"تب پھر مجھے ممبئی جانا ہوگا۔ میں نکلتا ہوں۔" میں نے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"صرف تم نہیں، میں بھی۔ آج ہی دونوں نکلیں گے۔ میری ہرپریت سے بات ہو چکی ہے، ڈونٹ وری۔"

"تو چلو، پھر نکلیں۔" میں نے کہا تو اس نے ہاں میں گردن ہلادی۔

❁......❁......❁

کوئی سکھ امرتسر پہنچے اور وہ ماتھا ٹیکنے دربار صاحب نہ جائے، یہ ہو نہیں سکتا تھا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی جب ہم امرتسر پہنچے۔ سندو ابھی تک ممبئی میں تھا اور ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔ میری اس سے بات ہوئی تو میں نے اسے واپس ممبئی آنے کا کہہ دیا۔ میری دلی خواہش تھی کہ میں رتن دیپ سنگھ سے ملوں، اس سے بھی زیادہ میں بانیتا کور دیکھنا چاہتا تھا۔ میرا امرتسر میں اس کے ساتھ گذرا ہوا وقت بڑا یادگار تھا۔ کئی یادگار لمحے ابھی تک تشنہ، اپنی اپنی جگہ پر میرے اور بانیتا کور کے انتظار میں تھے۔ مجھے ان کا فون نمبر یاد نہیں تھا کہ انہیں کال کر لیتا۔ ہاں علاقہ ضرور یاد تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میں وہاں تک پہنچ سکتا ہوں۔ میں نے راستے میں جب جسپال سے ذکر کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"یار میں بھی اسے دیکھنا چاہتا ہوں، جیسا تم نے اس کے بارے میں بتایا ہے نا، وہ دیکھنے کی چیز ہوگی۔"

سو رستے ہی میں ہمارا پروگرام بن گیا کہ رتن دیپ سنگھ سے ضرور ملا جائے۔ لیکن پہلے وہ ہرمندر صاحب جانا چاہتا تھا۔ وہیں سے ہم نے ٹیکسی والے کو چھوڑ دیا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ہم ہرمندر صاحب سے نکلے اور ایک ٹیکسی میں اس علاقے میں جا نکلے۔ ہم نے اس ٹیکسی والے کو بھی فارغ کیا اور پیدل ہی چل پڑے۔ شام ڈھل کر رات میں بدل چکی تھی جب ہم رتن دیپ سنگھ کی حویلی جا پہنچے۔

رتن دیپ سنگھ کو میں بہت اچھی طرح یاد تھا۔ میں جب وہاں پر تھا تو اس وقت میرے "کیس" تھے اور میں دلجیت سنگھ تھا۔ اس لیے وہاں کے لوگوں نے مجھے نہیں پہچانا، لیکن جیسے ہی رتن دیپ سنگھ کو میرے بارے میں پتہ چلا تو وہ مجھے لینے پورچ تک خود آیا۔ وہ مجھے یوں ملا جیسے مجھے دوبارہ اُسے ملنے کی امید نہ ہو۔

"او یار بڑی خوشی ہوئی ہے تم سے دوبارہ مل کے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے گلے لگا لیا۔ اس کا ملنا مجھے بتا رہا تھا کہ وہ کتنے خلوص سے مل رہا ہے۔ مجھ سے الگ ہوا تو میں اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ جسپال سنگھ ہے، میرا دوست۔"

"اُو تمہارا دوست ہے تو ہمارا بھی ہے نا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جسپال کو بھی گلے لگا لیا۔

کچھ دیر بعد ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس کی بیوی ہمیں آ کر مل گئی تھی۔ اس کے دونوں بیٹے گھر پر نہیں تھے۔ مجھے بانیتا کور سے ملنے کی بے چینی ہو رہی تھی۔ ایسے میں ایک ملازمہ نے بتایا کہ ہمارے لیے کھانا لگا دیا گیا ہے۔

"لو بھئی، تم لوگ کھاؤ کھانا، پھر کرو آرام، صبح باتیں ہوں گی۔" رتن دیپ سنگھ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، ہم صبح تک نہیں رہیں گے، ہمیں آج ہی ممبئی کے لیے نکلنا ہے، یہ تو بس امرتسر آیا تو آپ سے ملے بنا جانے کو دل نہیں کیا۔" میں نے مسکراتے ہوئے بتایا تو وہ کھڑے کھڑے بولا۔

"یار جب تمہارا دل نہیں کیا جانے کو تو ہم تمہیں یوں تھوڑی جانے دیں گے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی نا، کوئی دکھ سکھ کی باتیں کرتے ہیں۔ اگر ابھی جانا بہت ضروری ہے تو میں تمہیں روک نہیں سکتا، لیکن اگر کل تک رُک سکتے ہو تو رُک جاؤ۔ کچھ دیر ہی سہی۔" یہ کہہ کر وہ میری طرف سوالیہ انداز میں دیکھنے لگا۔

"ٹھیک ہے ہم کل دوپہر سے پہلے نکل جائیں گے، ویسے بھی ابھی ٹکٹ لینے تھے۔" میں نے کہا تو وہ خوش ہو گیا۔ پھر چلتے ہوئے بولا۔

"کھانا کھا کر اوپر، آ جانا میرے پاس۔" یہ کہہ کر وہ ڈرائنگ روم سے نکل گیا اور ہم کھانے کی میز کی جانب بڑھے۔ کافی پرتکلف کھانا تھا، سیر ہو کر کھایا۔ ہم اس وقت اوپر جانے کے لیے کھڑے ہی ہوئے تھے، کہ ایک سمت سے بانیتا کور میرے سامنے آئی اور آتے ہی میرے گلے لگ گئی۔ اس کا چہرہ مجھ سے دو تین انچ کے فاصلے پر تھا۔ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خوشی بھرے لہجے میں کہا

"اب بتاؤ، وہ کس جو ابھی تک ہم دونوں کے

درمیان لٹک رہی ہے، اسے اُتار لوں۔"
"تیری مرضی ہے بنٹو، میں تو اُس وقت بھی تیری دسترس میں تھا۔" میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو اس کی گرفت ایک دم سے ڈھیلی ہوگئی، پھر وہ مجھ سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔
"مطلب، تیری مرضی نہیں ہے، چل اس وقت ہی تجھے تم سے چھینوں گی، جب تمہاری مرضی ہوئی۔" یہ کہہ کر اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا" یہ تو اچانک ٹپک کہاں سے پڑا ہے؟"
"چل اوپر بابا کے پاس وہیں بتاتا ہوں، اور ہاں یہ میرا دوست جسپال سنگھ۔" میں نے کہا تو وہ ایک دم سے خوش ہوتے ہوئے بولی۔
"وہی جسپال؟" یہ کہہ کر اس نے جسپال سے زوردار انداز میں ہاتھ ملایا، پھر ہم دونوں کا ہاتھ پکڑ کر اوپر کی طرف چل دی۔
رتن دیپ سنگھ اکیلا ہی اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے اپنے بارے میں اختصار سے بتایا کہ کس طرح مجھے اغوا کرلیا گیا تھا، اور اب میں اسے تلاش کرنے کے چکر میں ہوں۔ ساری بات سن کر اس نے کہا۔
"اپنے فون میں ایک نمبر محفوظ کرلے، زوردار سنگھ نام ہے اُس کا، اس کے بڑھاپے پر مت جانا، جگری یار ہے میرا، ممبئی کے انڈرورلڈ کی پوری جانکاری ہے اس کے پاس۔ خود متحرک نہیں ہے، لیکن یہ سب سکھ کمیونٹی یا سکھ دھرم کے لیے کرتا ہے۔ صرف اپنے لوگوں کو تحفظ دینے کے لئے۔ ورنہ اس کا انڈرورلڈ سے کوئی لینا دینا نہیں۔"
یہ کہہ کر اس نے نمبر بتایا، جسے میں نے محفوظ کرلیا، تبھی اس نے زوردار سنگھ کو کال ملا کر میرے بارے میں بتا دیا کہ میں کسی بھی وقت دو چار دن میں اس سے ملوں گا۔ اس کے بعد ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ وہ میرے جانے کے بعد ہونے والی باتیں کرتا رہا۔ اصل دلجیت سنگھ واپس لوٹ آیا تھا۔ اس کے والدین بہت یاد کرتے تھے مجھے۔ لیکن میرے پاس وقت نہیں تھا کہ ان سے مل سکتا۔ دلجیت سنگھ اب رتن سنگھ ہی کیلئے کام کرتا تھا۔ وہ جسپال کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ جالندھر میں بہت کام ہوسکتا ہے، اگر جسپال ادھر رہے تو۔
"لیکن بابا، مجھے نہیں لگتا کہ یہ پنچھی پنجرے میں رہ کر کام کرنے والے ہیں۔" پہلی بار بانیتا کور اس گفتگو میں بولی تھی، جواب تک بالکل خاموش تھی۔
"ہاں، لگتا تو ایسے ہی ہے۔" رتن سنگھ نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور پھر ہماری طرف دیکھا
"بابا! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں جمال کے ساتھ ممبئی چلی جاؤں، تھوڑی ہوا بدل جائے گی۔" اس نے یوں کہا جیسے ہم کسی تفریحی ٹور پر جا رہے ہوں۔ اس پر جسپال نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔
"دیکھ پتر۔! تو اچھی طرح سمجھتی ہے کہ یہ وہاں کیا کرنے جارہے ہیں۔ آگے تیری مرضی۔" رتن دیپ سنگھ نے عام سے انداز میں کہا۔
"یہاں بھی تو وہی کچھ ہے نا بابا، یہ سب میرے لیے کون سانئی چیزیں ہیں۔" اس نے ضدی لہجے میں کہا
"بہت فرق ہے، یہاں اور وہاں میں، سارے بھارت اور بھارت سے باہر جتنا کرائم ہے، سمجھو وہیں سے پھوٹتا ہے۔ دِلّی میں اتنا کچھ نہیں ہوتا، جتنا ممبئی سے بنایا ہوا کھیل پورے بھارت میں کھیلا جاتا ہے۔ وہاں بھائی گیری ایک دھندہ ہی نہیں، روایت بھی ہے۔ ایک الگ سی زندگی ہے وہاں پر، یہاں سے مختلف ماحول ہے وہاں،" رتن سنگھ نے کہا۔
"تو آپ مجھے ڈرا رہے ہیں؟" وہ بولی۔
"نہیں، تمہاری بات کا جواب دے رہا ہوں۔" اس نے عام سے انداز میں کہا
"پھر تو جاؤں گی، وہاں سے کچھ سیکھ کر ہی آؤں گی، باقی واہ گرو کی مرضی۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا
"میں جانتا ہوں کہ تو بہادر ہے، وہاں سب ......" میں نے کہنا چاہا تو وہ بولی۔
"تم اگر ساتھ نہ لے جانا چاہو تو الگ بات ہے۔"

اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، میں تجھے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا۔" میں نے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا، اس کے چہرے پر غصہ پھیل گیا۔ وہ ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"او کے بابا، اب ہم چلتے ہیں۔ ابھی ان کی ٹکٹیں بھی لانی ہیں۔" اس نے کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ ہم ذرا دیر وہاں رہے اور رتن دیپ سنگھ کی اجازت سے نیچے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

وہ پورچ میں گاڑی لیے کھڑی تھی۔ میں اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور جسپال پیچھے۔ وہ ہمیں لیتے ہوئی نکل گئی۔ سارے راستے وہ خاموش رہی۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے ناراض ہے، سو میں بھی خاموش ہی رہا۔ دربار صاحب کے پاس ہی ایک ٹریول ایجنٹ سے دو ٹکٹ لے کر ہم واپس آ گئے۔ صبح دس بجے کے قریب فلائیٹ تھی۔ ہم کار میں آ کر بیٹھ گئے۔

"ناراض ہو۔" میں نے اسٹیرنگ پکڑے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تو۔" اس نے مختصر انداز میں جواب دیا۔

"چل میں تجھے آئس کریم کھلاتا ہوں۔" میں نے خوشگوار انداز میں کہا۔

"میں بچی نہیں ہوں۔" اس نے روکھے لہجے میں جواب دیتے ہوئے میرا ہاتھ ہٹا دیا۔ پھر ہم میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ حویلی آ گئے۔ اس نے ڈرائنگ روم ہی سے ہمیں الوداع کہا اور اندر کی جانب چلی گئی۔ ملازمین نے ہمیں کمرہ دکھایا۔

صبح ناشتے کی میز پر رتن دیپ سنگھ، اس کی بیوی اور بیٹے موجود تھے۔ خوشگوار ماحول میں ناشتہ کر کے ہم کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر ہم اجازت لے کر چل دیئے۔ ان کا ایک ملازم ہمیں ائر پورٹ چھوڑنے چل دیا۔ مجھے بانیتا کور کے روٹھ جانے کا بہت افسوس تھا لیکن اس کی ضد بھی تو ٹھیک نہیں تھی۔ جس وقت جہاز اُڑا، اس وقت میں نے اُسے بھی ذہن سے نکال دیا۔

دوپہر کے وقت ممبئی ائر پورٹ پر ہم اُترے۔ ہمیں وہاں کسی نے لینے تو آنا نہیں تھا۔ ہم ائر پورٹ سے باہر نکلے اور جوہو جانے کے لیے ٹیکسی لی اور چل پڑے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم بنگلے سے ذرا دور اتر گئے۔ جسپال نے ٹیکسی والے کو فارغ کیا۔ ہمیں بنگلے کا پوری طرح آئیڈیا تھا، بس یونہی احتیاطاً پیدل چل نکلے۔

سندو، ابھیت، ہرپال اور رونیت کور ڈرائینگ روم میں بیٹھے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہمیں وہاں بیٹھے کوئی تین یا چار منٹ ہوئے ہوں گے کہ باہر سے پوچھا گیا

"جمال صاحب سے ملنے کے لئے بانیتا کور گیٹ پر آئی ہیں۔"

"اوہ۔!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا

"یار، لگتا ہے تیرے پیار میں تڑپ رہی تھی، جو تیرے پیچھے پیچھے آ گئی۔" جسپال زور سے ہنستے ہوئے بولا۔

سبھی میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے اسے اندر آ جانے کے لیے کہا اور اس کے آنے تک مختصر تعارف کروا دیا۔ سبھی دلچسپی سے اسے دیکھنے لگے۔ نیلی جینز پر گلابی شرٹ، کھلے بال، ہونٹوں پر میرون لپ اسٹک، سیاہ گلاگز اور کاندھے پر چھوٹا سا بیگ۔

"تمہارا پیچھے پیچھے آنا بہت اچھا لگا۔" جسپال نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"میں آگے آگے آئی ہوں، دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا تم دونوں کا، آخر ائر پورٹ سے یہاں بھی تو آنا تھا۔" یہ کہتے ہوئے وہ سب سے ہاتھ ملانے لگی۔ جسپال نے اس کا بیگ پکڑ لیا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس وقت مجھے اس پر بہت پیار آ رہا تھا۔



دوپہر کے کھانے کے بعد سبھی اوپر والے کمرے میں ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ ظاہر ہے ہم وہاں تفریح کرنے نہیں آئے تھے۔ میں نے اپنی ساری کارروائی انہیں بتا دی لیکن ذرا سی تبدیلی کے ساتھ۔ میں روہی اور اس کی

مدد کو گول کر گیا تھا۔ وہ سبھی خوش تھے۔ انہیں گرباج سے کوئی مدد نہیں ملی تھی۔ گرباج کو یہ معلوم تھا کہ وہ ابھی تک چنڈی گڑھ ہی میں ہے، اسے یہی بتایا گیا تھا۔ جس فون سے اس کا رابطہ تھا، وہ بند تھا۔ اس کے علاوہ اس نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس لیے انہوں نے میرے ہی پلان پر عمل کرنے کو کہا۔

''پلان یہ میری جان کہ ہم رامیش پانڈے ہی کو پکڑیں گے اور اسی سے آگے ہمیں معلومات ملیں گی۔ اس کے سوا ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔'' میں نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

''لیکن اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ اس سے آگے کے سارے لوگ الرٹ ہو جائیں گے اور ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔'' سندو نے اپنی رائے دی۔ بات اس کی معقول تھی۔

''کیوں نہ اسے پکڑا جائے، جس سے رقم کی بات ہوئی تھی۔'' رونیت کور نے کہا۔

''اس سے کیا ہوگا؟'' ابھیت نے پوچھا۔

''وہ گینگ سامنے آئے گا، تو ہم بھی اُن کے سامنے آ جائیں گے۔ ان کے تحفظ کے لیے کون کون سامنے آتا ہے، اس سے......'' رونیت نے کہنا چاہا مگر سندو بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''یہ بہت لمبی لڑائی ہے، وہ ہمیں الجھا کر رکھ دیں گے۔ یہاں کے انڈر ورلڈ میں کون کب کس کا دشمن بن جائے، کچھ بھی پتہ نہیں چلتا، اور نہ ہی ہمیں یہاں کے بارے میں پوری طرح علم ہے، کس جگہ سانپ ہے اور کس جگہ شیر۔''

''تو کیا تم لوگ یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو گے، کہیں سے تو شروعات کرنی ہے نا۔'' رونیت نے کہا۔

''لیکن ہمارا مقصد تو اس بندے تک پہنچنا ہے جو یہ سارا کھیل کھیل رہا ہے۔'' سندو نے جواباً کہا۔

''انہیں اپنے پیچھے لگانا ہوگا۔'' ایک دم سے بانیتا کور نے گہری سنجیدگی سے کہا، سبھی اس کی طرف دیکھنے لگے تو وہ اسی لہجے میں بولی۔

''ہمارے پاس دو آپشن ہیں۔ ایک رامیش پانڈے، اسے چھیڑا تو حکومتی ایجنسیاں ہمارے پیچھے لگ جائیں گی۔ اس لیے معاملہ ذرا مشکل ہو جائے گا۔ اس پریم ناتھ کو پکڑیں اور اپنے ہونے کا ثبوت دیں۔ ایک ہلچل تو مچے گی، وہ ہمیں پکڑنے کے لیے متحرک ہوں گے تو ہی بلی تھیلے سے باہر آئے گی۔ آگے جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔''

''ڈن ہو گیا۔'' سندو نے ایک دم سے کہا، پھر رونیت کور کی طرف دیکھ کر بولا ''تم ادھر رہو گی، اور ہمیں گائیڈ کرو گی۔ تم نے سارا کچھ کر لیا ہوگا۔''

''ہو گیا، شام تک سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس نے اپنے انداز میں کہا تو ہم سب اٹھ گئے۔

بانیتا کور نے شلوار قمیص پہنی اور پوری طرح تیار ہو کر میرے ساتھ کار میں آ بیٹھی۔ اگرچہ میں جانی بھائی کے ساتھ رابطے میں تھا۔ اسے پریم ناتھ کے بارے میں بتا دیا تھا۔ لیکن میں پہلے زوردار سنگھ سے ملنا چاہتا تھا۔ فون پر بانیتا کور ہی نے اس سے بات کی تھی۔ وہ دادر کے علاقے میں رہتا تھا۔ اس کی بتائی ہوئی ایک خاص جگہ پر جا کر ہم نے رابطہ کیا۔ پھر وہ ہمیں فون پر گائیڈ کرنے لگا۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد اس تک پہنچ گئے۔

وہ اپنے بڑے سارے گھر کے لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اتنا بوڑھا بھی نہیں تھا، جیسا میں نے تصور کر لیا تھا۔ وہ ہمیں اٹھ کر ملا۔ اسے بانیتا کور کے مل جانے پر بڑی خوشی ہو رہی تھی۔ ہم بیٹھ گئے تو وہ بولا۔

''رتن نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم بھی ممبئی آ گئی ہو۔ سچ پوچھو نا تم اُس کا بیٹا ہو۔ باقی تو سب پیسے کے پیچھے بنیے ہو گئے ہیں۔'' اس نے کافی حد تک دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ اتنے میں اندر سے ملازمین کھانے پینے کو بہت کچھ لے آئے، جو بہرحال پنجابیوں کی روایت تھی۔ تبھی اس نے مجھ سے پوچھا۔

''ہاں پتر، تو بتا، کون بندہ چاہئے تمہیں؟''

''پریم ناتھ ہے کوئی۔'' یہ کہہ کر میں اس کی امپورٹ ایکسپورٹ کمپنی کا نام بتا دیا۔ اسے سنتے ہی وہ بولا۔

''ارے ہاں، یاد آیا، آج سے چند برس پہلے وہ ایک چھوٹا موٹا گینگ چلاتا تھا۔ پچھلے دو برس سے اس کی اڑان بہت اونچی ہوگئی ہے۔ منشیات بیچتے بیچتے وہ اب اسلحے کا کاروبار کر رہا ہے۔ اب مضبوط گینگ ہے اس کا۔''

''وہ ملے گا کہاں؟ اسے پکڑنا ہے۔'' بانیتا کور نے کہا۔

''اس کے آفس میں تو ذرا مشکل ہوگا، گھر سے لے کر اس کے آفس کے درمیان اسے اٹھایا جا سکتا ہے۔ ہاں یہ معلومات مل سکتی ہیں کہ کب اس پر ہاتھ ڈالا جائے۔'' اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔

''لیکن اگر اس کے گھر پر......'' میں نے پوچھا۔

''ممکن ہے، تم ذرا سکون سے بیٹھو، ڈنر کرتے ہیں، تب تک پتہ چل جائے گا سب۔'' یہ کہہ کر اس نے فون نکالا اور کال ملا کر کسی سے باتیں کرنے لگا۔ چند منٹ بعد اس نے فون واپس جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد رتن دیپ سنگھ کی باتیں ہی ہونے لگیں۔ اس دوران رامیش پانڈے کا بھی ذکر میں نے کر دیا۔ تب اس نے کہا۔

''اس پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس لیے سو بار سوچنا ہوگا کہ بھارت کی ساری ایجنسیاں تم لوگوں کے پیچھے لگ جائیں گی۔ اس سے کام ذرا مشکل ہو جاتا ہے، بہرحال دیکھتے ہیں، کیا ہوتا ہے۔'' اس نے عام سے لہجے میں یوں کہا جیسے یہ کام مشکل تو ہے ناممکن نہیں۔ مجھے اس کا انداز بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ سامنے بیٹھے بندے کو ڈرا نہیں رہا تھا، اس کی باتوں سے مزید حوصلہ ملتا تھا۔

دس بجے کے قریب جب ہم زوردار سنگھ کے پاس سے اٹھے تو پورا پلان لے کر ہی اٹھے۔ ایک خاص جگہ پر جانی بھائی کے لوگ اسلحہ سمیت پہنچ گئے تھے۔ ہمیں راستوں کا بالکل پتہ نہیں تھا۔ اس لیے زوردار سنگھ نے ایک ماہر ڈرائیور ہمارے ساتھ کر دیا۔

دادر کا وہ علاقہ کافی گنجان آباد تھا۔ پریم ناتھ کا گھر ایسی جگہ تھا، جہاں ابھی تک پرانے طرز کی عمارتیں موجود تھیں۔ کسی زمانے میں وہ کھلا علاقہ ہوگا۔ لیکن ان دنوں ایسے ہی دکھائی دے رہا تھا، جیسے وہ پرانا علاقہ ہو۔ جانی بھائی کے لوگ چار گاڑیوں پر تھے۔ انہیں لیڈ کرنے والا نوجوان میں نے اس دن چھت پر دیکھا تھا، جب میں جانی بھائی سے ملنے گیا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر میرے پاس آ گیا۔ ہم ایک طرف جا کر کھڑے ہوگئے۔

''یہ جانی بھائی کا علاقہ تو نہیں ہے لیکن اپنا لوگ کام کر لے گا۔ آپ لوگ ادھر انتجار کرو، ہم......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اونہیں، میں تم لوگوں کے ساتھ جاؤں گا۔ خیر۔! یہ تو پکا ہے نا کہ اس کا سیکورٹی ہوگا۔ تمہارا کام صرف سیکورٹی کو سنبھالنا ہے، باقی میں دیکھ لوں گا۔'' یہ سب طے کر کے ہم اپنی اپنی گاڑیوں کی جانب چل دیئے۔

وہ پرانی طرز کا ایک بنگلہ تھا۔ شاید وہ پرانے زمانے کے کسی امیر آدمی نے بنوایا ہوگا۔ اب اس کے پاس تھا۔ اس کی دیواریں اونچی نہیں تھیں۔ لیکن گیٹ پر کچھ سیکورٹی والے تھے۔ وہ نوجوان گیٹ پر گیا اور اس نے وہاں کوئی بات کی۔ اس وقت تک چاردیواری پر لگی تاروں کو چیک کر لیا گیا تھا۔ سیکورٹی والے نے فون پر اندر بات کی، پھر اجازت ملنے پر انہوں نے ہم تینوں کو چیک کیا اور اندر جانے کی اجازت دے دی۔ بانیتا کور ڈرائیور کے ساتھ گاڑی ہی میں باہر گیٹ پر تھی۔

ہم پورچ کے قریب پہنچے تو سامنے سے چند لوگ باہر آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا۔ انہی کے درمیان ایک سوٹ پہنے ہوئے ادھیڑ عمر آدمی نے آ کر ہتک آمیز لہجے میں پوچھا۔

''کیوں ملنا ہے پریم ناتھ جی سے، اپائنٹمنٹ لی ہے یا ایسے ہی منہ اٹھا کر چلے آئے ہو؟''

''انہوں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ میں جب چاہے ان سے مل لوں، ہم نے ان سے نوکری......'' نوجوان نے لجالت سے کہا۔

''اچھا یہیں رُک، میں پوچھتا ہوں۔'' اس نے اسی طرح ہتک آمیز لہجے میں کہا اور واپس مڑ گیا۔
نوجوان نے بہت پتے کی بات کی تھی۔ ایسے کرائم گینگ والوں کو ہر دم نئے لڑکوں کی ضرورت رہتی ہے۔ لڑکے بھی مختلف انداز میں ان گینگ میں شامل ہونے کی کوشش کرتے ہیں، جن کا انڈر ورلڈ میں نام بول رہا ہوتا ہے۔ یہی نئی بھرتی ان کی طاقت ہوتی ہے۔ گینگ والے جیسا چاہیں انہیں استعمال کرتے ہیں۔ توقع کے مطابق ذرا سی دیر میں وہ ادھیڑ عمر باہر آ گیا۔ اس نے آتے ہی اسی ہتک آمیز لہجے میں کہا۔
''اِدھر کھڑے ہو جاؤ، ابھی صاحب نے کہیں جانا ہے، تمہاری بات ہو جائے گی۔''
ہم اس وقت پورچ کے پاس تھے۔ سامنے دروازہ تھا، جس سے پریم ناتھ نے آنا تھا۔ چار قدم اور تین سیڑھیاں ہماری راہ میں تھیں۔ میں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں اس نوجوان کی طرف دیکھا اور اس طرح ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے کہ وہ دروازہ ہمارے بالکل سامنے تھا۔ اس وقت تک میں بھانپ چکا تھا کہ میں نے کیا کرنا ہے اور وہ اس نوجوان کے ساتھ کیا کریں گے۔ گیٹ کے پاس بانیتا انتظار میں تھی۔ وہ چند منٹ بہت جان لیوا تھے۔ اتنے میں ایک سیاہ چمچماتی ہوئی کار پورچ کی طرف آئی، اسی لمحے اندر کا دروازہ کھلا اور ایک کالے رنگ کا پتلا سا شخص باہر آنے کے لیے دروازے ہی میں تھا۔ اس کا سر گنجا تھا، سفید کوٹ پینٹ اور سنہری کمانی دار عینک لگائے ہوئے تھا۔ اس نے ہماری طرف دیکھا اسے دیکھتے ہی گن مین الرٹ ہو گئے۔ میں نے اپنے ہی پیروں پر چھلانگ لگائی، ایک گن والا میری نگاہ میں تھا، اس کی گن چھینتا ہوا پریم ناتھ پر جا پڑا۔ کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی اتنا بڑا حوصلہ کرے گا۔ میں نے بائیں بازو سے اس کی گردن دبوچ لی اور اسے دھکیل کر پیچھے کمرے میں لے گیا۔ سیکورٹی والوں کی ساری توجہ میری طرف تھی۔ اسی لمحے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نوجوان ایک دم سے پیچھے ہٹا۔ اس نے ایک گن مین کی گن چھین کر ان پر تان لی۔
''خبردار، کوئی ہلا تو۔'' میں نے شیشے میں سے باہر دیکھتے ہوئے زوردار آواز میں کہا۔
نوجوان نے اس وقت فائر کر دیا۔ یہ باہر والوں کے لیے الرٹ تھا۔ اس کے ساتھ ہی دائیں طرف سے ایک دم فائرنگ ہونے لگی۔ سیکورٹی والے اس طرف دیکھنے لگے تبھی اس نوجوان کے پیچھے کھڑے لڑکے نے ایک گن پر ہاتھ مارا اور گن قابو میں کرتے ہی ان پر تان لی۔
''پیچھے ہٹ جاؤ۔'' اس نوجوان نے کہا۔
اسی لمحے گیٹ پر زوردار فائرنگ ہوئی۔ مجھے معلوم تھا کہ بانیتا پیچھے نہیں رہنے والی۔ وہ کار میں پورچ تک آن پہنچی۔ تبھی پریم ناتھ نے گھگیائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
''کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟''
''میری بات مانو گے تو ماروں گا نہیں۔ تعاون کرو گے تو کام آؤں گا، چلو۔'' یہ کہہ کر میں نے اسے آگے بڑھایا تو سیکورٹی والوں نے گنیں تان لیں۔ تبھی بانیتا ریوالور تان کر کھڑی ہو گئی۔
''پیچھے ہٹ کر گنیں پھینک دو، اگر اپنی زندگی چاہتے ہو تو، پورا لشکر ہے، کوئی زندہ نہیں بچے گا۔'' اس نے نفرت اور غصے میں کچھ یوں کہا کہ پریم ناتھ تیزی سے بولا۔
''کوئی فائر نہیں کرے گا۔''
میں اسے دھکیلتے ہوئے اندر کی جانب لے گیا۔
''تیرے پاس صرف تین منٹ ہیں، میرے دس ملین ڈالر دے دو، ایک بھی بلٹ نہیں چلاؤں گا اور چلا جاؤں گا، دوسری صورت میں......'' میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔
''تم؟'' اس نے شدت حیرت سے میری طرف یوں دیکھا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ تب میں نے سرد لہجے میں کہا۔
''وقت شروع ہو گیا ہے۔''

اسی لمحے اندر سے ایک بندہ نمودار ہوا، اس نے فائر کرنا چاہا، میں نے اس کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔

''مجھے اوپر کمرے تک جانا ہوگا۔''

''آدھا منٹ گزر چکا ہے۔'' میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا تو وہی ادھیڑ عمر شخص جلدی سے اندر کی طرف گیا، ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ایک بریف کیس لے آیا، اس نے جلدی سے کھول کر دکھایا، اس میں نوٹ تھے۔

''کم ہوئے تو میں دوبارہ وصول لوں گا۔ اب چلو، باہر تک ہمیں چھوڑ کے آؤ۔'' میں نے کہا تو وہ ایک دم سے ہچکچا گیا۔ اس ہچکچاہٹ میں خوف تھا۔

''تمہیں رقم مل گئی تم جاؤ۔'' اس نے کہا۔

''مگر مجھے تم سے کچھ باتیں بھی کرنی ہیں اور تجھے اپنی سیکورٹی کے لیے کچھ ٹپس بھی دینا چاہتا ہوں، اگر تم زندہ رہے، میرے ساتھ تعاون کرو گے تو......'' میں نے کہا تو فوراً بولا۔

''چلو۔''

میں اس کے ساتھ باہر کی جانب آیا تو باہر بہت سارے لوگوں نے ایک دوسرے پر گنیں تانی ہوئی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے وہ بھی ٹھٹک گیا۔

''کتنا خون خرابہ ہو سکتا ہے۔ دیکھ رہے ہو؟''

میرے یوں کہنے پر اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا تو اس کے باڈی گارڈوں نے گنیں جھکا دیں۔ ہم آگے بڑھے۔ میں نے اُسے بانیتا والی کار میں بٹھایا اور کار چل پڑی۔ ہم جیسے ہی گیٹ کے باہر گئے۔ کاروں کا قافلہ آگے پیچھے ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے بندے ہمارا پیچھا کریں گے۔ اس لیے میں نے کہا۔

''میرا وعدہ ہے کہ میں تجھے کچھ نہیں کہوں گا۔ اپنے بندوں کو ہٹ جانے کا کہو، ورنہ......'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ اس نے فون نکالا اور انہیں رک جانے کا کہہ دیا۔ کافی دور نکل آنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

''تم کس کے ماتحت کام کرتے ہو، نام بتاؤ اور جاؤ، تیرا کام ختم، یہ بات ہمارے درمیان رہے گی۔''

''رامیش پانڈے۔'' اس نے چند لمحے سوچنے کے بعد سکون سے کہا۔

''گاڑی روکو۔'' میں نے ڈرائیور سے کہا تو گاڑی رک گئی۔ میں اسے ٹٹول چکا تھا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ ''صرف ایک بات دھیان میں رکھو، موت کے منہ میں چھلانگ لگانا کوئی معمولی بات نہیں، لیکن اسی میں ہی سب سے کم خطرہ ہے، صرف حوصلہ چاہیئے۔ ورنہ ہزار پلان دھرے رہ جاتے ہیں۔ جاؤ۔''

میں نے اسے جانے دیا۔ ڈرائیور سمجھتا تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ وہ نکل گیا۔ ایک کراس پر ہم نے گاڑی چھوڑ دی۔ میں اور بانیتا جانی بھائی والے لڑکوں کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں اب ان کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ مجھے کہاں لے جاتے۔ وہ ہمیں جوہو والے بنگلے کے آگے چھوڑ کر نکل گئے۔ اس سارے معاملے میں چار گھنٹے سے زیادہ وقت لگ گیا تھا۔ میں نے بریف کیس جانی بھائی کے لڑکوں کو دے دیا تھا۔ ہم اندر گئے تو سبھی ڈرائنگ روم میں تھے۔ ہمیں دیکھ کر ان کی سانس میں سانس آئی۔

''یہ دیکھ، قتل اور ڈکیتی کی واردات، یہی ہے نا وہ بندہ؟'' ہماری بات سن کر سندو نے ٹی وی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جوش میں کہا۔

''ہاں یہی ہے۔'' بانیتا نے کہا

''مان گئے استاد، یار تو اتنا حوصلہ کیسے کر لیتا ہے؟'' سندو نے جوش بھرے لہجے میں حیرت سے پوچھا۔

''دیکھ، موت کا ایک وقت مقرر ہے، اسے جب، جہاں اور جس وقت آنی ہے سو آنی ہے اور پھر جو انسانیت کا دشمن ہے، وہ قابل رحم نہیں۔ اس نے میرے ساتھ تعاون کیا، میں نے اسے چھوڑ دیا۔ میں اسے مار بھی سکتا تھا۔'' میں نے سکون سے کہا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ رونیت کور بتائے گی۔'' میں رونیت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مطلب؟''اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔
''مطلب، رامیش پانڈے، اسے ٹریس کرو، پھر پلان کرتے ہیں۔'' میں نے کہا ہی تھا کہ جانی بھائی کا فون آگیا
''بڑو تم تو استادوں کا استاد نکلا رے، لڑکا لوگ تم سے امپریس ہوگیا یار۔'' اس نے چہکتے ہوئے کہا۔
''بس جانی بھائی، کام تو پھر کام ہی ہوتا ہے نا۔'' میں نے بھی خوشگوار موڈ میں کہا
''ارے تیرا سٹائل ان لڑکا لوگن نے ایسا بتایا، دل خوس ہوگیا رے۔ پن یہ تو نے ڈالر کیوں بھیجا؟''
''یہ دیکھنے کو کہ اصلی ہے یا نقلی، اور پھر لڑکوں نے بھی محنت کی ہے نا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
''ہے تو اصلی، پن ابھی مارکیٹ میں لے جانے کا نہیں، میری بات سمزتا ہے نا، لڑکا لوگ کو میں نے خوس کر دیا، ڈونٹ وری۔'' اس نے چہکتے ہوئے کہا۔
''اچھا کیا، یہ تیرا کام ہے جو مرضی کر۔''
''یار ایسن کر ادھر میرے پاس آجا، بڑو اکٹھا ممبئی پر راج کریں گے۔ چل ففٹی ففٹی پر بات کر۔'' جانی بھائی نے بڑے موڈ میں کہا۔
''نہیں جانی بھائی، میں کسی اور منزل کا راہی ہوں۔ تو بول، تیرا کوئی کام ہے تو......'' میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔
''ارے نائیں، کوئی پلان ہو تو بتانا بڑو، چل رکھتا ہوں۔'' اس نے کہا تو میں نے بھی فون بند کر دیا۔
ہم ساری رات نہیں سوئے تھے۔ رات کے دو بجے کے قریب جب رونیت نے بتایا
''اس وقت رامیش پانڈے گوا میں ہے اور وہاں پر اپنی فیملی کے ساتھ ہے۔ سرکاری معلومات کے مطابق وہاں پر وہ چھٹی گزارنے گیا ہے۔ تین دن کا ٹور ہے، ایک دن ہوگیا ہے، ابھی دو دن باقی ہیں۔''
''تو پھر نکلتے ہیں۔'' سندو نے فیصلہ سنا دیا
''پہلے پوری معلومات لو، پھر نکلنا، وہ سڑک چھاپ یا گینگ چلانے والا غنڈہ نہیں ہے، سرکاری پروٹوکول کے ساتھ ہوگا۔'' ہرپال ہنستے ہوئے بولا۔
''پر وہ ہے تو انسان ہی نا، یہاں ممبئی میں وہ زیادہ طاقتور ہوگا۔'' سندو نے اپنی رائے دی تو رونیت بولی۔
''بات یہ نہیں کہ وہ کتنا طاقت ور ہے یا کمزور، بات صرف معلومات کی ہے۔ تم یہ کیوں نہیں سمجھتے ہو کہ جس کے پاس زیادہ معلومات ہوگی وہ اتنا ہی طاقتور ہوتا ہے۔ وہ یہاں ہے یا وہاں، ہمیں رستہ کہاں سے ملتا ہے؟''
''تو ٹھیک ہے نا، آج اور ابھی نکلتے ہیں گوا، اپنی گاڑیوں میں نکلیں گے تو دس گھنٹے کا راستہ ہے، جہاز سے جاؤ گے تو ایک گھنٹے کا، وہاں جا کر لوکیشن دیکھتے ہیں، دو دن میں کچھ نہ کچھ تو معلومات ملیں گی۔ میرا ایک دوست ہے وہاں۔''
''ٹھیک ہے، تو پھر نکلتے ہیں۔'' میں نے کہا۔
''ایک بات کہوں اگر برا نہ مانو تو؟'' سندو نے میری طرف دیکھ کر کہا تو سب نے اس کی طرف دیکھا
''بولو۔'' میں نے سکون سے کہا۔
''یار یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دو، تم ادھر ممبئی میں رہو۔ ہم دیکھتے ہیں اُسے۔'' اس نے یوں کہا جیسے وہ کچھ کرنا چاہتا ہو۔ ممکن ہے یہاں پر وہ اپنے آپ کو ایک فالتو شے تصور کر رہا ہو۔ وہ یہاں رہ کر سوائے خالی دعوؤں کے اور کچھ نہیں کر سکا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کے اندر کا مرد یہ برداشت نہ کر رہا ہو وہ ناکارہ ہو چکا ہے۔ وہ خود کو ثابت کرنا چاہتا ہو کہ اب بھی وہ سندو ہی ہے۔ میں نے چند لمحے سوچا اور مسکراتے ہوئے کہا
''ٹھیک ہے، اپنی ٹیم بنا لو اور نکل جاؤ۔''
وہ ایک دم جوش سے بھر گیا۔
''تم اور بانیتا ادھر رہو، باقی ہم سب جاتے ہیں۔'' اس نے کہا تو مجھے یاد آیا، تبھی میں نے پوچھا۔
''وہ گربا ج نے کچھ بتایا یا ابھی تک بے ہوش ہی پڑا ہے؟''
''نہیں وہ ہے تو ہوش میں، لیکن کچھ بتا نہیں پا رہا مجھے

لگتا ہے، اب اس کا کوئی فائدہ نہیں۔'' ابھیت نے بتاتے ہوئے اپنی رائے دی۔

''چل اسے تو دیکھتے ہیں، اگر ناکارہ ہے تو پھینک دیتے ہیں اسے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے سندو کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''تب تک سندو تم اپنے دوست کو تلاش کر لو جو مدد کر سکتا ہے یا پھر کوئی دوسرا تلاش کرنا ہوگا؟''

''او کے۔'' سندو نے کہا تو میں، ابھیت اور جسپال کے ساتھ نیچے تہ خانے کی طرف چل دیئے۔

گرباج فرش پر دہرا ہوا پڑا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ گیا۔ اس کے اٹھنے کی کیفیت کو دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ اس پر بہت تشدد ہو چکا ہے۔ میں اس کے پاس جا کر فرش پر بیٹھا اور اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ چند منٹ میری طرف دیکھتا رہا، پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''تم لوگ مجھے مار کیوں نہیں دیتے ہو؟''

''اس لیے کہ تمہیں مار کر ہمیں کچھ حاصل ہونے والا نہیں، بلکہ جو تمہیں معلوم ہے وہ بتا دو۔'' میں نے اس کے چہرے پر لگے زخم پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ تم لوگ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو، جو مجھے پتہ تھا وہ میں نے سب بتا دیا۔'' اس نے رو دینے والے انداز میں کہا

''لیکن ہمارے مطلب کی تم نے ایک بھی بات نہیں بتائی۔'' میں نے تحمل سے کہا۔

''میں کیسے اور کیا بتاؤں کہ تمہیں میری بات پر یقین آ جائے، میں شروع سے بتا سکتا ہوں کہ میں کیسے اس گیم میں آیا، اس میں سے تم جو چاہو پوچھ لو۔'' وہ روہانسا ہوتے ہوئے بولا۔

''یہ پھر ایک نئی کہانی سنائے گا۔'' جسپال نے کہا۔

''نہیں میں پوری بات بتاؤں گا، جو بالکل سچ ہوگی۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''چل ٹھیک ہے سنا۔'' میں نے کہا اور فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ کہنے لگا

''میں کینیڈا میں رئیل اسٹیٹ کا چھوٹا موٹا کام کرتا تھا، لیکن میری ہر دم یہی کوشش ہوتی تھی کہ راتوں رات امیر بن جاؤں۔ اس لیے میں ہر طرح کا دھندہ بھی کر لیتا تھا۔ ایسے ہی ایک دن میرے دوست نے مجھے ایک ادھیڑ عمر شخص سے ملوایا کہ اسے بھارت میں کسی کام کے لیے کچھ بندے چاہئیں۔ میں اسے ٹورنٹو ہی میں ملا تھا۔''

''کام کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی بتا رہا ہوں نا'' یہ کہہ کر وہ چند لمحے رکا پھر کہتا چلا گیا ''اس نے سندیپ اگروال یعنی سندو کو اغوا کرانے میں مدد دینے اور اس کی گرل فرینڈ نیہا اگروال کو اپنی محبت کے جال میں پھنسانے کا کام دیا۔ دونوں کام زبردست تھے۔ یہ کام مجھے میری شکل صورت دیکھ کر نہیں بلکہ انڈین اور پنجابی ہونے کی وجہ سے ملا۔ اس میں ڈالروں کی بہتات کے علاوہ ایک فلم ایکٹرس کے ساتھ وقت گزارنے کا چانس بھی تھا۔ میں نے فوراً ہاں کر دی۔ ہمارے ساتھ سات آٹھ مزید لوگ تھے۔ انہیں ایسے ہی مختلف لوگوں کے اغوا میں مدد دینا تھی۔ اغوا کرنے والے کون لوگ تھے، یہ ہمیں نہیں بتایا گیا۔ میں چند دن کے بعد ہی بھارت آ گیا۔''

''یہاں آ کر تو نے جو کچھ کیا، سندو کو اغوا کرا دیا۔'' جسپال نے تیزی سے کہا۔

''میں نے پوری محنت کی تھی اور ان کا جو کام تھا وہ پورا کر دیا۔ میں نے بڑا محتاط پلان بنایا تھا۔ صرف میں نے لالچ یہ کیا کہ سندو کی دولت سمیٹنا چاہی۔ وہ بھی میں نے سمیٹ لی تھی۔ اب صرف نیہا کو قتل کر دینا تھا کہ ساری کہانی وہیں دب جائے اور جسپال نے مجھے پکڑ لیا۔''

''تم نے آزاد سے بات کی تھی، کیا یہ وہی شخص تھا جس نے تم سے کینیڈا میں ڈیل کی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، وہ کوئی دوسرا شخص تھا۔ لیکن بھارت میں آ کر اسی سے رابطے میں تھے۔ اس دوران ہی مجھے معلوم ہوا کہ وہ سب لوگوں کو ایک جزیرے پر اکٹھا کر رہا ہے۔ اب اس

کا نمبر بند ہے۔''اس نے روہانسا ہو کر کہا۔
''اچھا چلو ٹھیک ہے، اب اگر ہم تمہیں چھوڑ دیں تو پھر تم کیا کرو گے؟ ظاہر ہے ہمارے کام تو نہیں آؤ گے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا۔
''میں ہمیشہ کے لیے اس زندگی سے توبہ کرلوں گا اور واپس کینیڈا چلا جاؤں گا۔ میں نے بہت سزا پالی۔''اس نے منت بھرے لہجے میں کہا۔
''اوکے، دیکھتے ہیں تمہارے ساتھ کیا کرتے ہیں۔'' میں نے کہا اور اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ اوپر ڈرائننگ روم میں آ کر میں نے جسپال سے پوچھا۔
''کیا خیال ہے تمہارا؟''
''مجھے نہیں لگتا کہ وہ اب بھی صحیح بات کر رہا ہے۔''
''اور ابھیت تم کیا کہتے ہو؟''
''نہیں، جو اس نے کہنا تھا کہہ دیا، پتہ نہیں کتنی بار پوچھا، وہ یہی جواب دے رہا ہے۔ اس پر مزید محنت فضول ہے۔''اُس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
''ٹھیک ہے اب اسے میں دیکھتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ تو سندو نے پوچھا۔
''تمہارے خیال میں کوئی معاملہ ہے۔''
''پتہ نہیں، ویسے تو یہ بیکار ہی ہے، ایک کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔
''ٹھیک ہے دیکھ اسے، ہم تیار ہوتے ہیں۔''اس نے کہا اور اٹھ گیا۔ میں نے صوفے پر بیٹھی بانیتا کور کی طرف دیکھا۔ وہ یوں بیٹھی تھی جیسے نیند میں ہو۔ میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔
''کمرے میں جا کر سو جاؤ، یہاں کیوں بیٹھی ہو۔''
''تیرے انتظار میں، تُو مجھے یہاں سے اٹھا کر کمرے میں لے جاؤ اور مجھے سلا دو۔''اس نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے خمار آلود لہجے میں کہا۔
''چل۔'' میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے ایک دم سے کہا اور اسے اپنے بازوؤں پر اٹھا لیا۔ میرے یوں کرنے پر سبھی نے اپنے اپنے انداز میں تبصرہ کرنے لگے۔ میں اسے لے کر کمرے میں چلا گیا۔ اسے بیڈ پر لٹایا اور اس کے پہلو میں لیٹ گیا۔ مجھے اس کا وہ انداز یاد آ رہا تھا جب وہ مسلح لوگوں کے درمیان پسٹل تان کر کھڑی تھی۔ مجھے اس پر بہت پیار آیا۔
''بنتو!''میں نے ہولے سے کہا۔
''ہوں۔''اس نے نیند بھرے لہجے میں ہنکارا بھرا
''تم اتنی دلیری سے پسٹل تان کر کھڑی ہو گئی، تمہیں ذرا بھی ڈر نہیں لگا کہ سامنے اتنے لوگ اسلحہ تانے کھڑے ہیں۔''میں نے سرگوشی کے سے انداز میں پوچھا۔
''نہیں لگا۔''وہ آنکھیں بند کیے بولی۔
''کیوں؟''میں نے تیزی سے پوچھا۔
''اس لیے کہ تم اندر تھے، اور باتیں بند کرو اور خاموشی سے میرے ساتھ لیٹے رہو، مزے کی نیند آ رہی ہے۔'' اس نے کہا میں اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ جلد ہی سو گئی لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں کچھ دیر تک موجودہ حالات پر سوچتا رہا۔ ایک خیال آتے ہی میں نے جانی بھائی کا نمبر ملا دیا۔
''بول بڑو۔''اس نے چہکتے ہوئے کہا۔
''جانی بھائی کبھی تم نے چیل کو دیکھا ہے، جسے ہم گدھ کہتے ہیں؟''میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔
''ہاں دیکھا ہے، بڑا صبر ہوتا ہے اس میں، جب تک اس کا شکار مر نہیں جاتا، وہ اس پر نظر رکھتا ہے، چاہے، جتنے دن گزر جائیں۔''اس نے بھی میری بات کو سنجیدگی سے لیا تو میں نے کہا۔
''مجھے دو تین لڑکے ایسے ہی چاہئیں، بہت صبر والے مگر فل ڈرامہ باز۔''
''ہے نا، کب چاہئیں۔''اس نے پوچھا۔
''ابھی بھیج سکتے ہو تو ابھی، ورنہ کل رات کو۔''میں نے کہا تو وہ بولا۔
''میں دیکھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ سندو نے اپنی گاڑیوں پر نکلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس

وقت رات کا اندھیرا تھا جب وہ لوگ گو نکلنے کے لیے تیار تھے۔ وہ نکل گئے تو جانی بھائی کی طرف سے دو لڑکے آ گئے۔ انہوں نے مجھے دیکھا ہوا تھا۔ چونکہ ہرپال نے وہیں اس بنگلے میں رہنا تھا، اس لیے میں نے اسے ساتھ لیا اور ایک کمرے میں چلا گیا۔ ان تینوں کو گرباج کے بارے اچھی طرح بریف کرنے کے بعد، انہیں ایک پلان دیا کہ انہوں نے کرنا کیا ہے۔ وہ سمجھ گئے تو میں وہاں سے نکلا۔ سب تیار تھے۔ اس لیے انہوں نے اسی وقت اپنا کام شروع کر دیا۔

ان تینوں نے گرباج کو بے ہوش کیا۔ اسے تہہ خانے سے لا کر کار میں ڈالا اور نکل گئے۔ چرچ روڈ کے پاس ایشور لعل پارک اس وقت سنسان تھا۔ انہوں نے پوری احتیاط سے ادھر ادھر کا جائزہ لے کر تسلی کر کے پارک میں ایک جگہ کا انتخاب کیا۔ پھر اسے نکال کر ایک بینچ پر ڈال دیا۔ ہرپال انہیں وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ دونوں اس کے قریب بینچ کے پاس یوں لیٹ گئے جیسے رات سے یہیں پڑے ہوئے ہوں۔ شراب کی ایک خالی بوتل قریب ہی رکھ لی۔ بظاہر وہ سوئے ہوئے تھے۔ لیکن ان کی حالت سے لگ رہا تھا کہ انہوں بڑی پی ہوئی ہے۔ اب تک شراب کے خمار میں ہیں۔ ممبئی کے پارکوں، فٹ پاتھوں، اور ایسی جگہوں پر جہاں رات گذاری جا سکے، کئی موالی، بے روزگار، غریب غربا، رات گذارنے کو پڑے رہتے ہیں۔ انہوں نے بھی کچھ ایسا ہی کرنا تھا۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد گرباج کو ہوش آ گیا، وہ اٹھنے کی کوشش میں تھا لیکن نہیں اٹھ سکا۔ اس کے منہ سے زوردار کراہ نکل گئی۔ یہی وہ موقعہ تھا جب وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کا ڈرامہ شروع ہو گیا۔

''اے چھوٹے، کیا ہے رے، ایسا آواز کیوں نکالتا ہے، کچھ دُکھتا ہے؟'' اس کی آواز میں یوں خمار تھا جیسے نشے میں ہو، تبھی دوسرے نے بھی اسی نشیلی آواز میں جواب دیا

''ارے نہیں بڑے، میں کب بولا؟''

''تو پھر کون بولا؟'' وہ لیٹے لیٹے حیرت سے بولا۔

اس پر گرباج نے ان دونوں کی طرف دیکھا اور اونچی آواز میں انہیں مخاطب کرتے ہوئے کراہ کر کہا۔

''یار میں ہوں۔''

''ہائیں تو کون؟'' بڑے نے کہا اور اٹھ بیٹھا، چھوٹا بھی اٹھ گیا اور اکتائے ہوئے لہجے میں بولا

''یار یہ کیا مصیبت ہے، سونے بھی نہیں دیتے یہ لوگ، یہ کدھر سے ٹپکا رے۔''

بڑے نے آنکھیں ملتے ہوئے گرباج کو دیکھا، پھر الجھتے ہوئے نشیلی آواز میں اس سے پوچھا۔

''یار جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تو ادھر نہیں تھا، ہم نے ادھر بیٹھ کر بوتل خالی کیا۔ کیا تو اس وقت تھا ادھر؟''

''نہیں، تم میری مدد کرو، مجھے اٹھا دو۔'' گرباج نے منت بھرے لہجے میں کہا تو چھوٹا بولا۔

''ابے پڑا رہ، اٹھ کے کیا کرے گا، سو جا۔''

''نہیں، میں مصیبت میں ہوں، میری مدد کرو یار۔'' اس نے پھر اسی لہجے میں کہا۔

''پر ہمیں کیا فائدہ، اپنا تو نشہ ہرن کر دیا نا۔'' چھوٹے نے اکتاہٹ سے کہا تو وہ انہیں لالچ دیتے ہوئے بولا۔

''دیکھو۔ میری مدد کرو گے نا تو مالا مال کر دوں گا۔''

''دیکھ بڑے کیا ہے اس کے پاس، وہ تو لے۔'' چھوٹے نے یوں کہا جیسے وہ لوٹنے کے چکر میں ہو۔

''دیکھو اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے، مجھے اغوا کیا گیا تھا، مجھے کسی ٹھکانے لگا دو تو میں تم دونوں کو بہت دوں گا۔'' اس نے کہا۔

''کیا لفڑا ہے تیرے ساتھ؟'' بڑے نے پوچھا۔

''یار میں سب بتا دوں گا۔ مجھے کسی محفوظ جگہ لے چلو، میرا یقین کرو، ایک فون کال کروں گا، تو جتنے چاہے گا اتنے پیسے دوں گا۔'' گرباج نے پھر منت کی تو بڑے نے چند لمحے سوچنے کی ایکٹنگ کی پھر اسے پکڑ کر بٹھا دیا۔ اس نے تھوڑی دیر چاروں طرف دیکھتے رہنے کے بعد پوچھا ''فون ہے تیرے پاس؟''

''نہیں تو، اپن کہاں رکھتا ہے۔''
''کوئی محفوظ جگہ ہے۔'' اس نے پوچھا۔
''ایک کھولی ہے۔'' بڑے نے کہا تو گرباج چونک گیا، تبھی اس نے تیزی سے پوچھا۔
''یہ کونسی جگہ ہے؟ میں کہاں ہوں؟''
''تو ممبئی میں جوہو کے ایشور لعل پارک میں ہے، کیسی بات کرتا رے تو۔'' جیسے ہی بڑے نے کہا تو وہ چونک گیا، اس میں جیسے جان آ گئی۔
''سچ کہتے ہو میں ممبئی میں ہوں۔'' اس نے تصدیق کی تو بڑے نے دوبارہ دہرا دیا۔
''تو مجھے اس کھولی ہی میں لے چل۔ دوپہر سے پہلے چلا جاؤں گا، مالا مال کر دوں گا۔ تو چل لے چل مجھے، کتنی دور ہے؟'' اس نے یوں تیزی سے پوچھا جیسے بے صبرا ہو رہا ہو۔
''تھوڑا دور ہے۔ ٹیکسی رکشہ تو لینا پڑے گا۔'' بڑے نے کہا تو گرباج نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ اسے جیب سے چند نوٹ مل گئے۔ اس نے وہ بڑے کو دے دیئے۔ دونوں نے مل کر گرباج کو اٹھایا اور اسے لے کر پارک کے باہر چل دیئے۔ اس میں جوش بھر گیا تھا۔
دن کی روشنی پھیل رہی تھی، جب وہ اسے گھو کھلے روڈ پر واقع ایک چال میں لے آئے جو سریش کالونی کی بیک سائیڈ پر ایک بڑی عمارت تھی۔ کم آمدنی والوں کے لیے ممبئی میں ایسی کئی عمارتیں ہیں، جن کے کمرے ڈربہ نما اور ان میں انسان پرندوں کی مانند رہتے ہیں۔ دوسری منزل پر ایک کمرہ نما کھولی تھی۔ اس میں انہوں نے گرباج کو لا ڈالا۔ چھوٹا اس کے پاس لیٹ گیا اور بڑا باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک فون تھا۔
''دیکھ میں فون ادھر بھائی سے مانگ لے کر آیا، تو کال کر لے، چائے لائے گا نا لڑکا تو فون واپس کرنے کا ہے، اسے پیسہ بھی دینا ہے کال کا۔'' بڑے نے اسے فون تھماتے ہوئے کہا۔
گرباج نے فون پکڑ کر تیزی سے نمبر ڈائل کیے۔ تھوڑی دیر تک بات کرتا رہا تو اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ فون واپس لوٹانے سے پہلے، اس نے ڈائل کیا ہوا نمبر صاف کر کے فون بڑے کو دے دیا۔
''یہ فون واپس کر دے اور چائے لے آ، پھر نکلتے ہیں۔'' اس کا لہجہ ہی بدلا ہوا تھا۔ جسے چھوٹے اور بڑے نے بہت محسوس کیا۔ بڑے نے فون واپس لیا تو چھوٹے نے پوچھا۔
''ابے کہاں نکلنا ہے، تیرے کو لینے کوئی نہیں آئے گا کیا، تو بھی اپنے جیسا پنٹر ہے؟''
''اونہیں یار، تم تو شک ہی کرتے چلے جا رہے ہو، ہم یہاں سے ایک جگہ جائیں گے، وہاں میں تم کو پیسہ دوں اور بات ختم۔'' گرباج نے کہا۔
''وہاں جا کر ٹیکسی کا کرایہ بھی ہم کو دینا پڑے، ادھر جا کر بولے گا کہ ہم بھاگ جائیں، کوئی پیسہ نہیں۔'' چھوٹے نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
''نہیں یار ایسا نہیں ہوگا، میرا یقین کرو۔'' یہ کہہ کر اس نے بڑے سے کہا،'' جا یار اگر چائے ملتی ہے تو ٹھیک، ورنہ وہیں چل کر پیتے ہیں۔''
''چائے تو آئے گی، ادھر چل کے دوبارہ پی لیں گے۔'' بڑے نے کہا اور باہر نکل گیا۔ بڑے کے واپس آنے سے پہلے ہی لڑکا چائے دے گیا۔ انہوں نے چائے پی اور وہ دونوں اسے پکڑ کر کھولی سے نکلے اور اسے نیچے لے آئے۔ اسی طرح وہ سڑک تک آئے، وہیں سے انہیں ٹیکسی ملی۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر اس نے ڈرائیور سے کہا۔
''آزاد نگر چلو۔''
''آزاد نگر، کہاں پر؟'' ڈرائیور نے پوچھا۔
''ویرا ڈیسائی روڈ کے ساتھ ہی اندر بلڈنگ میں جانا ہے۔'' گرباج نے کہا تو ٹیکسی چل دی۔
تقریباً آدھے گھنٹے میں وہ آزاد نگر پہنچ گئے۔ ان دونوں نے اندازہ لگا لیا کہ گرباج نے وہ جگہ نہیں دیکھی ہوئی۔ کچھ دیر کے بعد وہ ایک بلڈنگ سامنے آ رکے۔ باہر

ہی ایک آدمی کھڑا تھا۔ وہ صورت حال بھانپ کر آگے بڑھا۔ اس نے گرباج کو غور سے دیکھا اور اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

''گرباج سنگھ؟''

اس پر اس نے اثبات میں سر ہلایا تو اس شخص نے اپنا والٹ نکال کر ٹیکسی والے کو فارغ کیا۔ اس دوران وہ دونوں گرباج کو سہارا دیئے کھڑے رہے۔ وہ پلٹا تو انہیں آنے کا اشارہ کر کے آگے بڑھا۔ چاروں لفٹ سے چوتھی منزل تک گئے۔ پھر ایک اپارٹمنٹ میں انہیں لے جایا گیا۔ وہ کافی سجا ہوا تھا۔ ایک لڑکی ان کی منتظر تھی۔ گرباج کو صوفے پر لٹا دیا گیا تو دونوں نے کھڑے کھڑے ہی اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''لے بڑو، ہم نے تجھے ٹھکانے پر چھوڑ دیا، اب ہم جاتے ہیں۔'' چھوٹے نے کہا تو وہ اجنبی شخص بولا۔

''یار تم اتنے اچھے ہو، ہمارے دوست کو ہم تک پہنچا دیا، ابھی بیٹھو، چائے وائے پیو، پھر چلے جانا۔'' یہ کہتے ہوئے اس اجنبی شخص نے انہیں ہاتھ سے پکڑ کر سامنے دھرے صوفے پر بیٹھا دیا

''میں نے ان دونوں کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ انہیں ڈھیر سارے پیسے دوں گا......'' گرباج نے کہنا چاہا تو وہ شخص بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''یار یہ ہمارے محسن ہیں، ابھی چلے جائیں گے، خوش کر دیں گے انہیں، تم بتاؤ، یہاں کیسے؟''

''مجھے نہیں معلوم، میں تو چندی گڑھ میں تھا، وہ لوگ کب مجھے یہاں ممبئی میں لے آئے، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، یہ تو ان لوگوں نے مجھے بتایا کہ میں ممبئی میں ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے پارک سے اب تک کی روداد سنا دی۔ وہ شخص غور سے سنتا رہا۔ اس دوران چائے آ گئی۔ ایسے میں ایک ڈاکٹر اور نرس بھی وہیں آ گئے۔ انہوں نے کافی دیر تک پوری تسلی کرنے کے بعد کہا۔

''کافی تشدد ہوا ہے۔ یہ غنیمت ہے کہ کوئی ہڈی فریکچر نہیں ہے۔ میں انہیں فوری طور پر سفر کرنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ بہت ضروری ہے تو ایک دو دن بعد تک، اتنے میں یہ کافی سنبھل جائیں گے۔''

نرس بیگ سے دوائیاں نکال کر رکھ چکی تو ڈاکٹر واپس جانے کے لیے پلٹا تو نرس بھی چلی گئی۔ اس سے انہیں یوں لگا کہ جیسے گرباج کی آمد کے ساتھ ہی ڈاکٹر کو بلا لیا گیا تھا۔ وہ جا چکے تو اس شخص نے چند بڑے نوٹ نکال کر انہیں دے دیئے۔ تبھی اس شخص نے کہا۔

''دیکھو، تمہیں ایک دو دن لگ جائیں گے یہاں۔ ابھی تم شاید ہی کینیڈا کا سفر کر سکو۔ میری تو مصروفیت رہتی ہے، اگر تمہارے یہ دوست تمہاری دیکھ بھال کر سکیں تو اس کے الگ پیسے دے دیں گے۔''

''نہیں، ہم نے جانا ہے، ادھر رہنے کا نہیں، ہم تمہارے لفڑے میں نہیں آتے۔'' چھوٹے نے تیزی سے کہا اور اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ بڑا بھی اٹھ گیا۔

''ابھی میں مزید پیسے دیتا ہوں، تم جا کر نئے کپڑے خرید لو، یا میرے یہاں سے لے لو، شام تک تو رہو، کھانا وانا کھاؤ، پھر چلے جانا۔''

''نہیں تم کوئی لمبے لفڑے والا لگتا ہے، ہم تیرے لفڑے میں نہیں آتے، اپن کو جانے کا ہے۔'' بڑے نے کچھ اس انداز سے کہا جیسے وہ بہت ڈر گیا ہو۔ وہ دونوں وہاں رہنے کو نہیں مانے۔ گرباج اور اس شخص کو جب یہ یقین ہو گیا کہ یہ عام سے ٹپوری قسم کے شرابی ہیں۔ اس لیے انہوں نے ان دونوں کو جانے کی اجازت دے دی۔

وہ دونوں واپس کھولی میں چلے گئے اور یہ ساری روداد انہوں نے مجھے دوپہر کے بعد فون پر وہیں سے دی۔ میں نے انہیں کھولی ہی میں رکنے کا کہہ دیا۔



جسپال کے ساتھ سارے لوگ سہ پہر کے قریب گوا پہنچ گئے۔ سندو نے وہاں اپنی طرز کے بندے تلاش کر لیے تھے۔ اس نے روڈ کے ذریعے جانے کو اسی لیے ترجیح دی تھی کہ اس دوران وہ گوا میں مدد کے لیے لوگ تلاش کر سکے۔ فرنینڈس ایک چھوٹا گینگ چلاتا تھا۔ اس کا زیادہ

کام منشیات کی فروخت تھا، اس کے ساتھ ساتھ وہ غیر ملکی لوگوں کو لوٹ بھی لیا کرتا تھا۔ سمندر کے ذریعے اسلحہ لانے لے جانے کا ماہر تھا۔ سندو کو کام کا آدمی مل گیا تھا۔ جس وقت وہ گوا پہنچے انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ رامیش پانڈے کس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ عالمی چین والا وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل تھا۔ انہوں نے وہیں کمرے لیے اور رامیش پانڈے کے بارے اپنے کام کی ابتدا کر دی۔ رات گئے تک وہ پوری طرح تیار ہو کر پلان بنا چکے تھے کہ انہوں نے کیا کرنا ہے اور رامیش پانڈے سے نپٹنے کے بعد وہاں سے نکلنا کیسے ہے۔

سورج نکل آیا تھا۔ ہوٹل کی کھڑکی سے ساحل سمندر کا منظر بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ بہت سارے لوگ اس وقت ساحل پر تھے۔ جسپال نے رامیش پانڈے کو پہلی بار اسی صبح ساحل سمندر پر دیکھا۔ وہ ادھیڑ عمر، فربہ مائل اور ناٹے قد کا تھا۔ اگرچہ اس نے اسے تصویروں میں دیکھ لیا تھا لیکن اس وقت ذرا مختلف لگا۔ اس کے ساتھ اس کی موٹی اور گورے رنگ کی بیوی، دو لڑکپن عمر کی بیٹیاں اور ایک چھوٹا بیٹا تھا۔ ان سے ذرا فاصلے پر چند سیکورٹی گارڈ ٹہل رہے تھے۔ ان کا انداز واک کرنے والا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ سیکورٹی کا کوئی اور دائرہ بھی ہو، لیکن فی الحال سامنے پانچ چھ بندے ہی دکھائی دے رہے تھے۔

اس وقت جسپال ہوٹل کے ایک ایسے کمرے میں تھا جہاں سے ساحل سمندر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کسی اور جوڑے کا کمرہ تھا جو اس وقت بے ہوشی کی حالت میں بیڈ کے نیچے پڑے ہوئے تھے۔ وہ اس کمرے کی کھڑکی میں کھڑا دوربین سے رامیش پانڈے اور اس کی فیملی کو دیکھ رہا تھا۔ رونیت کور اس کے پاس کھڑی تھی۔ سندو، ابھیت اور فرینڈس کے لوگ ساحل سمندر پر اسی کے قریب ہی تھے۔ تبھی جسپال نے رامیش پانڈے کو روہی کی مدد سے فون کال ملائی۔ جس کا ریکارڈ کہیں نہیں ہوتا تھا۔ رامیش نے حیرت سے بجتے ہوئے فون کی اسکرین

حکمت

ایک دفعہ اکبر بادشاہ کو سرِ راہ کوئی اس کا بچپن کا دوست مل گیا۔ جب اس کے دوست کو یہ معلوم ہوا کہ اس کا دوست اکبر بادشاہ ہو گیا ہے تو اس نے اکبر بادشاہ سے اپنی کسی ضرورت کا اظہار کیا تو اکبر بادشاہ نے کہا کہ تم میرے محل میں آجانا جب وہ غریب دوست اس کے محل میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کا دوست اکبر بادشاہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اللہ تعالیٰ سے کچھ طلب کر رہا ہے۔ تو وہ الٹے پاؤں یہ کہتا ہوا واپس چلا گیا کہ جب اکبر بادشاہ ہو کر اس سے مانگ رہا ہے جس سے سب طلب کرتے ہیں تو ہم اللہ تعالیٰ سے کیوں نہ مانگیں۔ جو اللہ اس کو بادشاہ بنا سکتا ہے وہ مجھے بھی عطا کر سکتا ہے۔

(مرسلہ: **سعید حسن آفریدی**...... کراچی)

کو دیکھا، پھر کان سے لگا کر ہیلو کہا۔ اسپیکر آن تھا۔ جسپال نے فون رونیت کور کو تھماتے ہوئے کہا۔

"رامیش پانڈے، میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو اور میں تجھے مارنا بھی نہیں چاہتا، صرف چند سوال کا جواب نہیں، تصدیق چاہتا ہوں۔"

رامیش سمجھدار بندہ تھا۔ اس نے فوری ری ایکٹ نہیں کیا، بلکہ بڑے تحمل سے بولا۔

"تم کون ہو، کیا یہ نہیں جانتے کہ مجھے دھمکی دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔"

اس پر جسپال نے اُسے جواب نہیں دیا بلکہ سائلینسر لگی گن کو سیدھا کیا، ٹیلی اسکوپ سے اس کے بیٹے کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بڑے سے رنگین بال کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ کمرے میں ہلکی سی آواز گونجی لیکن وہاں ساحل پر ایک دم سے اُن کے درمیان خوف پھیل گیا۔ اس کے گارڈ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ایک دم سے الرٹ ہو گئے۔ تب جسپال نے سرد لہجے میں کہا۔

''میری بات کا جواب نہ دینے کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم سب کو یہیں مار سکتا ہوں۔ اب بھی سمجھ میں نہیں آیا تو بتاؤ، کس کا نشانہ لوں۔''

''اس کی کیا گارنٹی ہے کہ تو جواب لینے کے بعد ہمیں کچھ کہے گا نہیں؟'' اس نے بڑے تحمل سے کہا۔

''تم گارنٹی مانگنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ تماشا بننا چاہتے ہو تو بولو، تیرے گارڈ بھی کچھ نہیں کر پائیں گے۔ میرے پاس تم لوگوں سے زیادہ گولیاں ہیں۔ بولو کیا کہتے ہو۔'' جسپال نے بے پروا لہجے میں کہا۔

''پوچھو۔ کیا پوچھتے ہو؟'' اس نے سیکورٹی والوں کو ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔

''پریم ناتھ تمہارا گینگ چلا رہا ہے یا کسی دوسرے کا؟'' جسپال نے پوچھا۔

''اوہ تو یہ تم ہو۔'' اس نے بات سمجھتے ہوئے کہا۔ پھر بولا، ''وہ کسی دوسرے کا گینگ چلا رہا ہے۔''

''تمہارا اس میں کیا کردار ہے؟'' جسپال نے پوچھا۔

''اپنا مفاد لے کر انہیں کھیلنے کا موقع دے رہا ہوں۔ وہ جو کھیل کھیل رہی ہیں، اسے دیکھ رہا ہوں۔'' اس نے سکون سے گول مول جوب دیا

''اس دوسرے بندے کے بارے میں بتاؤ، کون ہے وہ؟'' جسپال نے پوچھا۔

''میری اس سے صرف دو بار ملاقات ہوئی ہے۔ میں نہیں جانتا وہ کون ہے، لیکن اتنا جانتا ہوں کہ وہ کسی عالمی گینگ کا ایک حصہ ہے۔'' رامیش بولا۔ اس دوران ایک سیکورٹی والا وہاں سے ہٹنے کی کوشش میں پیچھے ہٹا اور ان سے الگ ہو کر جیب سے فون نکالا ہی تھا کہ جسپال نے اس پر فائر کر دیا۔ وہ گھوم کر ساحل پر جا پڑا۔

''یہ باقی لوگوں کے لیے کافی ہے نا۔'' جسپال نے کہا اس وقت رامیش پانڈے کے چہرے پر تشویش لہرائی۔ اس نے اپنے لوگوں کو مارواڑی زبان میں کچھ کہا تو جسپال بولا، ''وقت کم ہے رامیش، اس کا رابطہ نمبر دو۔''

''ابھی دیتا ہوں۔'' اس نے کہا اور فون سے نمبر دیکھا، اور پھر بتا دیا۔ جسپال کو معلوم تھا کہ یہ نمبر نوٹ ہو گیا ہوگا۔ تبھی اس نے کہا۔

''ایک منٹ یہیں رکو، میں نمبر کی تصدیق کرلوں، اگر غلط ہوا تو......'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ جسپال نے دیکھا کہ وہ وہیں کھڑا تھا اس کے چہرے پر تشویش تھی۔ اسی لمحے روہی سے تصدیق ہو گئی کہ نمبر چل رہا ہے اور وہ ممبئی کا ہے۔ جسپال نے گن وہیں رکھی۔ فون سے رامیش کا نمبر ڈیلیٹ کیا۔ دونوں سکون سے باہر نکل گئے۔

جس وقت وہ اپنے کمرے میں پہنچے۔ اس وقت تک ہوٹل میں بھگدڑ نہیں مچی تھی۔ کسی نے ان پر شک نہیں کیا۔ ان کے پاس کمرے میں رکھنے کو کچھ نہیں تھا۔ ان کا سامان دو گھنٹے پہلے جا چکا تھا۔ کمرے سے انہوں نے وہ سامان لیا جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ ساحل پر سن باتھ لینے جا رہے ہیں۔ ان کی گاڑیاں فرینڈس کے ایک گیراج میں تھیں۔ جو شہر سے باہر جانے والے راستے پر تھا۔ جسپال اور رونیت ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے یوں لابی میں آئے جیسے وہ ایک دوسرے میں گم ہوں اور ابھی ساحل پر جا کر ایک دوسرے میں مزید گم ہو جائیں گے۔ یہ تو سچ تھا کہ وہ ہوٹل سے گم ہونے کے لیے ہی وہاں سے نکلے تھے۔ وہ ساحل کے ایک خاص مقام پر آ گئے۔ تبھی انہیں اطلاع ملی کہ رامیش، اس کی فیملی گارڈز سمیت ابھی تک ویسے ہی کھڑے ہیں لیکن خفیہ ایجنسیاں حرکت میں آ گئی ہیں۔

یہی چند منٹ ان کے لیے بہت اہم تھے۔ اگر وہ نمبر غلط ہوتا تو وہیں رامیش کو گولی مار دی جاتی۔ اس کے لیے سندو تیار بیٹھا تھا۔ پھر انہوں نے فرار ہو کر اکیلے اکیلے مختلف جگہوں پر پہنچنا تھا لیکن اسی وقت روہی سے کال آ گئی۔ وہ نمبر درست تھا اور اس شخص کے بارے میں پتہ چل گیا تھا۔ وہ لوگ فوراً واپس ممبئی پہنچ جائیں۔

گو اسے نکلنے کے لیے ان کے پاس وقت انتہائی کم تھا۔ اگر وہ زیادہ دیر کرتے تو وہ یہاں پھنس بھی سکتے تھے۔ ہر طرف ناکہ بندی کی اطلاعات آ رہی تھیں۔ انہیں لگا

جیسے انہوں نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہو۔



اس وقت سورج نہیں نکلا تھا جب میں اور بانیتا کور ناشتے سے فارغ ہو گئے تھے۔ میں رات بھر نہیں سویا تھا۔ بڑے اور چھوٹے نے جس وقت مجھے وہاں کی روداد سنائی تو مجھے شک پختہ ہو گیا۔ گرباج نے جس بندے کا نمبر ملایا تھا، اگرچہ اس نے ہوشیاری سے ڈیلیٹ کر دیا تھا لیکن وہ کسی جگہ جال میں اٹک گیا۔ پھر اسی نمبر کی مدد سے چند نمبر سامنے آئے جو بہت تیزی سے ایک دوسرے کو ملائے گئے۔ میرا شک یقین میں بدلنے لگا کہ جہاں پر گرباج ہے، وہیں سے ضرور کچھ نہ کچھ سامنے آئے گا۔ شام ہوتے ہی میں نے جانی بھائی سے ملنے کو کہا۔ اس نے ہوٹل آ جانے کو کہا۔ میں بانیتا کور کے ساتھ اس کے ہوٹل پہنچ گیا۔ جہاں میں اور جسپال ایک رات ٹھہرے تھے۔

ہوٹل کی چھت پر میری اور اس کی ملاقات ہوئی۔ اسے ساری بات کی خبر تھی۔ چونکہ اسے یہ خبر نہیں تھی کہ نمبر کہیں ٹریس ہو گئے ہوئے تھے، اس لیے اس نے پوچھا۔

''بڑو، تجھے کیسن مالوم کہ اس بلڈنگ میں وہ سالا آزاد ہوئے گا۔''

''پتہ نہیں کیوں جانی بھائی میری چھٹی حس مجھے بتا رہی ہے کہ وہاں کچھ نہ کچھ ہے، گرباج نے بہت تشدد جھیلا، پر بات پھر بھی ٹھیک نہیں کی۔'' میں نے اسے بتایا

''تو پھر سے اس سالے گرباج کو وہاں سے اٹھا لیتے ہیں۔ کیا بولے تو۔'' اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

''دیکھ جانی بھائی، ہم دونوں کے علاوہ باقی لوگ رامیش پر ہاتھ ڈالنے گئے ہیں، یا تو وہ مرے گا، یا سچ بولے گا۔ اگر اس نے بھی اس بلڈنگ میں رہنے والے کسی بندے کی تصدیق کر دی تو.....'' میں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس پر وہ چند لمحے سوچتا رہا، پھر اٹھ کر ٹہلنے لگا، کچھ دیر بعد بولا۔

''تُو اتنا بڑا رسک لے گا، میرے دماغ میں نہیں تھا۔ چل تُو کہتا ہے، ویسے ہی کرنے کا، کتنا لڑکا لوگ چاہئے تجھے۔''

''زیادہ رش نہیں چاہئے، چار پانچ، جو فائیٹر ہو اور شوٹر بھی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''مل جائے گا۔'' اس نے کہا تو میں نے سکون کا سانس لیا پھر پر تکلف ڈنر کے بعد وہیں ہوٹل کے ایک کمرے میں ٹھہر گئے۔ کمرے میں آتے ہی میں نے بانیتا کور سے کہا۔

''تم نے کوئی بات نہیں کی، خاموش رہی؟''

''میرے مطلب کی کوئی بات نہیں تھی اور مجھے لگتا ہے کہ تُو جتنی محنت کر رہا ہے وہ فضول جائے گی۔'' اس نے بیڈ پر پھیلتے ہوئے کہا۔

''کیوں ایسا کیوں لگتا ہے تمہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یار، وہ کوئی بے وقوف ہی ہوگا جو تیرے انتظار میں وہاں بیٹھا ہوگا کہ تُو جائے اور اسے پکڑ لے۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''میں سمجھا نہیں کیا کہنا چاہتی ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''مان لیا کہ وہ لوگ اسی بلڈنگ میں رہتے ہیں، جنہیں تم نے پکڑنا ہے، تم جزیرے سے بھاگے، گرباج پکڑا گیا، پریم ناتھ سے دو دو ہاتھ کر کے رامیش کا پتہ پوچھا، کیا یہ باتیں ان لوگوں کے لیے الارم نہیں ہیں کہ تم کسی بھی وقت ان تک پہنچ سکتے ہو۔'' وہ بولی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو، رامیش ہی تصدیق کرے گا نا کہ وہ کون لوگ ہوں گے۔ اصل الارم تب ہوگا، جب رامیش کو کچھ ہوگا۔ جس کے سر پر یہ ساری گیم کی جا رہی ہے۔ پریم ناتھ جیسے دوسرے مہرے بھی ہو سکتے ہیں۔''

''پھر بھی رسک ہے، تم چاہو تو ہم اس بلڈنگ میں جا سکتے ہیں لیکن مجھے نہیں لگتا کہ کوئی اہم آدمی وہاں سے ملے۔'' اس نے ہلکی سی انگڑائی لیتے ہوئے کہا تو میں نے نگاہیں پھیر لیں۔ میں کھڑکی میں جا کھڑا ہوا اور بانیتا کی

باتوں پر سوچنے لگا۔ بانیتا سوگئی اور میں نے روہی سے مسلسل رابطہ رکھا تھا۔ میری ساری توجہ ایک نمبر پر مرکوز ہوگئی۔ وہ ایک نمبر تھا جس پر بہت زیادہ کالیں آرہی تھیں اور وہاں سے کی بھی جارہی تھیں۔ یہ وہی نمبر تھا جس پر گرباج نے کال کی تھی۔ اور اس پر میں نے رسک لینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

جانی بھائی کے بھیجے ہوئے لڑکے سورج نکلنے سے پہلے ہی پہنچ گئے تھے۔ ہم ناشتہ کرکے تیار ہوئے اور اس وقت لابی میں آگئے جب سورج نے اپنی روشنی پھیلانے کے لیے سر اٹھایا۔ وہ ہمیں وہیں لابی میں ملے۔ وہ چھ لوگ تھے اور دو فور وہیل جیپوں میں آئے تھے۔ ہم چار چار بیٹھ گئے اور آزادنگر کی طرف چل پڑے۔

اس وقت ہم ویرا ڈیسائی روڈ کی اس بلڈنگ کے قریب تھے جس وقت جسپال نے رامیش پانڈے کو گن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا، رامیش پانڈے نے جیسے ہی وہ نمبر جسپال کو بتایا۔ اسی وقت روہی سے اس نمبر کی مزید تصدیق ہوگئی۔ یہ وہی جگہ تھی، جس جگہ گرباج جا پہنچا تھا، کچھ دیر بعد مین روڈ سے ویرا ڈیسائی لنک روڈ سے ہوتے ہوئے ایک فیول اسٹیشن کے پاس آن رکے۔ اس دوران میں تمام راستے میں انہیں سمجھاتا آیا تھا کہ یہ آپریشن انتہائی کم لوگوں کے ساتھ ہے۔ یہ کیسے کرنا ہوگا۔ اس میں کیا ہوسکتا ہے۔ خاص آلات کے ساتھ ہم سب میں رابطہ تھا۔ ایک جگہ ہونے والی آواز دوسرے کو سنائی دی جاسکتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹے روڈ پر ہم اس بلڈنگ کے پاس پہنچ گئے۔ اتنی صبح روڈ پر اکا دُکا لوگ ہی تھے۔ بلڈنگ کا چوکیدار میز پر سر رکھے پڑا تھا۔ ایک لڑکے نے اسے اٹھایا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا، لڑکے نے زوردار گھونسہ اس کے سر پر مارا۔ وہ اسی لمحے لڑھک گیا۔ ہم چار پہلے لفٹ میں داخل ہوئے، باقی سیڑھیوں سے اوپر چل پڑے۔ جیسے ہی چوتھی منزل تک پہنچ کر لفٹ کا دروازہ کھلا، سامنے پانچ لوگ کھڑے تھے۔ ان میں ایک گرباج تھا۔ باقی چاروں نے ہم پر گنیں تان لیں۔ مجھے یقین ہوگیا کہ یہ وہی جگہ ہے، جہاں سے اس ساری گینگ کے سُوتے پھوٹتے تھے۔ میں نے اب تک گرباج کو ایسے چہرے کے ساتھ ہی دیکھا تھا جس پر مظلومیت ہوتی تھی، لیکن اس وقت اس کے چہرے پر خباثت بھری طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی نفرت تھی۔ وہ چند لمحے میری جانب دیکھتا رہا، پھر بولا۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم یوں میرے سامنے آجاؤ گے۔ میں چاہوں یہ چاروں ابھی تیرے بدن میں اتنے سوراخ کردیں کہ کوئی گن بھی نہ سکے۔ مگر میں تمہیں ایسے نہیں ماروں گا، لے چلو انہیں۔'' آخری لفظ اس نے تحکمانہ انداز میں کہے تھے۔

میں نے ہاتھ اٹھا دیئے۔ ان چاروں نے بڑی سمجھداری کا ثبوت دیا تھا۔ انہوں نے ہمیں پکڑنے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا، بلکہ گن سے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ ہم جیسے ہی باہر آئے، کاریڈور میں سے دو بندے بھاگتے ہوئے آگئے۔ چند لمحے وہ صورت حال کا جائزہ لیتے رہے، پھر لمحہ بھر میں سب سمجھ کر ہماری تلاشی لینے کے لیے آگے بڑھے۔ اگلے چند لمحوں میں وہ ہمیں نہتا کر چکے تھے۔

(باقی آئندہ انشاءاللہ)



بد دعا

زرین قمر

وہ انسان تھی یا چڑیل یا پھر جادوگرنی اس کی بد دعا نے دو بہنوں کی زندگی اجیرن بنا کر رکھ دی تھی۔
معروف لکھاری زرین قمر کی خوفناک نمبر کے لیے خاص تحریر

زندگی میں بعض اوقات ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب کچھ پریشانیاں اور حادثات آپ کو گھیر لیتے ہیں اور آپ اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتے' ممکن ہے کہ کوئی مضبوط اعصاب والی خاتون یہ سب کو برداشت کر جائے اور خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دے لیکن روبینہ خان یہ نہیں کر سکتی تھی اور خاص طور سے اس وقت جب اس کی شادی داؤ پر لگی ہوئی تھی وہ یونہی بیٹھ کر تماشا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ قسمت کو اجازت نہیں دے سکتی تھی کہ وہ اس کے ساتھ جو چاہے کرے۔

وہ بچپن ہی سے بہت باہمت' بہادر اور اپنے فیصلے خود کرنے والی تھی اس نے ہمیشہ راہ میں آنے والی پریشانیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے وہ خود کو اپنے کزن بہرام خان سے ہر لحاظ سے بہتر سمجھتی تھی جس نے اپنی زندگی کی ناکامیوں کو بالکل غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا اس کی خالہ نگہت کا بھی یہی کہنا تھا کہ بہرام ہمیشہ سے اپنی قسمت پر راضی رہا ہے بہرام کے والدین کو بھی اس کی والدہ نے بہت سمجھایا تھا کہ وہ اس کا خاص خیال رکھیں لیکن انہوں نے بھی کوئی توجہ نہیں دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج بہرام خان تیس سال سے زیادہ کا ہے لیکن نہ اس کو کہیں جاب ملی' نہ اس کی زندگی میں کوئی لڑکی آئی' نہ شادی ہوئی' نہ بچہ ہوا۔ اس میں آگے بڑھ کر فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی۔

اپنی شادی کے دن تک روبینہ خان یہی سمجھتی تھی کہ بہرام خان کا مسئلہ صرف اور صرف اس کی بزدلی اور احمقانہ سوچ ہے لیکن شادی سے ایک رات پہلے جب وہ سونے کے لیے اپنے بستر پر لیٹی تو بہرام کے بارے میں وہ کسی اور انداز سے سوچ رہی تھی۔

سارا دن ایک کے بعد ایک مسئلہ اس کا پیچھا کرتا رہا تھا صبح جب وہ اپنی شادی کا لباس پہن کر دیکھ رہی تھی تو وہ کسی چیز میں الجھ کر ایک جگہ سے پھٹ گیا تھا اور اس نے اپنے ٹیلر کو اسے ٹھیک کرنے کے لیے دیا تھا جس نے شادی کی صبح وہ لباس واپس کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

''شیری! خدا کے لیے بتاؤ کہ محمود احمد کہاں ہے؟'' اس نے فون پر چیختے ہوئے اپنی دوست سے پوچھا وہ کافی دیر سے اپنے منگیتر سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ فون نہیں اٹھا رہا تھا پھر اس نے فون پر ہی شیری کو اپنے ساتھ ہونے والے حادثے کی اطلاع دی تھی جس نے اسے بہت پریشان کر دیا تھا۔

''تم پریشان مت ہو میں تمہارے پاس ہی آ رہی ہوں۔'' شیری نے اسے تسلی دی اور اپنے شوہر کو بتایا کہ وہ روبینہ کے پاس جا رہی ہے تقریباً آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ گئی تھی۔

''تم اس طرح پریشان مت ہو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' شیری نے کہا۔ ''آؤ یہاں بیٹھو' دیکھو ساری تیاریاں مکمل ہیں۔'' شیری نے روبینہ خان کے کمرے میں رکھے ہوئے مختلف پیکٹس کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارا سارا جہیز تیار ہو چکا ہے، تمام کپڑے، زیور، فرنیچر سب تیار ہے، اب پریشان مت ہو۔'' اس نے کہا، شیری نے روبینہ کی شادی کی ساری تیاری اس کے ساتھ مل کر کروائی تھی جبکہ روبینہ کی بہن دوسرے شہر میں تھی جہاں اس کا موسیقی کا بہت بڑا فنکشن ہونے والا تھا لیکن وہ روبینہ کی شادی میں آنے کا وعدہ کر چکی تھی۔

''دیکھو سب کچھ ہو گیا لیکن یہ میرا شادی کا سوٹ...... تمہیں پتا ہے اس طرح شادی کے سوٹ کا پھٹ جانا اچھا شگون نہیں ہے۔'' روبینہ نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''یہ باتیں چھوڑو اور یہ سوچو کہ کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا تھا، ٹیلر اسے ٹھیک کر دے گا۔'' شیری نے اسے سمجھایا اچانک فون کی گھنٹی بجی اور شیری نے دوڑ کر فون اٹھایا۔

''ہیلو...... ہاں وہ یہاں ہے۔'' اس نے کہا اور ریسیور روبینہ کی طرف بڑھا دیا۔ ''تمہاری بہن صائقہ خان ہے۔''

''صائقہ! میں تمہیں صبح سے فون کر رہی ہوں۔'' روبینہ نے ریسیور لیتے ہی صائقہ سے کہا۔

''کیا بات ہے تم ابھی تک کیوں نہیں آئیں۔''

''اوہ روبینہ! میں معافی چاہتی ہوں، میں نہیں آ سکتی۔''

''کیوں؟ تم نے وعدہ کیا تھا۔'' روبینہ نے غصے سے کہا۔

''ہاں میں نے وعدہ کیا تھا لیکن میں مجبور ہوں، تمہیں پتا ہے کہ مجھے میوزک سے کتنا لگاؤ ہے، مجھے ایک ٹی وی چینل سے مستقل طور پر پروگرام کرنے کی آفر ہے اور کل میرا انٹرویو ہے، ایسے موقع بار بار نہیں ملتے، تم اپنی شادی کے بعد محمود احمد کے ساتھ میرے پاس آنا پھر ہم مل کر خوب عیش کریں گے۔''

''تم کیا کہہ رہی ہو، میں تمہاری بہن ہوں اور تم میری شادی میں نہیں آ رہی ہو، خدا کے لیے......'' روبینہ زور سے چیخی۔

''دیکھو روبینہ! مجھے جلدی ہے میں پھر فون کروں گی۔'' صائقہ نے کہا اور فون بند کر دیا۔

''دیکھا تم نے......'' اس نے شیری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری بہن ہے، اس نے شادی میں آنے سے انکار کر دیا۔'' روبینہ نے تاسف سے کہا۔ ''صبح سے یہ دوسرا واقعہ ہے۔''

''ایسے مت سوچو روبینہ! سب ٹھیک ہو جائے گا تم پریشان مت ہو۔'' شیری نے اسے سمجھایا۔

''لیکن تم دیکھو محمود بھی فون نہیں اٹھا رہا، میں اسے لباس کے بارے میں بتاتی۔''

''کوئی بات نہیں، مصروف ہوگا تم ان باتوں سے پریشان مت ہو آرام کر لو۔ کل تمہاری شادی ہے پھر تم اس کے ساتھ کسی پُرفضا مقام پر ہنی مون کے لیے چلی جانا۔'' شیری نے اسے سمجھایا وہ اس کا دھیان بٹانا چاہتی تھی۔

''ہاں شیری! تم ٹھیک کہتی ہو، جب میں محمود سے پہلی بار ملی تو ہماری ملاقات اچانک ہوئی تھی میں ایک شاپنگ مال میں تھی کچھ خریداری کر رہی تھی کہ اچانک لوگوں کا شور سنائی دیا میں اس طرف متوجہ ہوئی تو میں نے دیکھا محمود جو میرے لیے بالکل اجنبی تھا لوگوں کے ہجوم میں زمین پر پڑا تھا میں دوڑ کر آگے بڑھی، تمہیں تو پتا ہے کہ ایک ڈاکٹر ہونے کے ناتے میرا فرض تھا کہ میں دیکھوں اسے کس قسم کی مدد کی ضرورت ہے، وہ بے ہوش تھا۔ میں نے اپنے اسپتال فون کیا کچھ ہی دیر میں ایمبولینس آ گئی اور میں اس کے ساتھ

ہی اسپتال چلی گئی یوں ہماری ملاقات ہوئی پھر ہم اکثر ملنے لگے وہ بھی مجھے پسند کرنے لگا تھا اور میں تو پہلی ملاقات میں دل ہار بیٹھی تھی۔'' شیری اس کی بات دھیان سے سن رہی تھی۔

''وہ تو ایک کال پر فون اٹھاتا ہے' آج اسے کیا ہوا ہے؟'' روبینہ نے پھر پریشان ہو کر کہا اسی وقت فون کی گھنٹی بجی تو اس نے لپک کر ریسور اٹھایا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ شاید صائقہ نے دوبارہ کال کی ہوگی لیکن دوسری طرف محمود تھا۔

''اوہ محمود! تم کہاں ہو' میں تمہیں صبح سے فون کر رہی ہوں۔'' روبینہ نے بے چینی سے کہا۔

''تم ٹھیک تو ہو؟'' روبینہ نے پوچھا۔

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔'' محمود نے جواب دیا۔

''میں تمہارے پاس آ رہا ہوں بس راستے میں ہوں۔'' محمود نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' روبینہ نے فون رکھ دیا اور شیری کو بتایا کہ محمود آ رہا ہے۔

''وہ یہاں کیوں آ رہا ہے؟'' روبینہ پریشان تھی۔

''پتا نہیں۔'' شیری نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''لیکن اس طرح دلہن سے ملنا اچھا شگون نہیں ہے۔'' روبینہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ کوئی ضروری بات ہو ورنہ وہ کیوں آتا۔'' شیری نے کہا۔

''ایسی بھی کیا بات ہو سکتی ہے' جو وہ فون پر نہیں کہہ سکتا۔'' روبینہ نے کہا۔

''چلو کچھ بھی سہی میں اس کے لیے پریشان بھی تھی' اچھا ہے اس سے مل لوں گی۔'' روبینہ نے خود کو اطمینان دلایا۔ وہ محمود کو اس لیے بھی پسند کرتی تھی کہ وہ اس کا بہت خیال رکھتا تھا انہوں نے نئی زندگی شروع کرنے کے بہت سے خواب دیکھے تھے اس نے وعدہ

پھول

کسی نے پھول سے پوچھا اے پھول! مجھے بتا تو کیوں کھلتا رہا، تو نے تو دی سب کو خوشبو تجھے کیا ملتا رہا؟ پھول نے مسکرا کر کہا ابھی تو نادان ہے جیون کے سچے پیار سے، ابھی تو انجان ہے دینے کے بدلے کچھ لینا یہ تو ایک کاروبار ہے اور جو دے کر بھی کچھ نہ مانگیں تو وہ ہی تو سچا پیار ہے۔

حلیمہ زمان......ٹوپی

کیا تھا کہ وہ روبینہ کو ایک خوب صورت سا گھر بنا کر دے گا اور اس کے علاوہ اس کی زندگی میں کوئی اور عورت نہیں آئے گی۔ آئندہ زندگی میں اپنے بچوں اور بیوی کے ساتھ زندگی گزارنے کا اس کا خواب روبینہ سے چھپا ہوا نہیں تھا جبکہ روبینہ کے والد تین سال پہلے اس کی والدہ کو چھوڑ کر چلے گئے تھے اور اب روبینہ ان کے ساتھ تنہا رہتی تھی' صائقہ بھی اپنے شوق کی لگن میں مہران سٹی چلی گئی تھی وہاں سے کافی فاصلے پر تھا۔

''اچھا میں ذرا اپنا حلیہ درست کر لوں' محمود آ رہا ہے وہ پہنچنے ہی والا ہوگا۔'' روبینہ نے اپنے خیال کو جھٹکتے ہوئے شیری سے کہا اور اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی اس نے وہاں لباس تبدیل کیا تھا اور پھر غسل خانے میں چلی گئی تھی۔

وہ آئینہ کے سامنے کھڑی اپنے بال درست کر رہی تھی کہ اچانک اسے آئینہ میں ایک اور چہرہ دکھائی دیا' چہرہ گہرا سانولا تھا اس پر جھریاں پڑی تھیں۔ روبینہ کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ تیزی سے پیچھے مڑی اس کے سامنے نیلے رنگ کے لباس میں ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی۔

''تم کون......؟'' روبینہ نے بولنا چاہا لیکن اس کی

زبان تو جیسے پتھر کی ہوگئی تھی' اس عورت کی آنکھوں میں وحشت تھی اور وہ آنکھیں تو روبینہ کو اکثر خوابوں میں تنگ کرتی تھیں۔ روبینہ کی آنکھوں میں خوف کی سرد لہر سی دوڑ گئی اور دل جیسے سینے میں برف ہوگیا' وہ حرکت نہیں کرسکتی تھی اور پھر جیسے سیکنڈ برسوں میں بدل گئے آخر اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور جب اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو وہ بوڑھی عورت غائب ہوچکی تھی روبینہ پھر تیزی سے آئینہ کی طرف مڑی اور اس کا ہاتھ بے اختیاری میں آئینہ سے ٹکرایا اور وہ ٹوٹ کر نیچے اس کے پیروں میں آ گرا۔

''کیا ہوا روبینہ! تم خیریت سے تو ہو؟'' اسے شیری کی آواز سنائی دی وہ غسل خانے میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا اس کا دل پھر سے دھڑکنے لگا۔

''روبینہ! تم ٹھیک تو ہو؟'' اسے پھر شیری کی آواز سنائی دی۔

''ہاں...... مجھ سے آئینہ ٹوٹ گیا ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''یہ کیا تھا؟'' وہ خود کلامی کررہی تھی ''مجھے کیا ہوگیا ہے' ابھی محمود آنے والا ہے شاید یہ سب میری ذہنی پریشانی کا نتیجہ ہے' بھلا یوں بھی کہیں...... اب روحوں کا تو زمانہ نہیں۔ لوگ پاگل کہیں گے۔'' وہ خود سے باتیں کررہی تھی پھر اس نے ٹوٹے ہوئے آئینہ کی ٹکڑے اٹھائے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اس لمحے بیرونی دروازے کی گھنٹی بجی۔

''اوہ شاید محمود احمد آ گیا۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا اور جلدی سے آئینہ کے ٹکڑے اور فریم ڈسٹ بین میں ڈالتی ہوئی غسل خانے سے نکل گئی۔

''شیری' روبینہ کہاں ہے؟'' اس نے محمود کی آواز سنی جو اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

''اوہ! اس سے آئینہ ٹوٹ گیا ہے۔'' شیری نے اسے بتایا اسی وقت روبینہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

''ارے تمہیں کیا ہوا؟'' روبینہ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ ''تمہارے چہرے پر تو یوں ہوائیاں اڑ رہی ہیں جیسے تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔''

''ڈراؤنا خواب؟'' روبینہ نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اس کی نظریں محمود پر جمی ہوئی تھیں جس نے توقع کے خلاف نیلے رنگ کی بغیر استری کی شرٹ پہنی ہوئی تھی جبکہ وہ اپنے لباس کا خاص خیال رکھتا تھا۔ شرٹ میلی بھی تھی۔

''تمہاری انگلیوں سے خون بہہ رہا ہے۔'' محمود نے اس کے ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو روبینہ نے بھی اس کی طرف دھیان دیا' اس کے سیدھے ہاتھ سے خون ٹپکتا ہوا فرش پر گرا تھا۔

''اوہ شاید شیشے اٹھاتے ہوئے میرا ہاتھ کٹ گیا ہے۔'' روبینہ نے تاسف سے کہا اور دوسرے ہاتھ سے اس انگلی کو دبالیا جس سے خون کا قطرہ گرا تھا۔

''روبینہ مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔'' محمود نے اس سے کہا اور شیری کی طرف دیکھنے لگا' روبینہ سمجھ گئی کہ وہ اس سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہے۔

''آؤ۔'' روبینہ نے کہا اور اسے ساتھ لیے ہوئے اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے کمرے میں آ کر محمود سے پوچھا۔

''تمہیں پتا ہے' زندگی میں انسان کو بعض اوقات فیصلے لینے پڑتے ہیں' ایسے فیصلے جن کے بارے میں ذہن ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ مشکل فیصلے ہوتے ہیں لیکن کرنا پڑتے ہیں۔''

''ہاں' میں سن رہی ہوں۔'' روبینہ نے اپنی زخمی

انگلی کو دیکھتے ہوئے کہا وہ ابھی تک باتھ روم میں ہونے والے واقعے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں تمہیں کیسے بتاؤں؟'' محمود نے کہا اور روبینہ نے اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں اور ان میں آنسو تھے۔

''کیا تم روتے رہے ہو؟'' روبینہ نے پوچھا۔

''اوہ...... مجھ سے نہیں ہوگا۔'' محمود نے کہا اور روبینہ کی طرف لاچارگی سے دیکھنے لگا۔

''کیا نہیں ہوگا؟'' روبینہ نے پوچھا۔

''میں...... میں تم سے شادی نہیں کرسکتا۔'' محمود نے کہا اور روبینہ اسے حیرت میں دیکھنے لگی، اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی اجنبی زبان بول رہا ہو جو اس کی سمجھ میں نہیں آرہی ہو۔

''تم مجھ سے شادی نہیں کرسکتے؟'' اس نے کچھ دیر بعد دہرایا۔

''میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا ہورہا ہے، میں...... میں اس کی وضاحت بھی نہیں کرسکتا۔''

''تم وضاحت نہیں کرسکتے؟ تم نہیں جانتے کہ تمہارے ساتھ کیا ہورہا ہے؟'' روبینہ نے دہرایا۔

''ہاں...... تین دن پہلے سب کچھ ٹھیک تھا لیکن کل صبح جب میں اٹھا، میں نہیں جانتا سب کچھ کیسے بدل گیا۔''

''سب کچھ ٹھیک تھا۔'' روبینہ نے پھر دہرایا۔

''خدا کے لیے روبینہ میری باتوں کو دہراؤ نہیں، انہیں سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''میں سمجھنے کی کوشش کررہی ہوں۔'' روبینہ نے کہا اور محمود نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔

''محمود کیا ہوا ہے، کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے؟'' روبینہ نے کہا، اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔

''نہیں...... نہیں...... تمہارا کوئی قصور نہیں ہے بس...... بس میں نہیں جانتا کہ کیا ہوا ہے؟'' محمود نے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' روبینہ اس کی جانب بڑھی اور اسے کاندھے سے پکڑ کر کاؤچ کے قریب لائی۔

''یہاں بیٹھو اور اب بات کرو۔'' اس نے کہا۔

''ہم دونوں مل کر مسئلے کا کوئی حل نکال لیں گے۔''

''میں بیٹھ نہیں سکتا، میری کار...... میں اسے اسٹارٹ چھوڑ آیا ہوں، اب بات کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے، روبینہ میں یہ شادی نہیں کرسکتا۔''

''کیا...... یہ نہیں ہوسکتا۔'' روبینہ نے کہا۔ ''اور وہ ہمارے ٹکٹ جو ہم نے فرانس جانے کے لیے خریدے ہیں، یہ ہنی مون پر جانے کے لیے...... تم ایسا نہیں کرسکتے۔'' روبینہ رو پڑی۔

''کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟''

''نہیں...... نہ میں نے کبھی تم سے پیار کیا اور نہ کبھی کرسکتا ہوں۔'' محمود نے جواب دیا تو روبینہ کو یقین نہیں آیا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ محمود اس کے ساتھ ایسا کرسکتا ہے اس نے محمود کی آنکھوں میں گہرے غم کے آثار نظر آرہے تھے لیکن اس نے رشتہ توڑنے کی کوئی وجہ نہیں بتائی تھی۔

''روبینہ مجھے نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا ہورہا ہے، میرے اختیار میں کچھ نہیں، مجھے امید ہے تم مجھے معاف کردوگی۔''

اور...... اور میرا کیا ہوگا؟'' روبینہ نے روتے ہوئے پوچھا۔

''تم اپنی امی یا اپنی خالدہ کے ساتھ رہنا، وہ تمہارا خیال رکھیں گی اور کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر تمہاری شادی کروادیں گی۔'' محمود نے یوں کہا جیسے یہ کوئی بڑی

بات نہ ہو پھر محمود واپسی کے لیے مڑا تھا اور روبینہ اس کے پیچھے دوڑی تھی۔

''آخر اس کی وجہ کیا ہے محمود!'' وہ اس کے پیچھے دوڑی تھی لیکن محمود دروازے سے نکل گیا تھا اور اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگیا تھا' روبینہ کی دوست شیری بھی اس کے پیچھے بھاگی تھی۔

''روبینہ تم کہاں جارہی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''پتا نہیں میں اس کے پیچھے جارہی ہوں۔'' روبینہ نے کہا اور اپنی کار میں بیٹھ کر محمود کا پیچھا کرنے لگی' شیری اس کے پیچھے چیختی رہ گئی تھی۔

''اوہ محمود میرے ساتھ یہ مت کرو۔'' وہ خود ہی خود اس کا تعاقب کرتے ہوئے بڑبڑائی تھی' کچھ دور جانے کے بعد اس کی کار کا انجن خود بخود بند ہوگیا تھا اس نے بہت کوشش کی تھی لیکن وہ دوبارہ اسٹارٹ نہیں ہوا اور روبینہ بے بسی سے محمود کی کار کو دور جاتے ہوئے دیکھتی رہ گئی تھی پھر وہ بے ساختہ رونے لگی اور اسے اپنی بہن صائقہ یاد آئی اسے اس وقت اس کی بہت کمی محسوس ہورہی تھی وہ بے اختیار رونے لگی۔

''کاش صائقہ اس وقت تم میرے پاس ہوتیں تو مجھے حوصلہ دیتیں۔'' اس نے کہا روتے روتے وہ نڈھال سی ہوگئی تھی اور یہ بھول گئی تھی کہ وہ سڑک پر اپنی کار میں بیٹھی ہے' اسے اپنے سامنے اپنی بہن صائقہ نظر آرہی تھی جو اسے دیکھ کر مسکرارہی تھی اور پیچھے گہرا نیلا آسمان تھا جس پر بادل بکھرے ہوئے تھے پھر اچانک جیسے صائقہ اونچائی سے نیچے جاگری تھی' روبینہ نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہی۔

''صائقہ......'' وہ زور سے چیخی تھی اسے اب بھی آسمان نظر آرہا تھا لیکن اس بار اس کا رنگ سیاہ تھا اور کوئی اس کی کار کی کھڑکی کے شیشے کو بجارہا تھا اسے ایک سایہ سا نظر آیا وہ شاید ایک بوڑھا چہرہ تھا پھر وہ اندھیروں میں ڈوب گئی تھی۔

اسے کچھ ہوش نہیں تھا کہ اسے گھر کون واپس لایا تھا وہ کئی دن تک اپنے بیڈ روم سے نہیں نکلی تھی اس کا رشتہ ٹوٹنے کے بارے میں اس کی والدہ اور اس کی دوست شیری نے سب کو بتادیا تھا اس نے کئی بار محمود کے گھر فون کرکے اس کے والدین اور بہن بھائیوں سے بات کی تھی لیکن انہیں بھی محمود کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں گیا ہے' ان کے رشتے داروں میں ان کی بھی سبکی ہوئی تھی کیونکہ وہ بھی شادی کے کارڈ بانٹ چکے تھے۔ روبینہ کئی روز بعد اپنے بیڈ سے اٹھی تھی اور غسل خانے میں گئی تھی لیکن آئینے کی طرف دیکھتے ہوئے ڈر لگتا تھا کہ کہیں وہی بدصورت بوڑھی عورت کا چہرہ نہ نظر آجائے جو پہلے نظر آیا تھا اور اس کی زندگی برباد ہوگئی تھی اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا' آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بن گئے تھے اس نے اپنا حلیہ درست کیا اور اپنی خالہ نگہت نواز خان سے ملنے کا فیصلہ کیا وہ اپنی خالہ سے بہت مانوس تھی اور ہر اہم بات انہیں بتاتی تھی اس نے اپنے ساتھ ہونے والے حادثے کے بارے میں بھی انہیں بتانا مناسب سمجھا۔

جب وہ ان کے گھر پہنچی تو وہ اسے دیکھ کر خوش ہوئی تھیں انہیں معلوم تھا کہ محمود سے اس کی شادی کا پروگرام ختم ہوچکا ہے۔

''میں آپ سے کچھ ضروری بات کرنے آئی ہوں۔'' روبینہ نے کہا۔

''میں جانتی ہوں تمہاری شادی محمود سے نہیں ہورہی' تمہاری امی نے مجھے بتادیا ہے۔''

''نہیں میں اس کے علاوہ بات کرنے آئی ہوں۔'' روبینہ نے کہا۔

''بتاؤ کیا بات ہے؟''

''آنٹی! میرے ساتھ عجیب واقعہ ہوا ہے۔'' روبینہ نے کہا۔ ''اس کی وجہ سے میں خوفزدہ ہوں۔''

''کیسا واقعہ؟'' نگہت نواز خان نے پوچھا۔

''جس روز محمود نے شادی سے انکار کیا اس روز اس کے آنے سے پہلے میں غسل خانے میں گئی تو میں نے بڑی حیران کن چیز دیکھی۔''

''کیسی چیز؟'' اس کی خالہ نگہت نواز نے دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا تو روبینہ نے انہیں تفصیل سے اس ہیولے کے بارے میں بتایا جو آئینے میں نظر آیا تھا اور پھر اس کا آئینہ ٹوٹ گیا تھا۔

''تم نے بوڑھی عورت کا عکس دیکھا' اوہ خدایا یہ تو بہت بُرا ہوا۔'' اس کی خالہ نگہت نواز نے کہا۔

''لیکن ہوسکتا ہے کہ وہ محض میرا تخیل ہی ہو۔'' روبینہ نے کہا۔ ''میں اس وقت ذہنی انتشار کا شکار تھی' میں بدروحوں پر یقین نہیں رکھتی لیکن میں نے اسے دیکھا تھا' کیا آپ نے بھی دیکھا؟'' روبینہ نے پوچھا۔

''ہاں...... میں نے بھی دیکھا ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''لیکن میں بھی اسے اپنا تخیل ہی سمجھی تھی۔''

''لیکن میں نے بعد میں بھی دیکھا جب میں اپنی کلرٹیگ میں تھی میں نے صائقہ کو دیکھا وہ اونچائی سے نیچے گر گئی تھی۔''

''کیا کسی نے اسے دھکا دیا تھا؟'' آنٹی نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتی' بس میں نے اسے گرتے ہوئے دیکھا تھا۔'' روبینہ نے جواب دیا۔

''تمہیں یاد ہے جب تم بارہ سال کی تھیں تب بھی تم نے ایسا ہی منظر دیکھا تھا جو تمہاری ٹیچر کے بارے میں تھا۔'' اس کی آنٹی نے اسے یاد دلایا۔

''ہاں مجھے یاد ہے۔'' روبینہ نے کہا۔

''تم نے دیکھا تھا کہ وہ کسی برفیلی چٹان سے نیچے گر رہی ہے' میں نے تم سے کہا تھا کہ تم انہیں بتادو لیکن تم انہیں بتانے سے خوفزدہ تھیں۔'' آنٹی نگہت نے کہا۔

''ہاں مجھے یاد ہے' ان کا انتقال ہوگیا تھا۔'' روبینہ نے افسوس سے کہا۔ ''لیکن اب میں نے صائقہ کے بارے میں جو دیکھا ہے اس کا کیا کروں؟'' روبینہ نے کہا۔

''روبینہ تمہیں جلدی کرنا چاہیے' تمہیں پتا ہے بہت سالوں پہلے ایک کالا علم کرنے والی عورت نے بددعا دی تھی میرا خیال وہ وقت آگیا ہے۔'' آنٹی نگہت نے کہا۔

''لیکن امی نے تو مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔'' روبینہ نے حیرت سے کہا۔

''وہ ان باتوں پر یقین نہیں کرتی' لیکن یہ سب ہوتا ہے' مجھے پتا ہے' یہ ایک بددعا ہے جو اثر دکھا رہی ہے۔''

''اگر آپ اس بارے میں کچھ جانتی ہیں' تو مجھے ضرور بتائیں۔'' روبینہ نے کہا۔

''ہاں' میں اس وقت بہت چھوٹی تھی لیکن مجھے وہ واقعہ اچھی طرح یاد ہے' تمہیں پتا ہے کہ دنیا میں آنے سے پہلے اور تمہاری بہن صائقہ کو اس دعوت نے بددعا دی تھی جو شاید اب رنگ دکھا رہی ہے۔ تمہیں پتا ہے تمہارے والدین پہلے ایک پہاڑی مقام نیزہ وریج میں رہتے تھے وہ ایک دوسرے کو چاہتے تھے اور ایک ساتھ ہی بڑے ہوئے تھے۔ تمہاری والدہ کی ایک دوست نادرہ تھی جس کی ماں جادوٹونا کرتی تھی ان سے کوئی بھی نہیں ملتا تھا۔ ان کا گھر بستی سے کچھ فاصلے پر تھا' نادرہ جڑی بوٹیوں سے علاج بھی کرتی تھی اور جادوٹونا بھی کرتی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے

دیکھنے کے علاوہ اپنی ناک سے سونگھ کر بھی چیزوں کا پتا لگا لیتی ہے وہ لوگوں کو برباد کرنے شادیاں ختم کرانے دوسروں کو ان کے غلط مقاصد حاصل کرنے میں مدد دینے کے لیے مشہور تھی۔ لوگ اس سے ڈرتے تھے اور اسے ناراض نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ اس کے عتاب کا شکار نہیں ہونا چاہتے تھے پھر یوں ہوا کہ تمہارے والد دلاور خان نادرہ کو پسند آ گئے اور وہ موقع نکال نکال کر ان سے ملنے لگی وہ بھی کسی پگڈنڈی کے کنارے کبھی کسی میدان میں کہیں بھی انہیں جا ملتی تھی ان کی تواضع کرتی تھی اس میں اکثر چیزوں پر اس نے کچھ جادو کیا ہوا ہوتا تھا۔ اس طرح کافی عرصہ گزر گیا جب تمہاری والدہ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے دلاور خان کو سمجھایا اور انہیں احساس دلایا کہ وہ کیسی خواتین ہیں اور دنیا ان کے بارے میں کیا کہتی ہے کچھ کوشش کے بعد وہ دلاور خان کو سمجھانے میں کامیاب ہو گئیں اور دلاور خان نے نادرہ سے ملنا چھوڑ دیا۔ اس کا علم نادرہ کی ماں کو ہو گیا لیکن اس نے کوئی کارروائی نہیں کی سب کو اس بات پر حیرت تھی کیونکہ وہ اپنے دشمن کو کبھی معاف نہیں کرتی تھی پھر بزرگوں نے تمہارے والد اور والدہ کی شادی کا فیصلہ کیا اور جس روز شادی تھی اور تمام مہمان موجود تھے۔ نادرہ کی ماں وہاں پہنچ گئی اور اس نے تمہارے والدین کو بددعا دی کہ خدا انہیں دو بیٹیاں دے لیکن دونوں کی شادی نہ ہو اور اگر ہو تو وہ مر جائیں۔ وہ ہمیشہ ناخوش رہیں ان کی زندگی میں کبھی خوشی نہ آئے ان کی چھوٹی بیٹی پینتیس سال کی ہونے پر مر جائے اور بڑی بیٹی تنہا زندگی گزارے۔ یہاں تک کہ جب وہ مر جائے تو چوہے اسے نوچ نوچ کر کھائیں۔" آنٹی نگہت نے اتنا کہا اور خاموش ہو گئیں۔ روبینہ کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔

"میرا خیال ہے کہ تم جلد از جلد مہران سٹی جاؤ اور اپنی بہن کی مدد کرو اسے مرنا نہیں چاہیے۔" آنٹی نے کہا اور روبینہ نے اثبات میں سر ہلایا اس کے بعد اس نے پہلا کام یہی کیا تھا کہ اپنے اسپتال جا کر دو ماہ کی چھٹی منظور کروائی اور والدہ کو اپنے منصوبے کے بارے میں بتا کر مہران سٹی روانہ ہو گئی۔

شیری اس کے ساتھ ہی مہران سٹی آئی تھی وہ اس مصیبت کے وقت میں اپنی اتنی اچھی دوست کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی صائقہ سے ملنے پر انہیں حیرت ہوئی تھی وہ بالکل بدل گئی تھی۔

"اوہ صائقہ! تم نے تو اپنے بال بالکل چینج کر لیے۔" روبینہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پہلے یہ کالے اور گھنگھریالے تھے اور اب سنہرے اور بالکل اسٹریٹ ہیں تم پر اچھے لگ رہے ہیں۔"

"ہاں تمہیں تو پتا ہے شوبز میں یہ سب ضروری ہے۔" صائقہ نے ہنستے ہوئے کہا اس نے خوب صورت موڈرن لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔

"آج دراصل میرا ایک فنکشن ہے۔" اس نے روبینہ کی نظریں اپنے لباس پر محسوس کیں۔

"اوہ اچھا۔" روبینہ نے کہا۔

"تمہیں پتا ہے میرا ایک دوست ہے وہی میرا یہ شو کروا رہا ہے۔ اس میں میڈیا کے لوگ بھی مدعو ہیں۔" صائقہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

"اچھا!" روبینہ نے کہا اس کے لہجے میں اداسی تھی شیری نے جلدی سے بات بدل دی۔

"تمہیں تو پتا چل گیا ہوگا صائقہ کہ روبینہ کی شادی محمود سے نہیں ہو رہی ہے۔"

"ہاں میں جانتی ہوں لیکن تم اداس مت ہونا زندگی میں یہ سب چلتا رہتا ہے اس سے دنیا نہیں بدلتی۔" صائقہ نے اسے سمجھانے والے انداز میں

کہا۔

"ہاں میں جانتی ہوں۔" روبینہ نے آہستہ سے کہا وہ سوچ رہی تھی اس کے ساتھ تو جو ہونا تھا ہو چکا اب وہ صائقہ کو بچانا چاہتی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ کیونکہ صائقہ کبھی اس کی باتوں پر یقین نہیں کرے گی اور اسی وجہ سے اس نے شیری کو بھی منع کر دیا تھا کہ وہ صائقہ کو اس بددعا کے بارے میں کچھ نہ بتائے۔

"تم لوگوں نے اچھا کیا جو یہاں آ گئیں اب ہم سب مل کر خوب مزے کریں گے گھومیں گے۔ میں تمہیں ریڈیو اسٹیشن اور ٹی وی اسٹیشن لے کر جاؤں گی پھر پکنک منائیں گے۔ تمہیں اچھی اچھی جگہوں کی سیر اکراؤں گی اور تم اپنا سب غم بھول جاؤ گی۔" صائقہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا اس رات وہ تینوں بہت دیر تک جاگتی رہی تھیں اور بہت ڈھیر ساری باتیں کرتی رہی ہیں۔ صائقہ نے اپنے دوست کے بارے میں بھی بتایا تھا وہ اس میں دلچسپی لے رہا تھا۔

مہران سٹی میں صائقہ ایک تین منزلہ عمارت کے فلیٹ میں رہتی تھی اور اس کا فلیٹ تیسری منزل پر تھا جسے صائقہ نے بڑے سلیقے سے سجایا ہوا تھا وہ چھوٹا ہونے کے باوجود بہت خوب صورت لگ رہا تھا صائقہ نے ایک کمرہ اسے اور شیری کو دیا تھا۔

"امید ہے تم اپنا وقت یہاں سکون سے گزار سکو گی۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

پھر دو دن تک وہ خوب گھومیں صائقہ نے ہر موقع پر ناصر بیگ کا ذکر کیا تھا جو اس کا واحد دوست تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے تھے پھر تیسرے روز روبینہ اور شیری کو اس سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا جب صائقہ انہیں سٹی کے ریڈیو اسٹیشن لے گئی تھی۔

"ان سے ملو روبینہ! یہ ناصر ہیں اور تم سے ملنے

باتوں سے خوشبو آئے

● پرندہ زندہ ہو تو چیونٹیاں کھاتا ہے مگر جب پرندہ مر جاتا ہے تو وہی چیونٹیاں اسے کھاتی ہیں۔

● ایک درخت ایک لاکھ ماچس کی تیلی بنا سکتا ہے مگر ماچس کی ایک تیلی ایک لاکھ درخت جلا سکتی ہے۔

● زندگی میں کبھی کسی کو مت ستانا اس وقت شاید آپ طاقت ور ہوں مگر وقت آپ سے زیادہ طاقتور ہے۔

● زمین انسان کو رزق دیتی ہے لیکن جب انسان مرتا ہے تو پھر وہی زمین اسے اپنا رزق بنا لیتی ہے۔

زویا خان ...... راولپنڈی

کے لیے بہت بے چین۔" صائقہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"صائقہ ہر موقع پر تمہارا ذکر کرتی ہے اس لیے تم سے ملنے سے پہلے ہی میں تمہارے بارے میں بہت کچھ جان گئی ہوں۔" روبینہ نے ہنستے ہوئے کہا اور شیری نے بھی اس کی تائید کی۔

"ہاں وہ تمہیں دیوانوں کی طرح چاہتی ہے۔" شیری نے کہا۔

"میں بھی اسے پسند کرتا ہوں کیا اس نے یہ نہیں بتایا کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور کئی بار کہہ چکا ہوں کہ وہ مجھے اپنے گھر والوں سے ملوائے مگر وہ بہت مصروف رہتی ہے۔" ناصر نے شکوہ کیا اور شیری نے چونک کر روبینہ کی طرف دیکھا کیونکہ بددعا بھی اسی موقع سے تعلق رکھتی تھی ان دونوں بہنوں کی شادی انہیں راس نہیں آنا تھی اور اب روبینہ کی کوشش کرنا تھی

کہ وہ اس سے شادی کو اس وقت تک روکے جب تک اس پُراسرار عورت اور اس کی بددعا کے بارے میں کوئی مناسب اقدام نہ کرلے اس نے ناصر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

''کیوں نہ آج رات کا کھانا ہم سب اکٹھے کھائیں، یہ میری طرف سے ہوگا۔'' ناصر نے کہا اور شہر کے مشہور ہوٹل میں کھانے کا پروگرام بنالیا تھا پھر رات کو وہ چاروں اس ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں موجود تھے، صائقہ بہت خوش نظر آرہی تھی اور اس نے ناصر کی فرمائش پر اس کا پسندیدہ گلابی لباس زیب تن کیا تھا۔

''مجھے صائقہ نے بتایا ہے کہ تمہارے منگیتر نے منگنی توڑ دی ہے۔'' ناصر نے کہا۔

''ہاں یہ میرے لیے بہت تکالیف دہ تھا۔''

''یقیناً یہ ہے بھی تکلیف دہ بات۔'' ناصر نے کہا۔

''لیکن اب سب ختم ہوچکا ہے۔'' صائقہ نے روبینہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ یہ سب بھلانے یہاں آئی ہے چنانچہ ہمیں بھی اس واقعے کو دہرانا نہیں چاہیے۔'' صائقہ نے ناصر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں لیکن بعض اوقات بدقسمتی ہمارا تعاقب کرتی ہے پھر اس سے فرار بھی چاہیں تب بھی وہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتی۔'' روبینہ نے کہا۔

''ارے ایسی باتیں مت کرو، روبینہ تمہیں پتا نہیں ناصران چیزوں پر کتنا یقین کرتا ہے۔ تمہیں پتا ہے اگر کسی جمعہ کو تیرہ تاریخ پڑجائے تو یہ اپنے فلیٹ سے باہر نہیں نکلتا اور اس کے پاس خوفناک فلموں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے یہ بڑے شوق سے دیکھتا ہے اور ان پر یقین بھی کرتا ہے۔'' صائقہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تو تم روحوں پر بھی یقین رکھتے ہو؟ بددعاؤں پر یا قسمت پر وغیرہ وغیرہ؟'' روبینہ نے پوچھا۔

''بھئی میں اس پر تو یقین نہیں رکھتا کہ ہماری دنیا میں کسی اور دنیا کی مخلوق ہے لیکن میں کچھ باتوں پر یقین رکھتا ہوں جن کا تعلق ہماری قسمت اور بدقسمتی سے ہوتا ہے۔'' ناصر نے کہا۔

روبینہ نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا لیکن اس نے سوچا کہ وہ کبھی تنہائی میں اسے اپنے ساتھ ہونے والے واقعے کے بارے میں بتائے گی کیونکہ وہ صائقہ کو بہت چاہتی تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ اس کے ساتھ بھی وہی ہو جو روبینہ کے ساتھ ہوا ہے۔

ڈنر سے واپسی پر جب وہ ناصر کی کار میں بیٹھ رہے تھے تو اچانک پارکنگ میں روبینہ کی نظر اس بوڑھی عورت پر پڑی جسے اس نے اپنے غسل خانے کے آئینے میں دیکھا تھا وہ دور کھڑی اسے گھور رہی تھی۔ اس نے نیلے رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر نفرت تھی، روبینہ کی اچانک چیخ نکل گئی۔

''کیا ہوا؟'' شیری نے اسے سنبھالتے ہوئے کہا۔

''وہ...... وہ......'' روبینہ نے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا ہے...... وہاں تو کچھ نہیں ہے۔'' ناصر نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں......'' روبینہ نے جلدی ہی خود کو سنبھال لیا۔

''ارے یہ تھک گئی ہیں، چلو گھر چل کر آرام کرلینا۔'' ناصر نے ہنستے ہوئے کہا صائقہ کے چہرے پر ناگواری تھی شاید اسے اتنے اچھے ڈنر کے اختتام پر روبینہ سے یہ توقع نہیں تھی۔

فلیٹ واپس آنے کے بعد کافی دیر تک وہ شیری سے بات کرتی رہی تھی اس نے شیری کو بتایا تھا کہ

پارکنگ میں اسے وہی پراسرار عورت نظر آئی تھی اور اس کی طرف حقارت سے دیکھ رہی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ غائب ہوگئی تھی۔

''تم نے کیا سوچا ہے تم اپنی بہن کو اس کے چنگل سے کیسے بچاؤ گی؟'' شیری نے پوچھا۔

''میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کیا کروں' میں تو کسی ایسے شخص کو جانتی بھی نہیں ہوں جو اس مصیبت کا توڑ کردے۔'' روبینہ نے کہا۔

''ارے تم تو پاگل ہو' جگہ جگہ ایسے لوگ موجود ہیں۔ پیسے لے کر یہ کام کرتے ہیں۔'' شیری نے کہا۔

''لیکن یہ کیسے پتا چلے کہ کون درست ہے' زیادہ تر لوگ تو پیسے لے لیتے ہیں لیکن انہیں آتا جاتا کچھ نہیں۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو' اس کے علاوہ ایک اور راستہ بھی ہے' نیٹ پر ایسی بہت سی سائٹس ہیں جہاں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اس کام کے ماہر ہیں اور وہ پیسے لے کر ایسے جادو کا توڑ کرتے ہیں۔ لوگوں کو ایک فارم پُر کرنا ہوتا ہے اور اپنا کریڈٹ کارڈ نمبر درج کرنا ہوتا ہے پھر انہیں ایک ای میل کے ذریعے مطلوبہ عمل بھیج دیا جاتا ہے جس سے انہیں کامیابی ملتی ہے اور ان کا ہر مسئلہ حل ہوجاتا ہے۔'' شیری نے اسے بتایا۔

''ہاں میں جانتی ہوں لیکن ابھی میں نے اس بارے میں کچھ فیصلہ نہیں کیا۔'' روبینہ نے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے کہ تم صائقہ کو اس بارے میں بتادو وہ اب پینتیس برس کی ہونے والی ہے اور تمہارے کہنے کے مطابق جب وہ اس عمر کو پہنچے گی تو اس کی موت واقع ہوجائے گی۔ تم یہاں آئی بھی اس لیے ہو کہ اسے بچاسکو۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو لیکن میں اسے کچھ بتا نہیں سکتی' وہ کبھی یقین نہیں کرے گی اور پھر تم نے اس کی عادت دیکھی ہے وہ کسی چیز کو سنجیدگی سے نہیں لیتی۔'' روبینہ نے مایوسی سے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس مسئلہ میں ہمیں اس کا اعتماد حاصل کرنا ہوگا۔''

''ہوں...... سوچوں گی اس بارے میں۔'' روبینہ نے شیری کی بات کا جواب دیا پھر وہ سونے کے لیے لیٹ گئی کیونکہ دوسرے دن انہیں ایک پکنک پر جانا تھا جو صائقہ نے اس کے لیے رکھی تھی کیونکہ صائقہ کے خیال میں روبینہ کی شادی رک جانے سے اس کے ذہن پر بُرا اثر پڑا تھا اور وہ اس کا دھیان بٹانا چاہتی تھی۔

اگلے روز صبح کے ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے پکنک کے انتظامات مکمل کیے تھے اور پھر ناصر کے آتے ہی وہ لوگ ساحل سمندر پر پکنک منانے چلے گئے تھے وہ جس مقام پر گئے تھے وہاں بہت پرفضا منظر تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں آسمان پر تھوڑے بادل تھے اور سمندر کی موجوں کی آواز نے ایک خوب صورت سماں باندھ دیا تھا' جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں بھی اپنا جلوہ دکھا رہی تھیں' روبینہ کو یہاں آکر واقعی سکون کا احساس ہوا تھا۔

''آؤ روبینہ! ہم اس پہاڑ پر چلتے ہیں۔'' صائقہ نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا اور شیری اور ناصر کو بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا' روبینہ اس کے ساتھ پہاڑی کی طرف بڑھ گئی تھی۔

''دیکھو ذرا سنبھل کر قدم رکھو' یہ پتھر بہت اونچے نیچے ہیں۔'' شیری نے روبینہ سے کہا جو ایک بڑے سے پتھر پر قدم رکھنے کی کوشش کررہی تھی۔

''ہاں میں سنبھل کر ہی قدم رکھ رہی ہوں۔'' اس نے جواب دیا پھر اچانک نہ جانے کیسے اس کا پاؤں پھسلا تھا اور وہ گر گئی تھی' نیچے گرتے ہوئے اس نے

دیکھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے وہی منظر تھا جو اس نے اپنی گاڑی میں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا' سامنے نیلا آسمان تھا۔ جس پر سفید بادلوں کے ٹکڑے نظر آرہے تھے اور اس نے سامنے صائقہ سر پر اسکارف باندھے کھڑی تھی پھر وہ نیچے گہرائی میں گری تھی اور روبینہ کی چیخ نکل گئی تھی۔

''صائقہ......'' اس نے زور سے کہا تھا۔

''کیا ہوا......تم ٹھیک تو ہو؟'' صائقہ نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا اور اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔

''میں نے تمہیں گرتے ہوئے دیکھا۔'' روبینہ نے کہا اور صائقہ کی ہنسی نکل گئی۔

''مجھے...... ارے تم گری ہو' تم خیالوں میں رہنا چھوڑ دو۔'' صائقہ نے اسے ہنستے ہوئے نصیحت کی۔

''نہیں صائقہ! تم نہیں سمجھو گی۔'' روبینہ نے روہانسی ہوکر کہا' ناصران لوگوں سے کچھ دور پہاڑی پر کھڑا سمندر کا نظارہ دیکھ رہا تھا۔

''ادھر بیٹھو میری بات سنو۔'' روبینہ نے صائقہ کو ایک جگہ بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا پھر اس نے شیری کی موجودگی میں صائقہ کو ساری بات بتادی اور یہ بھی بتایا کہ اس کی شادی کی تقریب کس وجہ سے نہیں ہوئی اور اب صائقہ کی زندگی کو بھی خطرہ درپیش ہے اسے کسی کی بددعا ہے کہ وہ پینتیس سال کی ہونے پر مرجائے گی اور اس کی شادی نہیں ہوگی۔

''میں یہاں تمہیں بچانے آئی ہوں' تم اگلے ہفتے پینتیس کی ہوجاؤ گی اور تمہیں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آسکتا ہے۔'' روبینہ نے کہا تو صائقہ ہنسنے لگی۔

''میں یقین نہیں کرتی؟''

''چلو تم یقین نہ کرو مگر احتیاط تو کرسکتی ہو۔''

''تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟'' صائقہ نے پوچھا۔

''کچھ دن کے لیے ناصر سے دور رہو' کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے چکر میں اس کو کوئی حادثہ پیش آجائے۔''

''اللہ نہ کرے روبینہ! تم کیسی باتیں کررہی ہو؟'' صائقہ نے قدرے غصے سے کہا۔

''تم میری بات مان لو پلیز یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔'' روبینہ نے قدرے نرمی سے کہا۔

''ہوں......'' صائقہ نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے۔

اس رات جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو دیر تک شیری سے باتیں کرتی رہی تھی اور شیری اسے سمجھاتی رہی تھی کہ وہ پریشان نہ ہو اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکل آئے گا۔ دوسرے دن شیری اور روبینہ ایک ایسی عورت سے ملنے گئے جو ان جادو کے اثرات کے بارے میں علم رکھتی تھی' وہ لوگوں کا علاج بھی کرتی تھی اور اس کا پتا اس کی خالہ نگہت نے اسے بتایا تھا اور ہدایت کی تھی کہ وہ کسی بھی پریشانی کی صورت میں اس سے ضرور ملے چنانچہ آج کا دن روبینہ نے اس عورت سے ملنے کے لیے رکھا تھا' اس سلسلے میں اس نے صائقہ سے مکمل رازداری رکھی تھی ورنہ شاید وہ اسے ایسا کرنے سے روک دیتی۔ اس عورت کا پتا ڈھونڈنے میں انہیں زیادہ مشکل نہیں ہوئی تھی وہ اپنے علاقے میں خاصی مشہور تھی اور لوگ اسے عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

''تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ تمہیں اور تمہاری بہن کو کسی کی بددعا ہے اور وہ اثر دکھا رہی ہے۔'' اس عورت نے روبینہ سے پوچھا تو اس نے ساری تفصیل بتادی جو اس کی خالہ سے اسے معلوم ہوئی تھی وہ بہت غور سے اس کی باتیں سنتی رہی تھی اس کی بات مکمل ہونے کے بعد اس عورت نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا اور آنکھیں بند کیے ہی کچھ پڑھنے لگی تھی اس کے

لمبے سیاہ بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ وجد کے عالم میں جھوم رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھول دی تھیں اور بغور روبینہ کی طرف دیکھنے لگی۔

''وہ آخری بار تمہیں کب نظر آئی تھی؟'' اس نے پوچھا

''ایک دن پہلے جب ہم لوگ سمندر کے کنارے پکنک پر گئے تھے تب میں نے اپنی بہن کو بھی تصور میں پہاڑی سے نیچے گرتے ہوئے دیکھا۔'' روبینہ نے بتایا۔

''ہوں......'' اس عورت نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''تم اسے ایک روح یا ایک تصوراتی ہیولا سمجھتی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''جی ہاں کیونکہ وہ مجھے اسی طرح نظر آئی ہے' میں یہی سمجھتی ہوں۔'' روبینہ نے کہا۔

''یہ درست ہے کہ وہ تمہیں خیالی طور پر نظر آتی ہے لیکن وہ زندہ ہے اور وہ تمہارا تعاقب کر رہی ہے اسے جیسے ہی موقع ملے گا وہ اپنے علم کے ذریعے تمہیں پھر نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گی۔''

''وہ مجھے تو نقصان پہنچا چکی ہے' میری شادی رکوا دی اور اب وہ میری بہن......'' روبینہ کی سسکی نکل گئی۔ ''میں اپنی بہن کے لیے بہت پریشان ہوں اور اسے ہر قیمت پر بچانا چاہتی ہوں۔''

''فطری بات ہے وہ تمہاری بہن ہے' میں تمہیں کچھ چیزیں دے رہی ہوں اور جس طرح کہہ رہی ہوں اس طرح ہی انہیں استعمال کرنا ہے پھر دو دن بعد آ کر مجھے بتانا کہ کیا ہوا؟''

''ٹھیک ہے۔'' روبینہ نے جواب دیا اس کے بعد اس عورت نے ایک سیاہ رنگ کا دھاگا اور چند کاغذی تعویز اسے دیے تھے اور ہدایت کی تھی کہ سیاہ دھاگا صائقہ کے تکیے میں رکھ دیا جائے اور تعویز پانی میں گھول کر وہ بھی پیئے اور صائقہ کو بھی پلائے اس کے بعد وہ واپس چلی آئی تھی۔

''روبینہ! دھاگا تو اس کے تکیے میں ہم اس کی غیر موجودگی میں رکھ دیں گے لیکن پانی کیسے پلائیں گے۔'' شیری نے اس سے پوچھا۔

''میں ان کو گھول کر پانی میں ملا دوں گی اور وہی پانی اس کے کمرے میں رکھی پانی کی بوتل میں ڈال دوں گی۔'' روبینہ نے جواب دیا پھر اسی دن انہیں یہ سب کرنے کا موقع بھی مل گیا تھا۔

دو دن تک روبینہ صورت حال کا جائزہ لیتی رہی لیکن کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی تھی وہ مزید پریشان ہوگئی تھی' تیسرے روز وہ شیری کے ساتھ پھر اس عورت کے پاس جانے کے لیے گھر سے نکلی تھی پھر وہ اس عورت کے گھر کے پہنچی ہی تھیں کہ ایک گلی کے کونے پر روبینہ کو پھر وہی بوڑھی عورت نظر آئی تھی اس بار اس کی جھلک شیری نے بھی دیکھی تھی' روبینہ تیزی سے گلی کے اس حصے کی طرف بڑھی تھی لیکن وہ عورت دوسری گلی میں داخل ہوگئی تھی' روبینہ نے بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ شیری بھی اس کے ساتھ تھی کچھ دور جا کر وہ عورت پیچھے مڑی اور اس نے بڑی زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ ان دونوں کی طرف دیکھا پھر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ روبینہ برابر اس کا پیچھا کر رہی تھی پھر وہ عورت ایک بوسیدہ سے گھر میں داخل ہوگئی تھی روبینہ اور شیری نے بھی اس کے پیچھے اس مکان میں داخل ہونے میں دیر نہیں کی تھی لیکن اندر جانے کے بعد وہ عورت انہیں نظر نہیں آئی' مکان میں ٹوٹا پھوٹا فرنیچر پڑا ہوا تھا اور مکان خالی تھا وہ دونوں حیران تھیں کہ ان کی آنکھوں کے سامنے عورت اس مکان میں داخل ہوئی تھی لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا اس بار شیری نے بھی

اسے دیکھا تھا۔

''تم نے دیکھا وہ کتنی پُراسرار ہے۔'' روبینہ نے شیری سے کہا جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''ہاں اس کا حلیہ بڑا عجیب ہے اسے دیکھ کر ڈر لگتا ہے۔'' شیری نے کہا پھر وہ باہر آ گئی تھیں روبینہ نے اس محلے کے ایک شخص سے اس مکان کے بارے میں پوچھا تو اسے پتا چلا کہ وہ مکان کافی عرصے سے خالی پڑا تھا اور مشہور تھا کہ وہاں آسیب ہے چنانچہ کوئی اس میں رہنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ اس دن وہ دونوں عاملہ عورت کے پاس نہیں گئے تھے اور واپس گھر آ گئے تھے۔ روبینہ بہت خوفزدہ تھی اب تک وہ عورت صرف اسے نظر آتی تھی لیکن آج وہ دن کی روشنی میں شیری کے ساتھ تھی اور شیری نے بھی اسے دیکھا تھا چنانچہ کم از کم اب شیری یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ عورت روبینہ کا کوئی واہمہ ہے۔

اس رات جب وہ دونوں سونے کے لیے لیٹیں تو بہت دیر تک اس بارے میں باتیں کرتی رہی تھیں انہوں نے صائقہ کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

''شیری! مجھے ڈر لگ رہا ہے میرا خیال ہے اسے اندازہ ہو گیا ہے کہ ہم اس عاملہ کے پاس جا رہے ہیں اور اس کے علم کا توڑ کروانا چاہتے ہیں جس سے اسے نقصان بھی پہنچ سکتا ہے اب اور زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ وہ اپنی پوری قوت سے اپنی مدافعت کرے گی اور ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گی۔'' روبینہ نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

''ہاں' تم ٹھیک کہتی ہو لیکن تم گھبراؤ نہیں' میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' شیری نے کہا۔

''سوچ لو شیری! وہ تمہیں بھی نقصان پہنچا سکتی ہے۔''

''میں تمہاری سچی دوست ہوں اور تمہاری ہر مصیبت میں تمہارے ساتھ ہوں' تم پریشان مت ہو۔ میں تم پر یقین بھی کرتی ہوں اور تمہارا ساتھ دینے کا فیصلہ بھی کر چکی ہوں اگر ضرورت پڑی تو اپنے شوہر سے بات کروں گی وہ ضرور ہمارا ساتھ دیں گے۔'' شیری نے اسے سمجھایا تو اسے کچھ اطمینان ہوا پھر وہ سو گئی تھی۔

دوسری صبح اس کی آنکھ فون کی گھنٹی بجنے پر کھلی تھی اس نے ریسور اٹھایا تھا۔ دوسری طرف سے جو آواز اسے سنائی دی وہ اس کے لیے اجنبی تھی۔

''ہیلو! مجھے یہ نمبر صائقہ کی والدہ نے دیا ہے' مجھے شیری سے بات کرنی ہے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''کیا بات ہے' آپ کون ہیں؟ شیری سے کیا کام ہے آپ کو؟'' روبینہ نے پوچھا۔

''پلیز آپ میری ان سے بات کرا دیں۔''

''اچھا۔'' روبینہ نے کہا اور سوتی ہوئی شیری کو آواز دے کر اٹھایا۔

''شیری...... شیری...... اٹھو دیکھو تمہارا فون ہے کوئی تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔'' روبینہ کے آواز دینے پر شیری اٹھی تھی اور اس نے ریسیور لے لیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

''کک...... کیا، کیا ہوا؟'' اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا' روبینہ بھی چونک کر اسے دیکھنے لگی پھر شیری نے خاموشی سے دوسری طرف سے کہی جانے والی بات سنی تھی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور آواز کانپ رہی تھی۔

''وہ...... وہ کہاں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ ''میں پہنچ رہی ہوں۔'' اس نے جلدی سے جواب دیا اور

ریسیور رکھ کر باتھ روم کی طرف بھاگی۔
"کیا ہوا......شیری بتا تو کیا بات ہے......کس کا فون تھا؟" روبینہ نے اس کے پیچھے جاتے ہوئے پوچھا' شیری ایک دم رکی پھر اس کی طرف مڑی۔
"میرے شوہر کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے' وہ اسپتال میں ہیں اور ان کی حالت نازک ہے۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔
"کیا......؟" روبینہ کے لہجے میں حیرت تھی وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شیری کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"مجھے ابھی جانا ہے۔" شیری نے کہا اور باتھ روم میں داخل ہوکر دروازہ بند کرلیا پھر اس نے تیار ہونے میں دیر نہیں لگائی تھی صائقہ کو پتا چلا تو اس نے بھی افسوس کیا۔
"میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔" روبینہ نے پیشکش کی۔
"نہیں، میں چلی جاؤں گی تم خود بھی پریشان ہو' اپنا خیال رکھنا۔" روبینہ نے کہا اور تیزی سے اپنا سامان لیے گھر سے نکل گئی' روبینہ حیرت سے اسے جاتے دیکھتی رہی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ شیری کے شوہر کے ایکسیڈنٹ میں یقیناً اس پراسرار عورت کا ہاتھ ہے۔ شیری اس کا ساتھ دینے کا عزم کرچکی تھی اور عاملہ کے پاس بھی اس کے ساتھ گئی تھی چنانچہ شیری کو راستے سے ہٹانے کے لیے اس کے شوہر کو حادثے کا شکار کیا گیا تھا۔ اب روبینہ اکیلی تھی وہ صائقہ کو بھی کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی اور صائقہ کی عمر پینتیس سال ہوچکی تھی اس عمر میں اس عورت نے اسے مرنے کی بددعا دی تھی اب صائقہ کے پاس وقت نہیں تھا اور روبینہ ہی اسے بچاسکتی تھی۔ وہ تیزی سے اندر کی طرف بھاگی اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اب اکیلے ہی مسئلے کو حل کرے گی۔ وہ جلدی جلدی اس عاملہ کے پاس جانے کے لیے تیار ہونے لگی' صائقہ نے بہت پوچھا کہ کہاں جارہی ہے لیکن اسے کچھ نہیں بتایا بس یہی کہا ایک ضروری کام سے جارہی ہوں' واپسی پر سب بتاؤں گی۔ وہ تیار ہوکر گھر سے نکل گئی اور ایک رکشہ لے کر عاملہ کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔
اس کا رکشہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا روڈ پر کافی رش تھا کہ اچانک نہ جانے کہاں سے ایک بوڑھی عورت رکشے کے سامنے آگئی' رکشہ والے نے تیزی سے بریک لگائے اور رکشے کا بیلنس برقرار نہیں رکھ سکا وہ ایک سمت میں جھکا اور پیچھے آنے والی گاڑی اسے اپنے ساتھ گھسیٹتی ہوئی کافی دور تک لے گئی پھر رکشہ الٹ گیا۔ روبینہ رکشے کے نیچے دبی ہوئی تھی اس کے کافی چوٹیں آئی تھیں' وہ اپنے اطراف جمع ہونے والے لوگوں کو دیکھ رہی تھی اسے سب کچھ گھومتا ہوا محسوس ہورہا تھا پھر اس کی بند ہوتی ہوئی آنکھوں نے اپنے اوپر ہی سرمئی لباس میں ملبوس بکھرے بالوں والی بوڑھی عورت کو جھکے ہوئے دیکھا تھا اس کے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں تھے پھر روبینہ اندھیروں میں ڈوبتی چلی گئی۔
جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو اسپتال میں پایا' صائقہ اس کے پاس ہی موجود تھی۔
"مجھے کیا ہوا تھا؟" روبینہ نے پوچھا۔
"تم ٹھیک ہو؟ تمہارا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔" صائقہ نے بتایا۔
"میرا ایکسیڈنٹ......؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "لیکن ایکسیڈنٹ تو شیری کے شوہر کا ہوا تھا وہ چلی گئی۔" روبینہ نے کہا۔
"لیکن تم بھی تو اس کے جانے کے بعد تیار ہوکر گھر سے نکلی تھیں' میں تم سے پوچھتی رہی کہ تم کہاں جارہی ہو لیکن تم نے کچھ نہیں بتایا تھا۔" صائقہ نے

کہا۔

''ہاں...... '' روبینہ کو یاد آیا وہ عاملہ کے گھر جارہی تھی کہ اچانک اس کے رکشے کے آگے وہ بوڑھی عورت......

''اوہ صائقہ! تم نہیں سمجھو گی' دیکھو ہم دونوں کی جان خطرے میں ہے۔'' روبینہ نے صائقہ سے کہا۔

''تم پاگل ہو روبینہ! بھلا ہمیں کس سے خطرہ ہوسکتا ہے؟'' صائقہ نے کہا۔

''جس نے میری شادی رکوائی' مجھے میرے منگیتر سے الگ کردیا جس نے شیری کے شوہر کا ایکسیڈنٹ کروایا اور اسے مجھ سے جدا کردیا۔ جس نے میرا ایکسیڈنٹ کروا کر مجھے سزا دی۔''

''تمہیں سزا دی؟ کس بات کی سزا؟'' صائقہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں بچانے کی جدوجہد کرنے کی سزا۔'' روبینہ نے جواب دیا۔

''تم کیا کہہ رہی ہو' میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔'' صائقہ نے الجھے لہجے میں کہا۔

''دیکھو صائقہ!'' روبینہ نے اسے سمجھانے کے لیے بات شروع کی تو صائقہ نے اسے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا۔

''بس ابھی مت بولو' اپنے ذہن پر زور مت ڈالو' تم بہت زخمی ہو۔ تمہارے سر میں بھی چوٹیں آئی ہیں' تم آرام کرو' ہم پھر بات کریں گے۔''

''لیکن تمہیں میری بات سننا ہوگی یہ ضروری ہے۔'' روبینہ نے کہا۔

''ہاں ضرور سنوں گی لیکن ابھی نہیں' ابھی تم آرام کرو۔'' صائقہ نے جواب دیا اور تبھی وہاں ایک سسٹر آگئی تھی جس نے روبینہ کو انجکشن لگایا تھا اور وہ پھر اندھیروں میں چلی گئی تھی۔

چند گھنٹوں بعد جب اسے ہوش آیا تھا تو صائقہ اس کے پاس موجود تھی اب کے بار ناصر بھی وہاں موجود تھا لیکن ناصر کو دیکھ کر روبینہ کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آرہے تھے۔

''اوہ صائقہ! تم دیکھ رہی ہو یہ کون ہے...... دیکھو...... اسے دیکھو۔'' روبینہ پاگلوں کے انداز میں ناصر کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''ارے روبینہ! تمہیں کیا ہوگیا ہے یہ ناصر ہے میرا منگیتر ہماری شادی ہونے والی ہے' تم جانتی تو ہو۔'' صائقہ نے بُرا ماننے والے انداز میں کہا۔

''میں اسے نہیں کہہ رہی ہوں اس کے پیچھے دیکھو' وہ بوڑھی عورت...... وہ دیکھو...... وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہے' دیکھو......''

''لیکن یہاں تو میرے' تمہارے اور ناصر کے علاوہ کوئی بھی نہیں ہے۔''

''نہیں صائقہ وہ دیکھو...... وہ...... سامنے تو کھڑی ہے۔'' روبینہ نے کہا لیکن اس بار صائقہ نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا وہ ناصر کی طرف مڑ گئی تھی۔

''ناصر! میرا خیال ہے اس کے دماغ پر بھی خاصی چوٹ آئی ہے' یہ بہکی بہکی باتیں کررہی ہے اس حادثے میں اس کی ٹانگیں تو ختم ہی ہوچکی تھیں' اب دماغ بھی......'' صائقہ افسردہ ہوگئی تھی۔

''میں کہتی ہوں تم ناصر سے دور ہوجاؤ' ناصر کو چھوڑ دو۔ ورنہ وہ تمہیں مار دے گی۔'' روبینہ اپنی دھن میں بولے جارہی تھی جیسے اس نے صائقہ کی بات ہی نہ سنی ہو۔

''نہیں' ناصر کو کچھ نہیں ہوگا تم ایسی باتیں مت کرو۔'' صائقہ نے بُرا ماننے والے انداز میں کہا۔

''تم میرا یقین کیوں نہیں کرتیں۔'' روبینہ نے

بے بسی سے کہا لیکن صائقہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

پھر تقریباً ایک ماہ تک وہ اسپتال میں رہی تھی اس عرصے میں اسے پتا چلا تھا کہ شیری کا شوہر ایکسیڈنٹ میں مارا گیا تھا' شیری پھر اس سے ملنے نہیں آئی' صائقہ کبھی کبھی اسے وہیل چیئر پر بٹھا کر اسپتال کے لان میں گھمانے لے جاتی تھی۔ اس نے روبینہ کو بتایا تھا کہ اس کے پیروں کی معذوری عارضی ہے کچھ دن میں چلنے پھرنے لگے گی لیکن وہ جانتی تھی کہ اس نے روبینہ سے جھوٹ بولا تھا وہ اب اپنی ٹانگوں پر کھڑی نہیں ہوسکتی تھی لیکن یہ بات روبینہ کو بتانے کی صائقہ میں ہمت نہیں تھی کیونکہ روبینہ ویسے بھی ذہنی مریض ہوکر رہ گئی تھی' اب اسے ہر وقت ہر طرف وہی بوڑھی عورت نظر آتی تھی جو اسے مارنے کی کوشش کرتی تھی لیکن صائقہ کو وہ کبھی نظر نہیں آئی اور صائقہ اس کو روبینہ کے ذہن کا خلل سمجھتی رہی۔

اسپتال سے فارغ ہوکر گھر آتے ہوئے انہیں ایک ہفتہ ہی ہوا تھا اور یہ ہفتہ صائقہ کے لیے بہت مشکل تھا۔ اسے ہر وقت روبینہ کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ اب اس نے اپنے فنکشنز اور میوزک کے پروگراموں پر توجہ کم کردی تھی' ملازمت سے بھی اکثر چھٹی ہوجاتی تھی۔ وہ بہت پریشان تھی اس کی زندگی کا انداز ہی بدل گیا تھا' روبینہ کی ذہنی حالت کی وجہ سے ناصر بھی اس سے کھنچا کھنچا رہنے لگا تھا کیونکہ روبینہ ناصر کے سامنے ہی صائقہ کو ناصر سے علیحدگی پر مجبور کرتی رہتی تھی پھر ایک دن ہمت کرکے صائقہ نے اسے بتا ہی دیا تھا۔

''روبینہ ہم لوگ اگلے ہفتے واپس اپنے گھر جارہے ہیں' امی کے پاس۔'' صائقہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔

''خیریت...... یہ اچانک گھر واپسی کا خیال کیسے آ گیا؟'' روبینہ نے پوچھا۔

''ہاں میں نے سوچا کہ ایسے موقع پر اپنی والدہ کے ساتھ ہونا بہت ضروری ہے۔''

''کیسے موقع پر؟'' روبینہ حیران تھی۔

''بھئی میں نے امی سے بات کرلی ہے اور انہیں بتادیا ہے کہ میں ناصر سے شادی کا فیصلہ کرچکی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ بھی مجھے چھوڑ جائے جیسے محمود نے تمہیں چھوڑ دیا۔ میں مزید دیر کرنا نہیں چاہتی' امی کو تمہاری بھی فکر ہے وہ تمہیں جلد از جلد صحت یاب دیکھنا چاہتی ہیں۔''

''تم پاگل تو نہیں ہوگئی ہو؟ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ وہ ہر وقت ہمارے سروں پر سوار ہے' تم نے محمود اور میرا حشر دیکھا' تم نے شیری کے شوہر کا حال دیکھا اور اب تم مجھے دیکھ رہی ہو' اب بھی تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں اس کے چنگل سے تمہیں چھڑانا چاہتی ہوں' اسی لیے میں اس کے عتاب کا شکار ہورہی ہوں اور تم...... تم کچھ سمجھنے کو تیار ہی نہیں ہو۔'' روبینہ نے روہانسی ہوکر کہا۔

''روبینہ تم جانتی ہو میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتی اور تمہاری باتیں تو بالکل بے سروپا ہیں' کیا میں اور تم ساری زندگی شادی نہیں کریں گے؟'' صائقہ نے غصے سے کہا۔

''دیکھو' زندگی سے زیادہ تو کچھ نہیں ہے اگر شادی نہ کرکے ہم زندہ رہ سکتے ہیں تو کیا حرج ہے؟''

''میری سمجھ میں یہ منطق نہیں آتی۔'' صائقہ نے کہا اور پھر اس موضوع پر مزید بات نہیں کی۔

اگلے ہفتے وہ لوگ ناصر کے ساتھ واپس اپنی والدہ

کے پاس پہنچ گئے تھے صائقہ اور ناصر کی شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں، روبینہ کا خوف سے برا حال تھا، اس کے کہنے کے مطابق وہ بوڑھی عورت بہت ناراض تھی اور ہر وقت اس کے آس پاس ہی رہتی تھی لیکن کسی کو نظر نہیں آتی تھی پھر ایک روز جب شادی میں صرف ایک دن رہ گیا تھا اور صائقہ مایوں بیٹھی ہوئی تھی وہ عورت پھر روبینہ کو نظر آئی، وہ روبینہ کی وہیل چیئر کے برابر ہی کھڑی تھی اور غصے سے اسے گھور رہی تھی۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ اگر صائقہ کی شادی ہوئی تو وہ نہیں بچے گی۔''

''میں نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی تھی۔'' روبینہ نے کہا اور صائقہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی اس وقت وہ کمرے میں روبینہ کے ساتھ اکیلی تھی اس کے آگے تھالی میں مہندی اور اُبٹن سجی تھی جس کے درمیان موم بتیاں روشن تھیں۔

''تم کس سے بات کررہی ہو؟'' صائقہ نے اس سے پوچھا۔

''اسی سے..... وہی بوڑھی عورت..... یہ تو جان کا عذاب بن گئی ہے، دیکھو کیسے مجھے گھور رہی ہے۔''

''تم تو پاگل ہوگئی ہو، یہاں تمہارے اور میرے علاوہ کوئی بھی تو نہیں۔'' صائقہ نے کہا۔

''تم تو کبھی میرا یقین نہیں کرو گی، میں آج اس کو بتاتی ہوں۔'' روبینہ نے کہا اور اپنی وہیل چیئر اپنے انداز سے اس بوڑھی عورت کے ہیولے کی طرف گھمائی جو اس کے اور صائقہ کے درمیان کھڑی تھی وہ پیچھے کو کھسک گئی تھی اور صائقہ کے قریب چلی گئی تھی۔

''تم وہاں سے ہٹو۔'' روبینہ نے اور تیزی سے وہیل چیئر اس کی طرف بڑھائی وہ عورت درمیان سے غائب ہوگئی اور روبینہ اپنی وہیل چیئر سمیت زور سے صائقہ سے ٹکرائی اور صائقہ موم بتیوں سے سجی مہندی اور اُبٹن کے تھال پر گرگئی اس کے کپڑوں میں فوراً آگ لگ گئی تھی روبینہ کو جیسے کوئی ہوش نہیں رہا تھا، بوڑھی عورت کونے میں کھڑی قہقہے لگارہی تھی۔

''میں نے کر دکھایا، تم سمجھتی تھیں مجھے ہرادو گی۔ دیکھو وہ جل رہی ہے، ہاہاہا.....''

''میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی، تم نے میری شادی بھی ختم کرائی تھی.....'' روبینہ چیخ رہی تھی اس کی آوازیں سن کر لوگ کمرے میں آگئے تھے اور صائقہ کو بچانے کی کوشش کررہے تھے لیکن اب بہت دیر ہوچکی تھی۔ صائقہ بہت زیادہ جل گئی تھی اسے فوراً ہی اسپتال بھجوایا تھا جہاں سے کچھ دیر بعد اس کی موت کی خبر آگئی تھی۔ روبینہ کو کوئی ہوش نہیں تھا وہ واقعی اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی تھی۔

''تم زندہ رہو گی، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔'' بوڑھی عورت کے ہیولے نے اس سے کہا اور وہ چیخ رہی تھی۔

''دیکھو وہ قاتل ہے..... دیکھو اس نے صائقہ کو مارا ہے، دیکھو..... یہ سامنے کھڑی ہے۔'' لیکن کسی نے بھی اس کی بات کا یقین نہیں کیا تھا سب کا خیال تھا کہ وہ بہن کی موت کے صدمے سے پاگل ہوگئی تھی۔

''جب تک تم زندہ ہو میں تمہارے ساتھ ہوں، میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''دیکھو..... دیکھو یہ مجھے ماررہی ہے، دیکھو وہ میری طرف دیکھ رہی ہے..... دیکھو یہ میری طرف بڑھ رہی ہے۔ اسے روکو..... اسے پکڑو..... اسے دیکھو.....'' لیکن اب اس کی چیخ و پکار سننے والا کوئی نہیں تھا۔



مقدس درخت

محمد سلیم اختر

پختہ عقیدہ اور سوچ انسان کو مافوق الفطرت اور شیطان بھی بنا دیتی ہے اور فرشتہ بھی وہ پتھر کے خداؤں سے روزی بھی مانگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا عاجز بندہ بن کر اس کے آگے سجدہ ریز بھی ہوجاتا ہے۔
ایک دیہاتی نوجوان کی روداد، اس کا دعویٰ تھا کہ اس کی جان صحن میں لگے درخت میں ہے۔

میں بیس برس بعد پاکستان لوٹا تھا۔ میرے ہمراہ میری انگریزی بیوی ریتا بھی تھی‘ میں نے اور ریتا نے محبت کی شادی کی تھی۔ اب ہمارے بچے جوان تھے اپنے اپنے گھروں کے ہوگئے تھے پھر بھی ہماری محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ان بیس برسوں میں میرے والدین فوت ہوگئے تھے‘ صرف ایک بڑا بھائی تھا جس نے گاؤں میں زمینوں اور دیگر امور کی ذمہ داری سنبھال رکھی تھی اس لیے مجھے اب بھی کوئی فکر اور پریشانی نہ تھی۔ کچھ عرصہ بعد جب بڑے بھائی کا بھی انتقال ہوگیا تو میں نے اور ریتا نے پاکستان میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا پروگرام بنایا اور پاکستان آ گئے۔ ہم دونوں میاں بیوی کو دیہاتی زندگی اچھی لگتی تھی‘ ہم دونوں کو ہی باغبانی کا بھی شوق تھا اور یہ شوق مجھے اپنے ابا جان سے ورثہ میں ملا تھا‘ گاؤں میں ہماری کئی ایکڑ زمین تھی اس کے علاوہ انہوں نے ایک باغ بھی بنا رکھا تھا جس میں کئی قسم کے پھلوں اور پھولوں کے درخت تھے۔

میں جب گاؤں آیا تو دیکھا کہ باغ میں خاصی توسیع کردی گئی ہے اس میں تمام قسم کے پھل اور پھولوں کے پودے موجود تھے۔ ابا مرحوم نے اپنے شوق کی تکمیل کی خاطر خاصی رقم خرچ کرکے کئی نایاب قسم کے پودے دور دراز سے منگوائے تھے‘ شاید یہ باغ کے مالی قدیر خان کی محنت کا اثر تھا کہ باغ میں ہریالی ہی ہریالی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ قدیر بہت عرصہ سے ہمارے پاس کام کررہا تھا۔ باغ کے اندر ہی اسے ایک چھوٹا سا کچا سا مکان بنا کردیا گیا تھا‘ جہاں وہ اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ قدیر خان بھی اس ماحول کا اس قدر عادی تھا کہ وہ اب کہیں اور جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔

مجھے اور ریتا کو باغ اور اس کی تراش خراش بہت پسند آئی اور ہم قدیر خان کے کام سے بھی بہت خوش ہوئے۔ میں نے قدیر خان کی تنخواہ اور دیگر سہولیات میں اضافہ کردیا جس پر وہ بہت ہی خوش ہوا۔ قدیر خان بے حد کم گو اور خاموش طبع آدمی تھا۔ وہ دوسرے کاموں میں جس قدر کھویا کھویا اور سست نظر آتا تھا۔ باغبانی میں اسی قدر مہارت اور چستی دکھاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ابا جان کے وقتوں سے ہمارے پاس کام کررہا تھا۔ اس کی یہی خوبی مجھے بھی پسند آئی اور میں اس کی معمولی خامیوں اور غلطیوں کو بھی نظر انداز کردیتا۔ اسے پھولوں اور پودوں سے والہانہ محبت تھی‘ وہ اپنے کام میں مگن رہتا تھا۔ لگتا تھا اسے کوئی غم فکر اور پریشانی نہیں ہے اور باغبانی ہی اس کی زندگی کا مقصد ہے اور وہ زندہ ہی ان کی خدمت کے لیے ہے اس کی انگلیوں کا لمس خشک اور مردہ پودوں کے لیے بھی پیغام حیات لے آتا تھا۔

اُدھر صبح ہوتی اور اُدھر وہ پودوں کی کانٹ چھانٹ

اور تراش خراش شروع کر دیتا۔ میں کسی بھی وقت اسے باغ کے کسی گوشے میں کچھ نہ کچھ کرتے ہوئے ہی پاتا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ بظاہر باغبانی کی خاطر ہی زندہ ہے۔

آہستہ آہستہ میں اور ریٹا گاؤں کے ماحول میں رچ بس رہے تھے‘ عرصہ بعد گاؤں آ کر ابھی میں پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہو پا رہا تھا۔ گاؤں کی عورتیں کم ہی حویلی میں آتی تھیں کیونکہ ان کو انگریزی نہ آتی تھی اور ریٹا پنجابی اور اردو نہیں جانتی تھی۔ قدیر خان اور مجھ میں جسمانی اور ذہنی طور پر خاصا تضاد تھا۔ قدیر خان ایک ان پڑھ کھویا کھویا اور کمزور صحت کا مالک تھا جبکہ میں صحت مند پڑھا لکھا اور ذہین تھا البتہ قدیر خان کی آنکھوں کی چمک لاجواب تھی۔ وہ محبت اور زندگی کی چمک تھی اس چمک میں ایک لافانی سی کیفیت محسوس ہوا کرتی تھی۔ قدیر خان مجھ سے عمر میں بڑا تھا اس کی شادی بھی ہو چکی تھی مگر اولاد نہیں تھی۔ میں نے اس کی بیوی کو ابھی تک نہیں دیکھا تھا نہ ہی میں نے اس سے کہا اور نہ ہی وہ خود اپنی بیوی کو ہماری حویلی میں لایا۔ اس کی بیوی کا نام صغریٰ تھا سنا تھا کہ صغریٰ بہت ہی حسین ہے اور عمر میں قدیر خان سے دس برس چھوٹی ہے مگر میں نے قدیر خان سے کبھی اس کے بارے میں نہ پوچھا تھا۔



مجھے گاؤں میں رہتے ہوئے چھ ماہ گزرے تو مجھے ایک المناک سانحہ سے دوچار ہونا پڑا‘ سردیوں کے دن تھے دو تین دن سے بارش ہو رہی تھی اور ٹھنڈی ہوائیں بھی چل رہی تھیں۔ ریٹا شام کو باغ میں گھوم رہی تھی کہ اسے سردی لگ گئی اور اچانک اسے اپنے سینے میں سخت درد کی شکایت ہوئی‘ وہ جلدی سے کمرے میں آ گئی اس وقت اس پر نمونیہ کا حملہ ہو چکا تھا‘ ڈاکٹر کے آتے اور اسے طبی امداد ملنے سے پہلے ہی اس کی حالت خاصی خراب ہو گئی وہ دو دن تک موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہی اور پھر وہ مجھے تنہا چھوڑ کر اگلے جہاں سدھار گئی۔

میں اس روز بہت رویا تھا کیونکہ وہ میری پہلی اور آخری محبت تھی‘ وہ کمرہ جہاں اس نے زندگی کے آخری سانس لیے تھے ایک آم کے گھنے درخت کے سائے میں تھا۔ آم کا درخت بہت ہی پرانا اور اتنا بڑا تھا کہ اس کی ٹہنیاں کمرے کی چھت پر بھی پھیلی ہوئی تھیں۔ ان دو دنوں میں جب بھی ریٹا کو ہوش آتا وہ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بڑبڑا کر کہتی کہ اس کمرے میں اندھیرا کیوں ہے‘ اس میں دھوپ کیوں نہیں آتی شاید بیماری کی شدت میں اسے جو سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا لاشعوری اظہار وہ دھوپ نہ آنے کی شکایت کے ذریعے کر رہی تھی مگر اس کی حالت ایسی نہ تھی کہ اسے اس کمرے سے ہٹا کر کسی دوسرے کمرے میں لٹا دیا جاتا۔ وہ اسی حالت میں مر گئی‘ میں تنہا ہو گیا اور اس گھر اور خاص کر آم کے اس درخت سے وحشت اور نفرت محسوس ہونے لگی‘ مجھے وہ درخت جان کا دشمن لگا اور میں اسے ہی ریٹا کی موت کا ذمہ دار سمجھنے لگا اور مجھے اس کے وجود سے نفرت ہو گئی۔ یوں بھی اس کے ہونے یا نہ ہونے سے باغ کے مجموعی حسن میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ لہٰذا میں نے اس درخت کو کٹوانے کا ارادہ کر لیا۔

میں کئی دن اسی کے بارے میں سوچتا رہا‘ میں جب بھی اس درخت کو دیکھتا تو میرا خون کھول اٹھتا‘ جب ہوا چلتی اور اس کی شاخیں جھومتیں تو مجھے یوں لگتا کہ ایک جان لینے سے ان کی تسلی نہیں ہوئی ہے اور اب وہ مجھ پر موت کا منحوس سایہ ڈالنا چاہتا ہے۔ بالآخر ایک دن میں نے قدیر خان کو بلایا اور اسے حکم

دیا کہ وہ آم کے اس درخت کو کاٹ ڈالے۔
اس نے میرا حکم سنا مگر کوئی جواب دیئے بغیر کمرے سے نکل گیا' ایک دن گزر گیا مگر اس نے میرا کہا نہ مانا اور درخت کو نہ کاٹا شاید میرا یہ حکم اس لیے تکلیف دہ تھا کہ وہ ایک پھل دینے والے درخت کو کاٹ ڈالے۔ اول تو وہ یوں بھی پھول اور پودوں سے دیوانگی کی حد تک محبت کرتا تھا اور درخت جیسی زندہ اور زندگی بخش شے کو کاٹ ڈالنا اس کے نزدیک غیر انسانی فعل ہو سکتا تھا۔ وہ تو پھولوں اور پودوں کو نئی زندگی دینے کا قائل تھا شاید درخت کے تنے پر کلہاڑا چلانا اس کے لیے اتنا ہی مشکل تھا جیسے کسی انسان کی گردن کاٹنا۔
دوسرا اس درخت کے ساتھ تو اس کے اس قدر والہانہ لگاؤ کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ قدیر خان ایک تو ہم پرست انسان تھا اور کئی مرتبہ اس نے اس درخت کی شاخوں سے تعویز باندھ باندھ کر منتیں مانی تھیں اور مرادیں بھی پائی تھیں جن میں سے ایک مراد تو صغریٰ کا حصول تھا تو بھلا اس کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ایسے مقدس درخت پر اپنے ہاتھوں سے کلہاڑا چلائے یہ تو اس کے نزدیک گناہِ عظیم تھا۔
میں نے اگلے دن دوبارہ قدیر خان سے یہی بات کہی کہ وہ اس آم کے درخت کو کاٹ ڈالے' قدیر خان نہایت ہی دھیمے لہجے میں بولا۔
''صاحب جی! یہ درخت تو اس زمانے سے یہاں موجود ہے جب میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ اس پر لگنے والے آم اتنے میٹھے ہوتے ہیں کہ لوگ دوسرے دیہاتوں سے محض ایک دو آم کھانے کے لیے آتے ہیں۔ یہ آپ کے والد محترم کا صدقہ جاریہ ہے اس بے چارے پر کلہاڑا چلانے کا کیا فائدہ ہوگا؟'' مجھے اس کی یہ دلیل سخت ناگوار گزری' میں نے اس کو چلے جانے کو کہا اور اس سے کوئی بحث نہ کی کیونکہ اس کی دلیل فضول تھی اس کے بعد بھی کئی بار میں اشارتاً اسے کئی مرتبہ اس درخت کی نحوست کا ذکر کر کے اس سے درخت کٹوانا چاہا مگر ہر مرتبہ نہ تو اس نے کھل کر انکار کیا اور نہ میری بات پر عمل کیا۔ میں نے یہ بات خصوصی طور پر نوٹ کی کہ درخت کے کٹوانے کے ذکر پر اس کا موڈ یکدم خراب ہو جاتا تھا اور وہ باغ میں کام کرتے ہوئے بھی کچھ نہ کچھ بڑبڑاتا رہتا تھا۔ مجھے اس کے انکار پر غصہ بھی آ جاتا مگر میں نے پھر بھی اسے نوکری سے نہ نکالا' اس لیے کہ وہ ایک تجربہ کار مالی تھا اور اس کے جانے کے بعد اس باغ نے اجڑ جانا تھا۔ کوئی اور مالی اس طریقے سے کام نہ کر سکتا تھا اور نہ ہی باغ کو سنبھال سکتا تھا' اس طرح قیمتی اور نایاب پودے برباد ہو جاتے۔
دو ماہ گزر گئے تھے وہ منحوس درخت وہاں ہی کھڑا تھا اس کا سایہ اب بھی کھڑکی پر پڑ رہا تھا۔ اسی کھڑکی کے سامنے ریٹا کا بستر تھا' جہاں سے دھوپ کمرے میں جاتی تھی' میں یہ جان گیا تھا کہ قدیر خان کبھی بھی اس درخت کو نہیں کاٹے گا بالآخر جھلاہٹ اور مایوسی کے عالم میں میں نے خود ہی اس کو کاٹ ڈالنے کا ارادہ کر لیا۔ ایک روز جب قدیر خان دوپہر کا کھانا کھانے اپنے گھر گیا تو میں نے کلہاڑا اٹھایا اور درخت کے تنے پر وار کرنے لگا' مجھے نہ جانے کیوں یہ یقین تھا کہ جب کلہاڑا چلنے کی آواز قدیر خان کے کانوں میں پہنچے گی تو وہ حویلی کی طرف آئے گا اور جب مجھے کلہاڑا چلاتے ہوئے دیکھے گا تو وہ شرمندہ ہوگا اور میرے ہاتھوں سے کلہاڑا لے کر خود درخت کاٹنے لگے گا مگر قدیر خان تو کلہاڑے کی آواز سن کر نہ آیا' البتہ ایک جوان اور خوب صورت لڑکی دوڑتی ہوئی آئی اور آ کر میرے قدموں میں گر گئی' میں نے

اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا۔
"تم کون ہو اور یہ کیا حرکت کررہی ہو؟"
"صاحب جی میں صغریٰ ہوں' قدیر خان کی بیوی۔" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا میں نے اس کے بارے میں جیسے سنا تھا وہ تو اس سے بھی بڑھ کر حسین تھی۔ وہ سچ مچ اس قدر حسین اور قیامت خیز بدن کی مالک تھی کہ جو کوئی بھی اس پر ایک نظر ڈال لیتا تو پھر اس کے لیے اس کے سراپا سے آنکھیں ہٹانا مشکل ہوجاتا تھا۔ قدیر خان کی عمر دیکھتے ہوئے بھی یہ بات عجیب لگی کہ اس نے اتنی کم عمر اور نوجوان حسینہ سے کیسے شادی رچالی تھی۔ اس کے سراپا نے مجھے بھی مبہوت کرڈالا تھا پھر اس نے مجھے خدا اور رسولؐ کے واسطے دینے شروع کردیئے کہ میں اس درخت کو نہ کاٹوں جب میں نے اس کی وجہ پوچھی تو وہ روتے ہوئے بولی۔
"صاحب جی اگر آپ نے اس درخت کو کاٹ دیا تو قدیر خان بھی زندہ نہ رہ سکے گا' میں سچ کہتی ہوں خدا کے لیے اب اس پر کلہاڑا نہ چلانا اس کی جان اس درخت میں ہے جوں ہی درخت کٹ کر گرے گا وہ بھی مرجائے گا۔"
جب صغریٰ مجھ سے فریاد کررہی تھی تو میں نے دیکھا کہ گاؤں کا ایک نوجوان جس کا نام وسیم تھا' وہ بھی ہمارے قریب آکر کھڑا ہوگیا تھا اور وہ بڑی محویت اور پیاری بھری نظروں سے صغریٰ کو دیکھ رہا تھا۔ اس میں اس بے چارے کا کوئی قصور نہ تھا۔ سارا قصور صغریٰ کی خوب صورتی کا تھا جو ہر ایک کے دل پر بجلی گراتی تھی۔ وسیم بھی ایک بھرپور جوان تھا' میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ صغریٰ کو پسند کرتا ہے اور شاید صغریٰ بھی اس کو چاہتی ہوگی۔ ممکن ہے وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے بھی ہوں۔

پھر میں نے ان خیالات کو جھٹک دیا اور صغریٰ کی طرف متوجہ ہوا' مجھے شک ہوا کہ صغریٰ کا رونا محض ایک فریب ہے۔ قدیر خان کو یہ یقین ہوگا کہ میں اس درخت کو نہ کاٹنے کی بات نہیں مانوں گا اس لیے اس نے اپنی خوب صورت بیوی کو سکھا پڑھا کر بھیجا ہوگا کہ میں اس کی خوب صورتی سے مرعوب ہوکر شاید درخت کاٹنے کا ارادہ بدل دوں۔ میں نے صغریٰ کی بے سروپا باتوں کا یقین نہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا کہ آخر ایک انسان کی جان کا درخت کے کٹنے یا نہ کٹنے سے کیا تعلق ہوسکتا ہے؟
"ایسا ہوتا۔" صغریٰ مجھے یقین دلاتے ہوئے بولی۔ "میرا شوہر دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا کہ اچانک کلہاڑا چلنے کی آوازیں آنی شروع ہوئیں ان آوازوں کو سن کر میرے شوہر نے دل پر ہاتھ رکھ لیا جیسے یہ کلہاڑا درخت کے تنے پر نہیں بلکہ اس کے دل پر چل رہا ہے' مجھے میرے شوہر نے ہی آپ کی طرف بھگایا ہے کہ آپ کو درخت کاٹنے سے روک لوں۔" صغریٰ یہ کہہ کر زاروقطار رونے لگی اور ساتھ ہی کہنے لگی۔ "اسے بالکل یوں محسوس ہورہا ہے کہ اس کے دل پر کوئی چاقو چلا رہا ہے۔ صاحب جی وہ مرجائے گا' آپ اسے مت کاٹیں' جوں جوں درخت کٹتا جائے گا وہ موت کے منہ میں گرتا جائے گا' خدا کے لیے صاحب جی اس کی جان بچالیں۔" مجھے صغریٰ کی ان خرافات کا بالکل یقین نہ آیا' میں نے ان حالات میں درخت کاٹنا مناسب نہ سمجھا لیکن قدیر خان کی دھوکا بازی کا پول کھولنے کا ارادہ کرکے میں اس کے مکان کی طرف چل دیا' صغریٰ اور وسیم بھی میرے ساتھ چل پڑے۔
ہم اس کے گھر پہنچے تو مجھے قدیر خان کی ہائے ہائے کی آوازیں سنائی دینے لگیں' جیسے وہ سخت اذیت

میں مبتلا ہو' صغریٰ انتہائی بے چینی کے عالم میں مکان میں داخل ہوگئی۔ جیسے اس سے قدیر خان کی تکلیف برداشت نہ ہو رہی ہو' وہ اب بھی یہی کہے جا رہی تھی "اگر درخت کٹ گیا تو اس کا شوہر بے چارہ مر جائے گا۔" میں اور وسیم باہر ہی کھڑے تھے' مجھے ان باتوں پر یقین نہ تھا میں نے دیکھا کہ وسیم کی حالت بھی عجیب سی لگ رہی تھی حالانکہ میری طرف اس کا بھی اس معاملے سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا لیکن اس کے باوجود مجھے وسیم کچھ زیادہ ہی فکر مند اور بے تاب نظر آ رہا تھا۔ اب تو مجھے یقین ہوگیا کہ وسیم' صغریٰ کو پسند کرتا ہے پھر مجھے یاد آیا کہ گاؤں کے کسی آدمی نے مجھے ایک بار بتایا تھا کہ شادی سے پہلے صغریٰ اور وسیم ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اسی لیے تو وسیم آج بے چینی کے عالم میں وہاں چلا آیا تھا۔ جیسے صغریٰ کی آہ وزاری سے اس کے دل پر بھی آرے چل رہے ہوں جب صغریٰ اندر چلی گئی تو میں نے وسیم کے چہرے پر ایک اور کیفیت بھی دیکھی اس کے لبوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی اور اس کی آنکھوں میں بھی ایک عجیب سی چمک تھی۔ میں نے اندازہ لگالیا کہ اب اگر میں نے درخت کی جانب ایک قدم بھی بڑھایا تو مجھے وسیم کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا بھلا وہ یہ کیسے برداشت کر پائے گا کہ اس کی محبوبہ کو کوئی تکلیف پہنچے۔ وہ صغریٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مجھے درخت کاٹنے سے باز رکھ سکتا تھا' میں نے اس کی طرف دیکھا کر کہا۔

"کتنی عجیب سی بات ہے یہ بھی قدیر خان نے نہ جانے کیا ڈرامہ رچایا ہے۔"

"کیوں صاحب جی؟" وسیم نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ کو ان باتوں پر یقین نہیں ہے کمال ہے اس دنیا میں کوئی بات ناممکن نہیں ہے' یہ آپ کا خیال ہے کہ قدیر خان نے چکر چلایا ہے مگر اس کی تو جان پر بنی ہوئی ہے۔"

مجھے وسیم کے اس لہجے پر اور بھی حیرت ہوئی لیکن پھر میں نے سوچا کہ بھلا وسیم کا بھی اس میں کیا قصور ہے اس نے یہ سب کچھ صغریٰ کی زبان سے سنا تھا اور وہ صغریٰ کو دل و جان سے چاہتا تھا اس لیے وہ بھلا اس کی باتوں پر یقین کیوں نہ کرتا۔ محبت دنیا کی عظیم ترین طاقت ہے اس کے طفیل انسان ہر بات مان لیتا ہے اگر وسیم نے صغریٰ کو سچ سمجھ لیا تھا تو ٹھیک ہی کیا تھا وہ مجھ سے مخاطب ہونے کے بعد بڑی گہری سوچ میں غرق ہوگیا شاید جس انداز سے صغریٰ دوڑتی ہوئی اپنے مکان میں گئی تھی اور جس طرح اس کا توبہ شکن جوبن مچل مچل کر دعوتِ نظارہ دے رہا تھا' وہ وسیم کو اور بھی گھائل کر گیا' وسیم تو خیر جوان آدمی تھا میں نے بھی جب صغریٰ کا یہ عالم دیکھا تو دل میں سوئے ہوئے جذبات انگڑائیاں لینے لگے تھے۔

میں نے قدیر خان کے پاس جانے اور مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے درشتی سے کلہاڑے کو زمین پر پھینکا اور حویلی کی طرف چل پڑا' میں نے دیکھا وہ کلہاڑا وسیم نے اٹھالیا اور ایک طرف کو روانہ ہوگیا۔ قدیر خان اور صغریٰ اپنے مکان میں تھے یوں ایک لڑائی ٹل گئی تھی۔



حویلی میں آ کر میں وسیم کا چہرہ نہ بھول سکا' وہ جو صغریٰ سے محبت کرتا تھا میں سوچتا رہا وسیم وہاں اس قدر کھوئے ہوئے انداز میں کھڑا آخر کیا سوچ رہا تھا' اس کے ذہن میں کیا بات تھی؟ وہ میرا کلہاڑا کیوں اٹھا کر لے گیا؟



اسی شام کو ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں اور سردی میں

اضافہ ہوگیا اس لیے میں جلدی ہی بستر میں گھس گیا۔رات کو بھی ہوائیں چلتی رہیں اس لیے مجھے صحیح طرح سے نیند بھی نہ آئی۔دماغ میں صغریٰ کا چہرہ اور اس کی باتیں گھومتی رہیں۔کلہاڑے کی آواز اب بھی میرے دماغ میں گونج رہی تھی' ایک دو بار مجھے یہ محسوس ہوا کہ باہر کوئی کلہاڑا چلا رہا تھا مگر میں نے اسے اپنا وہم جانا اور بستر میں ہی گھسا رہا۔صبح میری آنکھ ذرا دیر سے کھلی جب میں باہر آیا تو میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ آم کا درخت کٹا ہوا زمین پر پڑا تھا۔قریب ہی وہ کلہاڑا پڑا تھا جو وسیم اٹھا کر لے گیا تھا مجھے یقین ہوگیا کہ وسیم نے ہی اسی کلہاڑے سے اس درخت کو کاٹ ڈالا ہے مگر اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس کے بعد میرا خیال فوراً ہی قدیر خان کی طرف چلا گیا۔میں تیز تیز قدموں سے اس کے مکان کی طرف چل دیا میں اس کے مکان کے قریب پہنچا تو وہاں مکمل خاموشی تھی۔میں نے دروازہ کو ہاتھ لگایا تو وہ کھل گیا' میں قدیر خان کو آوازیں دیتے ہوئے اندر کمرے میں داخل ہوگیا۔مجھے صغریٰ کہیں بھی نظر نہ آئی' قدیر خان ایک چارپائی پر مردہ حالت میں پڑا تھا' اب مجھے یقین ہوگیا کہ درخت کے کٹ جانے سے قدیر خان کی موت واقع ہوگئی ہے۔صغریٰ نے سچ کہا تھا کہ یہ درخت کٹ گیا تو اس کا شوہر موت کے منہ میں چلا جائے گا۔میں نے قدیر خان کے جسم کو ہلا جلا کر دیکھا وہ واقعی مر چکا تھا مگر صغریٰ وہاں موجود نہ تھی۔میں نے اس کو کئی آوازیں دیں مگر اس کا کچھ پتا نہ چلا کہ وہ کہاں چلی گئی ہے۔میں واپس حویلی لوٹ آیا اور گاؤں کے امام مسجد کو قدیر کی موت کی اطلاع دی انہوں نے لاؤڈ اسپیکر پر اس کی موت کا اعلان کیا تو گاؤں کے لوگ میرے گھر آنا شروع ہوگئے۔میں نے انہیں قدیر کی موت کا بتایا تو لوگ اس کے مکان کی طرف چل پڑے۔ظہر کی نماز کے بعد قدیر کا جنازہ پڑھایا گیا اور دفنا دیا گیا۔میرے لیے اور گاؤں کے لوگوں کے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ وسیم اور صغریٰ دونوں گاؤں میں موجود نہ تھے' دونوں پریمی نہ جانے کہاں چلے گئے تھی۔

لوگ طرح طرح کی باتیں بنا رہے تھے' کوئی کہہ رہا تھا اس درخت پر بدروحوں کا بسیرا تھا' قدیر کو بھی ان بدروحوں نے سزا دی ہے۔کوئی کہتا ہے اسے وسیم کی بددعا لگی ہے کیونکہ اس نے جادو ٹونے کرکے صغریٰ کو وسیم سے بدظن کرکے اس سے شادی کی تھی جس کا بدلہ وسیم نے درخت کو کاٹ کر لے لیا ہے' اس درخت پر کئی تعویز بندھے ہوئے تھے ایک شخص نے تعویزوں والی ٹہنیاں کاٹ کر علیحدہ کیں اور پھر ان کو آگ لگا دی۔جتنی دیر آگ میں تعویز جلتے رہے اتنی ہی دیر قدیر کی چیخیں سنائی دیتی رہیں جب سب کچھ جل کر راکھ ہوگیا تو آوازیں آنی بند ہوگئیں' اگلے روز گاؤں کے لوگوں نے دیکھا اور بتایا کہ قدیر کی قبر کا نام و نشان ہی نہیں ہے' ایسے لگتا ہے کہ جیسے یہاں کوئی قبر تھی ہی نہیں۔

میں یہ سب کچھ جان کر پریشان ہوگیا اور ایک ہفتے بعد واپس انگلینڈ لوٹ آیا' مجھے نہیں معلوم کہ اب میری حویلی کا کیا حال ہوگا؟ لگتا ہے اس میں بھی بدروحوں نے بسیرا کرلیا ہوگا۔



نقلی شہر

آلشبہ مخدوم

روہی کا صحرا ہزارہا کہانیوں کا مسکن ہے جہاں پر ہر قدم پر نت نئی کہانیاں آپ کو ملیں گی اس صحرا میں جہاں خوب صورت نظارے، انوکھے چرند پرند ملتے ہیں وہیں آپ کی ملاقات نادیدہ مخلوق سے بھی ہوسکتی ہے۔
ایک مہم جو کی کہانی اس کی گولی سے ایک نادیدہ مخلوق زخمی ہوگئی تھی۔

صحرائی ہرن رات کے اندھیرے میں ہمارے سامنے بھاگتے چلے جارہے تھے۔ وہ تھے تو سات آٹھ لیکن جیسے ہی ہم فاصلہ کم کرکے ان کے قریب ہوتے تو کبھی وہ زیادہ نظر آتے اور کبھی کم۔ رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا۔ وہ ہمیں صرف جیپ کی ہیڈ لائیٹس میں دکھائی دیتے تھے۔ تیز روشنی میں ایک دم سے سامنے آتے پھر چوکڑیاں بھرتے غائب ہو جاتے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے سے یہی کھیل جاری تھا۔ مجھے صرف ایک بات کا احساس ہورہا تھا کہ یہ ڈر کر بھاگ تو رہے ہیں، ادھر ادھر غائب ہوجانے کے بعد وہ پھر سامنے کیوں آجاتے ہیں؟ میں نے اپنے طور پر یہی سوچا کہ ہم نے ان پر فائر نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے وہ ہم سے ڈر تو رہے ہیں، لیکن دہشت زدہ نہیں ہوئے، شاید ہماری طرح وہ بھی ہم سے کھیل رہے ہیں۔ ایک جگہ ہم رک گئے تاکہ دیکھ سکیں کہ وہ کرتے کیا ہیں۔

صحرا میں رات کا پر ہول سناٹا دہشت انگیز ہوگیا تھا۔ ہوا اتنی زیادہ تیز نہیں تھی لیکن اس کی مخصوص سیٹی دار آواز میں تیزی آگئی تھی۔ گرمی کا وہ احساس ختم ہو کر رہ گیا تھا، جو دن کے وقت تھا۔ آسمان پر بادل گھرے ہوگئے تھے۔ ادھورا سا چاند کبھی بادلوں کی اوٹ میں چھپ جاتا اور کبھی بادلوں کی قید سے آزاد ہوکر چاندنی پھیلاتے ہوئے ہانپنے لگتا۔ ہم اس بستی سے کافی دور آگئے تھے جہاں ہم ٹھہرے تھے۔

ہمارے سامنے پھیلا ہوا ریگستان یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے اس کا دوسرا کنارا نہیں ہوگا۔

ہم چار دوست کل شام ہی اس بستی میں آئے تھے۔ یونیورسٹی میں دو متحارب گروپوں میں شدید فائرنگ کے نتیجے میں تین لڑکے جاں بحق ہوگئے تھے۔ زخمیوں کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں تھا۔ اس کے بعد کافی کشیدگی ہوگئی تھی۔ سو یونیورسٹی تا حکم ثانی بند کردی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی انتظامیہ نے ہاسٹل بھی بند کردیئے تھے۔ گھروں کو لوٹ جانے کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہمارا کلاس فیلو رب نواز روہی کا رہنے والا تھا۔ ہم اکثر اس سے خواہش کیا کرتے تھے کہ ہمیں صحرا دکھالائے۔ سو میں نے ایک مقامی دوست کی جیپ لی اور آصف، ندیم، وقار کے ساتھ رب نواز کے پاس اس کی بستی چلے گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ ایک دو دن اُس کے پاس رہیں گے، اس دوران اگر یونیورسٹی کھل گئی تو ٹھیک ورنہ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے۔

رب نواز نے ہماری خوب خاطر مدارات کی۔ سارا دن وہاں کے گھر، ٹوبے، ریوڑ، گائیں، اونٹ دیکھتے رہے۔ اس کے ابا اور مقامی لوگوں سے گپ شپ کرتے اور سوتے جاگتے گزر گیا تھا۔ اس دن ہمارا پروگرام بنا کہ صحرا نوردی کی جائے۔ سورج غروب ہوتے ہی ہم نے جیپ میں کھانے پینے کا سامان رکھا اور نکل پڑے۔ رب نواز چونکہ وہیں پیدا

ہوا تھا اس لیے اسے پورے علاقے کے بارے میں معلوم تھا۔ پہلے پہل صحرا ہمیں بہت اچھا لگا، پھر گزرتے وقت کے ساتھ اس کی دہشت ہم پر طاری ہونے لگی۔ ایک انجانا خوف ہم میں سرائیت کر گیا تھا۔ اگرچہ اس کا کسی نے اظہار نہیں کیا تھا، لیکن میں کم از کم ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔

ہمیں وہاں رکے کچھ دیر ہوگئی تھی۔ صحرائی ہرن ہمارے سامنے یوں کلانچیں بھرتے گزر جاتے جیسے ہمیں اپنے ساتھ کھیلنے کی دعوت دے رہے ہوں۔ انہی ہرنوں کے باعث میرے اندر کا انجانا خوف بہت کم ہوگیا تھا۔

''رب نواز! لا اپنی گن اور کریں ان کا شکار۔'' ندیم نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔ اس کی نگاہ ہرنوں پر لگی ہوئی تھی۔

''تمہارا کیا خیال ہے میں ان پر فائر نہیں کر سکتا؟'' رب نواز نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب، میں سمجھا نہیں؟'' ندیم نے الجھتے ہوئے پوچھا تو وہ گہرے انداز میں بولا۔

''میرے خیال میں انہیں بس دیکھو، ان کا شکار نہ کرو۔'' اس نے اسی عجیب لہجے میں کہا تو میں نے اس سے پوچھا۔

''تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟''

''یار میری اتنی عمر ان جانوروں میں گزر گئی ہے، انہیں سمجھتے، ان کی عادتوں کو دیکھتے، میں نے اس ریگستان میں بہت ہرن دیکھے ہیں، لیکن یہ مجھے کچھ الگ سے دکھائی دے رہے ہیں۔'' اس نے یوں کہا جیسے اس کی آواز کہیں دور سے آ رہی ہو۔

''مطلب، الگ سے کیسے؟'' ندیم نے یوں پوچھا جیسے وہ اس کی بات کو مذاق سمجھ رہا ہو۔

''یار یہ میں نہیں سمجھا سکتا۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

''ادھر لا گن، میں دیکھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے بندوق پکڑی اور ہرنوں میں سے ایک کا نشانہ لیا۔ مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس کا نشانہ کوئی خاص نہیں، ایسے ہی کارتوس ضائع کرے گا۔

''اچھا ٹھہرو۔'' میں نے تیزی سے کہا تو اس نے رک کر میری جانب سوالیہ انداز میں دیکھا تو میں بولا، ''دیکھ، اگر ہم انہیں زندہ پکڑ لیں، ایک بھی ہمارے ہاتھ آ گیا تو اسے پال لیں گے۔''

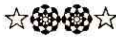
''تو اور ہرن، اُو جا اتنا بھاگ لے گا ان کے ساتھ؟'' یہ کہہ کر اس نے ایک آنکھ بند کی اور ہرن کو نشانے پر لے لیا۔ وہ ہرن ہم سے کافی فاصلے پر کانچیں بھرتے ہوئے کھیل رہے تھے۔ ایک دم سے اس نے فائر کیا تو پورا ریگستان جیسے گونج اٹھا۔ سامنے ہرنوں کی ٹولی میں ایک ہرن گر کر تڑپنے لگا تھا۔ دوسرا کافی حد تک زخمی تھا، باقی سب بھاگ گئے تھے۔ ہم جیپ میں سے تیزی کے ساتھ اترے اور انہیں پکڑنے کے لیے بھاگے۔ ندیم اس تڑپتے ہوئے ہرن کی جانب لپکا کیونکہ چھری اس نے اٹھائی تھی۔ میں اس زخمی ہرن کی طرف بڑھا جو لنگڑاتے ہوئے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔ میں جتنا اس کے قریب ہوتا، وہ اتنا ہی مجھ سے دور ہو جاتا۔ ایک لمحے کے لیے تو لگتا کہ میں اسے پکڑ لوں گا، لیکن اگلے ہی لمحے وہ مجھ سے اتنا دور ہو جاتا کہ باوجود میری پہنچ کے، وہ میرے ہاتھ نہ لگتا۔ کئی بار تو میری پوریں اُسے لگیں۔ اُس کی ملائم اور نرم جلد کا احساس میری پوروں پر جم کر رہ گیا تھا۔ میں اس کے پیچھے بھاگتا ہوا ہانپنے لگا، پھر ٹھوکر کھا کر اوندھے منہ گر گیا۔ چند منٹ بعد جب میری سانس بحال ہوئی تو میں حیرت سے

ششدر رہ گیا۔ میرے سامنے دور تک بتیاں روشن تھیں۔ یوں جیسے ایک پورا شہر آباد ہو۔ پاگل کردینے والی بات یہ تھی کہ میں جس ریت پر گرا تھا، اب میرے نیچے ریت نہیں، پختہ زمین تھی۔

میرے سامنے جو شہر تھا، اس کے آباد ہونے کی صرف ایک ہی وجہ سمجھ میں آرہی تھی کہ اس میں روشنی تھی۔ لیکن نہ تو یہ روشنی جدید زمانے کی تھی کہ وہاں بلب، گلوب یا ٹیوب لائیٹس لگی ہوتیں اور نہ ہی پرانے زمانے کی وہ مشعلیں، لالٹین یا کوئی پٹرومیکس جل رہا ہوتا۔ وہاں بس ہر طرف سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ وہاں مکان بھی کوئی پختہ نہیں تھے اور نہ ہی کوئی بازار کی کوئی صورت دکھائی دے رہی تھی۔ بس لکڑی کے ٹکرے تھے چھوٹے چھوٹے مگر اوپر کی جانب لمبائی میں تھے۔ اُوپری سرا تکون تھا۔ ان میں گھاس پھوس اُگا ہوا تھا۔ زمین پر کوئی ایسا کونا نہیں تھا، جہاں گھاس نہ اُگی ہو، ہر طرف سرسبز اور شاداب علاقہ تھا۔ جا بجا جنگلی پھول اُگے ہوئے تھے۔

میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے یہ سب دیکھ رہا تھا اور یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے گرنے ہی سے ماحول بدل گیا ہے یا میرے دماغ پر کوئی ایسی چوٹ آگئی ہے کہ مجھے یہ سب ایسا دکھائی دے رہا ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو مجھے لگا جیسے میرے بدن میں تھکن نام کی کوئی شے ہی نہیں ہے۔ میں اٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس وقت میرے ذہن میں سوال یہ تھا کہ میں جاؤں کدھر؟ میں ابھی اسی کشمکش میں تھا کہ میں نے دیکھا کافی فاصلے سے کچھ لوگ میری طرف تیزی سے آرہے ہیں۔ ان کی حالت عجیب سی تھی۔ وہ چل نہیں رہے تھے بلکہ یوں میری جانب بڑھ رہے تھے جیسے ہوا میں لہرا رہے ہوں۔ انہوں نے لمحوں میں فاصلہ طے کیا اور میرے ارد گرد منڈلانے لگے۔ میں نے انہیں غور سے دیکھا تو وہ سب عورتیں تھیں اور ان کے بدن پر لباس نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ مجھے حیرت زدہ کرنے والی بات یہ تھی کہ ان کے بدن جگنو کی مانند جل بجھ رہے تھے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ میں کسی ماورائی مخلوق کے حصار میں ہوں۔ وہ مجھے گھیر کر اس شہر کی جانب لے گئے جو نجانے کہاں تک پھیلا ہوا تھا۔



میں ایک بڑے میدان میں تنہا کھڑا تھا۔ وہ جگمگاتی ہوئی عورتیں مجھے وہاں چھوڑ کر غائب ہو چکی تھیں۔ میرے سامنے اونچا سا ایک اسٹیج بنا ہوا تھا۔ جو بے حد روشن تھا۔ میں اسے دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ننگ دھڑنگ عورتیں میرے ارد گرد جمع ہونے لگیں۔ وہ بڑی بھیانک تھیں۔ ان کی آنکھیں وحشت بھری، لمبی ناک، تیز نوکیلے دانت جیسے کسی بھیڑیئے کے ہوں، بال بکھرے زبانیں لمبی اور سرخ، وہ اپنے خونیں پنجے لیے دانت نکوستی، بھیانک آوازیں نکالتیں میری جانب بڑھنے لگیں۔ یہ وہ لمحہ تھا جب میرے اندر خوف کی لہر سرائیت کر گئی۔ وہ بڑے وحشی انداز میں میری جانب بڑھ رہی تھیں۔ ایک لمحے کو تو لگا جیسے وہ میری بوٹی بوٹی کر کے چبا جائیں گی۔ اس لمحے خوفناک قسم کا میوزک بجنے لگا۔ اسٹیج پر ایسی ہی کئی ساری وحشت ناک اور بھیانک عورتیں نمودار ہوئیں۔ ان کی چیخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ مجھے لگا جیسے ڈر اور خوف کے باعث میں بے ہوش ہونے والا ہوں۔ مجھے چکر آنے لگے اور میں گرنے لگا۔ تبھی ہوا کے کسی جھونکے کی طرح ایک سایہ سا لہرایا اور اس نے مجھے

تھام لیا۔ وہ برف کی مانند ٹھنڈا تھا۔ میرے بدن میں جھرجھری ہوئی۔ انہی لمحات میں اسٹیج کی طرف سے اعلان ہوا۔

''اے اجنبی' تو ہمارے قبضے میں ہے۔ ابھی تیرے لیے یہاں ایک مقابلہ ہوگا، جو مقابلہ جیت جائے گی، ہم تجھے اس کے حوالے کر دیں گے، پھر وہ تیری مالک ہوگی اور تو اس کا غلام، وہ چاہے تجھ سے کھیلے، تجھے کھا جائے یا جو مرضی سلوک کرے۔ تجھے اس کا ہر حکم ماننا ہوگا۔ نہ ماننے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ تو ہر حال میں اب ہمارا غلام ہے۔''

یہ وہ پہلی باتیں تھیں جو میں نے وہاں پر سنیں۔ وہ چیخنے چنگاڑنے جیسا بول رہی تھیں۔ عام حالات میں وہ میں سننا بھی پسند نہ کرتا مگر وہ جو بھی کہہ رہی تھیں مجھے ان کی سمجھ پوری طرح آ رہی تھی، اس لیے میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

''مم...... میرا جرم...... کیا ہے؟''

''تیرا جرم بہت بڑا ہے، تو ہماری شہزادی کا شکار کرنے لگا تھا۔'' وہاں سے بتایا گیا

''شہزادی، مطلب میں تو ہرن......'' میں نے کہنا چاہا تو میری بات کاٹ کر کہا گیا

''جس کے پیچھے تو بھاگ رہا تھا، وہ ہماری شہزادی ہے جو اس وقت اپنی کنیزوں کے ساتھ تجھے دیکھ رہی ہیں۔ شکر کرو، جو گولی سے مری ہے وہ شہزادی کی کنیز تھی، اگر شہزادی کو کچھ ہو گیا ہوتا تو اب تک تیرے اگلے پچھلے سب ختم ہو چکے ہوتے۔''

بڑے ہی کرخت اور ہتک آمیز انداز میں مجھے، میرا جرم بتا دیا گیا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ ہرن کے روپ میں وہ کوئی چڑیل تھی۔ میرے اندر خوف بھر گیا تھا، مجھ پر کپکپی طاری ہو چکی تھی۔ میرے لیے ڈرا دینے والا یہ خیال بہت تھا کہ میں چڑیلوں میں گھر گیا ہوں۔

''مجھے...... معاف کر دیں، مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ شہزادی تھی۔ میں تو ایک جانور......''

''خاموش آدم زاد۔ شہزادی اب تمہارا مقابلہ دیکھے گی۔ چلو جس جس نے اس آدم زاد کو غلام بنانا ہے وہ میدان میں آ جائے۔''

ایک دم سے بھیانک چیخیں بلند ہونے لگیں۔ کئی ساری ننگ دھڑنگ چڑیلیں میرے ارد گرد منڈلانے لگیں۔ ان کے بدن سے بدبو آ رہی تھی، جیسے سڑا ہوا خون ہو۔ مجھے اُبکائی آنے لگی جس سے میری طبعیت خراب ہونے لگی۔ ان کے جلتے بجھتے جسم انہیں مزید بھیانک بنا رہے تھے۔ مجھے میدان کے کنارے پر لا کھڑا کیا گیا۔ اس وقت میری نگاہ چاروں طرف پڑی۔ بے شمار چڑیلیں میدان کے ارد گرد کھڑی تھیں۔ میدان میں کافی ساری چڑیلیں تھیں۔ وہ ایک دم سے ایک دوسری پر جھپٹ پڑیں۔ میوزک کی آواز اور ان کی بھیانک چیخیں، دل دہلا رہی تھیں۔ وہ ساری ایک دوسرے کو مرنے مارنے پر اُتر آئی تھیں۔ اچانک ایک دھما کا ہوا، ایک چڑیل پھٹ کر دھویں میں تحلیل ہو گئی۔ پھر یکے بعد دیگرے ایسے دھماکے ہونے لگے۔ میرا گلا خشک ہو رہا تھا۔ مجھے اپنے سامنے لڑتی ہوئیں وہ چڑیلیں اپنی موت دکھائی دے رہی تھیں۔ ان میں جو بھی کامیاب ہوتی مجھے اپنا غلام بنا لیتی، وہ میرے ساتھ کیا کرنے والی تھی۔ اس کا میں ادراک بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ دھماکے ہوتے رہے۔ ایک ایک کر کے وہ مرتی رہیں، یہاں تک کہ ان میں سے دو چڑیلیں رہ گئیں۔ وہ ایک دوسری پر حملہ آور تھیں۔

اس وقت میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ ان کے بدن نہ اُدھڑے ہوئے تھے اور نہ پھٹے ہوئے بلکہ

جسم میں سوراخ ہوگئے ہوئے تھے۔ اور ان سوراخوں میں سے گاڑھا لعاب دار پانی بہہ رہا تھا۔ میری اُبکائی والی کیفیت پھر سے ہونے لگی۔ فضا ان کی چیخوں سے گونج رہی تھی۔ سڑے ہوئے گوشت کی بُو لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے لیے وہاں کھڑا رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ آخر کار ایک چڑیل دوسری پر حاوی ہوگئی۔ اس نے اُسے گھما کر زمین پر دے مارا، جس سے ایک دھماکا ہوا اور اس کی چنگاریاں دور تک اڑیں۔ وہ چڑیل میری طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے مجھے کچا چبا جائے گی۔ وہ میری طرف بڑھی تو اس کے بھدے اور لمبے ہونٹوں سے رال ٹپک رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے میرا وقت آخر آن پہنچا ہو۔

وہ میرے بالکل قریب آ کر رک گئی۔ اس کی وحشت ناک آنکھیں میرے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ جس میں اس کے دیدے تیزی سے گھوم رہے تھے۔ اس نے اپنا بھدا اور نوکیلے ناخنوں والا ہاتھ میری گردن کی جانب بڑھایا۔ اگلے ہی لمحے اس کا گرم ہاتھ میری گردن پر تھا، میرا سانس رک گیا۔ خوف اور دہشت سے میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ مجھے لگا کہ وہ میرا خون پی جائے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا، اس نے مجھے گردن سے پکڑ کر آگے کی جانب گھسیٹا۔ میں ہوا میں اچھل گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہوا میں تھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لیتی ہوئی اسٹیج پر جا گری۔ حیرت انگیز طور پر مجھے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ کچھ لمحوں کے بعد میں اس شہزادی کے سامنے تھا، جس کی اجازت سے یہ سب ہو رہا تھا۔ اس سے بھی بری طرح کا تعفن اٹھ رہا تھا۔ مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ اس وقت میں نے خود پر غور کیا۔ اس قدر سڑاند اور تعفن کے باوجود، اتنی دہشت اور خوف میں خود پا کر بھی میں بے ہوش کیوں نہیں ہو پا رہا تھا۔ کم از کم اس صورت حال کے عذاب سے غفلت ہی کے باعث جان چھوٹ جائے۔ مگر ایسا بھی نہیں ہو رہا تھا۔ مجھ پر جان کنی کی کیفیت طاری تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں ابھی مر جاؤں گا، لیکن جان بھی نہیں نکل رہی تھی۔

وہ شہزادی میرے سامنے تھی۔ اس کا کریہہ چہرہ میرے سامنے تھا۔ ویسی ہی وحشت ناک آنکھیں، بھدے اور رال ٹپکاتے ہونٹ، تعفن زدہ بدن اور چنگاریاں چھوڑتا ہوا برہنہ بدن۔ میں نے نفرت سے منہ پھیر لیا تو میرے ساتھ کھڑی چڑیل نے میری ٹھوڑی کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر شہزادی کی جانب پھیر دیا۔ پھر خرخراتی ہوئی آواز میں یوں بولی جیسے ابھی رو دے گی۔

''تمہارے حکم سے میں نے اسے جیت لیا شہزادی، لیکن یہ تمہارا مجرم ہے، اسے میں تحفے میں پیش کرتی ہوں، اس کے ساتھ کیا کرنا ہے، یہ تمہاری مرضی۔''

یہ سنتے ہی وہ چند لمحے اس چڑیل کی طرف دیکھتی رہی، پھر اپنے بھدے ہونٹوں پر مسکراہٹ لا کر بولی ''جاؤ، تمہیں اس تحفے کے عوض کچھ اور طاقتیں دی جاتی ہیں۔ تم نے میرا مان رکھا، میں تجھے نواز دوں گی۔'' یہ کہتے ہی اس نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ اس کی انگلیوں میں سے رنگ برنگی روشنیاں پھوٹنے لگیں۔ جو سیدھی اس چڑیل پر جا پڑیں۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے مزید طاقتور دکھائی دینے لگی۔ اس کی سرخ آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ وہ خوشی سے چیخ مارتے ہوئے وہاں سے اڑتی ہوئی چل دی۔ میں نے یہ نظارہ دیکھا تو سامنے کھڑی چڑیل سے مزید خوف زدہ ہو گیا۔

اس شہزادی نے اپنی انگلی میری طرف کی۔ اس میں سے ایک نیلی لکیر نکلی۔ وہ میری بدن پر جہاں لگی وہیں آگ لگ گئی۔ میرے کپڑے جل گئے اور میرا جسم یوں ہوگیا جیسے کسی نے تیز دھار آلے سے کاٹ کر اس میں سرخ مرچیں بھر دی ہوں۔ میں تکلیف اور جلن سے دہرا ہو کر تڑپنے لگا۔ میں نے اسٹیج سے چھلانگ لگا دی۔ تو وہ نیلی روشنی میرے ارد گرد چکر کاٹنے لگی۔ میں ایک دم سے ٹھٹک گیا۔ وہ نیلی لکیریں یوں مجھے واپس لے کر جانے لگیں جیسے کسی ریوڑ سے بچھڑی ہوئی بھیڑ کو کتے واپس ریوڑ میں لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے اپنے بدن پر جلن اور تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔ میں اس نیلی لکیر کو دوبارہ اپنے بدن کے ساتھ مَس نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ میں اس سے بچ رہا تھا کہ ایک دم سے آواز گونجی۔

''اے آدم زاد، میری ایک وفادار کنیز کو تم لوگوں نے مار دیا اور تو مجھے قابو میں کرنا چاہتا تھا۔ تمہارا جرم بہت بڑا ہے، اتنا بڑا کہ ہم تجھے قتل بھی کر دیں تو اس کی سزا پوری نہیں ہوگی۔'' اس نے نفرت انگیز لہجے میں چیختے ہوئے کہا تو وہاں اک شور مچ گیا۔ مجھے لگا وہاں پر موجود ساری خطرناک چڑیلیں میری تکہ بوٹی کر دیں گی۔

''میں تمہیں تو...... نہیں مارنا چاہتا تھا...... مجھے کیا معلوم...... کہ وہ ہرن تم......'' میں نے کہنا چاہا مگر وہ چیختے ہوئے میری بات کاٹ کر بولی

''بس، تم صرف یہ بتا دو، میرے غلام بن کر یہاں رہو گے یا اپنی دنیا میں مجھے ساتھ لے کر جاؤ گے؟''

''کیا میں اپنی دنیا میں واپس جا سکتا ہوں۔'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''ہاں، تم جا سکتے ہو، لیکن میرا ساتھ جانا شرط ہوگا، اگر تم میری شرط مانتے ہو تو میں تمہیں ابھی تمہاری اپنی دنیا میں جانے کی اجازت دیتی ہوں۔'' اس نے کانوں میں چبھتی ہوئی آواز میں کہا تو میں نے فوراً ہی ہاں میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں میں اپنی دنیا میں واپس جانا چاہتا ہوں۔''

''تو جاؤ۔''

اس نے یہ لفظ کہے ہی تھے کہ ایک دم سے یوں ہوا جیسے بجلی کے کسی ٹرانسفارمر کو آگ لگ گئی ہو۔ ایک دم سے دھڑ دھڑ ہونے لگی۔ چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے زمین پر سے آگ ایک دم ہی سے اُگ آئی ہو، پانی کے جیسے فواروں کی مانند آگ ابھرنے لگی۔ دھویں سے سانس بند ہونے لگا۔ وہ ساری چڑیلیں مست الست ہو کر بھیانک ناچ ناچ رہی تھیں۔ ان میں سے کوئی یہاں اور کوئی وہاں پھٹ جاتی، دھماکا ہوتا اور وہ دھواں بن جاتی۔ آگ اور دھواں چاروں جانب پھیل رہا تھا۔ میرا سانس بند ہونے لگا مجھے یوں لگا جیسے میں مر رہا ہوں۔ لحہ لحہ میرا وجود میرا ساتھ چھوڑتا چلا جا رہا تھا۔ میرے حواس جواب دے گئے اور میں چکرا کر گرتا چلا گیا۔ مجھے کوئی ہوش نہیں رہا۔



مجھے ہوش آیا تو میرے دوست مجھ پر جھکے ہوئے تھے۔ پہلے تو مجھے ان کے چہرے دھندلے دھندلے دکھائی دیے، پھر چند لمحوں بعد صاف ہو گئے۔ کچھ دیر تک مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ میں یہاں کیوں پڑا ہوا ہوں اور وہ مجھے نیند سے بیدار کر رہے ہیں۔ لیکن جیسے ہی آصف کی مجھے آواز سنائی دی۔

''ہوش کر ہوش۔''

تبھی مجھے یاد آیا میں تو چڑیلوں کے نرغے میں تھا۔ میں نے انتہائی سرعت سے اٹھ کر چاروں جانب دیکھا۔ وہاں دور دور تک صحرا کے سوا کچھ نہیں تھا۔ تیز دھوپ چمک رہی تھی۔ اور یوں لگ رہا تھا کہ جیسے دن کا پہلا پہر ختم ہونے کو ہو۔ میں نے اپنے دوستوں کی طرف دیکھا۔ بلاشبہ میرے چہرے پر کچھ ایسا تھا کہ ندیم نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''کیا ہو گیا ہے تجھے، یوں ہماری طرف اجنبیوں کی طرح کیوں دیکھ رہا ہے؟''

''میں یہاں کیسے؟ اور وہ ش......ش......'' اس سے زیادہ میں کچھ نہ کہہ سکا۔ میرے ہونٹ یوں سل گئے، جیسے مجھ میں بولنے کی ذرا سی بھی قوت نہ ہو۔

''یار لگتا ہے اس کے ذہن پر کوئی طاری ہو گیا ہے، اس وقت اس سے سوال جواب کرنا فضول ہے، اسے یہاں سے لے چلیں۔'' ندیم نے کہا تو انہوں نے مجھے سہارا دے کر اُٹھایا تو میں بے جان سا ان کے اُٹھانے پر اُٹھتا چلا گیا۔ انہوں نے قریب کھڑی جیپ میں مجھے ڈالا اور وہاں سے چل دیئے۔

میں سارے راستے ہوش میں تھا۔ مجھے سب دکھائی دے رہا تھا کہ مجھے لے جایا جا رہا ہے لیکن مجھے وہی یاد رہتا تھا جو میرے سامنے تھا۔ کیا ہو رہا تھا، اس کی مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ یہاں تک کہ انہوں نے مجھے بہاول پور وکٹوریہ اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ پہنچا دیا۔ وہاں میرے ساتھ ڈاکٹرز کیا کرتے رہے، کیا ہوتا رہا، میں بس انہیں دیکھ رہا تھا، ان کے کسی سوال کا جواب نہیں دے پا رہا تھا۔ تبھی وہیں ایک سینئر ڈاکٹر آ گیا۔ اس نے تحمل سے پوچھا۔

''مجھے یہ بتائیں کہ اس کے ساتھ ہوا کیا؟''

''سر! ہم دوست روہی میں شکار کر رہے تھے۔ یہ ایک ہرن کو پکڑنے کے چکر میں دور نکل گیا۔ یہاں تک کہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ ہم اس کے پیچھے گئے، تو یہ ہمیں دکھائی نہیں دیا۔ تقریباً دس گھنٹے بعد یہ ہمیں ایک ٹیلے کے ساتھ پڑا ہوا ملا۔ یہ بے ہوش تھا۔ اسے ہوش میں لائے ہیں تو یہ نہ تو بول رہا ہے اور شاید نہ ہی کوئی بات سمجھ رہا ہے۔ ایک ٹک دیکھتا ہی جا رہا ہے۔'' آصف نے تفصیل سے بتایا۔

''ٹھیک ہے، اسے داخل کروا دیں۔ میں اس کے کچھ ٹیسٹ لکھ دیتا ہوں، وہ کروائیں۔ پھر دیکھتے ہیں اسے کیا ٹریٹمنٹ دینا ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا اور کسی دوسرے مریض کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں ڈاکٹر کو اپنی حالت بتانا چاہتا تھا کہ میرے سامنے وہی چڑیلوں کا منظر گھوم جاتا۔ مجھ پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور میں اپنے طور پر چھپنے کی کوشش کرتا۔ باوجود اس احساس کے کہ میں اب محفوظ ہوں، میں خود پر قابو نہیں رکھ پاتا۔ لیکن میں کچھ بھی نہ کہہ پایا۔

مجھے عام وارڈ کی بجائے پرائیوٹ کمرہ دلایا گیا۔ میرے ساتھ میرے تینوں دوست تھے۔ رب نواز اپنے گھر چلا گیا تھا۔ دو دن مجھے سکون آور دوائیوں پر رکھا گیا۔ مجھے جب بھی ہوش آتا، وہی منظر سامنے آ جاتا اور میری حالت غیر ہو جاتی۔ باوجود کوشش کے میں خود پر قابو پانے میں ناکام رہتا۔ تیسرے دن یونیورسٹی کھل گئی۔ وہ سب ہاسٹل چلے گئے۔ انہوں نے باری باندھ لی کہ ہر بندہ آٹھ گھنٹے میرے پاس رہے گا۔ صرف شام کے وقت وہ تینوں اکٹھے ہوتے تھے۔ کچھ دیر گپ شپ کے بعد وہ ہاسٹل چلے جاتے۔ ان تینوں نے میرے بارے میں کسی کو نہیں بتایا کہ میں اسپتال میں ہوں۔ یہ انہوں نے

اچھا کیا تھا، ورنہ پتہ نہیں کون کون سی کہانیاں اٹھتیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں ہوتیں۔

چوتھے دن میرے مزید ٹیسٹ ہوئے۔ لیکن ان کی رپورٹ ہمیں نہیں دی گئی۔ شام سے رات ڈھل گئی تھی۔ میرے دوست کھانا کھانے کے لیے اسپتال سے باہر گئے ہوئے تھے۔ میں اس وقت ایسی کیفیت میں تھا کہ جیسے بندہ نہ سو رہا ہوتا ہے اور نہ جاگ رہا ہوتا ہے۔ شاید وہ دوائی کا وقت تھا۔ ایک نرس آگے تھی اس کے ساتھ دوسری نرس پیچھے تھی، جس نے ہاتھ میں ٹرے پکڑا ہوا تھا۔ وہ جیسے ہی کمرے داخل ہوئیں تو ایک دم سے چیخیں مار اٹھیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ انتہائی دہشت زدہ تھیں۔ دوسری کے ہاتھ میں پکڑا ہوا ٹرے چھوٹ کر فرش پر جا پڑا تھا۔ میں یہ سب دیکھ رہا تھا مگر مجھ میں اٹھنے کی سکت نہیں تھی کہ گردن اٹھا کر دیکھ سکوں۔ اگلے ہی لمحے وہ کمرے سے باہر تھیں۔ زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ کئی سارے لوگ آتے اور کمرے میں جھانک کر چلے جاتے۔ یہاں تک کہ میرے دوست آگئے۔ وہ میری طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

''وہ سب بکواس کر رہے ہیں۔ بھلا ایسا بھی ممکن ہے، اگر ہوتا تو چار دن ہو گئے ہمیں ہی کچھ دکھائی دے جاتا۔ ایسی تو کوئی بات ہی نہیں۔'' ندیم نے غصے میں کہا۔

''لیکن ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچو، انہیں آخر ایسی کیا ضرورت ہے کہ وہ جھوٹ بولیں گی، وہ کیوں کہیں گی کہ یہاں پر انہوں نے کوئی جن، بھوت یا چڑیل دیکھی ہے، اس میں ان کا کیا فائدہ؟'' آصف نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

''لیکن انہوں نے ایسا کہا؟'' یہ کہتے ہوئے وقار نے ایک دم میری جانب دیکھا اور بولا، ''کہیں یہی تو ڈرامہ کر کے یہاں نہیں پڑا، ممکن ہے اس نے اسی نرس کو چھیڑا ہو اور اس نے ......'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر میری جانب دیکھا۔ اس کا چہرہ سرخ تھا۔

''او بکواس نہ کرا وئے۔ ڈرامہ ہوتا تو اب تک یہ ٹھیک ہو چکا ہوتا۔ اتنے دن نہیں چلتا یہ سب۔ سیدھی سی بات ہے اگر چڑیل، جن یا بھوت انہیں دکھائی دے سکتا ہے تو ہمیں بھی نظر آتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔'' ندیم نے حتمی انداز میں کہا۔

وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ڈاکٹر کمرے میں آ گیا۔ اس نے آتے ہی مجھے دیکھا۔ ایک گرانڈیل سی نرس نے میرا بلڈ پریشر دیکھا پھر چارٹ پر لکھ کر ڈاکٹر کو دکھایا۔ ڈاکٹر نے اچھی طرح چیک اپ کے بعد میرے دوستوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اس کی تمام رپورٹس نارمل ہیں۔ جسمانی طور پر یہ بالکل ٹھیک ہے۔ آپ چاہیں تو اسے گھر لے جا سکتے ہیں۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب، اسے ہوش نہیں، یہ بات نہیں کرتا، اس کی حالت ایسی ہے جیسے کومے میں ہو۔ آپ اسے تندرست قرار دے رہے ہیں؟'' وقار نے سنجیدگی سے کہا تو ڈاکٹر بولا۔

''ممکن ہے اسے کوئی دماغی شاک لگا ہو۔ انعان ہے اندھیرے میں کہیں ڈر گیا ہوگا۔ گھر میں رہے گا تو اس کے اثرات آہستہ آہستہ ختم ہو جائیں گے اور ویسے بھی اتنے دن مسکن دوائیوں پر جسمانی طور پر تندرست اس بندے کو نہیں رکھا جا سکتا۔'' ڈاکٹر نے حتمی لہجے میں کہا تو آصف نے جلدی سے کہا

''ڈاکٹر صاحب! اس وقت ہم اسے کہاں لے کر جائیں گے۔ یہ رات یہیں رہے، ہم کل صبح اسے لے جائیں گے۔ صبح آپ اسے......''

''او کے او کے۔ صبح تک۔'' یہ کہہ کر وہ باہر کی

جانب چل دیا۔ میرے تینوں دوست ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ظاہر ہے ان کے لیے یہ بہت مشکل تھا۔ وہ مجھے ہاسٹل لے کر جاتے یا گھر؟ ہاسٹل لے کر جاتے تو وہاں پوچھا جاتا کہ کیا ہوا، اتنے دن تک کیوں چھپایا، وغیرہ وغیرہ اور میرے گھر والوں کو پتہ چلتا اور یہی سوال ہوتے تو......



رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کمرے میں تیز میوزک شروع ہو گیا ہو اور اس کے ساتھ ہی سڑے ہوئے گوشت کی سڑاند پھیل رہی ہو۔ میوزک اور سڑاند کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ آصف ایک طرف بیڈ پر سو رہا تھا۔ تبھی میری نگاہ ساتھ دھری کرسی پر پڑی۔ میں چونک گیا۔ وہی بھیانک شہزادی میری طرف دیکھ کر بیہودہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔

''تم یہاں؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا تو وہ خبیثانہ انداز میں ہنستی چلی گئی۔ اس کے پیلے دانتوں اور لہو رنگ ہونٹوں سے رال بہہ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کی بیہودہ ہنسی تھمی تو میری طرف دیکھ کر بولی۔

''تم خود ہی تو مجھے اپنے ساتھ اپنی دنیا میں لے کر آئے ہو۔ اب میں تمہارے ساتھ ہوں اور تیرے ساتھ ہی رہوں گی۔'' یہ کہہ کر وہ پھر ہنس دی تو میں نے تیزی سے پوچھا۔

''تم تب سے یہاں ہو، جب سے میں یہاں ہوں اور وہ نرس ٹھیک کہہ رہی تھی، تم سے......''

''دکھائی دی تھی۔ میں ہی اسے دکھائی دی تھی۔ بے وقوف تجھے پسند کرنے لگی تھی۔ جان بوجھ کر تیرے کمرے کے چکر لگاتی تھی۔'' اس نے خرخراتے ہوئے انداز میں غصے سے کہا۔

''بے وقوف ہو تم، وہ میرا علاج کر رہے ہیں اور تم؟'' میں نے خفگی سے کہا۔

''تمہیں کچھ بھی نہیں ہوا، تم ٹھیک ہو۔ اب میں اور تم اس دنیا کو دیکھیں گے۔ بہت پیار کریں گے۔'' وہ خبیثانہ ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔

''میں اگر ٹھیک ہوتا تو یہاں کیسے پڑا ہوتا؟'' میں نے غصے میں کہا۔

''میں نے کہہ دیا کہ تم ٹھیک ہو تو بس ٹھیک ہو۔'' اس نے جھومتے ہوئے کہا۔

''اوئے کیا بات ہے تو کس سے باتیں کر رہا ہے؟'' آصف نے میری طرف دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

''کسی سے بھی نہیں؟'' میں نے گھبراتے ہوئے کہا۔

''دیکھو، یہ خوشی کی بات ہے کہ تم باتیں کرنے لگے ہو، لیکن اوٹ پٹانگ سے تو......'' اس نے کہتے ہوئے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''نہیں میں ٹھیک ہوں، تم پریشان نہ ہو۔ آؤ ذرا باہر لان میں بیٹھتے ہیں۔'' میں نے کہا کیونکہ سڑاند کے باعث میرا دماغ خراب ہو رہا تھا۔ وہ میری جانب دیکھے چلے جا رہی تھی۔ لیکن روک نہیں پائی۔ میں اور آصف باہر لان میں آ گئے۔ وہ مجھے میرے بارے میں بتانے لگا۔ ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک دم سے نرسنگ اسٹیشن کی طرف سے چیخوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پھر اس کے ساتھ ہی کوریڈور میں بھگدڑ مچ گئی۔ ہم دونوں ہی اس جانب لپکے۔ میں نے دیکھا وہ ایک جانب دانت نکوستے ہوئے ہنستی چلی جا رہی تھی۔ وارڈ میں دہشت پھیل چکی تھی۔ ایک نرس بے ہوش ہو چکی تھی۔

''یہ نرس ہی پاگل ہے۔ ڈاکٹر بھی کہہ رہا تھا

کہ......'' آصف نجانے کیا کہہ رہا تھا اور میں اسے دیکھ رہا تھا وہ باہر کی سمت چلی گئی تھی۔



میں ہاسٹل آ گیا تھا۔ میں بالکل ٹھیک تھا اور اپنے آپ کو نارمل محسوس کر رہا تھا۔ تین چار دن تک میں کمرے ہی میں پڑا رہا۔ ایک صبح وقار نے کہا
''کب تک یونہی کمرے میں پڑا رہے گا۔ چل آج ذرا ٹھور شہور نکال، ڈیپارٹمنٹ چلیں۔ تیرا دل بھی بہل جائے گا۔''
بات اس کی معقول تھی۔ میں تیار ہو کر اس کے ساتھ ہی ڈیپارٹمنٹ چل دیا۔ تقریباً سبھی کلاس فیلو ملے۔ اس وقت کاریڈور میں چند دوستوں سے گپ شپ ہو رہی تھی۔ ایسے میں ریحانہ الیاس آتی ہوئی نظر آئی۔
تعلیمی سیشن کے اس عرصے میں ریحانہ سے میری کافی گپ شپ ہو گئی تھی کہ بات انڈر اسٹینڈنگ تک آ پہنچی تھی۔ اگرچہ میں کافی محتاط رہتا تھا [illegible] دل سے قربت چاہتا تھا۔ وہ بھی کافی سمجھدار [illegible] سمجھتی تھی کہ ڈیپارٹمنٹ میں کچھ بھی نہ ہو تو اس کے افسانے بن جاتے ہیں۔ وہ اپنی داستان زبان زدِ عام نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ویسے بھی وہ بڑی سوبر اور اسمارٹ تھی۔ ایک دلکش شخصیت کی مالک تھی۔
وہ دور ہی سے مجھے دیکھ کر مسکرائی اور پھر قریب آ کر سب کو سلام کیا اور مجھ سے بولی۔
''کہاں غائب رہے ہوا تنے دن، گرفتاری کا ڈر تھا یا فائرنگ سے اتنے ہی خوف زدہ ہو گئے تھے۔''
''ریحانہ، گرفتاری کا ڈر مجھے اس لیے نہیں کہ میں نے کون سا ہنگامہ کیا یا میں ان ہنگامہ کرنے والوں کے ساتھ تھا۔ فائرنگ میرے سامنے ہوئی نہیں جو میں خوف زدہ ہو جاتا۔'' میں نے انتہائی تحمل سے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ ہنستے ہوئے وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس وقت میرے سمیت سبھی لوگ حیرت زدہ رہ گئے جب ریحانہ قہقہہ لگاتے ہوئے ایک دم گھگھیا گئی، اس کے ساتھ ہی اس نے چیخ ماری اور بے ہوش ہوتی چلی گئی۔ اس کے ساتھ مہوش کھڑی تھی، اس نے فوراً ہی اسے پکڑ لیا۔
ایک دم سے سارے ہی پریشان ہو گئے، تبھی میں نے فطری طور پر اپنے پیچھے دیکھا، وہی بھیانک چہرے والی شہزادی چڑیل کھڑی تھی۔ اس وقت مجھے اس پر بے انتہا غصہ آیا، میں اپنا غصہ اس پر اُتارنے ہی والا تھا کہ ایک دم سے مجھے خیال آیا۔ ان میں سے کسی کو نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا بیتی اور ریحانہ کے بے ہوش ہو جانے کی وجہ کیا ہے؟ میں اگر اس بھیانک شہزادی سے بات کروں گا تو سب مجھے پاگل سمجھیں گے۔ وہ ان سب کو کہاں دکھائی دے رہی تھی۔ وہاں پر موجود مہوش اور نائلہ نے ریحانہ کو سنبھالا۔ وہ اسے لے کر کلاس روم کی طرف چلی گئیں۔ مجھے اس کے بے ہوش کی وجہ معلوم تھی۔ میں اس لیے وہاں نہیں گیا کہ اگر وہ بھیانک شہزادی اسے دوبارہ نظر آ گئی تو کہیں اپنے حواس ہی نہ کھو دے۔ میں وہاں سے نکل کر اس لان کی جانب بڑھ گیا، جو اکثر ویران ہی رہتا تھا۔
وہ بھیانک شہزادی اپنے اصلی رُوپ میں میرے سامنے کھڑی تھی۔ روہی کے بعد یہ دوسری بار میرے سامنے تھی۔ وہ برہنہ تھی۔ سر کے بال کسی جھاڑی کی مانند بکھرے ہوئے تھے۔ وحشت زدہ سرخ آنکھیں کنپٹیوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ لمبا اور تیکھا ناک اوپری ہونٹ کی جانب مڑا ہوا تھا۔ تیز، نوکیلے اور میلے دانتوں میں سے رالیں بہہ رہی تھیں۔ نچلا

ہونٹ لٹکا ہوا تھا۔ اسکے گلے میں کانٹوں اور ہڈیوں کی مالا تھی۔ کھردرا اور سیاہ بدن یوں چمک رہا تھا کیسے کوئی سیاہ تیل لگا دیا گیا ہو۔ میں نے پہلی بار اسے غور دیکھا تو کراہت کا احساس میرے اندر ابھرنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے مجھے ابھی قے آ جائے گی۔ میں نے خود پر بڑا جبر کیا۔ اس وقت مجھے اس پر غصہ ہی بہت آ رہا تھا۔ وہ للچائی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''آخر تم چاہتی کیا ہو؟'' میں نے غصے میں لرزتے ہوئے پوچھا تو وہ بولی۔

''بھول گئے تم؟ میں تمہارے ساتھ تمہاری دنیا میں آئی ہوں۔ مجھے تمہارے ساتھ رہنا ہے۔'' اس نے خرخراتی ہوئی آواز میں یوں کہا جیسے وہ غصے میں آ گئی ہو۔

''تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم لوگوں کو ڈراتی پھرو۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

''جو بھی تیرے قریب آئے گی، میں اس کا سامان کروں گی۔'' اس نے بے پرواہی سے کہا۔

''میں کل گھر جاؤں گا۔ میری ماں، میری بہن مجھے ملے گی تو پھر بھی......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹ کر بولی۔

''جو بھی تم سے محبت کرے گا، میں اسے برداشت نہیں کروں گی۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے تم مجھے اپنی دنیا میں لے جاؤ اور مار دو مجھے؟'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''تم کیا چاہتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''دیکھو، میں نے اگر اس دنیا میں رہنا ہے تو مجھے دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی ملنا جلنا ہے۔ ان کے ساتھ رہنا ہے۔ یوں لوگ میرے ہونے سے بے ہوش ہوتے رہے تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ مجھے اس کا کوئی حل سوچنا ہوگا۔'' میں نے اس کی صر کہا۔

''میں نے یہ پوچھا ہے کہ تم کیا چاہتے ہو۔'' اس نے خرخراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''تم دفعہ ہو جاؤ اپنی دنیا میں۔ کیوں......'' میں نے غصے کہا۔

''لیکن تم مجھے خود سے الگ نہیں کر سکتے، اگر ہمت ہے تو کر کے دیکھ لو۔ میں نے تمہیں کچھ نہیں کہا اس لیے تم ایسا کہہ رہے ہو؟'' اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''تو کیا کرو گی، مجھے مار دو گی نا تو مار دو۔ تب کس کے ساتھ رہو گی؟'' میں اس پر چیختے ہوئے کہا۔

''تم مجھے پسند ہو، اس لیے میں تجھے ماروں گی نہیں، تم خود مر جانا پسند کرو تو مر جاؤ۔'' وہ لہراتی ہوئی بولی۔

''آخر تم چاہتی کیا ہو؟ میں نے تمہارا کیا......'' میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''فضول مت بولو، میں تم سے پوچھ رہی ہوں کہ تم کیا چاہتے ہو؟'' میں بولا۔

''تم...... تم نقصان نہیں پہنچاؤ گی، کسی کو بھی نہیں، مجھے بھی نہیں۔ کسی کو دکھائی نہیں دو گی۔ مجھے بھی نہیں۔'' میں نے انتہائی غصے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، میں تمہاری یہ شرط مان لیتی ہوں اور تم مجھے خود سے الگ کرنے کا کبھی نہیں کہو گے۔'' اس نے کہا تو میں نے ہاں میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔''

میں نے جیسے ہی یہ کہا وہ لہراتی ہوئی ایک جانب چل دی اور پھر دھوئیں کی مانند ہوا میں تحلیل ہو گئی۔

میں نے ایک طویل سانس لی اور واپس ڈیپارٹمنٹ کی جانب چل دیا۔ میرے دماغ میں بہت کچھ چل رہا تھا۔



یہ واقعہ گزرے چار ماہ ہو گئے۔ اس دوران وہ بھیانک شہزادی نظر نہیں آئی۔ وہ صرف مجھے ہی دکھائی نہیں دی بلکہ کسی کو بھی نہیں۔ نرس اور ریحانہ کی طرح کا پھر کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ ان چار ماہ میں بڑا سکون رہا۔ میں بھی آہستہ آہستہ اسے بھول گیا۔ کبھی کبھار دوستوں میں بات ہو جاتی، وہ اس واقعہ کو میرے ذہن کا فتور خیال کرتے۔ مجھے بھی وہ سب خواب ہی لگتا۔ بہرحال وہ بھیانک شہزادی اپنی تمام تر وحشت، خوفناکی اور کراہت کے میرے ذہن سے نکل گئی۔ میری زندگی نارمل تھی۔ اور میں سکون سے اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف تھا۔



ایک دن میں کینٹین کے باہر لان میں بیٹھا اپنے دوستوں کا انتظار کر رہا تھا۔ وہاں کافی رش تھا۔ میرے سامنے ایک کرسی خالی پڑی ہوئی تھی۔ میں فریش جوس کے سپ لے رہا تھا کہ اچانک میرے سامنے ایک لڑکی یوں آن کھڑی ہوئی، جیسے وہاں موجود کئی سارے لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان میں سے نکل کر آئی ہو۔ وہ ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ پھر میرے سامنے دھری کرسی کو پکڑتے ہوئے پوچھا

"کیا میں بیٹھ سکتی ہوں؟"

"جی، کیوں نہیں، بیٹھیں۔" میں نے اس کے سراپا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ بیٹھ کر یوں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی، جیسے کیسی ویٹر کو دیکھ رہی ہو۔

وہ خاصی حسین لڑکی تھی۔ گول چہرہ، جس پر معصومیت پھیلی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں، چھوٹا سا ناک، پتلے پتلے ہونٹ، ذرا سا صحت مند جسم، اس نے اپنے گھنے بال پونی ٹیل میں باندھے ہوئے تھے۔ اس کے ڈریس اور انداز سے یہی لگتا تھا کہ وہ کافی ماڈ لڑکی ہے۔

"آپ پلیز، کسی ویٹر سے کہیں نا کہ وہ جوس دے جائے۔" اس نے میری طرف دیکھ کر لجالت سے کہا۔ میں نے چھوٹے کو آواز دی اور اسے جوس کا آرڈر دے دیا۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ تب میں نے پوچھا

"آپ کو یہاں پہلی بار دیکھا ہے؟"

"جی، پہلی بار ہی دیکھا ہوگا کیونکہ میں یہاں آئی ہی پہلی بار ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا

"مطلب؟" میں نے اس کی دھیمی سی مسکراہٹ دیکھتے ہوئے کہا۔ اتنے میں چھوٹا آ گیا تو میں نے اسے جوس کا آرڈر دے دیا۔ وہ پلٹا تو وہ بولی

"میں دراصل یہاں پر ایک ریسرچ کے سلسلے میں آئی ہوں۔ میرا باٹنی سبجیکٹ ہے اور صحرائی پودوں کے بارے یہ ریسرچ ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی یونیورسٹی کے بارے میں بتایا تو میں نے کہا

"لیکن ابھی تک آپ نے اپنا نام نہیں بتایا؟"

"فرح نام ہے میرا" اس نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، تو ہمارے درمیان گپ شپ چل پڑی۔ کافی دیر تک یونہی بے مقصد باتیں ہوتی رہیں۔ وہ لڑکیوں کے ایک ہاسٹل میں ٹھہری ہوئی تھی اور پچھلے تین دن سے صحرا میں جا کر پودے تلاش کر رہی تھی۔ اس نے کافی کچھ بتایا۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد جب ہم وہاں سے اٹھے تو ہم میں خاصی بے تکلفی آ چکی تھی اور اس کے ساتھ اگلے دن یہیں ملنے کا وعدہ بھی۔

"ابھی آپ کہاں جا رہی ہیں؟" میں نے پوچھا

"میں ہاسٹل جاؤں گی۔" اس نے کہا تو میں نے

اسے ہاسٹل ڈراپ کرنے کی آفر کردی۔ ہاسٹل سے ذرا فاصلے پر میں نے اس سے پوچھا
''صحرا میں کب اور کیسے جاتی ہیں آپ؟''
''میں دن کے پہلے وقت ہی صحرا میں جاتی ہوں اور میں نے ایک پرائیویٹ کار ہائیر کی ہوئی ہے۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔
''آپ کو تو یہ ریسرچ بہت مہنگی پڑے گی۔'' میں نے کار روکتے ہوئے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر بولی۔
''پھر کیا ہوا۔'' یہ کہہ کر وہ اتر گئی۔ وہ شکریہ ادا کر کے ہاسٹل گیٹ میں داخل ہوگئی۔ میں چند لمحے اس کے حسن کے سحر میں رہا اور پھر اپنے ہاسٹل کی جانب بڑھ گیا۔ فرح ایک دم ہی سے میرے حواسوں پر چھا گئی تھی۔

اگلے دن میں کینٹین پر وقت سے پہلے پہنچ گیا اور لاشعوری طور پر اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ کل والے وقت سے ذرا دیر بعد وہاں آگئی۔ مجھے دیکھ کر اس کا انداز یوں تھا جیسے اسے امید ہو کہ میں اسے وہیں ملوں گا۔ پھر وہیں بیٹھے باتیں کرتے کھاتے پیتے دو تین گھنٹے گزر گئے۔ اس دن فرح نے بتایا کہ اب وہ چار دن صحرا نہیں جائے گی۔ یہیں لائبریری میں کام کرے گی۔ یہی چار دن ہم بالکل ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ اچھی خاصی دوستی ہوگئی۔

''کل دوپہر کے بعد میں نے چلے جانا ہے۔'' اسی شام اس نے افسردگی سے کہا تو مجھے بڑا عجیب سا لگا۔ ایک دم سے میں اداس ہوگیا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔
''ایک دن تو میں نے جانا ہی ہے، تم تو یوں اداس ہوگئے جیسے میں نے تمہارے ساتھ ہمیشہ رہنا ہے۔''
''وہ تو تمہاری مرضی ہے۔ ویسے کل کیا کر رہی ہو؟''
''کل میں نے لیبارٹری میں ٹیسٹ کے لیے کچھ فریش پودے لینے ہیں اور واپسی پر چلے جانا ہے۔''
''اگر میں تمہیں چھوڑ دوں تو......'' میں نے اس سے پوچھا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔
''اس سے اچھا کیا ہوگا، میرے پیسے بھی بچ جائیں گے اور تھوڑا وقت بھی تمہارے ساتھ گزر جائے گا۔''
''تو پھر طے ہے کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔'' میں نے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔
''او کے، میں کار والے سے کہہ دوں گی کہ وہ صبح نہ آئے اور تم مجھے ہاسٹل سے پک کر لینا۔ میں اپنا سامان بھی واپسی پر لے لوں گی۔''
ہمارے درمیان طے ہوگیا۔
اگلی صبح میں اس کے ہاسٹل کے سامنے تھا۔ وہ جیسے تیار ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک وقت پر باہر تھی۔ وہ میرے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھی اور ہم روہی کی جانب نکل گئے۔ دوپہر تک ہم نے واپس آجانا تھا۔ راستے میں ایک جگہ چھوٹی سی بستی تھی اور وہیں ڈیرہ بھی تھا۔ اس سے ذرا پہلے صحرا کا روایتی گوپا تھا۔
''یہاں سے بہت اچھی دودھ پتی ملتی ہے۔ کیا خیال ہے پئیں؟'' فرح نے مجھ سے پوچھا تو میں نے کار روک دی۔ کار تو میں نے روک دی لیکن مجھے وہاں کوئی بندہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یوں جیسے وہ گوپا ویران ہو۔
''یار یہاں تو کوئی دکھائی ہی نہیں دے رہا ہے؟''
''اندر ہیں۔'' اس نے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی۔ ہم گوپے کے اندر گئے تو وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ مجھے ایک دم سے وہ جگہ بہت پُراسرار لگی۔

میں نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے ہی تھے کہ میرے پیچھے گوپے کا دروازہ بند ہوگیا۔فرح نے جو میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا، وہ چھوڑ دیا۔اس کے ساتھ ہی گوپے کے اندر کا فرش پھٹتا چلا گیا اور میں سنبھلتے سنبھلتے اس خلا میں گرتا چلا گیا۔ میرے ساتھ فرح بھی تھی۔ پتہ نہیں کتنا وقت یونہی گذر گیا۔ پھر جیسے ہی میرے پاؤں زمین پر لگے تو وہاں کی دنیا ہی عجیب تھی۔

دور دور تک ویرانی تھی۔ کسی بھی ذی روح کا احساس نہیں تھا۔اس جگہ سورج کا شائبہ تک نہیں تھا۔ ملگجی روشنی تھی، جو نیلگوں نہیں بلکہ سرخی مائل تھی۔اچانک زمین سے فوارے کی مانند مٹی اچھلتی، جس میں ہڈیاں ہوتیں۔ وہ فضا میں دور تک بکھر جاتیں۔کوئی ڈھانچہ کسی طرف سے نکلتا اور اس کے پیچھے ہوا میں تیرتا ہوا کوئی آگ کا گولا آتا، اور اس ڈھانچے کو لگتا۔ وہ چلتے چلتے بکھر جاتا۔ میں ابھی یہ دیکھ ہی رہا تھا کہ میری نگاہ فرح پر پڑی تو بے ساختہ میری چیخ نکل گئی۔ وہ بھیانک شہزادی تھی جو دانت نکوستے ہوئے میری طرف دیکھ رہی تھی۔اس کے بھدے پیلے دانتوں اور ہونٹوں سے رال بہہ رہی تھی۔فطری طور پر میرے منہ سے نکلا۔

''تم...... یہ تم ہو؟''

''ہاں' یہ میں ہی ہوں، مگر تم اتنا کیوں گھبرا گئے ہو۔ابھی میں تجھے کچھ نہیں کہوں گی۔ابھی تو میں تجھے ایک تماشا دکھانے لائی ہوں۔''

''کیسا تماشا اور ...... اور یہ تم روپ بدل کر ......؟'' میں نے خوف زدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں میں نے روپ بدلا اور تیری وجہ سے بدلا۔'' اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''میری وجہ سے؟ وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''تم نہ ہوتے تو شاید یہ روپ بدلنے والی طاقت مجھ میں نہ آتی۔ خیر تم ایسے نہیں سمجھو گے۔ میں تمہیں بتاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ زور زور سے ہولناک انداز میں یوں چیخنے لگی۔ جیسے کسی کو بلا رہی ہو۔ ذرا سی دیر بعد اس پر اسرار ویرانے میں سے اس جیسی کئی چڑیلیں نمودار ہونے لگیں، مجھے تو یہی لگتا تھا کہ جیسے وہ زمین سے اُگ رہی ہیں۔وہ تعداد میں کافی ساری تھیں، جو کچھ فاصلے پر آ کر رک گئیں۔

''یہ کون ہیں؟''

''یہ سب میری طرح ہی کی ہیں، لیکن انہوں نے روپ بدلنے کی طاقت حاصل کر لی ہے۔'' اس نے کہا ہی تھا کہ میرے سامنے کھڑی وہ بھیانک چڑیلیں خوبصورت اور حسین دوشیزاؤں میں بدل گئیں۔ان کا رنگ روپ دیکھنے والا تھا۔ایک سے بڑھ کر ایک حسین تھی۔لباس کے نام پر کسی کے بدن پر کچھ نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر ایسے ہی کھڑی رہیں اور پھر دوبارہ اسی حالت میں تبدیل ہونے لگیں۔اب وہی بھیانک چڑیلیں میرے سامنے تھیں۔

''یہ سب کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم سب آگ کی پیدوار ہیں۔ ہماری بڑی ملکہ جو بڑی قوت رکھتی ہے، اس نے ایسی ہی مختلف قوتیں حاصل کی ہیں۔ یہ روپ بدلنے کی قوت پہلی قوت ہوتی ہے، جو ہم حاصل کرتے ہیں۔مگر یہ انسان کے بغیر نہیں ہو سکتی ہیں۔ چار ماہ تک میں تیری قوت کے ساتھ خود کو رکھ کر یہ قوت حاصل کرتی رہی۔تم نے جو کہا میں نے وہ کیا۔'' اس نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

''چار ماہ۔میری قوت؟'' میں نے پوچھا۔

''ہماری ساری طاقتیں انسان کی وجہ ہی سے ہوتی ہیں۔تم یاد کرو، میں نے تم کیا کچھ نہیں کروایا۔

کیسے کیسے کام کیے ہیں تو نے، کیا وہ سب کالے کرتوت نہیں تھے۔'' اس نے کہا تو میں چونک گیا۔ اس کے ملنے کے بعد سے میں نے پتہ نہیں کتنی لڑکیوں کو ورغلایا، نشے کیے، جوا کھیلنے کا عادی ہو گیا اور وہ سب بڑی آسانی سے ہو جاتا تھا۔

''تو یہ سب تم......'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''میں نہیں، وہ تم ہی کرتے تھے، میں تو تمہارے اندر اس کی خواہش کو بڑھا دیتی تھی۔ دیکھو لوگ ہمیں تسخیر کرنے کے لیے بہت کچھ کرتے ہیں، بڑی بڑی ریاضتیں کرتے ہیں۔ ہم ان کی غلام ہو جاتی ہیں۔ تم ویسے ہی میرے ہتھے چڑھ گئے ہو۔''

''اب تم میرے ساتھ کیا کرنے والی ہو؟'' میں نے کافی حد تک اعتماد سے پوچھا حالانکہ میں اندر سے بہت ڈرا ہوا تھا۔

''میں تمہیں یہاں صرف اس لیے لے کر آئی ہوں کہ تمہیں اپنا آپ دکھا دوں، اگر تم میری بات مان لو گے تو میں تمہیں بہت فائدہ دوں گی اور اگر نہیں مانو گے تو یہیں، ان ڈھانچوں کے ساتھ ایک ڈھانچہ بن جاؤ گے۔ تمہارا تازہ تازہ خون میری طاقت کی وجہ بن جائے گا۔'' اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''میرا فائدہ کیا ہے اور تم کیا منوانا چاہتی ہو؟'' میں نے پوچھا تو قہقہہ لگا کر بولی۔

''تم جو مانگو گے دوں گی۔ میں جو مانگوں گی تم مجھے وہ دینا۔ مجھے تو اپنی طاقتیں بڑھانی ہیں۔ مجھے بھی اپنی دنیا کی ملکہ بننا ہے۔''

''تم کیا مانگو گی اور میں......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ ایک دم سے میری بات کاٹ کر بولی۔

''میں یہ تم سے ابھی طے نہیں کروں گی اور نہ کر

سکتی ہوں۔ ماننا ہے مانو، ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ، اگر بچ سکتے ہو تو بچ جاؤ۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے کریہہ ہاتھ فضا میں بلند کر دیئے۔ اس میں سے آگ پھوٹنے لگی۔ جس کے شعلے دور دور تک جاتے تھے۔ گوشت سڑنے کی بُو پھیلنے لگی تھی، جس سے مجھے اُبکائی محسوس ہونے لگی۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میرے سامنے وہی بھیانک عورتیں آن وارد ہوئیں۔ انہوں نے بھی زمین پر پاؤں مارتے ہوئے اپنے ہاتھ زمین کی طرف کیئے تو وہاں آگ بھڑکنے لگی۔ شعلے اوپر کی جانب اٹھنے لگے۔ اس بھیانک شہزادی کے کریہہ ہاتھوں میں نجانے کہاں سے بھالا آ گیا، وہ اسے لہراتے ہوئے زور زور سے وحشت ناک انداز میں چیخنے لگی۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا کہ وہ کسی بھی وقت لہولہان کر دے گی۔ زن زن سے وہ بھالا میرے قریب سے ہو کر گزر جاتا۔ میں نے اس کی بات ماننے کا فیصلہ کر لیا۔

''میں تمہاری بات مانتا ہوں۔'' میں نے زور سے کہا تو ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ وہ ساری یکبارگی رُک گئیں۔ پھر خوشی کے انداز میں وہ وحشیانہ طور پر ناچنے لگیں۔ جیسے ان کی کوئی بڑی جیت ہو گئی ہو۔ پتہ نہیں کتنی دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ اتنا گہرا اندھیرا چھا گیا، جس میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے ہم گوپے کے اندر کھڑے تھے۔ وہ بھیانک شہزادی اب فرح کے روپ میں میرے سامنے تھی۔ اب اس کا حسن دلفریب نہیں تھا بلکہ وہ مجھے ایسا نقاب دکھائی دے رہا تھا، جس میں کراہت چھپی ہوئی ہو۔

''آؤ، واپس چلتے ہیں۔'' فرح نے کہا تو میں گوپے میں سے تیزی کے ساتھ باہر نکلا اور کار میں جا بیٹھا۔ وہ میرے ساتھ آ بیٹھی۔ ہم صحرا سے نکلتے چلے گئے۔

جس وقت میں گرلز ہاسٹل کے سامنے آ کر رکا، اسی وقت ایک لڑکی پر میری نگاہ پڑی۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے فرح میرے ساتھ سے اٹھ کر وہاں جا کر کھڑی ہو گئی ہے۔ وہ ہو بہو وہی تھی۔ اس کے پاس بیگ تھا، اور دوسری ایسی چیزیں، جس سے لگ رہا تھا کہ وہ کہیں جا رہی ہے۔ میں نے فرح کی جانب دیکھا تو وہ مکارانہ انداز میں بولی

''اسی کا روپ دھارا ہے میں نے اور اس کے سارے خیالات میرے ذہن میں ہیں۔ اب یہ یہاں نہیں رہی تو کوئی بات نہیں، اب مجھے بھی یہاں نہیں رہنا، تم کار بڑھاؤ۔''

''اترنا نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا

''نہیں، بلکہ اب میں تجھے ایک نئے روپ میں ملوں گی۔'' یہ کہتے ہی وہ دھوئیں کی مانند تحلیل ہونے لگی۔ یہاں تک کہ کار کے اندر سڑے ہوئے گوشت کی سڑاند پھیل گئی۔ میں نے گھبرا کر کار بڑھا لی۔



اسی شام میں اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا سوچ رہا تھا کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے ایسا کیا جرم کر لیا کہ وہ چڑیل میرے ساتھ ہی چپک گئی ہے۔ وہ مجھے کچھ کہتی بھی نہیں اور مجھے ڈراتی بھی ہے۔ ایک بات اس کی میرے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھی کہ اسے اپنی دنیا کی ملکہ بننے کے لیے طاقتیں چاہیں اور وہ چار ماہ تک میرے ساتھ چپکی یہی روپ بدلنے کی طاقت حاصل کرتی رہی۔ میں تو یہی سمجھا تھا کہ وہ جان چھوڑ گئی۔ لیکن وہ تو میرے ساتھ تھی۔ کیا وہ میرے ساتھ یونہی چپکی رہے گی؟ یہ خیال ہی مجھے لرزا دینے والا تھا۔ کیا میری اپنی مرضی، اپنی

زندگی ختم ہوگئی، کیا اب میں اسی چڑیل کا پابند ہوکر رہ جاؤں گا؟ میں کچھ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ غیر فطری ماورائی قسم کے منظر، جن سے میں گذر چکا تھا۔ وہ مجھے اب بھی خوف زدہ کررہے تھے۔

میں ساری رات نہ سو سکا۔ خوف اور دہشت سے میری آنکھ ہی نہیں لگی تھی۔ جب بھی آنکھیں بند کرتا وہی منظر میرے سامنے آجاتے۔ صبح ہوتے ہی میں تیار ہوکر ڈیپارٹمنٹ چلا گیا۔ وہاں کوئی بھی نہیں آیا ہوا تھا۔ میرے اندر پہلے ہی بے چینی تھی، خوف اور دہشت نے مجھے لرزا کر رکھ دیا تھا۔ میں سب جگہ پھر کر واپس کینٹین کی طرف جارہا تھا کہ ایک دم سے میرے سامنے سرخ سپورٹس کار آرکی۔ اس میں ایک حسین و جمیل لڑکی تھی۔ اس نے سلیولیس اپر پہنا ہوا تھا۔ بوائے کٹ بال، تیکھے نقوش گلے میں نازک سا لاکٹ، جس میں ہیرا جڑا ہوا تھا اور اس کی رنگینی پھیل رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور بڑی ادا سے بولی

''آؤ، بیٹھو، ہم اپنا نیا گھر دیکھیں۔''

''ہم، مطلب، ایک دوسرے......'' میں نے کہنا چاہا لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آ گیا کہ یہ بھیانک شہزادی ہے جو کسی دوسرے روپ میں سامنے آگئی ہے۔

''جاؤ، مجھے کہیں نہیں جانا۔''

''دیکھو، میں تجھے پیار کرتی ہوں اور ابھی تک تجھے کچھ نہیں کہا، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تجھے کچھ کہوں گی نہیں۔ تم موت کی طلب کرو گے، لیکن ایسی اذیت دوں گی کہ نہ موت آئے گی اور نہ تم زندہ رہو گے، چپ چاپ میری بات مان لو۔'' اس نے انتہائی نفرت اور طنزیہ لہجے میں کہا تو مجھ پر ایک دم سے خوف طاری ہو گیا۔ میں اس کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا۔

شہر سے باہر وہ ایک فارم ہاؤس کے جیسا ایک بڑا سا گھر تھا۔ جس میں فوارے چل رہے تھے۔ دن کی دھوپ میں وہ روشن تھا۔ وہ مجھے لیتی ہوئی اندر چلی گئی۔ ڈرائینگ روم میں بٹھا کر خود سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''یہ گھر، یہ کار یہاں کا سب کچھ تمہارا ہے۔ تم جس لڑکی کو بھی چاہو، یہاں لے آؤ اور عیش کرو۔ دولت کی پرواہ مت کرنا، یہ لو ایسی گڈیاں، جتنی چاہو یہاں سے مل جائیں گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے بڑے نوٹوں کی چھ گڈیاں میری جانب پھینک دیں۔''

میں حیران و پریشان یہ دیکھ رہا تھا۔ لیکن اندر ہی اندر سے ایک دم خوش ہو گیا۔ میرے اندر لاشعور میں چھپی ہوئی خواہش کو وہ پورا کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔

''لڑکی کیوں، تم اس روپ میں......''

''نہیں، لڑکی لاؤ۔ تم موج کرو۔'' اس نے کہا اور پھر اٹھ کر اندر کی جانب چلی گئی۔



کئی دنوں سے ایک لڑکی فاخرہ میری نگاہ میں تھی۔ بہت تیز طرار اور دھانسو قسم کی تھی۔ مجھے اس کے بارے میں یہ اندازہ تھا کہ وہ بہت امیر کبیر لڑکوں سے دوستی رکھنے کی ہمیشہ سے خواہشمند رہی ہے۔ اس کا اسٹائل ہمیشہ ایسا ہوتا تھا، جیسے وہ کسی یورپین ملک سے یہاں آئی ہو۔ وہ ایک بڑے بیورو کریٹ کی بیٹی تھی۔ کئی ملک گھومی تھی۔ لڑکے بھی اس کی طرف بڑا جھکاؤ رکھتے تھے، وہ کسی عام لڑکے کو منہ

نہیں لگاتی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کبھی میرے نزدیک آئے گی لیکن دولت کی اپنی ایک کشش ہوتی ہے۔ ایک ہفتے میں وہ قریب آ گئی۔ میں نے بے تحاشا دولت لٹائی اور پھر ایک شام وہ میرے ساتھ ایک مہنگے ریستوران میں تھی۔ کافی پیتے ہوئے اس نے میرا گھر دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے بھی اس کی خواہش کو ابھارا۔ جس وقت میں نے مختلف برانڈ کی شراب کا نام لیا تو وہ ایک دم سے میرے ساتھ جانے کو تیار ہوگئی۔ اسی شام وہ میرے ساتھ فارم ہاؤس پر آ گئی۔

''تم اکیلے رہتے ہو یہاں پر؟'' اس نے ماحول دیکھ کر متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو۔''

''تمہیں تنہائی کا احساس نہیں ہوتا۔'' اس نے اٹھلا کر کہا تو میں نے خمار آلود لہجے میں کہا۔

''ہوتا ہے لیکن آج تو بہت اچھا لگ رہا ہے، تم جو ہو۔'' میرے اتنا کہنے پر وہ بے باک ہوگئی۔

میرے سامنے شراب کی مہنگے برانڈ کی بوتل کھلی ہوئی تھی۔ میں اور فاخرہ دو دو پیگ اتار چکے تھے۔ ہم دونوں خواب گاہ میں تھے۔ مستی اور سرور کی انتہا پر پہنچ کر ہمیں اپنے آپ کا ہوش نہیں رہا۔

میری آنکھ کھلی تو فاخرہ میرے ساتھ بیڈ پر نہیں تھی۔ میں نے اس سارے گھر میں تلاش کر لیا مگر وہ مجھے نہیں ملی۔ ایک ملازم نے بتایا کہ وہ لڑکی جا چکی ہے تو میں نے ہاسٹل جانے کے لیے نکل پڑا۔

میں ہاسٹل میں گیا تو میرے دوست آصف نے بڑے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

''کہاں سے آ رہے ہو؟ رات تم یہاں نہیں تھے۔'' اس نے پوچھا۔

''میں...... میں بس کہیں تھا۔'' مجھ سے کچھ بن نہ پڑا تو محض ہکلا کر رہ گیا۔ اس پر وہ پریشان ہوتا ہوا بولا۔

''دیکھو۔ تم پھنس جانے والے ہو۔'' وہ پریشان ہوتا ہوا بولا۔

''تم کل میرے سامنے فاخرہ کے ساتھ نکلے ہو، کہاں گئے ہو اس کی مجھے نہیں خبر، لیکن فاخرہ کی لاش ایک ویرانے سے ملی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اس علاقے کی نشاندہی کی تو مجھے شک سا ہوا کہ فارم ہاؤس والا علاقہ بھی وہی ہے۔

''فاخرہ کی لاش؟'' میں ششدر رہ گیا۔

''ہاں ہاں۔ فاخرہ کی لاش، اس کی لاش دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے اسے جنگلی بھیڑیوں نے یا پھر جنگلی کتوں نے بھنبھوڑا ہو، اس طرح کی ابتر لاش کو دکھایا نہیں جا رہا ہے۔ لیکن پولیس اور خبروں کے ذرائع یہی بتا رہے ہیں۔ کیا تم اس کے ساتھ تھے یا......''

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر میرے چہرے کی جانب دیکھا تو میں لمحوں میں سمجھ گیا کہ یہ سب کیا ہوا ہوگا۔

''یہ سچ ہے کہ وہ کل شام میرے ساتھ تھی، لیکن ہم نے کافی پی اور وہ اپنے گھر اور میں ایک دوست کے ہاں چلا گیا۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

''کون دوست؟'' اس نے پوچھا

''میری ایک گرل فرینڈ ہے۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا تو وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولا

''دیکھو اگر پولیس نے......''

''میں سنبھال لوں گا۔ فکر مت کرو۔'' میں نے اسے سمجھایا تو وہ شاکی نظروں سے دیکھتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں وہیں سے پلٹا اور اسی فارم ہاؤس کی جانب چل پڑا۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہاں کوئی فارم ہاؤس نہیں تھا۔ ایک ویرانہ تھا۔ جہاں سے لاش ملی تھی وہاں پولیس نے دائرہ بنایا ہوا تھا۔ خون کے سرخ دھبے جا بجا پھیلے ہوئے تھے۔

''تم ابھی سے پریشان ہوگئے؟''

بھیانک شہزادی کی آواز میرے کانوں میں پڑی تو میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ میرے سامنے تھی۔

''لل...... لیکن یہ کیا، یہ تم نے کیوں کیا؟''

''میں نے اس کا خون پینا تھا، وہ پی لیا۔ ابھی بہت سارے لوگوں کا خون پینا ہے۔ یہ تو ابتدا ہے۔ مجھے ناقابل تسخیر بننے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔'' وہ خرخراتے ہوئے بولی۔

''مگر پولیس......'' میں نے خوف زدہ ہوتے ہوئے کہا تو میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''میں رات کا پہلا پہر اسی فاخرہ کے روپ میں ان کے گھر رہی ہوں۔ پھر بھی اگر کوئی تم سے پوچھے کہ کہاں تھے تو میں تمہارے ساتھ ہوں، کوئی تم سے کچھ نہیں پوچھے گا۔'' یہ کہہ کر وہ تحلیل ہوگئی۔ میں چند منٹ وہاں رہا پھر وہاں سے لوٹ آیا۔



میں دکھ کی انتہا پر تھا۔ ایسا ہونا نہیں چاہئے تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اس بھیانک شہزادی سے بہت فائدے حاصل کرسکتا تھا۔ لیکن اس کے عوض انسانی خون، یہ سوچتے ہی مجھے جھرجھری آگئی۔ میں نے پہلی بار سوچا کہ اس سے نجات کیسے حاصل کروں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ میں کہاں جاؤں۔ کسے اپنی بپتا سناؤں، کون ہے جو مجھے اس مصیبت سے نجات دلاسکتا ہے۔ میں سارا دن ہاسٹل میں پڑا رہا، شام ہوتے ہی میرا دل گھبرانے لگا۔ میں ہاسٹل سے باہر نکلا اور سڑک پر آگیا۔ میں جاگنگ کے موڈ میں چلتا چلا جارہا تھا کہ سامنے سے پروفیسر ریحان جاگنگ کرتے ہوئے آرہے تھے۔ وہ نفسیات کے پروفیسر تھے۔ ہمارے ایک سمسٹر میں وہ ہمیں انسانی نفسیات پڑھاتے رہے تھے۔ میں ان کے قریب آیا تو انہیں سلام کیا۔ وہ مجھے دیکھ کر رک گئے اور خوشگوار لہجے میں بولے

''آج تم کارشار میں نہیں گھوم رہے ہو، کچھ افسردہ دکھائی دے رہے ہو، کوئی پرابلم؟''

''سر پرابلم تو ہے، مگر سمجھ نہیں آتا کہ وہ بتاؤں کیسے؟'' میں نے الجھتے ہوئے کہا

''انٹرسٹنگ! مجھے بتاؤ، شاید ہم دونوں مل کر کچھ سمجھ سکیں۔'' وہ میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولے

''سر میں ابھی فریش ہوکر آپ کے پاس آتا ہوں۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا

''مگر تم آ نہیں پاؤ گے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا

''آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں سر؟''

''اس لیے کہ اگر تمہیں مجھ پر یقین ہوتا کہ میں تمہارا مسئلہ حل کرسکتا ہوں تو تم ابھی مجھے سب بتانا شروع کردیتے۔ کیونکہ تم لاشعوری طور پر اپنے مسئلے سے جان چھڑانا ہی نہیں چاہتے۔ مجھے اندازہ ہے کہ وہ کوئی بڑا ہی رنگین مسئلہ ہے۔ ایسا ہی ہے نا؟'' وہ مسکراتے ہوئے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولے۔

''سر ہے تو ایسا ہی۔'' میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا تو وہ بولے۔

''آؤ، بات کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ چل دیئے۔ میں ان کے ساتھ چل پڑا۔

میں ان کے ساتھ اسٹڈی روم میں تھا۔ وہ

میرے سامنے تھے۔ تب میں نے انہیں ساری بات بتا دی تو انہوں نے کہا۔

''اب تمہارے ذہن میں جو سوال ہیں وہ کہہ دو۔ اس کا علاج ہے۔ جو تمہیں سمجھ میں آ جائے گا۔''

''سر، کیا ایسا ممکن ہے کہ اس ظاہری دنیا کے علاوہ بھی کوئی دنیا ہو سکتی ہے، کوئی ماورائی۔'' میں نے پوچھا

''بالکل ہے، بلکہ اسی دنیا میں کئی نظام چل رہے ہیں۔ باقی نظام ایک طرف رکھو لیکن جس کی تم بات کر رہے ہو، وہ بہت کمزور ہے۔ کم از کم انسان سے بہت کمزور۔'' انہوں نے اس طرح کہا کہ میری دلچسپی بڑھ گئی۔

''وہ کیسے سر؟'' میں نے پوچھا

''دیکھو۔ انسان کی ترتیب چار عناصر سے ہے۔ آگ، ہوا، پانی اور مٹی۔ وہ مخلوق محض آگ ہے۔ اب آگ ہی آگ کے ساتھ بھڑکے گی۔ ہوا بھی اس کا ساتھ دے سکتی ہے لیکن، پانی اس کو فنا کر دے گا۔ مٹی تو ابھی الگ پڑی ہوئی ہے۔''

''میں سمجھا سر، میرے اندر جو آگ ہے وہ اسی کو کمزوری بنا کے اپنا مفاد حاصل کر رہی ہے۔'' میں نے بات سمجھتے ہوئے کہا

''انسان اس دنیا پر سپیریئر ہے۔ یہ خدا نے اسے مقام دیا ہے۔ یہ مخلوق انسان کے ساتھ مل کر ہی اپنا راستہ بناتی ہیں۔ جیسے ہم اپنے گھر میں جب تک کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیں گے وہ کیسے داخل ہو سکتا ہے۔ ہم اگر اپنے گھر میں گند ڈالیں گے تو بدبو آئے گی۔'' انہوں نے اطمینان سے کہا۔

''سر وہ مجھ پر حاوی ہو گئی ہے۔ میں اُس سے کیسے نجات حاصل کروں؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''وہ کبھی بھی تم پر حاوی نہیں رہی اور نہ ہو سکتی ہے۔ تم اندر سے مضبوط نہیں ہو۔ تم اپنی نفسانی خواہشوں کی وجہ سے کمزور ہو۔ تمہارے اندر کی وائیٹل فورس کہاں ہے؟ وہ طاقت جو انسان کی اپنی اصلی طاقت ہے۔ جس میں چاروں عناصر کی طاقت شامل ہے۔ اس طاقت کو مضبوط سے مضبوط کرنے کا فقط ایک ہی طریقہ ہے۔ اور وہ طریقہ مذہب دیتا ہے۔'' انہوں نے مجھے سمجھایا۔

''کیا اگر میں چاہوں تو اسے بھگا سکتا ہوں۔'' میں نے پوچھا۔

''یار انسان تو شیطان کو اپنے قابو میں کر لیتا ہے، یہ تو اس سے بہت کمزور مخلوق ہیں۔ انسان کے اندر کی پاکیزگی، اس کی سب سے بڑی طاقت ہے، اور یہ پاکیزگی جہاں سے ملتی ہے لے لو، پھر یہ تمہیں کبھی نہیں ستائے گی۔'' پروفیسر نے کہا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مجھ یقین ہو گیا کہ میں ایسا کر سکتا ہوں۔

پروفیسر مجھے بہت دیر تک سمجھاتے رہے۔ میں ان کی باتیں سمجھتا رہا۔ یہاں تک کہ میں ان کے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔

اس رات میں ہاسٹل کی مسجد میں چلا گیا۔ وہاں سے واپسی کے بعد میرے اندر دور تک اطمینان تھا۔ اس رات کے بعد وہ بھیانک شہزادی مجھے دکھائی نہیں دی۔



بدعقیدہ

نوشاد عادل

تجسس اور لالچ انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ یہ فطرت انسان کو اللہ تعالیٰ تک بھی لے جاتی ہے اور ابلیس ملعون سے بھی ملاتی ہے۔ اپنے حالات تبدیل کرنے کے خواہش مند ایک نوجوان کا احوال ایک جعلی پیر نے اسے موت کی سرنگ میں اتار دیا تھا۔

ملتان میں خزانے کی تلاش میں سرنگ کھودنے کے واقعہ کے پس منظر میں لکھی جانے والی کہانی۔

کام چور بھٹکے ہوئے بد عقیدہ لوگوں کے لیے بطور خاص

اس کی سانسیں بُری طرح پھولی ہوئی تھیں‘ سینہ ایسے پھول پچک رہا تھا جیسے وہ میلوں بھاگتا ہوا آ رہا ہو‘ پورا جسم پسینے میں شرابور تھا اس نے اپنے ماتھے اور چہرے پر آنے والے پسینے کو آستین سے صاف کیا اور کھرپی کی مدد سے دوبارہ زمین کھودنے میں مصروف ہوگیا۔ گڑھا زیادہ چوڑا نہ تھا اس لیے اس میں کدال یا بیلچہ چلانا ممکن نہ تھا اور پھر ان کی ضربوں سے آوازیں بھی بلند پیدا ہوتیں جنہیں سن کر آس پاس کے گھر والے متجسس ہو جاتے کہ یہ آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو اس بارے میں بھنک بھی پڑے۔

اب تک اس نے تقریباً دس فٹ گہرا گڑھا کھود لیا تھا‘ ایسا کرنے میں اسے ایک ہفتہ لگ گیا تھا‘ ایک چھوٹی سی کھرپی کی مدد سے اتنا گڑھا کھودنا آسان کام نہیں تھا‘ یہ بہت صبر آزما اور جاں گسل عمل تھا لیکن وہ مستقل مزاجی اور لگن سے یہ کام انجام دے رہا تھا۔

تھوڑی مٹی جمع ہوگئی تو اس نے رسّی سے بندھی ہوئی بالٹی میں مٹی بھردی اور آواز لگائی۔

''ناصرہ...... بالٹی کھینچ لے۔'' ساتھ ہی اس نے رسّی ہلائی۔

اوپر قدموں کی چاپیں سنائی دیں اور گڑھے کے کنارے پر ایک لڑکی آ کر بیٹھ گئی۔

''بھائی...... کھینچوں بالٹی؟''

''ہاں...... مٹی بھردی ہے کھینچ لے۔'' اس نے رک کر زور زور سے سانس لیتے ہوئے کہا‘ گڑھے کے حبس نے اس کا تیل نکال دیا تھا مگر کوئی جذبہ تھا جو اس سے یہ کام کروا رہا تھا۔ اس کی بہن ناصرہ نے رسّی کھینچ کر بالٹی نکالی اور اوپر فرش پر خالی کردی۔

''لے بھائی‘ بالٹی پکڑ......'' ناصرہ نے آواز لگائی۔

''ہاں دے......'' اس نے اوپر دیکھتے ہوئے اور پھر بالٹی پکڑ لی۔

''بس کر بھائی‘ اب باہر آ جا۔ ٹائم بہت ہوگیا ہے‘ تین بج رہے ہیں‘ صبح کام پر بھی جانا ہے تجھے۔'' ناصرہ نے جھک کر اس سے کہا۔

''ہاں بس‘ میں آ جاؤں گا تُو سو جا‘ جا کے۔ میں خود ہی آ جاؤں گا‘ جا...... جا کے سو......''

''پر بھائی تُو اکیلا کیسے کرے گا یہ؟''

''کرلوں گا‘ جا تُو جا......'' اس نے پلکوں پر آنے والی پسینے کی لکیر کو آستین سے پونچھا۔

''میں...... میں تیرے ساتھ ہی جاؤں گی بھائی‘ میں ابھی اِدھر ہوں۔'' ناصرہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ شاہد نے اوپر دیکھا ناصرہ جھانک کر

اسے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی' دس فٹ گڑھے میں پیلے سے بلب کی موقوف روشنی اندر نہیں پہنچ رہی تھی۔ ناصرہ کو بس ایک ہیولہ سا حرکت کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ شاہد دوبارہ گڑھا کھودنے میں مصروف ہوگیا' ہاتھ چلاتے چلاتے بولا۔

''اب روشنی کم ہوگئی ہے اندر' کل سے میں کوئی بندوبست کروں گا روشنی کا۔''

''ایک لالٹین ہے' بس اس میں تیل ڈالنا پڑے گا۔'' ناصرہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''وہ میں کل لیتا آؤں گا' تو اسے جھاڑ پونچھ کر رکھنا۔''

''ٹھیک ہے بھائی۔'' شاہد کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے اور دھیرے دھیرے گڑھے کی گہرائی میں انچ انچ بھر اضافہ ہوتا جارہا تھا۔



گلی کے کونے سے رکشہ نمودار ہوا اور شور کرتا ہوا گلی میں آ گیا۔ شاہد رکشہ چلا رہا تھا' اس نے ایک دومنزلہ مکان کے سامنے رکشہ آہستہ کرلیا اور زور زور سے ایکسی لیٹر دیا' ساتھ ہی دوسری منزل والی کھڑکی پر دیکھتا جارہا تھا جس پر ایک گہرے رنگ کا میلا سا پردہ لٹک رہا تھا۔

اس گھر کی مخالف قطار میں بنے ہوئے گھروں میں سے اس کا مکان چوتھا تھا' رکشہ اس نے اپنے گھر کے دروازے کے سامنے روک لیا اور انجن بند کرکے نیچے اتر آیا۔ اس کی نظریں بدستور کھڑکی پر جمی ہوئی تھیں تب پردہ ہٹا اور ایک لڑکی نے جھانک کر اسے دیکھا۔ شاہد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی' لڑکی نے بھی جوابی مسکراہٹ اچھالی اور اسے موبائل پر کال کرنے کا اشارہ کیا۔ اتنے میں شاہد کے گھر کا دروازہ کھل گیا' دروازہ اس کی بہن ناصرہ نے کھولا تھا' شاہد نے کھڑکی والی لڑکی کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور رکشہ دھکیلتا ہوا اندر لے گیا۔

صحن میں رکشہ کھڑا کرکے شاہد اپنے کمرے کی طرف تیزی سے بڑھا' ناصرہ نے آواز لگائی۔

''کھانا لگادوں بھائی۔''

''ابھی نہیں۔'' شاہد نے عجلت آمیز لہجے میں کہا وہ اپنے کمرے میں جاکر جلد از جلد موبائل پر اس لڑکی کو کال کرنا چاہتا تھا جو کھڑکی پر کھڑی تھی۔

''ابھی گرم کیا ہے' ٹھنڈا ہوجائے گا۔'' ناصرہ نے دوبارہ کہا۔

''فکر مت کر ٹھنڈا ہی کھالوں گا۔'' شاہد نے اپنے کمرے سے آواز لگائی۔

''اچھا تو نسرین سے بات کرنے کی جلدی ہے' دیکھ لیا ہوگا اسے۔'' ناصرہ نے ہنس کر کہا۔

''کرلے بھائی' اماں ابھی باہر گئی ہے کام سے' ابا آیا نہیں ہے۔'' شاہد نے اس کی بات سنی ان سنی کردی اور فوراً جیب سے موبائل نکال کر نسرین کا نمبر ڈائل کیا' نسرین نے فوراً ہی کال ریسیو کرلی۔

''آ گئیں تم......؟'' شاہد نے اس کی آواز سنتے ہی پوچھا۔

''دیکھ لیا ہے پھر بھی پوچھ رہے ہو آ گئیں۔'' نسرین نے ہنستے ہوئے کہا۔

''پورے پندرہ دن بعد شکل دیکھی ہے تمہاری۔'' شاہد نے پیار بھرے انداز میں شکایتاً کہا۔

''فون پر تو روز ہی بات ہوجاتی تھی۔'' نسرین بولی۔

''مگر فون پر تو صرف آواز ہی سن سکتا ہوں نا۔ شکل دیکھنے کو ترس گیا تھا میں۔'' شاہد نے کہا۔

''تو اب آ گئی ہوں نا اور شکل بھی دیکھ لی میری۔ میں کون سا ہمیشہ کے لیے ماے کے گھر چلی گئی تھی۔'' نسرین ہنسی۔

''پتا ہے یہ پندرہ دن مجھ پر کتنے بھاری گزرے تھے' لگتا ہے پندرہ سال بعد شکل دیکھی ہے تمہاری۔''

''شاہد ایک ضروری بات کرنی ہے تم سے۔'' اچانک نسرین کی آواز میں سنجیدگی در آئی۔

''ہاں بولو؟'' شاہد کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہوگئے۔

''اگر مجھ سے شادی کرنی ہے تو پھر جلد سے جلد کچھ کرنا ہوگا۔'' نسرین نے اٹکتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔

''میں...... میں سمجھا نہیں...... کیا کرنا ہوگا؟'' شاہد نے تذبذب کے عالم میں پوچھا۔

''پیسے کمانے ہوں گے' کوئی کام کرنا ہوگا ورنہ...... ورنہ میرا بابا تمہیں میرا رشتہ نہیں دے گا۔''

''کام کرتا تو ہوں' رکشہ چلاتا ہوں یہ بھی تو محنت مزدوری ہے نسرین!''

''یہی تو مسئلہ ہے۔'' نسرین نے پریشان ہوتے ہوئے بتایا۔ ''میرا بابا ایک رکشہ ڈرائیور سے میرا رشتہ نہیں کرے گا۔''

''اور تم...... تم کرو گی؟'' شاہد نے سوال کیا۔

''میرے کہنے سے کیا ہوگا' رشتہ تو میرے بڑے ہی طے کریں گے اور اگر گھر سے بھاگنے کا کہو گے تو میں یہ کام نہیں کرسکتی۔''

''بس اتنی ہی محبت تھی مجھ سے؟''

''بات سمجھو شاہد' معاملہ ہنسی خوشی نمٹ جائے تو اچھا ہے اور پھر تم اپنے گھر کی طرف بھی دیکھو' تم اکلوتے بیٹے ہو اپنے ماں باپ کے' تم ہی ان کا سہارا ہو' تمہارے بعد وہ کیا کریں گے۔ تمہاری بہن کا کیا ہوگا' ہمیں خود غرض بن کر نہیں سوچنا ہوگا۔'' نسرین نے اپنے فیصلے کے حق میں دلائل دیتے ہوئے اسے قائل کرنا چاہا۔

''تو پھر میں کیا کروں اور کیا کرسکتا ہوں میں؟''

''زیادہ وقت نہیں ہے' زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو سال اور کھینچ سکتی ہوں اس کے بعد پھر مجھے الزام نہ دینا۔'' نسرین کی آواز بھرا گئی تھی شاہد سوچتا رہ گیا پھر بولا۔

''اچھا چلو چھوڑو' یہ بات بعد میں کریں گے پہلے یہ بتاؤ کہ تم......''



''اچھا تو یہ بات ہے۔'' دلدار نے چائے کی پیالی ٹیبل پر رکھتے ہوئے سر ہلایا۔ ''ابے جبھی میں بولوں آج تیرا منہ کیوں سوجا ہوا ہے' یہ چکر چل رہا تھا دماغ میں۔ ابے میں تو ٹھیک ہی کہتا ہوں یہ کالے سر والیوں کے چکر ہوتے ہی برے ہیں' آدمی کہیں کا نہیں رہتا۔ چل یار کچھ سوچتے ہیں' اب تیرا مسئلہ ہے کچھ تو کرنا ہوگا۔'' شاہد چائے کی پیالی ہاتھ میں تھامے اسے گھور رہا تھا۔ دلدار اس کا دوست تھا وہ بھی رکشہ چلاتا تھا' اس وقت دونوں ایک گندے سے ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے' ان کے رکشے باہر کھڑے تھے۔

''یار اگر نسرین مجھے نہ ملی تو میں تو مر جاؤں گا دلدار۔'' شاہد نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''ابے سب عاشقوں کا یہی حال ہوتا ہے بہت دیکھے ہیں تیرے جیسے' کوئی نہیں مرتا نہ عاشق نہ معشوق۔ تُو چائے تو پی' ٹھنڈی ہورہی

ہے۔" شاہد خاموشی سے چائے پینے لگا۔

"پڑھا لکھا تُو نے نہیں ہے کوئی ہنر بھی تیرے پاس نہیں ہے۔" دلدار نے انگلیوں پر گنتے ہوئے کہا۔ "بس اب لے دے کے ایک ہی کام رہ گیا ہے تیرے پاس وہی کر کے کامیاب ہوسکتا ہے۔"

"وہ...... وہ کیا......؟" دلدار نے آگے پیچھے دیکھا اور قدرے جھک کر ہلکی آواز میں بولا۔

"ڈکیتی...... لمبا ہاتھ پھر بیڑا پار۔"

"ڈ...... ڈ...... ڈکیتی......" شاہد کا حلق خشک ہوگیا۔

"ابے آہستہ بول کسی نے سن لیا تو بغیر ڈکیتی کے ہی ڈاکو سمجھے گا۔ بول کیا بولتا ہے۔"

"ن...... نہیں یار...... میں یہ نہیں کرسکتا۔" شاہد نے صاف انکار کرتے ہوئے گردن ہلائی۔ "مجھ میں اس چیز کا حوصلہ نہیں ہے۔"

"دھت تیرے کی ڈرپوک عاشق! میں تو سمجھا کہ تو ابھی اٹھے گا اور ڈزا ڈز گولیاں برسا کر کوئی بینک لوٹ لے گا پر سالا تُو تو بالکل لوسی نکلا۔" دلدار ہنسنے لگا۔

"یار میرا مذاق مت اڑا میں ڈرپوک نہیں ہوں۔" شاہد تھوڑا خفا ہوگیا۔ "بس گھر والوں کا خیال ہے ورنہ قسم سے پتا نہیں کیا سے کیا کردوں۔"

"ابے چل نا مذاق کررہا تھا میں تُو تو بلاوجہ بُرا مان گیا۔ اچھا سن غور سے ایک بات تو آئی ہے دماغ میں ایک عامل ہے اس کے پاس چلتے ہیں۔ اسے اپنا مسئلہ بتادینا وہ کوئی نہ کوئی حل بتادے گا۔" دلدار نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"کون عامل؟" شاہد نے چونک کر پوچھا اس کے اندر دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔

"تو نہیں جانتا مگر میں کسی سلسلے میں اس سے ایک دو بار مل چکا ہوں چلنا ہو تو بتادینا۔ ہوسکتا ہے تیرا کام بن جائے۔"

"اگر ایسی بات ہے تو میں تیار ہوں کب چلیں؟"

"آج تو مجھے جلدی گھر جانا ہے کل شام میں چلتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے کل مجھے لے چلنا۔" شاہد نے کہا۔

"بس تو اسی بات پر چائے کے پیسے دے دے آج کی چائے تیری طرف سے۔" دلدار نے ہنس کر اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔



"کیا مطلب ہے تیرا؟" بانو نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے نسرین کو غور سے دیکھا۔ "تُو آخر کیا کہنا چاہتی ہے۔"

"وہی جو تیری عقل میں آیا ہے بانو!" نسرین نے اپنے بالوں کی ایک لٹ کو انگلی پر لپیٹتے ہوئے کہا اس کے انداز میں بے پروائی تھی۔

"یعنی کہ تُو شاہد سے اتنے ٹائم سے صرف وقت گزاری کررہی تھی؟" بانو نے بھویں اچکائیں۔

"نہیں ایسی تو بات نہیں ہے۔"

"تو پھر تیرا کہنے کا مطلب تو یہی ہے نا۔"

"میں اس سے ٹائم پاس نہیں کررہی تھی بانو! وہ مجھے اچھا لگتا تھا۔" نسرین کہنے لگی بانو نے اس کا جملہ اچک لیا۔

"لگتا تھا...... تھا سے کیا مراد ہے تیری اب اچھا نہیں لگتا؟"

"اچھا تو وہ اب بھی ہے سیدھا سادہ مگر......

مگر اب میں نے اپنا ارادہ تبدیل کرلیا ہے بانو!'' نسرین نے سنجیدگی سے بانو کی آنکھوں میں جھانکا۔

''تجھے پتا ہے نا' میں اپنے مامے کے پاس لاہور گئی تھی۔ وہاں جا کے پتا چلا کہ زندگی کیا ہوتی ہے۔ لوگ زندگی کے مزے کیسے لوٹتے ہیں' یہاں ملتان میں تو ہم کنویں کے مینڈک بنے ہوئے ہیں۔ میری مامی بول رہی تھی کہ تُو اِدھر آجا میرے پاس میں تیرا یہاں بڑے سے بڑے گھر میں رشتہ کروادوں گی' پھر ساری زندگی عیش کرنا' گاڑیوں میں گھومنا پھرنا وہاں کیا رکھا ہے ملتان میں۔ واقعی لاہور میں بڑے پیسے والے لوگ ہیں بانو! یہاں تو میں رکشے والے کے خواب دیکھتی تھی۔ اب پتا چلا کہ سب بے کار ہے اب میں دل سے نہیں دماغ سے سوچ رہی ہوں اور فیصلہ کرچکی ہوں۔'' نسرین اتنا بتا کر خاموش ہوگئی۔

''مگر...... مگر شاہد کا کیا بنے گا' اسے پتا چلے گا تو وہ خودکشی کرلے گا۔ وہ ایسا ہی بندہ ہے نسرین! اسے کیا بولے گی؟'' نسرین مسکرائی اور بانو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''فکر نہ کر' میں نے اس کے بارے میں بھی سوچ لیا ہے کہ کیا کرنا ہے۔''

''کیا...... کیا سوچا ہے؟'' بانو کے انداز میں بےتابی تھی۔

''اسے میں نے بول دیا ہے کہ میرے پاس ڈیڑھ دو سال ہیں بس بابا مجھے کسی رکشے والے کے پلے نہیں باندھے گا۔ تُو بھی جانتی ہے بانو! شاہد کے پاس نہ تعلیم ہے نہ کوئی ہنر' وہ دو کیا دس سال تک کچھ نہیں کرسکتا اور معاملہ طریقے سے نمٹ جائے گا' وہ مجھے قصوروار بھی نہیں ٹھہرا سکے گا' اُدھر مامی تو رشتہ تلاش کرنے نکل جائے گی' میرے مامے کے بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات ہیں وہاں۔''

''ہوں' تو یہ بات ہے۔'' بانو نے گہری سانس لی۔ ''دیکھ لے نسرین' سوچ سمجھ لے اب بھی۔''

''بہت سوچا اور بہت سمجھا ہے بانو! تبھی یہ فیصلہ کیا ہے' زندگی گزارنے کے لیے صرف محبت کافی نہیں اور بھی بہت سی ضروریات ہوتی ہیں۔'' نسرین نے کہا۔

بانو چند لمحات اسے یک ٹک دیکھتی رہی' نسرین بولی۔

''اچھا تو ادھر بیٹھ میں چائے لے کر آتی ہوں۔''



''کہاں تھا اتنے دنوں سے؟'' عامل بابا نے سرخ آنکھوں سے دلدار کو گھور کر دیکھا۔ ''بڑے دنوں بعد شکل دکھائی ہے تُو نے' شہر سے باہر گیا ہوا تھا کیا؟''

''نہیں' میں نے کہاں جانا ہے بابا جی! ادھر ہی تھا آپ کی بادشاہی میں۔ بس صبح سے رات گئے تک رکشہ چلاتا رہتا ہوں' فرصت ہی نہیں ملی ورنہ حاضری ضرور دیتا۔'' دلدار نے لجاجت سے کہا۔

''یہ کسے لایا ہے ساتھ۔'' عامل بابا نے شاہد کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''میرا دوست ہے شاہد! یہ بھی رکشہ چلاتا ہے۔'' دلدار نے بتایا۔ ''ایک مسئلہ تھا اس کا' اسی سلسلے میں اسے لایا ہوں آپ کے پاس۔''

شاہد بڑی دیر سے وہاں کے ماحول اور عامل بابا کا بغور جائزہ لینے میں مصروف تھا' عامل بابا کا یہ ٹھکانہ ایک مضافاتی علاقے میں تھا' عام طور پر ایسے

لوگ مضافاتی علاقے کو ہی اپنا مسکن بناتے ہیں' جہاں زیادہ شور شرابا نہ ہو۔ یہ کافی بڑا پلاٹ تھا اس کے گرد سات فٹ اونچی باؤنڈری وال بنی ہوئی تھی' درمیان میں چند کمرے بنے تھے کسی جگہ پلستر نہیں کیا گیا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کی تعمیر کا کام کافی عرصہ سے رکا ہوا ہے' وہاں کا ماحول خاصا وحشت ناک اور پُراسرار سا تھا' ایک عجیب سی چیختی ہوئی خاموشی تھی' وہ سب کے ساتھ اپنے حلیے بشرے سے چھٹرے چھانٹ قسم کے بدمعاش لگ رہے تھے۔ بڑے بڑے میلے بالوں والے اور گندے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ صحن میں کئی بکرے بندھے ہوئے تھے' اس کا اندازہ تھا کہ یہاں آنے والے حاجت مندوں نے بابا کو دیئے ہوں گے۔ عامل بابا بھی اسے کوئی اچھا نہیں لگا تھا مگر وہ کچھ بولا نہیں' اتنے میں اس کے کانوں سے دلدار کی آواز ٹکرائی۔

''میں نے اسے آپ کے بارے میں بتایا تھا' بولا کہ مجھے بابا کے پاس لے چل' بس بابا جی اس کے دل کی مراد پوری ہوجائے اس کا مسئلہ حل ہوجائے۔''

عامل بابا نے ہاتھ اٹھا کر دلدار کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور شاہد کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''لڑکی کا معاملہ ہے؟'' شاہد نے تھوک نگلتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی۔

''شادی کرنا چاہتا ہے نا؟''

''جی......جی......''

''اور وہ لڑکی......وہ کیا چاہتی ہے؟''

''وہ بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔'' شاہد نے جلدی سے جواب دیا۔

''تو پھر مسئلہ کیا ہے' ماں باپ نہیں مان رہے لڑکی کے۔''

''باپ......باپ کا مسئلہ ہے' وہ ایک رکشے والے سے اپنی بیٹی کی شادی نہیں کرے گا۔'' شاہد نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''یہ چاہتا ہے اس کے پاس جلد از جلد دولت آجائے تاکہ یہ اس لڑکی سے شادی کرسکے' لڑکی والے چاہتے ہیں کہ جس لڑکے سے وہ اپنی لڑکی کی شادی کریں وہ اچھا کھاتا پیتا ہو۔'' دلدار نے مزید اضافہ کیا۔

''ہوں......'' بابا نے سر جھکا لیا تھا وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ شاہد اور دلدار امید بھری نظروں سے اسے دیکھتے رہے' کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی' آخر بابا نے سر اوپر اٹھایا' اب بھی اس کی آنکھیں بند تھیں' اس کے ہونٹ ہل رہے تھے' پھر اس نے آنکھیں کھول کر شاہد کو دیکھا اور بولا۔

''دو دن بعد آ میرے پاس' مگر اب کی بار اکیلا آ۔''

''اکیلا......؟'' شاہد نے دلاور کی طرف دیکھا۔

''میں نہ آؤں اس کے ساتھ؟'' دلدار نے پوچھا۔

''میں نے اسے اکیلا آنے کو کہا ہے' اکیلا مطلب کوئی اور ساتھ نہ ہو۔'' بابا نے گرجدار آواز میں کہا۔

دلدار تھوڑا سہم گیا ''ٹھیک ہے' ٹھیک ہے بابا جی۔''

''اب جاؤ تم دونوں۔'' بابا نے ہاتھ جھلاتے ہوئے کہا۔

''اور سن......'' ان دونوں کو اٹھتا دیکھ کر بابا نے دوبارہ زور سے کہا۔'' جاتے جاتے میرے بندے

کومل لے نام لکھوادے اب جا۔'' دونوں باہر نکل آئے' ان کے پیچھے ایک آدمی آ گیا۔ صحن میں کئی چارپائیاں بچھی پڑی تھی، وہ آدمی ایک جھلنگا میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''بیٹھو......'' اس نے ان دونوں کو بھی اشارہ کیا۔

دلدار اور شاہد بیٹھ گئے پھر اس نے شاہد سے اس کا پورا نام پوچھا ''کیا نام ہے تیرا' پورا نام بتا؟''

اس کے بعد وہ اس کے گھر والوں کے نام پوچھنے لگا پھر لڑکی اور اس کے گھر والوں کے نام دریافت کیے' دونوں کے گھر کے پتے معلوم کر کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی خستہ حال کاپی میں لکھتا چلا گیا' آخر میں وہ کہنے لگا۔

''بس اب جا اور کل آتے ہوئے ایک کالا بکرا لیتے آنا' صدقہ دینا ہوگا' ساتھ میں پانچ ہزار بھی۔''

''بکرا......اور......اور پانچ ہزار......'' شاہد تھوک نگل کر اسے دیکھتا رہ گیا۔

''ہاں...... ہاں ٹھیک ہے۔'' دلدار نے جلدی سے کہا اور شاہد کا بازو پکڑ کر آنے کا اشارہ کیا۔

''چل اب جا...... اٹھ۔'' شاہد مرے مرے قدموں سے اس کے ساتھ آ لیا۔ باہر آ کر شاہد نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

''یار دلدار! یہ بکرا اور پیسے میں کہاں سے لاؤں گا؟''

''اے فکر کا ہے کو کی تو نے۔'' دلدار نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ''میں مر گیا ہوں کیا' ان شاء اللہ بکرے کے پیسے تو میں دے دوں گا' کام ہو جائے تو لوٹا دینا۔ باقی رہا پانچ ہزار کا معاملہ تو وہ تُو دیکھ' ابا سے پکڑ لے۔'' شاہد ہنستا ہوا بولا۔

''ابا کے پاس کون سا تجوری رکھی ہے نوٹوں کی' وہ خود کتنا کماتا ہے مزدوری کرتا ہے' لگ گئی تو لگ گئی ورنہ صبح سے شام تک خالی بیٹھ کر خالی ہاتھ آ جاتا ہے۔''

''دیکھ یار یہ تو تُو نے کرنا ہی ہوں گے۔'' دلدار نے رکشے کے پاس پہنچ کر کہا۔ شاہد کا رکشہ بھی ساتھ کھڑا تھا۔ ''بابا بڑا پہنچا ہوا ہے' تجھے وہ راستہ بتا دے گا جس پر چل کر دولت تیرے قدموں میں ہوگی بس شروع شروع کی تھوڑی تکلیف ہے۔ اس سے گزر گیا تو سمجھ لے کام بن گیا۔''



''بس اب پانچ ہزار کی بات ہے پھر سمجھو کام بن جائے گا۔'' پوری بات بتانے کے بعد شاہد امید بھری نظروں سے ناصرہ کو دیکھنے لگا۔

''ہاں سو تو ٹھیک ہے مگر......'' ناصرہ بولتے بولتے رک گئی۔

''مگر کیا......؟'' شاہد نے اسے دیکھا۔

''پانچ ہزار......؟''

''وہی تو مسئلہ ہے۔'' شاہد نے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ ''ابا کے پاس تو ایک پھوٹی کوڑی نہیں نکلے گی' سمجھ نہیں آ رہا کیا کروں اور کہاں سے پیسے لاؤں؟'' ناصرہ اٹھ کر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

''بھائی اگر میں دے دوں پانچ ہزار...... تو کیا مجھے واپس مل جائیں گے؟''

شاہد ایک دم کھڑا ہو گیا۔ ''تیرے پاس کہاں سے آئے' تُو کہاں سے لا کے دے گی؟''

''میرے پاس رکھے ہیں' جمع کیے تھے۔ میری بات کا جواب دے؟''

''ہاں ہاں' واپس کر دوں گا' ڈبل کر کے واپس

کروں گا۔" شاہد ایک دم جوش میں بھر گیا۔ "کوئی بھی قسم لے لے وہ دلدار ہے نا بول رہا تھا بابا بڑا پہنچا ہوا ہے۔ وہ ضرور ایسا عمل بتائے گا جس سے میرے پاس بڑی دولت آ جائے گی پھر تو فکر نہ کرنا' جو بولے گی تجھے دلا دوں گا۔ بس تُو میرا ساتھ دے دے' میری پیاری بہن!"

"بس تو ٹھیک ہے بھائی مگر مجھے یاد سے پیسے واپس کر دینا' بہت مشکلوں سے جمع کیے ہیں سب سے چھپا کے۔" ناصرہ نے کہا۔ شاہد مسکراتے ہوئے سر ہلانے لگا۔



"بڑے خوش لگ رہے ہو آج؟" نسرین نے بستر پر نیم دراز ہو کر کان سے موبائل لگایا ہوا تھا' دوسری جانب شاہد کی آواز تھی۔

"ہاں نسرین! میں آج بہت خوش ہوں' بہت زیادہ......" دوسری طرف سے شاہد نے چہکتے ہوئے کہا۔

"خیر تو ہے نا' کوئی خزانہ تو ہاتھ نہیں لگ گیا۔" نسرین ہنسی۔

"وہ بھی لگ جائے گا۔" شاہد بھی آہ بھر کے بولا۔ "اور تمہیں تو پتا ہے میرا خزانہ کون ہے؟"

"نہیں مجھے تو نہیں پتا' کون ہے تمہارا خزانہ؟"

"تم......" شاہد نے ٹھک سے جواب دیا۔ 'تم سے بڑھ کر میرے لیے اور کوئی خزانہ نہیں ہے نسرین! انہیں معلوم میں تمہیں پانے کے لیے کیا کیا جتن کر رہا ہوں۔"

"اچھا تو بتا دو کیا کیا جتن کر رہے ہو؟" نسرین نے کھنکتی ہوئی آواز میں کہا۔

"وہ میں وقت آنے پر بتا دوں گا' پہلے میرا کام ہو جائے پھر......پھر اچھا ہو پائے گا۔"

"شاہد......" نسرین سنجیدہ ہو گئی۔

"ہوں' بولو......؟"

"اگر مجھ سے واقعی پیار کرتے ہو تو جلد کچھ کر لو' پھر بعد میں مجھے الزام نہ دینا۔"

"یہ کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟" شاہد تڑپ اٹھا۔ "گھر میں کوئی بات ہوئی ہے کیا؟"

"بات تو نہیں ہوئی' میں تو صرف بتا رہی ہوں تمہیں' ہو بھی سکتا ہے' بس مجھے ہر وقت ڈر لگا رہتا ہے۔"

"تم بے فکر رہو' میں......میں تمہاری خاطر ہر کام کر سکتا ہوں۔ ہر حد سے آگے جا سکتا ہے' تم نے مجھے آزمایا نہیں ہے ابھی۔"

"اب وقت آ گیا ہے آزمانے کا۔" نسرین نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔

"میں آزمائش پر پورا اتروں گا نسرین۔"

"مجھے کچھ تو بتاؤ؟ تم کیا کر رہے ہو؟" نسرین کے اندر کا تجسس زبان پر آ گیا۔

"بتاؤں گا' بالکل بتاؤں گا اگر ابھی مجھے مجبور نہ کرو۔ وقت آتے ہی سب سے پہلے تمہیں ہی تو بتانا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب سب کچھ ٹھیک ہونے کا وقت آ گیا ہے۔" شاہد نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"اللہ کرے ایسا ہو جائے۔" نسرین نے دھیمی آواز میں کہا۔



شاہد کو ایسا لگا کہ اس کی سماعت نے دھوکا کھایا ہے جو کچھ اس نے سنا اس پر یقین نہیں آ رہا تھا' وہ بے یقینی کے عالم میں عامل بابا کو دیکھنے لگا پر اس کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

"خز......خزانہ......؟"

''ہاں خزانہ......'' عامل بابا کی آواز کمرے میں گونج اٹھی۔ ''ایک بار سنا نہیں تُو نے' میں نے خزانہ ہی کہا ہے۔''

''مگر...... گھر میں خزانہ یہ...... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' شاہد کی زبان اور دماغ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ ''ہم تو وہاں برسوں سے رہ رہے ہیں' میرے دادا بھی وہاں رہتے تھے' ساری زندگی گزاری ہے انہوں نے اس گھر میں مگر...... مگر کبھی خزانے کا کوئی ذکر نہیں آیا اور نہ تو انہیں کوئی خبر ہوئی۔''

''تو تیرے خیال میں میں جھوٹ بول رہا ہوں۔'' عامل بابا نے شعلہ بار نظروں سے شاہد کو دیکھا' اس کی آنکھوں سے گویا چنگاریاں نکل رہی تھیں' وہ سخت طیش میں آ گیا تھا۔

''مم...... میں...... میں نے......'' شاہد نے تھوک نگلا۔ ''ایسا تو نہیں بولا بابا جی۔''

''مگر یقین بھی تو نہیں کیا۔'' بابا نے دونوں ہاتھ اٹھا کر زور زور سے جھلائے۔ ''جا...... جا کر اپنے کمرے کی کھدائی کرنا شروع کردے' بالکل کمرے کے بیچوں بیچ کھودتا جا اسے' کھودتا جا۔ اس وقت تک کھودتا رہ' جب تک کہ خزانہ نہ پالے' اتنا بڑا خزانہ ہے وہ کہ تیری سات پشتیں بیٹھے بیٹھے عیش سے زندگی بسر کریں گی۔''

شاہد کے جسم میں سنسنی کی لہریں دوڑ رہی تھیں' حقیقت یہ تھی کہ اسے اب تک بابا کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا' وہ آنکھیں اور منہ پھاڑے بابا کی شکل تکے جا رہا تھا۔

''نہ کر...... نہ کر یقین' جا چلا جا۔ کچھ نہیں ہونے کا تیرے ساتھ' لے جا اپنا بکرا اور اپنے پیسے...... جا۔'' بابا نے اس کی کیفیت بھانپ لی تھی۔

''نن...... نہیں...... مجھے...... مجھے یقین آ گیا بابا جی! آ گیا یقین۔ آپ...... آپ بالکل ٹھیک بول رہے ہیں۔'' یکا یک شاہد کے جسم میں نئی روح پڑ گئی۔ ''میں آپ کے کہنے پر عمل کروں گا' سوفی صد عمل۔''

''بس ٹھیک ہے جا اور زندگی سنوار لے اپنی' جو کہا ہے اس پر ویسا ہی عمل کر' خزانہ تجھے پکار رہا ہے۔'' یہ کہہ کر عامل بابا نے آنکھیں بند کرلیں۔

شاہد وہاں سے اٹھ گیا۔



''مگر بھائی ایسا بھلا کیسے ہوسکتا ہے۔'' ناصرہ کی بھی وہی کیفیت تھی جو شاہد کی ہوئی تھی۔ ''ہمارے گھر میں خزانہ دفن ہے' میں نہیں مانتی۔''

''میں نے بھی نہیں مانا تھا ناصرہ!'' شاہد نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مگر بابا ایسے ہی کیسے بول دے گا' کوئی تو بات ہوگی نا۔''

''اگر...... اگر ایسا ہوا تو بھائی! ہمارے تو دن ہی پھر جائیں گے۔ ہم امیر ہوجائیں گے۔'' ناصرہ آخر عورت ذات تھی' جلد یقین کرلینے والی' جلد بہکاوے میں آنے والی' وہ خوش نظر آنے لگی۔

''ہاں وہ تو ہے' بس تو پھر مجھے آج سے ہی کام شروع کردینا چاہیے۔'' شاہد کی آنکھوں میں بھی امید کے دیے روشن ہوگئے تھے۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں بھائی۔'' ناصرہ نے جوشیلی آواز کے ساتھ کہا پھر ایک دم کچھ سوچنے لگی۔ ''مگر بھائی اماں ابا کا مسئلہ ہے۔''

''کیا مسئلہ ہے؟''

''انہیں بتائے بغیر کام نہیں کرسکتے۔''

''ہیں......'' شاہد بھی سوچنے لگا تھا۔ ''یہ تو ہے تو بتا دیتے ہیں پھر' وہ منع تو نہیں کریں گے۔''

''رات کو کھانے کے وقت بتادیں گے' جب ابا آجائے گا۔'' ناصرہ نے کہا اور شاہد نے سر ہلا دیا۔

رات کو کھانے پر جب وہ چاروں اکٹھے ہوئے تو ناصرہ نے جھجکتے ہوئے بات شروع کی۔

''ابا......وہ......وہ......ایک بات بتانی تھی۔''

''ہاں بول؟'' اس کے ابا نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''وہ......وہ ابا...... بھائی گیا تھا کسی پیر بابا کے پاس۔'' ناصرہ اٹکتے ہوئے بتانے لگی۔

''پیر بابا کے پاس؟'' اس کے ابا کا چلتا ہوا منہ رک گیا پھر اس نے شاہد کی جانب دیکھا۔ ''کیوں گیا تھا؟''

''ابا اصل میں......'' شاہد نے دھیرے دھیرے تمام قصہ اپنے باپ کے گوش گزار کردیا' اس کی ماں بھی پوری توجہ سے سن رہی تھی' شاہد نے سارا واقعہ سنا ڈالا بس اس میں سے نسرین کا ذکر حذف کرلیا۔

خزانے کا سن کران کے ماں باپ سناٹے میں آگئے' وہ کھانا بھول کر ایک دوسرے کی شکلیں تکنے لگے تھے۔ شاہد خاموش ہوگیا تھا اب ان چاروں کے درمیان گہری خاموشی چھاگئی تھی۔

''یعنی پیر بابا نے یہ بتایا کہ......'' اس کے ابا نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر تصدیق کی نیت سے بولنا شروع کیا۔ ''ہمارے اس گھر میں ایک خزانہ دفن ہے؟''

''ہاں ابا' یہی بتایا ہے اس نے؟''

''میں کیسے مان لوں کہ یہ سچ ہے۔'' ابا نے نفی میں سر ہلایا۔

''مجھے تو نہیں لگتا یہ ٹھیک بات ہے۔''

شاہد بولا۔ ''مگر اب پیر بابا نے حساب کتاب لگایا تھا' کچھ پڑھ پڑھا کر ہی بتایا ہے' سچ کہا ہوگا۔''

''مجھے تو سچ ہی لگتا ہے یہ۔'' اس کی ماں نے پہلی بار زبان کھولتے ہوئے کہا پھر اپنے شوہر سے بولی۔ ''یاد نہیں ہے تمہیں خود ہی تو بتاتے تھے کہ تمہارے باپ نے یہ مکان ایک ہندو سے خریدا تھا' ایک ہندو کو کسی سے اپنی جان کا خطرہ تھا وہ چند دنوں میں ہی اونے پونے داموں میں مکان بیچ گیا تھا۔''

''ہاں یاد ہے۔ میں نے ہی تو بتایا تھا تجھے۔'' اس کا شوہر سر ہلاتا ہوا بولا۔

''اور ابا سنا ہے ہندو لوگ اپنی دولت اور سونا دفن کردیتے تھے' یہ بات تو سچ ہے نا۔'' شاہد کی سانسیں پھولنے لگی تھیں' اسے ماں باپ کی زبان سے پہلی بار یہ بات معلوم ہوئی تھی اس کا یقین مزید مستحکم ہونے لگا تھا۔

''ابا ہوسکتا ہے ہمیں خزانہ مل جائے اور ہمارے دن پھر جائیں۔'' ناصرہ نے امید بھرے انداز میں کہا۔

''دیکھ لیں' شاید ہمارے نصیب میں ایسے ہی امیر ہونا لکھا ہو۔'' ابا کے بولنے سے پہلے اس کی ماں نے کہا۔ ابا نے کچھ کہنا چاہا مگر الفاظ منہ میں ہی رہ گئے اور وہ خاموش ہوگیا۔

''دیکھ بیٹا' جو کرنا ہے کرلے مگر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو' پتا لگ گیا تو ہمارے ہاتھ کچھ نہیں لگنے والا۔'' اماں نے شاہد کو سمجھایا۔

''فکر مت کر اماں' میں رات میں کام کروں گا' آرام آرام سے' کسی کو ذرا بھی شک ہونے نہیں دوں گا۔'' شاہد نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔



اب اسے ایک ہفتے سے زیادہ ہوگیا تھا اپنے کمرے میں کھدائی کرتے ہوئے، ناصرہ اس کے ساتھ ہوتی تھی، وہ دن بھر رکشہ چلاتا تھا اور رات کو کھانا کھانے کے بعد اس کمرے میں آجاتا تھا جہاں سرنگ نما گڑھا کھودرہا تھا۔ پہلے پکے فرش پر کدال چلا کر اسے توڑا تھا۔ رات کے سناٹے میں ٹھک ٹھک کی آوازیں محلے میں سنی گئیں، برابر والے پڑوسی نے وقت کے وقت ان کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا دیا تھا۔

پہلی رات تھی لہٰذا کمرے میں ناصرہ اور شاہد کے علاوہ ان کے ماں باپ موجود تھے اور بہت تجسس آمیز نظروں سے شاہد کو کدال چلاتے دیکھ رہے تھے ان کے اشتیاق سے ایسا لگتا تھا کہ جیسے انہیں امید ہے آج ہی چند فٹ کھدائی کے بعد خزانہ نکل آئے گا۔

دروازے پر ہونے والی دستک نے ان چاروں کو چونکا دیا تھا، شاہد کا چلتا ہوا ہاتھ رک گیا، تقریباً ڈھائی بجے کا وقت تھا۔

''یہ...... یہ کون آگیا اس وقت؟'' اس کی ماں کے منہ سے گھبرائی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔

''میں دیکھتی ہوں جاکے۔'' ناصرہ نے پریشانی کے عالم میں کہا مگر اس کے باپ نے ہاتھ کے اشارے سے منع کردیا۔

''رہنے دو تو ادھر ہی رک، میں دیکھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس کا ابا کمرے سے نکل کر بیرونی دروازے تک آگیا، دستک اب تک ہورہی تھی، ساتھ ہی کسی کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

''او شاہد، دروازہ کھول یار، یہ کیسی آوازیں آرہی ہے ٹھک ٹھک کی...... شاہد......''

''آرہا ہوں بھائی، آرہا ہوں دو منٹ صبر کر۔'' ابا نے جاکر دروازہ کھول دیا، سامنے محمود صاحب کھڑے تھے جو ان کے برابر والے مکان میں رہتے تھے۔

''کیا ہوا بھائی محمود!'' ابا نے سوال میں پہل کردی۔

''ہیں، میں تم سے پوچھ رہا ہوں گھر میں خیریت تو ہے نا۔ میں کافی دیر سے ٹھک ٹھک کی آوازیں سن رہا تھا، تمہارے گھر سے آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے کہا کہ کہیں ڈاکو واکو تو نہیں آگئے گھر میں۔ دیوار توڑ رہے ہوں۔'' محمود صاحب نے آنے کی وجہ بتائی۔

''او بھائی، ڈاکو میرے گھر آکے کیا کریں گے کیا ملے گا انہیں، آبھی گئے تو الٹا کچھ دے دلا کے جائیں گے، بس وہ ذرا کمرے کا دروازہ خراب ہوگیا تھا، اسے نکال کر دوسرا لگانا ہے شاہد اس کے قبضے نکال رہا تھا۔'' ابا نے اسے مطمئن کرنے کے لیے جھوٹ گھڑتے ہوئے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے بھائی جی، پر اس وقت؟'' محمود صاحب کو اپنی نیند خراب ہونے کا بڑا ملال تھا۔ ''دن میں کرلیتے کام۔''

''دن میں شاہد کہاں ہوتا ہے، مجھ سے تو ہتھوڑا نہیں چلتا، بدن میں اب طاقت ہی کہاں ہے۔ پھر مجھے بھی مزدوری پر جانا ہوتا ہے، بس تھوڑی تکلیف برداشت کرلو، اب تھوڑا سا کام باقی رہ گیا ہے اس کے بعد کام ختم۔'' ابا نے انہیں تسلی دی، محمود صاحب سر ہلاتے ہوئے چلے گئے۔

پہلی رات کام کرتے ہوئے شاہد کے چھکے چھوٹ گئے تھے، پکا فرش کھودنا آسان کام نہیں تھا، تقریباً ساڑھے تین فٹ کی چوڑائی میں اس نے پکا فرش اکھاڑ ڈالا تھا پکے فرش کے بعد بہت سے

پہاڑی پتھر بھی درمیان میں حائل ہوئے' ان پتھروں کو نکالنے کے بعد ایک فائدہ تو ہو گیا کہ اب نرم زمین آ گئی تھی اور آواز سے جان چھوٹ گئی۔ پہلی رات صرف دو فٹ چوڑا کھودا تھا' اب کام آسان تھا بس نرم زمین کھودتے جانا تھی' شاہد تھکن کے مارے چور ہو گیا تھا۔

اس طرح ہفتہ گزر گیا' اب شاہد کے معمولات یہ ہو گئے تھے کہ وہ دن بھر رکشہ مزدوری کرتا اور رات میں خزانے کی تلاش میں لگ جاتا۔ اس نے دلدار کو بھی نہیں بتایا تھا کہ پیر بابا اسے کس کام پر لگا دیا ہے شاہد کو خدشہ تھا کہ اگر اس نے دلدار کو خزانے کے بارے میں بتا دیا تو کہیں اس کے ذریعے یہ بات پھیل نہ جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دلدار کی نیت بھی خراب ہو جائے۔ دولت تو اچھی اچھی دوستیاں خراب کر دیتی ہے' نسرین سے بھی مسلسل رابطہ تھا وہ نسرین کو تسلیاں دیتا تھا کہ وہ بہت جلد کچھ نہ کچھ کر لے گا اور پھر رشتے کے لیے اپنے باپ کو اس کے گھر بھیجے گا۔ نسرین نے اسے کافی کریدنا چاہا تھا کہ آخر وہ کیا کر رہا ہے یا کیا کرنا چاہ رہا ہے مگر شاہد نے اسے نہیں بتایا' نسرین جھنجلا جاتی تھی۔

''آخر تم کر کیا رہے ہو' مجھے بتانے میں ہرج ہی کیا ہے' ایسا کیا کام ہے جو مجھ سے چھپا رہے ہو؟''

شاہد نے جواب دیا۔ ''بتا دوں گا' بے فکر رہو مگر ابھی نہیں ابھی کسی کو نہیں بتا سکتا' تو برا نہ مان میں یہ سب تیرے لیے ہی تو کر رہا ہوں۔''

''کہیں کوئی غیر قانونی کام تو نہیں کر رہا۔'' نسرین نے خدشے کے تحت سوال کیا۔

''یہ تُو نے کیسے سوچ لیا نسرین؟''

''بس ایسے ہی دل میں خیال آیا تھا' تم مجھے بھی نہیں بتا رہے ہو تو کوئی نہ کوئی وجہ تو ہو گی۔''

''اپنے سوال کا جواب تُو نے خود ہی دے دیا ہے' کوئی بڑی وجہ ہی ہے جبھی تو نہیں بتا رہا مگر میرا وعدہ ہے وقت آنے پر سب سے پہلے تجھے ہی بتاؤں گا اور دیکھنا تُو بہت خوش ہو جائے گی' ہاں۔''

''دیکھو شاہد تمہیں میری قسم ہے کوئی الٹا سیدھا قدم مت اٹھا لینا اور...... اور جو کرنا ہے جلدی کرو' اب گھر میں میرے بیاہ کی باتیں ہونے لگی ہیں۔''

''تُو گھبرا مت' سب ٹھیک ہو جائے گا' بس دعا کرتی رہا کر۔'' شاہد نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

اب تک اس نے پندرہ فٹ کے قریب گڑھا کھود لیا تھا جواب گڑھے سے زیادہ سرنگ دکھائی دیتا تھا' پندرہ فٹ پر بھی خزانے کا نام ونشان نہیں ملا تھا لیکن شاہد پر ایک جنونی کیفیت طاری تھی' اس نے سوچ لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ اس وقت تک سرنگ کھودتا رہے گا جب تک اسے خزانہ نہیں مل جاتا۔ پندرہ فٹ گہرائی بھی کم نہیں ہوتی اور پھر سرنگ اندر سے زیادہ چوڑی نہیں تھی' درمیان میں کئی جگہوں پر بڑے بڑے پتھر آ گئے تھے جنہیں توڑنا ناممکن تھا لہٰذا اسے پتھروں سے پرے ہٹ کر کھدائی کرنا پڑی' اس طرح آگے سے سرنگ سیدھی کے بجائے پیچ وخم کھاتی ہوئی جا رہی تھی' اب شاہد لالٹین لے کر سرنگ میں گھستا تھا' پہلے وہ رسّے کے ذریعے اترتا اور جہاں سے سرنگ ٹیڑھی میڑھی ہو کر گہرائی میں لمبی ہو رہی تھی وہاں اسے پیٹ کے بل رینگ کر آگے بڑھنا پڑتا تھا۔ سرنگ میں سیلن' گھٹن اور عجیب سی چکرا دینے والی بو تھی' کوئی اور ہوتا تو اس کام سے باز آ جاتا مگر شاہد کے دماغ پر خزانے کا بھوت سوار تھا سرنگ گہری ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا جنون بھی

بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ناصرہ اس کے ساتھ ہوتی تھی، وہ جتنی مٹی کھودتا اسے بالٹی میں بھر دیتا تھا۔ اب اندر گھٹن اور بو کے ساتھ ساتھ شاہد کو آکسیجن کی کمی کا بھی سامنا کرنا پڑ رہا تھا' اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ جس کمرے میں کھدائی کر رہا تھا وہاں کا دروازہ اور کھڑکی اچھی طرح بند کردیتے تھے کہ رات کو کھٹ پٹ کی آوازیں اور روشنی باہر نہ جائے پھر سرنگ کے اندر گھٹن اور گرمی تو پہلے ہی ہوتی تھی اوپر سے لالٹین کی تپش اور مٹی کا تیل جلنے کی بو دماغ گھما دینے والی ہوتی تھی۔ شاہد کے جسم کے مسام کھل جاتے اور پسینہ دھاروں کی صورت میں نکلنے لگتا تھا' کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ شاہد کو گرمی اور حبس کی وجہ سے چکر آ گئے اور وہ حواس کھونے لگا تھا' تب وہ گھبرا کر جلدی سے باہر نکل آتا تھا مگر وہ مستقل مزاجی سے اپنے کام پر ڈٹا ہوا تھا' اس پر بس خزانے کا جنون طاری تھا۔ خزانہ ملنے کی صورت میں ہی وہ نسرین کو بھی پا سکتا ہے ورنہ خوشیاں ملنے کی اور کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی' ناصرہ کو بھی خزانے کا آسرا تھا۔ اس نے بھی اپنے ذہن میں بہت سے خواب سجا لیے تھے' خزانے کے علاوہ اس کے دماغ میں کوئی اور سوچ ہی نہیں آرہی تھی' اس نے تو یہ بھی سوچ لیا تھا کہ خزانہ جب مل جائے گا تو وہ کیا کیا خریدے گی' شہزادیوں کی طرح زندگی گزارے گی۔

ماں کی نیندیں بھی اجڑ گئی تھیں' اس بے چاری نے بچپن سے آج تک غربت اور افلاس کی کڑی دھوپ ہی دیکھی تھی' اسے بھی یہ امید تھی جب ناصرہ اور شاہد کام میں لگے رہتے تھے تو ان کی ماں کم از کم دو چکر ضرور لگاتی تھی۔

بس گھر میں وحد ابا جی تھے جنہیں بظاہر اس جھنجٹ سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر ان کے دل میں بھی امید کی ایک موہوم سی شمع روشن تھی وہ کسی سے اس بارے میں پوچھتے نہیں تھے مگر ان کی باتوں پر کان لگے رہتے تھے کہ شاید انہیں کوئی خوشخبری سننے کو مل جائے لیکن اب تک وہ اچھی خبر سے محروم ہی تھے۔



''یار یہ تجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔'' دلدار بغور شاہد کو دیکھ رہا تھا۔ ''چند روز میں ہی اتنا کمزور ہو گیا ہے' خیریت تو ہے نا؟ بیمار شمار تو نہیں ہے؟''

''نہیں یار!'' شاہد اپنے مرجھائے ہوئے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ لے آیا۔ ''خیریت ہی ہے' بس کئی راتوں سے نیند پوری نہیں ہو رہی ہے' پتا نہیں نیند دیر میں کیوں آرہی ہے۔''

''اوہ اچھا اچھا۔'' دلدار نے ہنستے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور چہرہ قریب کر کے آنکھ ماری۔ ''تارے بھی گنتا ہوگا' خواب بھی رنگین رنگین آتے ہوں گے' اگر ایسا ہے تو میں سمجھ گیا تیرا مرض' بس اب شادی کرلے جلدی سے۔''

''شادی......؟'' شاہد نے دلدار کو حیرت سے دیکھا۔

''ہاں تو اس میں اتنا حیران ہونے والی کون سی بات ہے' میں نے کوئی انوکھی بات کردی ہے' سب کے ساتھ ہوتا ہے ایسا' جب میرے ساتھ ہوا تھا نا تو میں نے تو گھر میں ہنگامہ مچا دیا تھا۔ شادی کرو شادی کرو' پھر اماں نے فوراً شادی کروادی۔'' دلدار نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''میں ابھی کیسے شادی کروں یار!'' شاہد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پاس پلے تو کچھ ہے نہیں' شادی کے لیے تو بڑا پیسہ چاہیے ہوتا ہے۔''

''ہاں بات تو تیری بھی ٹھیک ہے۔'' دلدار نے

اس کی بات سے اتفاق کیا پھر چونکتا ہوا بولا۔ ''یار وہ کیا ہوا اس کا' وہ عمل بابا کا' کوئی تعویز گنڈا' کوئی عمل شمل بتایا اس نے؟''

''وہ...... وہ ہاں...... ہاں' میں گیا تھا بعد میں ان کے پاس۔'' شاہد نے لمحاتی گڑبڑاہٹ کے بعد خود کو سنبھال لیا۔ ''بس پڑھنے کو ایک وظیفہ دیا ہے' وہی پڑھتا رہتا ہوں۔''

''کوئی اثر وثر ہوا کہ نہیں؟'' دلدار نے پوچھا۔

''کہاں یار! ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔'' شاہد نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

دلدار نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا ''چل اچھا' دل چھوٹا نہ کر ہو جائے گا سب ٹھیک' کبھی کام جلدی ہو جاتے ہیں تو کبھی دیر سویر بھی ہو جاتی ہے' ربّ سے امید رکھ۔''

''ہوں......'' شاہد نے مختصراً جواب دیا۔



رات ڈھائی بجے شاہد جب روز کی مشقت سے فارغ ہو کر اپنی چارپائی پر سونے کے لیے لیٹا تو اس کا سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا' ایسا لگ رہا تھا کہ اندر کوئی ہتھوڑے برسا رہا ہے' اب سرنگ چوں کہ خاصی لمبی ہو گئی تھی اس لیے اس کے اندر اترنا اور واپس آنا بھی ایک تھکا دینے والا اور مشکل کام ہو گیا تھا

اب شاہد اس کے اندر زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی گھنٹے کھدائی کرتا تھا' اندر حبس اور گرمی اسے موم کی طرح پگھلا دیتی تھی' وہ ہر چند منٹ بعد آدھے راستے اوپر آ کر گہری گہری سانسیں لیتا اور اپنے چکراتے دماغ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا تھا' اتنے دنوں کی بے سود محنت نے اب ناصرہ کی امیدیں آدھی سے بھی کم کر دی تھیں' ایک دوبار تو وہ بول بھی چکی تھی۔

''بھائی' مجھے تو نہیں لگتا کہ یہاں کوئی خزانہ دفن ہے اگر ہوتا تو کب کا مل چکا ہوتا۔ بس اب اس کا خیال دل سے نکال دو' دفع کرو اسے' ہمارے نصیب ایسے نہیں ہیں کہ خزانہ ملے۔ بس دو وقت کی روٹی مل رہی ہے وہی کھاؤ اور سو جاؤ' اس سے آگے اور کچھ نہیں ہے تقدیر میں۔''

''مگر میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہمیں خزانہ ضرور ملے گا۔'' شاہد کے لہجے میں یقین کا عنصر غالب تھا۔

''ابھی تو ہمت نہ ہارو' دیکھ میں نے بھی اب تک امید لگا رکھی ہے' ایک یہی تو راستہ ہے جس پر چل کر ہم اپنی تمام خواہشوں کو پورا کر سکتے ہیں ورنہ تو ہم کچھ ہی نہیں کر سکتے' ساری زندگی ایسے ہی جل کڑھ کر گزار دیں گے' میں نے امیدوں کے پہاڑ بنا لیے ہیں ناصرہ! اب انہیں میں توڑ بھی نہیں سکتا۔''

''لیکن بھائی اگر واقعی کچھ بھی ہاتھ نہ آیا تو......؟'' ناصرہ نے ایک خوفناک سوال کر ڈالا۔

شاہد کے جسم میں ایک جھرجھری پیدا ہوئی جس نے پورا وجود ہلا کر رکھ دیا' بظاہر ایک عام سا خدشہ تھا مگر اس نے شاہد کی امیدوں کے پہاڑوں میں گہری دراڑیں ڈال دی تھیں۔ اس کی اندرونی کیفیت کو ناصرہ نے فی الفور بھانپ لیا اور تیزی سے دوبارہ گویا ہوئی۔

''مم...... میرا مطلب یہ نہیں تھا بھائی! میں تو بس ایسے ہی پوچھ رہی تھی' میرے منہ میں خاک' اللہ نہ کرے ہم ناکام ہوں۔ ہمیں اپنا کام کرتے رہنا چاہیے' مگر بھائی اب ذرا خیال سے اندر اترا کرو' سرنگ کافی گہری ہو گئی ہے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔''

''ہاں' ہاں میں خیال رکھتا ہوں۔'' شاہد نے

اندر سے اپنے مسمار ہوتے ہوئے وجود کو سنبھالا دے دیا تھا۔ ''اسی لیے تو اب ساری ساری رات کام نہیں کرتا' زیادہ سے زیادہ دو یا ڈھائی گھنٹے کافی ہیں' اندر گرمی اور حبس میں دم گھٹنے لگتا ہے۔'' ناصرہ اس کی شکل دیکھتی رہ گئی۔ شاہد نے کہا۔ ''اچھا اب تُو جان' رات زیادہ ہوگئی ہے' آرام کر۔ مجھے بھی بہت نیند آرہی ہے' جسم درد کے مارے ٹوٹ رہا ہے۔'' ناصرہ سر ہلاتے ہوئے چلی گئی۔



شاہد سرنگ میں بڑی احتیاط کے ساتھ اتر رہا تھا' اب اسے اندازہ بھی نہیں رہا تھا کہ سرنگ کتنی گہری ہوگئی ہے اور شاہد کو اس کی لمبائی گہرائی سے کوئی غرض بھی نہ تھی' اس کو صرف ایک ہی چیز سے غرض تھی خزانے سے۔ شاہد کے ہاتھ میں کھرپی تھی اوپر سے ناصرہ نے اس کی مدد سے بالٹی لٹکائی ہوئی تھی جسے لے کر وہ نیچے اتر رہا تھا آج اسے کافی ٹائم ہوگیا تھا' باہر طوفانی رات تھی۔ ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے تھے' بارش کا بھی امکان تھا ناصرہ نے اسے منع کردیا تھا کہ آج کام نہ کرے مگر شاہد نہ مانا اس کا کہنا تھا کہ ایک دن کام نہ کرنے کا مطلب ایک دن بڑھ جاتا ہے اور خزانہ ایک دن دور ہوجائے گا۔ وہ کام ہرگز نہیں روکے گا۔ شاہد سرنگ میں اتر رہا تھا اسے باہر بادلوں کی گرج اور بجلی کی تیز آوازیں سنائی دے رہی تھیں' عین ممکن تھا کہ اب تک بارش بھی شروع ہوچکی ہو' اسے تو سرنگ میں صحیح اندازہ نہیں ہورہا تھا' دس فٹ گہرائی سے نیچے آنے کے بعد شاہد کو حبس اور گرمی نے آدبوچا۔

وہ صرف ایک پرانی لنڈے کی جینز اور میلی ٹی شرٹ میں اترا تھا' جینز کی وجہ سے اسے رگڑ وغیرہ لگنے کا زیادہ خطرہ نہیں رہتا تھا۔ شاہد بڑی احتیاط کے ساتھ نیچے اترنے کا عمل جاری رکھے ہوئے تھا' ہر روز اسی راستے آنے جانے کی وجہ سے اسے اب ہر قدم کا اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کا اگلا قدم کس جگہ پڑے گا' اب اس نے لالٹین کی جگہ ایک ایمرجنسی لائٹ خرید لی تھی' ناصرہ ایمرجنسی لائٹ کو چارج کرکے رکھ دیتی تھی جو رات کے وقت سرنگ میں کام آتی تھی۔

نیچے اترتے ہوئے ایک جگہ شاہد رک گیا' یہاں سے راستہ تنگ تھا' اب وہ لیٹ کر جانے کے بجائے جسم کو سکیڑ کر نکال جاتا تھا۔ شاہد نے گہری سانس بھر کر جسم سکیڑا اور تنگ جگہ سے اندر داخل ہوگیا' اس کے بعد کا راستہ سیدھا گہرائی میں جانے کے بجائے ترچھا تھا اور چند قدم کے فاصلے کے بعد دوبارہ گہرائی میں جارہا تھا' چند قدم کے بعد شاہد جب گہرائی کی جانب آیا تو اچانک ہی اس کے ہاتھ سے ایمرجنسی لائٹ چھوٹ کر گہرائی میں گرتی چلی گئی۔

شاہد نے اسے پکڑنے کی پوری کوشش کی مگر خود بھی اپنا توازن کھو بیٹھا اور دونوں اطراف کی رگڑ کھاتا ہوا نیچے گرنے لگا' اس کے منہ سے چیخیں نکل گئیں جو اوپر موجود ناصرہ نے نہیں سنی تھیں کیوں کہ اوپر بادلوں کی گرج اور ہواؤں کا سخت شور برپا تھا۔

شاہد سرنگ کی گہرائی میں گرتا جارہا تھا' اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ پاتال کی اتھاہ گہرائیوں میں گررہا ہے' معاً اسے جھٹکا لگا اور گرنے کا عمل رک گیا وہ اس جگہ تک آگیا تھا جہاں تک اس نے سرنگ کھودی تھی' نیچے گرتے ہوئے جسم کے بے شمار حصوں پر زبردست چوٹیں آئی تھیں اور کئی جگہوں سے خون بھی رس رہا تھا جس کا عالم اسے

ہاتھ لگانے کے بعد ہوا تھا' اس جگہ ایمرجنسی لائٹ بھی پڑی تھی خوش قسمتی سے لائٹ بند نہیں ہوئی تھی اس نے لائٹ ہاتھ میں پکڑی اور اردگرد کا جائزہ لیا' پہلی بار اسے انجانے خوف نے آگھیرا اسے کبھی ڈر نہیں لگا تھا یا پھر وہ خزانے کی دھن تھی جس نے اسے ہر خوف و ڈر سے عاری کر دیا تھا۔ شاہد کو ایسا لگ رہا تھا کہ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ایک تنگ و تاریک اور گہری قبر میں آ گرا ہے۔

اس نے چہرہ اٹھایا اور پوری قوت سے آواز لگائی ''ناصرہ......'' وہ مسلسل آوازیں لگانے لگا لیکن اوپر سے اسے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔

گرمی اور حبس کسی عفریت کی طرح اس کے وجود پر حاوی ہونے لگے تھے' شاہد کے دماغ میں خیال آیا کہ اگر اس نے خود ہی فوراً یہاں سے نکلنے کی کوشش نہ کی تو یہ جگہ اس کا مدفن بن جائے گی۔ اس خیال نے اس کے بدن میں خوف کی لہریں دوڑا دیں' شاہد نے ایمرجنسی لائٹ دانتوں میں دبائی اور اوپر چڑھنے لگا' ابھی وہ چند فٹ اوپر ہی آیا تھا کہ ایک روح لرزا دینے والا واقعہ پیش آیا۔ نیچے سے کسی نے شاہد کا پیر پکڑ لیا۔

پہلے تو شاہد نے اسے اپنا وہم سمجھا گر زور لگانے پر بھی وہ اپنا پیر آزاد نہ کرا سکا تب اس نے چہرہ جھکا کر لائٹ کی روشنی میں نیچے دیکھا۔

اگلے ہی لمحے شاہد کو ایسا لگا کہ اس کی روح جسم سے نکل رہی ہے' اس کی آنکھیں خوف و دہشت کی شدت سے ابل پڑیں' اس نے چیخنا چاہا مگر خشک حلق میں پڑے کانٹوں نے آواز کا رستہ مسدود کر دیا تھا' روشنی میں اس نے ایک خوف ناک چہرہ دیکھا تھا' ایک انسان کا چہرہ...... وہ شاہد کے قدموں سے نیچے تھا اس نے اپنے ایک ہاتھ سے شاہد کا پیر پکڑ رکھا تھا۔

سب سے خوف ناک بات یہ تھی کہ اس پُراسرار انسان کے چہرے پر کھال نہیں تھی اور سرخ گوشت واضح دکھائی دے رہا تھا' ایسا لگتا تھا کہ کسی ڈھانچے پر صرف گوشت مونڈھ دیا گیا ہے اور پوری جسم کی کھال کھینچ لی گئی ہے کیونکہ اس کے ہاتھ کا بھی یہی حالت تھا۔

شاہد کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن آواز ندارد' تب اس پُراسرار شخص کا مدقوق سا منہ کھلا اور ایک غیر انسانی چیخ نکلی' یہ چیخ باریک سی تھی مگر اس کی نیز کی انی جیسی چبھن نے شاہد کے کانوں میں سوراخ کر دیئے۔ ایسا لگا جیسے کانوں سے خون نکل آئے گا تب وہ خوف ناک چہرے والا شاہد کے پیر پکڑ کر اوپر آنے لگا جیسے کوئی شخص پانی کے پائپ کو پکڑ کر اوپر چڑھتا ہے شاہد کے ہاتھ سے ایمرجنسی لائٹ گر چکی تھی لیکن گرنے کے بعد اس کا رخ اوپر کی جانب تھا اس لیے شاہد خوف ناک چہرے والے کو بخوبی دیکھ سکتا تھا پھر وہ شخص شاہد کے روبرو آ گیا۔

اس کا چہرہ شاہد کے چہرے سے صرف چند انچ کے فاصلے پر تھا' دفعتاً اس کا منہ کھلا اور اس میں سے کالے رنگ کا بڑا سا کیڑا برآمد ہوا اور یہ کیڑا گرگٹ جیسا تھا مگر سائز میں اس سے کہیں بڑا تھا' شاہد چلّانے لگا مگر آواز کھو چکی تھی۔

کیڑا شاہد کے کھلے ہوئے منہ سے اندر چلا گیا' وہ اتنی سرعت سے گیا تھا کہ شاید کو منہ بند کرنے کا موقع بھی نہ مل سکتا تھا' اب وہ اپنے پیٹ کے اندر کیڑے کے متحرک وجود کو محسوس کر رہا تھا' شاہد نے زوردار چیخ ماری' اس بار اس کے منہ سے آواز نکلی تھی اور وہ اپنے بستر سے اٹھ بیٹھا۔

اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا اور سانس

بُری طرح پھولا ہوا تھا جیسے وہ کسی بلند پہاڑ پر چڑھ کر چوٹی پر پہنچا ہو' کچھ دیر تک تو شاہد اپنی سانسیں ہموار کرتا رہا۔ رات کا نا جانے کیا وقت ہو رہا تھا جب حواس ایک جگہ جمع ہوئے تو اس نے شکر ادا کیا کہ یہ صرف خواب تھا اس کے باوجود شاہد نے لاشعوری طور پر اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور اس کیڑے کی موجودگی کا احساس کرنے کی کوشش کی' اگلے لمحے اسے اپنی حماقت کا ادراک ہو گیا تھا۔

اس کے بعد شاہد کافی دیر تک جاگتا رہا' اپنے بستر پر بار بار کروٹیں بدلتا رہا تھا' وہ خوف ناک چہرہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہی نہیں ہو رہا تھا نا جانے کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔



''آخر تم کر کیا رہے ہو شاہد!'' نسرین نے دبی آواز میں شاہد سے پوچھا وہ خالی خالی نظروں سے نسرین کو دیکھ رہا تھا۔

اس وقت دونوں ایک جوس کی دکان میں بیٹھے تھے' نسرین کو آج بازار کسی ضروری کام سے جانا تھا کچھ خریداری کرنی تھی لہٰذا وہ شاہد کے ساتھ رکشے میں آ گئی تھی اس طرح اس کا آنے جانے کا کرایہ بھی بچ گیا تھا' خریداری کے بعد شاہد اور وہ ایک جوس کی دکان میں آ کر بیٹھ گئے تاکہ مستقبل کے بارے میں بات کر لی جائے۔

''میں' میں کر رہا ہوں کوشش...... کر رہا ہوں......'' شاہد اس کے سوال پر قدرے بوکھلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا وہ خالی الذہنی کے عالم میں جوس کے گلاس کو گھورنے لگا۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں شاہد! کافی دنوں سے محسوس کر رہی ہوں تم کھوئے کھوئے سے رہنے لگے ہو' پتا تو چلے آخر تمہیں ہوا کیا ہے' کیا کوشش کر رہے ہو بتاؤ تو مجھے۔ جب پوچھتی ہوں صرف یہ بتا دیتے ہو کہ کوشش کر رہا ہوں' یہ کوشش ختم کب ہو گی اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔'' نسرین رکے بغیر بولتی چلی جا رہی تھی۔

''نکلے گا' نتیجہ ضرور نکلے گا۔ بس تم تھوڑا اور انتظار کر لو میرا۔'' شاہد نے اعتماد کے ساتھ کہا۔

''میں تو ہمیشہ تمہارا انتظار کر سکتی ہوں' پر...... پر میرے گھر والے مجھے جلد از جلد گھر سے نکالنا چاہتے ہیں۔ میں ہر بار تمہیں بولتی ہوں اگر کچھ اور ہو جائے تو مجھے الزام نہیں دینا' بس سمجھ لینا کہ تمہاری نسرین بہت مجبور ہو گئی تھی۔'' شاہد پتھر کے بُت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا اسے دیکھتا رہ گیا۔

''یہ...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' شاہد کے منہ سے بمشکل نکلا۔

''میں نہیں' یہ حالات بتا رہے ہیں۔'' نسرین نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''میں کب تک اکیلی اپنے گھر والوں کے آگے مزاحمت کرتی رہوں گی' مجھے ہتھیار ڈالنا پڑ جائیں گے اور...... اور میں گھر سے بھاگ بھی نہیں سکتی اور نہ تم بھاگ سکتے ہو۔ ہم دونوں اپنے اپنے گھر کے حالات کے آگے بے بس ہیں اور یہ قدم نہیں اٹھا سکتے۔''

''بس تم دعا کرو نسرین! میں کسی طرح کامیاب ہو جاؤں' دعا میں تو بڑا اثر ہوتا ہے۔'' شاہد نے تھرتھراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

نسرین نے جواب نہیں دیا لیکن اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔



شاہد نے کپڑے کے دونوں تھیلے رکشے میں رکھے اور گلی کا دروازہ کھول دیا۔

''ابا دروازہ بند کرلو۔'' اس نے رکشہ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا اور دروازے سے گزر کر گلی میں آ گیا۔
کپڑے کے بڑے بڑے تھیلوں میں وہ سرنگ سے نکالی ہوئی مٹی بھر کر پھینک آتا تھا' یہ شروع سے ہی اس کا معمول بنا ہوا تھا جب سے اس نے خزانے کی تلاش میں سرنگ کھودنی شروع کی تھی' صبح سویرے وہ تھیلے رکشے میں ڈال کر گھر سے نکل جاتا تھا۔ آج بھی وہ معمول کے مطابق مٹی پھینکنے کے لیے صبح سویرے رکشہ لے کر نکلا تھا' ٹوٹی ہوئی گلی' جگہ جگہ گندگی اور کچرے کے انبار لگے ہوئے تھے جن پر سیکڑوں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں' یہاں کوئی بھی گاڑی تیز نہیں چلائی جاسکتی تھی شاہد احتیاط سے رکشہ چلا رہا تھا' اتنے میں اس کے سامنے محمود صاحب آ گئے' ان کے ہاتھ میں دودھ کی تھیلی تھی وہ دودھ لے کر آ رہے تھے اور یہ آمنا سامنا پہلی بار نہیں ہوا تھا بلکہ پہلے بھی کئی بار ان کی مڈبھیڑ ہوچکی تھی۔
محمود صاحب کو دیکھتے ہی شاہد نے غیر محسوس طریقے سے رکشہ کی رفتار بڑھادی اور ان کے نزدیک سے گزرتا چلا گیا محمود صاحب نے رکشے میں رکھے ہوئے تھیلے دیکھ لیے تھے شاہد نے بیک مرر میں انہیں دیکھا وہ اپنی جگہ رک کر اسے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے شاہد کے دل میں ایک انجانا سا خوف بیٹھ گیا کہ کہیں محمود صاحب کو اس پر شک تو نہیں ہوگیا' پتا نہیں وہ کیا سوچ رہے ہوں گے۔ شاہد کا دماغ خدشات کی آندھی کی زد میں خشک پتے کی طرح چکرا رہا تھا' کہیں ایسا نہ کہ اس کا کام ادھورا رہ جائے پھر...... پھر کیا ہوگا؟
شاہد کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہوگئیں۔ پھر وہ اپنے خوابوں کی تکمیل کیسے کرسکے گا'

ہیرے جیسے لفظ

☆ نفرت۔ نفرت سے کبھی کم نہیں ہوتی' محبت سے کم ہوتی ہے۔
☆ نظر اس وقت تک پاک ہے جب تک اٹھائی نہ جائے۔
☆ جن لوگوں میں خوبیاں زیادہ ہوں ان کی خامیاں نظر انداز کردو۔
☆ مطالعہ غم اور اداسی کا بہترین علاج ہے۔
☆ وقت کی پابندی بیدار قوموں کا نشان ہے۔
☆ انسان آنسوؤں اور مسکراہٹوں کے درمیان لٹکا ہوا پنڈولم ہے۔
☆ ماں ایسی ہستی ہے جو اولاد سے کبھی نہیں اکتاتی۔
☆ رونے سے سکون ملتا ہے اور غم آنسوؤں میں بہہ جاتا ہے۔
☆ اتنا میٹھا نہ بنو کہ لوگ نگل لیں اور اتنا کڑوا نہ بنیں کہ لوگ تھوک دیں۔
(مس ارم نور ارما...... کراچی)

ابھی تو خزانے کی امید ہے' بصورت دیگر یہ امید خاکستر ہوجائے گی' ان کے بعد از پھر اندھیرا ہوگا۔
ان سوچوں سے دست و گریباں شاہد کو ہوش اس وقت آیا جب ایک جانب سے ایک سائیکل سوار اس کے رکشے کے سامنے آ گیا' اگلے ہی لمحے شاہد نے پوری قوت سے بریک لگائے' رکشے کے ٹائروں کی چرچراہٹ دور تک گونج اٹھی۔
''اندھا ہوگیا ہے کیا؟'' سائیکل سوار ایک سائیڈ ہوکر چلانے لگا۔ ''پاگلوں کی طرح سیدھا سیدھا چلا آ رہا ہے' ابھی رکشہ میرے اوپر چڑھا دیتا تو کون ذمہ دار ہوتا۔''
''معاف کرنا بھائی جی۔'' شاہد کے منہ سے

نکلا۔ ''غلطی ہوگئی' بس میں تھوڑا پریشان ہوں' اس لیے دھیان نہیں دیا تھا۔''

''معاف کرنا......'' سائیکل سوار نے اس کی نقل اتاری۔ ''بس ایک لفظ بول کے جان چھڑا لیتے ہو' معاف کرنا۔ ابھی اگلے بندے کی جان چلی جاتی تو کس سے معافی مانگتے۔ پریشان ہے تو پریشانی گھر رکھ کر آیا کرو' پتا نہیں کہاں کہاں سے آ جاتے ہیں منہ اٹھا کے۔'' سائیکل سوار بکتا جھکتا چلا گیا۔

صبح سویرے کا وقت تھا' ابھی سڑکوں پر اتنا رش نہیں ہوا تھا' اس لیے کوئی ان کے پاس نہیں آیا' تھوڑے بہت افراد نے یہ منظر دیکھ تو لیا تھا مگر پاس آنے کی زحمت نہیں کی اگر رش کا وقت ہوتا تو اب تک وہاں تماشہ دیکھنے والوں کی بھیڑ لگ چکی ہوتی' شاہد نے سر جھٹک کر رکشا آگے بڑھا دیا۔



شام کے وقت شاہد رکشہ لے کر دوبارہ گھر کی طرف آیا' گلی میں داخل ہو کر اس نے نسرین کے گھر کی کھڑکی پر نظر ڈالی تھی' مگر کھڑکی پر صرف پردہ لہرا رہا تھا۔ ایک عجیب سی مایوسی نے اس کے وجود کو سپرد اضطراب کر دیا تھا' ایسا پہلے نہیں ہوتا تھا شاہد کے رکشے کی آواز سنتے ہی نسرین جھٹ کھڑکی پر آ جاتی تھی' اب ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا وہ بھی شاہد اسے کال کر کے بتا دیتا تھا کہ وہ آ رہا ہے۔ آج ویسے بھی اس کے موبائل کی چارجنگ ختم ہوگئی تھی لہٰذا وہ بتا نہیں سکا تھا' عام طور پر شاہد رات کو واپس آتا تھا آج دن بھر طبیعت بوجھل رہی تھی۔ دماغ پر دوسوسوں کا بھاری پتھر پڑا ہوا تھا اس لیے اس نے جلدی گھر کی راہ لی تھی۔

کھڑکی پر سے نظریں ہٹانے کے بعد اس نے سامنے دیکھا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا' اس کے گھر کے دروازے پر لوگوں کا رش دکھائی دے رہا تھا' ان لوگوں میں اسے محمود صاحب بھی نظر آ گئے تب صبح کا منظر اس کی نگاہوں کے آگے گھوم کر رہ گیا۔

رکشے کو آتا دیکھ کر تمام افراد اسی کی جانب دیکھ رہے تھے' نزدیک آ کر شاہد نے رکشہ روک دیا پھر اسے آف کر کے وہ اترا اور دھڑکتے دل کے ساتھ لوگوں کو دیکھا۔

''خیریت تو ہے' کوئی مسئلہ ہو گیا ہے کیا؟'' شاہد نے بمشکل اپنے اعصاب اور آواز پر قابو پا رکھا تھا۔

''وہ تو تم بتاؤ گے کہ یہ مسئلہ کیا ہے؟'' محمود صاحب نے آگے بڑھ کر اس سے پوچھا۔ ''شک تو مجھے بہت پہلے سے تھا' یہ راتوں کو ٹھک ٹھک کی آوازیں آنا' اوپر سے صبح روز تھیلوں میں مٹی بھر کر پھینکنے جانا' یہ کیا چکر ہے۔ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ تم کوئی کھڈا کھود رہے ہو گھر میں لیکن کیا وجہ ہے' یہ تم بتاؤ گے؟''

شاہد کو زبردست چکر آ گئے اسے یوں لگا کہ وہ چکرا کر گر جائے گا' مگر فوراً ہی اس نے خود کو سنبھال لیا۔

''مم...... میں...... میں نے کوئی کھڈا وڈا نہیں کھودا' یہ جھوٹ ہے۔ جاؤ یہاں سے سب' کیوں تماشہ بنایا ہوا ہے میرے گھر کے سامنے۔''

''وہ تو ابھی پولیس والے سب کچھ اگلوا لیں گے تجھ سے۔'' سلامو کا نے زہریلے لہجے میں کہا اس شخص کا محلے میں تقریباً ہر شخص سے جھگڑا ہو چکا تھا' پیدائشی جھگڑالو انسان تھا۔ جب کوئی نہیں ملتا تو اپنی بیوی سے لڑنا شروع کر دیتا تھا ہر ایک کے معاملے میں دلچسپی لینا اور لوگوں کو ایک دوسرے

کے خلاف اکسانا اس کا اولین مشغلہ تھا۔

''چپ کرو تم کاکا......'' شاہد اس پر الٹ گیا۔ ''میرے معاملے میں اپنی ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں ہے' میں بھی کوئی لحاظ نہیں کروں گا تمہارا' عزت پیاری ہے تو جاؤ ادھر سے۔''

''او چل چل'' سلاموکا کا نے ہاتھ لہرایا۔ ''منہ مت لگ میرے' دو منٹ میں طبیعت ہری کر دوں گا۔ جانتا ہے تو میرے کو' ابھی تو تو اپنی خیر منا' میں تو بعد میں نمٹوں گا تجھ سے۔'' اسی وقت کچھ شور سا ابھرا اور شاہد کے گھر سے دو پولیس والے باہر آئے' کسی نے انہیں خبر کر دی تھی کہ شاہد آ گیا ہے۔

پولیس والوں نے بغور شاہد کا جائزہ لیا اور ایک نے مسکرا کر کہا۔

''او ہشکے بھی ہشکے' کیا بات ہے تیری' کوئی تو انسان ہے کہ خرگوش' اتنا بڑا کھڈ کھود ڈالا...... ہیں۔'' شاہد کی زبان تالو سے جا چپکی تھی اب تو پول کھل گئی تھی جواب دینے یا حیلے بہانے کرنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں تھا۔

''خزانہ تلاش کر رہا ہے۔'' دوسرے پولیس والے نے سر ہلا کر کہا۔ ''بتا دیا ہے تیرے ابے نے' مل گیا خزانہ؟'' شاہد ٹکر ٹکر ان دونوں کو دیکھے جا رہا تھا' ایسا لگ رہا تھا کہ وہ سننے' بولنے کی قوتوں سے محروم ہو گیا ہے۔

''او پاگل خانے' تیرے گھر کے نیچے کوئی قارون کا خزانہ دفن ہے' سرنگ کھودے ہی جا رہا ہے' کھودے جا رہا ہے مجھے تو لگتا ہے تیرے دماغ پر کوئی زہریلی گیس چڑھ گئی ہے' علاج کروا جا کے اپنا' ایسے خزانے ملنے لگے تو ہو گیا کام۔'' پہلے پولیس والے نے نیچے جاتی ہوئی پتلون اوپر کرتے ہوئے کہا۔

بلند مرتبہ کی چیز

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

''اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعا سے زیادہ بلند مرتبہ کوئی چیز نہیں ہے۔''

(عبدالرحمٰن......کراچی)

چھینک

ایک چینی پاکستان آیا۔ ایئر پورٹ پر پاکستانی افسر نے اس کا نام پوچھا تو اس نے اپنا نام چھینک بتایا۔

افسر نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''یہ کیسا نام ہوا۔ کیا یہ کوئی چینی نام ہے؟''

چینی بولا۔ ''جی نہیں۔ یہ میرے نام کا اردو ترجمہ ہے۔''

افسر بولا۔ ''پھر چینی زبان میں آپ کا کیا نام ہوا؟''

چینی نے جواب دیا۔ ''آچھو۔''

(محمد حسن خان......بہاول نگر)

''ابھی تو سمجھا دیا ہے تیرے پیو کو' آئندہ یہ حرکت نہیں کرنا۔ ورنہ پتا ہے تجھے' ہم پولیس والے دماغ کا علاج بھی کر سکتے ہیں' سمجھ میں آئی کہ نہیں آئی۔'' دوسرے نے شاہد کے کندھے پر ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

شاہد نے کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھا اور میکانکی انداز میں سر ہلا دیا' اس کے وجود کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری تھا' اس نے جتنے بھی خوابوں کے محلات بنائے تھے وہ شیشے کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے اور کرچیوں میں تبدیل ہو رہے تھے' یہ کرچیاں اس کے وجود کو زخمی کر رہی تھیں۔

''میرا خیال ہے اب یہ ایسا نہیں کرے گا' اس کی سمجھ میں آ گیا ہے باقی ہم سمجھا دیں گے۔''

حافظ جاوید نے پولیس والوں سے کہا' وہ بھی اسی محلے کے پرانے رہنے والے تھے' وہ ابھی چند منٹ پہلے ہی یہاں آئے تھے۔

پولیس والوں نے دو تین باتیں اور سنائیں اور چلتے بنے' شاہد نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ اپنا رکشہ گھر میں لے آیا اور اندر سے دروازہ بند کرلیا' محلے والے آدھے تو جا چکے تھے باقی آدھے آپس میں اس بارے میں باتیں کرتے رہے۔



اس واقعے کے بعد شاہد کے گھر میں مایوسیوں نے ڈیرے ڈال لیے تھے' گھر کا کوئی فرد ضرورت سے زیادہ آپس میں بات نہیں کرتا تھا' ناصرہ کو بھی چپ لگ گئی تھی۔ اسے سب سے زیادہ اپنے پانچ ہزار کا دکھ تھا جو اس نے شاہد کو ادھار دیئے تھے جب تک کام چل رہا تھا اسے پیسوں کا آسرا تھا' مگر کھڈے کا راز فاش ہونے کے بعد اپنے پیسوں کے ڈوبنے کا سو فیصد یقین ہوگیا تھا لیکن اندر سے وہ ابھی امیدیں لگائے ہوئے تھی کہ شاید کوئی کرشمہ ہو جائے۔

شاہد نے کام روک دیا تھا اور تقریباً دو ہفتے گزر گئے تھے' وہ اب رکشہ چلا رہا تھا' اب اس کی ملاقات اپنے دوست دلدار سے بھی کم ہی ہورہی تھی بلکہ شاہد ہی اس کا سامنا کرنے سے کترا رہا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ دلدار سے کم ملنا ہوا گر ملاقات ہو بھی جاتی تھی تو شاہد کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے جلد از جلد وہاں سے کھسک لیتا تھا' دلدار نے بھی اس کے اس رویے کو محسوس کرلیا تھا لہٰذا اس نے بھی کبھی شاہد کو زبردستی روکنے کی کوشش نہیں کی۔

شاہد کو تو گویا چپ ہی لگ گئی تھی' وہ اب سمجھ گیا تھا کہ اس کے نصیب میں نہ دولت ہے اور نہ نسرین' اب وہ نسرین سے بھی بات نہیں کررہا تھا اُدھر نسرین کی کال بھی نہیں آرہی تھی۔ جس نے شاہد کو مزید توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا مگر وہ نسرین کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتا تھا' بظاہر تو شاہد خاموش خاموش رہنے لگا تھا مگر اس کے اندر آتش فشاں پک رہا تھا' جو کسی وقت بھی پھٹ کر باہر آسکتا تھا۔ ذہنی کرب اور خلفشار نے اسے بے خوابی کا مریض بنا دیا تھا' جس کمرے میں وہ کھڈا کھود رہا تھا اس کا دروازہ باہر سے بند کردیا تھا اور اس روز کے بعد سے وہاں کوئی نہیں گیا تھا۔

اس رات شاہد جب سونے کے لیے لیٹا تو نیند حسب معمول غائب تھی' دماغ میں بس سناٹوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ آج اس کی عجیب کیفیت ہورہی تھی' سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور وہ دنیا میں کیا صرف رکشہ چلانے ہی آیا ہے' بہت دیر تک شاہد اپنے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ وقت کا کوئی احساس نہیں تھا پھر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

ہر جانب غضب کا سناٹا تھا گھر میں بھی اور باہر بھی' تمام نفوس سو رہے تھے' جاگ رہا تھا تو صرف شاہد۔ ایک عجیب سی بے کلی نے اسے سونے نہیں دیا تھا' وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آج اتنی زیادہ بے قراری کیوں ہے' نیند تو روز ہی دیر سے آتی تھی مگر کسی نہ کسی طرح سے سو ہی جاتا تھا آج معاملہ ہی یکسر مختلف تھا۔ شاہد بستر پر بیٹھا بدن کھجانے لگا تھا۔

دفعتاً سے ایک عجیب سی آواز سنائی دی' شاہد چونک کر کمرے میں دیکھنے لگا' وہ ہمہ تن گوش ہوکر آواز سننے کی کوشش کرنے لگا لیکن اب اسے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس

نے واقعی کوئی آواز سنی تھی اور یہ اس کا وہم نہیں ہوسکتا تھا' کیوں کہ وہ پورے ہوش وحواس میں تھا۔

کئی منٹ گزر گئے شاہد اب تک آواز کے تجسس میں مبتلا تھا' آہستہ آہستہ اس کے بدن پر چھایا تناؤ ختم ہونے لگا' تب اسے پیاس کا احساس ہوا شاہد دھیرے سے بستر سے اترا اور کمرے سے باہر نکلا' صحن میں پانی کے اسٹینڈ پر مٹکے رکھے تھے وہ صحن میں آیا اور مٹکوں کی طرف بڑھنے لگا۔

یکلخت اسے دوبارہ آواز سنائی دی' اس بار آواز براہ راست اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی' جیسے کسی نے کان میں سرگوشی کی ہو۔ اب شاہد نے بخوبی سمجھا کہ آواز اس سے مخاطب تھی اور کوئی لہراتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

''میرے پاس آ جاؤ...... میرے پاس آ جاؤ۔''

شاہد کے دماغ پر اس پُر اسرار آواز کی لہریں قابض ہوتی جا رہی تھیں اور وہ اس کے ٹرانس میں آنے لگا وہ میکانکی انداز میں آواز کی سمت میں بڑھنے لگا تھا کچھ ہی دیر میں وہ اس کمرے کے سامنے آ پہنچا جہاں سے آواز سنائی دے رہی تھی۔

یہ وہی کمرا تھا جسے بند کر دیا گیا تھا اور جس میں اس نے سرنگ کھودی ہوئی تھی' شاہد نے باہر لگی ہوئی کنڈی کھولی اور اندر داخل ہوگیا' اندر گھپ اندھیرا تھا شاہد کے اندر آنے کے بعد عقب میں دروازہ خود بخود بند ہوگیا تب شاہد کے حواس ایک دم بیدار ہوگئے وہ پلٹا مگر دروازہ بند تھا۔

اس لمحے وہ آواز دوبارہ ابھری' اس بار آواز پہلے کے مقابلے میں زیادہ تیز تھی۔ شاہد پلٹا اور عقب میں منظر کو دیکھ کر اس کے قدموں تلے زمین نکلنے لگی۔

سرنگ میں سے روشنی نکل رہی تھی جیسے اس کے

گہر آب دار

☆ انسان چاہے کسی بھی نسل کا ہو کسی بھی رنگ کا ہو۔ اس کے خون اور اس کے آنسوؤں کا رنگ ایک ہی ہوتا ہے۔

☆ روٹھنا چاہیے لیکن اتنا نہیں کہ منانے والا مناتے مناتے خود روٹھ جائے۔

☆ وقت ایک ایسا آوارہ گرد ہے جس نے آج تک کہیں قیام نہیں کیا۔

☆ ناکامی کا خوف ہی ناکامی کا آغاز ہے۔

☆ ہم سفر ہم خیال نہ ہو تو کامیابی نہ ہوگی۔

☆ رنگین خواب دیکھنے سے بہتر ہے کہ انسان ڈٹ کر زندگی کی بلیک اینڈ وائٹ حقیقتوں کا سامنا کرے۔

☆ جب بھی آپ نے خود سے یہ سوال کیا کہ میں خوش ہوں تو سمجھئے کہ آپ کی خوشیوں کا خاتمہ ہوگیا۔

(مبارک احمد...... چیچہ وطنی)

اندر انگارے دہک رہے ہوں اور اس میں سے وہی بد ہیئت اور مکروہ انسان باہر آ رہا تھا جسے شاہد نے پہلے ہی سرنگ میں دیکھا تھا' وہ شاہد کو ہی دیکھ رہا تھا سرنگ میں سے آنے والی انگاروں کی تپش سے اس کا گوشت سے بھرا چہرہ پگھل رہا تھا اور چربی نظر آنے لگی تھی' اس کے بال جھڑ جھڑ کر چہرے پر آ رہے تھے یہ ایسا منظر تھا کہ اچھے اچھوں کے ہوش اڑا کر رکھ دے' وہ انسان نما بلا مگر مچھ کی طرح رینگتا ہوا شاہد کے پاس آ گیا' شاہد کے جسم میں اتنی سکت بھی نہ رہی تھی کہ وہ حرکت کرسکتا۔

اس بلا نے شاہد کا ہاتھ پکڑ لیا' تب شاہد نے دل دہلا دینے والی چیخ ماری۔



اس کے حواسوں پر پڑے پردے دھیرے

دھیرے سرک رہے تھے‘ منظر کی دھندلاہٹ کم ہونے لگی تھی اسے چند ہیولے دکھائی دے رہے تھے۔
کچھ مانوس سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں مگر وہ ٹھیک سے کچھ سمجھ میں نہیں پارہا تھا‘ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ پانی میں ڈوبا ہوا ہے اور بتدریج اس کا جسم سطح کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جھلمل کرتے ہوئے پانی پر اسے وہ ہیولے نظر آرہے تھے‘ ان کی آوازیں بھی ایسی ہی سنائی دے رہی تھیں جیسے پانی کے اندر تیرنے والے کو سنائی دیتی ہیں پھر وہ ایک دم سطح پر ابھر آیا۔
شاہد بستر سے اٹھ بیٹھا تھا اس کی سانسیں پھول رہی تھیں‘ اس کے بستر کے پاس اس کی ماں اور ناصرہ کھڑے تھے‘ اسے ہوش میں آتے دیکھ کر اماں نے اس کے سرہانے بیٹھ کر گلے میں بانہیں ڈال دیں۔
”تُو ٹھیک تو ہے نا شاہد پُتر! کیا ہوگیا تھا تجھے‘ تو بے ہوش کیسے ہوگیا تھا؟“ اماں بہت پریشان تھیں۔
شاہد نے گم صم سے انداز میں ان لوگوں کو دیکھا اور غیر ارادی طور پر گردن ہلانے لگا۔
”مم...... میں...... ٹھیک...... اماں......“
”وہاں اندر کون گیا تھا رات کو؟“ ابا نے قدرے غصے سے کہا۔ ”منع کیا تھا نا اس کمرے میں جانے کو‘ باز نہیں آیا تو...... باپ کی سنتا ہی کب ہے‘ مل گیا تجھے خزانہ؟“
”بس بس‘ خاموش ہوجاؤ۔“ اماں نے انہیں ڈانٹ دیا۔ ”دیکھتے نہیں کیا حالت ہوگئی ہے میرے بیٹے کی۔“
”ہاں اس حالت کا ذمہ دار یہ خود ہی ہے یا پھر تم دونوں۔“ ابا کا غصہ بڑھ گیا۔ ”تم دونوں کو بھی بڑا شوق ہے نا خزانے کا اور ڈھونڈو خزانہ......“ یہ کہہ کر ابا کمرے سے نکل گئے۔
”بھائی‘ کیا ہوگیا تھا تمہیں؟“ ناصرہ نے بھی زبان کھولی۔ ”تم بے ہوش کیوں ہوگئے تھے اور ......اور وہاں کیا کرنے گئے تھے؟“
”وہ...... وہ...... میں......“ شاہد ہکلانے لگا تب اسے سب کچھ یاد آ گیا‘ وہ پُراسرار آواز خوف ناک انسان۔ شاہد پھر مکر گیا۔ ”پتا نہیں‘ مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔“ شاہد نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔
”اچھا پُتر! چھوڑ...... تُو آرام کر‘ لیٹ جا۔ میں تیرے لیے گرم گرم دودھ لے کر آتی ہوں‘ لیٹ جا۔“ اماں نے شاہد کو دوبارہ بستر پر لٹا دیا۔
اماں نے باہر جاتے ہوئے ناصر سے کہا۔ ”بھائی کو تنگ نہ کر‘ سونے دے اسے‘ چل تُو بھی باہر آ جا‘ چل......“ ناصرہ نے ایک نظر شاہد کو دیکھا اور اماں کے ساتھ باہر نکل گئی۔



مزید کچھ وقت بغیر کسی حادثے یا قابل ذکر واقعے سے گزر گیا‘ شاہد کو دوبارہ وہ آواز سنائی دی نہ کوئی خوف ناک خواب دیکھا۔ شاہد اس واقعہ کے بارے میں اکثر سوچتا تھا اور بہت سوچتا تھا کہ آیا اس نے وہ خواب دیکھا تھا یا پھر وہ حقیقت تھی۔ اس واقعہ کی سچائی کو کبھی اس کے دماغ نے قبول نہیں کیا‘ اسے ہمیشہ وہ صرف ایک خواب ہی لگا تھا مگر دماغ کی سوئی صرف ایک جگہ آ کر ٹک جاتی تھی۔
آخر وہ اس کمرے تک کیسے پہنچا تھا‘ اگر وہ خواب تھا تو اپنے گھر والوں کو اس کمرے میں بے ہوش کیسے ملا؟ اسے تو اپنے بستر پر ہونا چاہیے تھا۔ ناچاہتے ہوئے بھی وہ خود کو زبردستی قائل کرتا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ وہ نیند میں چلتا ہوا اس کمرے میں چلا

گیا ہو اور کسی وجہ سے وہاں بے ہوش ہو گیا ہو۔

نسرین سے اب بہت کم بات ہو پاتی تھی' وہ سوچ کر رہ جاتا تھا کہ وہ کس منہ سے نسرین سے بات کرے گا' جو کچھ اس نے سوچا تھا وہ سب راکھ بن کر ہوا میں اڑ گیا تھا' کئی بار ایسا ہوا کہ نسرین کی کال آ رہی ہوتی تھی مگر وہ ریسیو نہیں کرتا تھا' ایک دوپہر کو ایسا ہی ہوا۔

شاہد ایک سواری کو اتار کر کھانا کھانے کے لیے ایک ہوٹل پر آیا اور کھانے کا آرڈر دے کر بیٹھا ہی تھا کہ نسرین کی کال آنے لگی۔ شاہد موبائل ہاتھ میں پکڑے دیکھتا رہ گیا' وہ تذبذب کا شکار تھا کہ کال ریسیو کرے یا نہیں پھر نا جانے کیا سوچ کر اس نے کال ریسیو کر لی۔

''ہیلو......'' شاہد نے دھیمی آواز میں کہا۔

''اتنے دنوں سے تم میرا فون کیوں نہیں اٹھا رہے تھے۔'' دوسری جانب سے نسرین کی خفگی آمیز آواز سنائی دی۔

''وہ...... میں...... میں تھوڑا......'' شاہد کو کوئی بہانہ نہیں سوجھ رہا تھا۔

''میں تمہیں ایک بات بتانا چاہ رہی تھی۔''

''وہ کیا؟'' شاہد کے منہ سے ایک دم نکلا۔

''میرے ماما آئے تھے لاہور سے' مامی بھی تھی۔ انہوں نے میرے لیے کوئی رشتہ دیکھا ہے' اسی سلسلے میں اماں ابا سے بات کرنے آئے تھے۔'' نسرین نے بتایا۔

شاہد کا دل اچھل کر حلق میں آ پھنسا' اس کا وجود نازک شیشے کی طرح چھناکے سے ٹوٹ کر بکھرنے لگا تھا۔

''بس اب تھوڑا سا موقع اور ہے۔'' نسرین مسلسل بول رہی تھی۔ ''میں نے ابھی کوئی صاف

غزل

جذبۂ ایماں تم سے زندہ انتہائے یقین تم ہو
محافظ سرحدوں کے، مٹی کے امین تم ہو
لہو سے تمہارے ہی اس چمن کو کھلنا ہے
غیرت کا آسماں محبت کی زمین تم ہو!
بحر بر کے رخ موڑنے کی صلاحیت رکھتے ہو
کہکشاؤں پہ جگمگانے والے نگین تم ہو
وقت کو ہنر جینے کا تم نے بخشا ہے!
دلوں کے مکیں جو وہ حسین تم ہو
مشکل وقت پڑے جب قوم وملک پر
جاں لٹانے کو تیار پھرو وہیں تم ہو
تمہارے ہوتے ہوئے ڈر نہیں دشمن کا
آفتوں کو بھگانے والے حرف بریں تم ہو
قافلہ جہاد کے سپہ سالار ووارث ہو
پرستارِ حق وصداقت کے سچائی دیں تم ہو
ہاتھ ہمارے جب اٹھے خیر مانگیں تمہارے لیے
خدا کامیابی خوشی دے تم کو کہیں تم ہو
(فوزیہ غزل' شیخوپورہ)

جواب نہیں دیا ہے' اب اگر کچھ کرنا ہے تو کر لے' ورنہ پھر......'' نسرین نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا' شاہد کے وجود طوفان کی زد میں آ چکا تھا۔ نسرین پھر کچھ کہنے لگی تھی لیکن اب اس کی آواز شاہد کی سماعت سے دور تھی پھر اس نے موبائل بند کر دیا۔

جب شاہد وہاں سے اٹھا تو ایک فیصلہ کر چکا تھا۔



ابا نے کمرے کا دروازہ کھولا' اندر ناصرہ سرنگ کے دہانے کے نزدیک کھڑی تھی' دروازے کی آواز سن کر ناصرہ بوکھلا کر پلٹی اور ابا کو دیکھتے ہی اس کا رنگ فق ہو گیا۔

''پھر دماغ خراب ہوگیا اس کا۔'' ابا نے آتے ہی چلا کر کہا۔ ''منع کیا تھا ناں پھر گھس گیا سرنگ میں۔''

''ابا...... وہ...... وہ......'' ناصرہ کی سانسیں پھول گئیں۔

''کیا وہ وہ......'' ابا نے خونی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''سب پتا ہے تُو بھی کم نہیں ہے اپنی ماں پر گئی ہے جیسی وہ لالچی ہے ایسی تُو بھی ہے۔'' ناصرہ سے کوئی جواب نہ بنا تو کمرے سے کھسک لی۔ اس کے جاتے ہی اماں اندر آ گئیں۔

''اے کیا ہے کیوں شور مچایا ہوا ہے؟''

''وہ تیرے لاڈلے کا دماغ پھر خراب ہوگیا اندر گھس گیا ہے سانپ کی طرح خزانہ ڈھونڈنے۔''

''آ جائے گا خود ہی آ جائے گا۔ تم جاکے سو جاؤ اپنی چارپائی پر۔ پتا نہیں کون سا درد اٹھتا ہے تمہارے پیٹ میں ذرا سے کھٹکے پر آ جاتے ہو۔ اس عمر میں آ کے لوگ اللہ اللہ کرتے ہیں اور تم اپنی اولاد کی کھوج میں رہتے ہو کہ کون کیا کر رہا ہے کیا نہیں؟ ابھی خزانہ مل گیا تو سب سے آگے آگے تم ہی ناچ رہے ہوگے۔'' اماں نے بھی گولہ باری شروع کردی۔

''تُو شہہ دیتی رہ اسے۔'' ابا کا پارہ مزید چڑھ گیا۔ ''تیری ہی وجہ سے یہ پاگل ہوگیا ہے ہم جیسوں کو نہیں ملتے خزانے۔ ہمارے نصیب میں صرف مزدوری لکھی ہوتی ہے روز کمانا اور روز کھانا سمجھی بے عقل عورت۔'' اتنا بک جھک کر ابا جی بھی باہر نکل گئے۔

اماں نے آگے بڑھ کر سرنگ میں جھانکا اندر اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا اس نے شاہد کو آواز لگائی مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ اتنے میں ناصرہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوگئی اماں کو سرنگ کے نزدیک دیکھ کر بولی۔

''کیا کر رہی ہو اماں ادھر؟''

''دیکھ تو ذرا میں نے آواز دی تھی شاہد کو کوئی جواب ہی نہیں دے رہا ہے وہ تو آواز دے۔''

''بھائی آ جائے گا اماں! فکر نہ کرو تم جاؤ اپنے کمرے میں جا کر آرام سے سو جاؤ ورنہ ابا ابھی آ کر دوبارہ شروع ہو جائیں گے۔'' ناصرہ نے اماں کے کندھے پکڑ کر سرنگ کے دہانے سے دور کیا۔

''تُو ذرا دیکھتی رہ اسے مجھے پریشانی ہو رہی ہے۔'' اماں نے کہا۔ ناصرہ نے تسلی دی۔ ''ہاں میں ہوں یہاں تم جاؤ۔''

اماں چلی گئیں ناصرہ کچھ دیر وہاں کھڑی رہی آج اسے بھی تیز نیند آ رہی تھی لہٰذا دس منٹ بعد وہ بھی جمائیاں لیتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔



''میرے ماما آئے تھے لاہور سے مامی بھی تھیں۔ انہوں نے میرے لیے کوئی رشتہ دیکھا ہے اسی سلسلے میں اماں ابا سے بات کرنے آئے تھے۔''

نسرین کے جملے رہ رہ کر شاہد کے دماغ پر بم کی طرح گر رہے تھے اسے ایک پل بھی قرار نہیں آ رہا تھا کوئی ایسی صورت سجھائی نہیں دے رہی تھی کہ جس پر عمل کرکے وہ نسرین کو حاصل کرسکے۔ اس پر ایک جنونی کیفیت طاری ہوگئی تھی وہ سرنگ میں گھس گیا تھا اور اس وقت سرنگ کے آخری سرے پر آ پہنچا تھا۔ اس نے ایمرجنسی لائٹ منہ میں دبائی ہوئی تھی وہ ہاتھ میں پکڑی ہوئی کھرپی سے اردگرد کی سیلن زدہ دیواریں کھود رہا تھا اس کے ہاتھ برق رفتاری سے چل رہے تھے اس کے اندازے

سے لگتا تھا کہ آج وہ خزانہ حاصل کر کے ہی رہے گا‘ جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جس سے پسینے کی دھاریں نہ بہہ رہی ہوں مگر اسے اس بات کا احساس تک نہ تھا۔ اس کے جنون کے ساتھ ساتھ جھنجلاہٹ میں بھی اضافہ ہوتا جارہا تھا‘ ایسے میں اسے ایسا لگا جیسے اوپر سے اسے کسی نے آواز دی ہو‘ آواز ایسی تھی کہ وہم کا گمان ہوا تھا۔ شاہد نے جواب دینے کے بجائے اپنے کام پر توجہ رکھنے کو ترجیح دی۔

شاہد نے پوری قوت کے ساتھ سرنگ کو مزید کھودنا شروع کردیا تھا‘ بہت سا وقت گزر گیا اس کو احساس نہ ہوا تھا کہ وہ کب سے سرنگ میں موجود ہے‘ اس سے پہلے وہ کبھی اتنی دیر تک اندر نہیں رہا تھا۔ ہر تھوڑی دیر بعد وہ باہر کا رخ کرتا تھا اور تازہ دم ہوکر دوبارہ اندر آتا تھا۔

اچانک کھرپی کسی عجیب سی چیز سے ٹکرائی‘ جس کی وجہ سے آواز پیدا ہوئی شاہد چونک اٹھا اس نے لائٹ کا رخ پوری طرح سے اس جانب کیا تب اسے کسی دھات کی جھلک دکھائی دی جس کا چھوٹا سا حصہ دکھائی دے رہا تھا۔

”یہ...... یہ کیا ہے؟“ شاہد کے دماغ میں سوال گونجا۔ اس نے دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے کھرپی کی مدد سے اس دھات کے اردگرد کھودنا شروع کردیا‘ رفتہ رفتہ وہ شے واضح ہوتی چلی گئی۔ وہ بظاہر ایک چھوٹا سا دھاتی بکس دکھائی دے رہا تھا‘ شاہد کا دل بلیوں اچھلنے لگا تھا‘ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس بکس میں خزانہ بند ہے جس کی اسے تلاش تھی اور جس کے بارے میں پیر بابا نے بتایا تھا‘ شاہد کے ہاتھ خرگوش کی تیزی سے چل رہے تھے اچانک ایمر جنسی لائٹ آف ہوگئی‘ وہاں قبر سے زیادہ گہرا اندھیرا چھا گیا۔

شاہد نے ہاتھ روک کر لائٹ کو منہ سے نکالا اور اسے دھیرے دھیرے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مارنے لگا تب ایک دم لائٹ روشن ہوگئی۔

روشنی میں شاہد نے اپنی زندگی کا سب سے بھیانک منظر دیکھا۔ بکس اب تقریباً ستر فیصد ظاہر ہوگیا تھا اور اس کا ڈھکن کھلنے لگا تھا‘ جسے وہ کسی خود کار میکنزم کے تحت کھول رہا ہو۔ تب شاہد نے بکس میں سونے کے سکے دیکھے‘ لائٹ کی روشنی ان پر پڑ کر منعکس ہوری تھی اور سرنگ میں سونے کی پیلی روشنی پھیل گئی‘ شاہد پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ ساکت و جامد رہ گیا تھا‘ پر سونے کے سکے کھنکنے لگے اور ان کے درمیان سے ایک انسانی چہرہ نکلنے لگا۔ وہی انسانی چہرہ جس پر کھال نہیں تھی اور صرف گوشت چپکا ہوا تھا‘ وہ بکس میں سے نکلتا چلا جارہا تھا شاہد پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان چیخنا چاہا مگر آواز گھٹ کر رہ گئی۔ اس بار اس چہرے کے پیچھے دھڑ کے بجائے سانپ کا دھڑ تھا۔ وہ بکس میں سے نکل کر شاہد کے جسم کے گرد بل ڈال رہا تھا‘ شاہد اپنی جگہ سے حرکت کرنے سے معذور ہو چکا تھا‘ بل ڈالتے ڈالتے آخر اس انسانی سانپ کا انسانی چہرہ شاہد کے چہرے کے مقابل آکر رک گیا۔

شاہد کے ہاتھوں سے ایمر جنسی لائٹ نکل کر بکس میں پڑے ہوئے سکوں پر گر گئی تھی پھر سانپ کے دھڑ نے اپنا حلقہ تنگ کرنا شروع کردیا وہ اب شاہد کو بھینچ رہا تھا‘ خوف نے اسے ہلنے اور چیخنے سے معذور کردیا تھا۔ اب اسے اپنی ہڈیاں اور پسلیاں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوری تھی پھر اس جگہ زلزلہ سا آگیا‘ سرنگ کی دیواروں پر سے مٹی جھڑنا

شروع ہوگئی۔

موت کا خوف اتنا بڑھ گیا کہ شاہد کے جسم میں اپنی زندگی بچانے کا آخری خیال آ گیا' ایک آخری جدوجہد' آخری مزاحمت وہ پوری قوت صرف کرکے اوپر کی جانب اٹھنے لگا' اوپر سے مٹی کے بڑے بڑے ٹکڑے گر رہے تھے جب کہ جسم بھینچنے کی وجہ سے اس کا دم گھٹ رہا تھا' تب ایک ساتھ بہت ساری مٹی نے شاہد کو سرنگ میں دفنا کرکے رکھ دیا' اس کے منہ سے آخری چیخ بھی نہیں نکل سکی۔

❁ ❁ ❁

پورے علاقے میں ایک سنسنی پھیلی ہوئی تھی ہر کسی کی زبان پر شاہد کا تذکرہ تھا' ریسکیو کی ٹیم شاہد کے گھر آ چکی تھی۔ گلی میں لوگوں کا اژدھام موجود تھا' دوسرے علاقوں سے بھی لوگ آ کر وہاں جمع ہوگئے تھے پولیس بھی موجود تھی۔ ساتھ ہی مختلف چینلز کے نمائندے بھی آ چکے تھے اور لائیو کوریج میں مشغول تھے' آناً فاناً ٹی وی چینلز کے ذریعے یہ خبر پورے ملک میں پھیل چکی تھی کہ ملتان کا ایک نوجوان اپنے گھر میں سرنگ کھود کر خزانہ تلاش کررہا تھا' اسے کسی پیر بابا نے بتایا تھا کہ اس کے گھر میں خزانہ فن ہے۔

ریسکیو کے لوگ سرنگ کے دہانے پر اندر جانے کے انتظامات کررہے تھی۔ شاہد کے گھر والوں کا روتے روتے بُرا حال ہوگیا تھا۔ ناصرہ اور اس کی ماں پچھاڑیں کھا رہی تھی' باپ سکتے کے عالم میں تھا اس کے بڑھاپے کا سہارا لالچ کی نذر ہوگیا تھا۔

کئی گھنٹوں تک شاہد کی تلاش جاری رہی' مگر اس وقت امیدیں دم توڑ گئیں جب شاہد کو مردہ حالت میں سرنگ سے بمشکل نکال لیا گیا۔ اسے مرتے ہوئے کافی وقت گزر گیا تھا' خیال یہی ظاہر کیا گیا کہ وہ سرنگ میں دبنے اور دم گھٹنے کی وجہ سے مرا ہے مگر اصل بات کیا تھی یہ کسی کو نہیں پتا کہ آخر شاہد کے ساتھ ہوا کیا تھا۔

شاہد کی ماں کا سب سے بُرا حال تھا' چینلز والوں نے اس سے اس واقعے کی تفصیلات معلوم کرنا چاہی تو اس نے بُری طرح روتے ہوئے بتایا تھا۔

''وہ خزانہ ڈھونڈ رہا تھا' ہماری آنکھوں پر بھی لالچ کی چربی چڑھ گئی تھی' ہم نے اسے نہیں روکا' خزانہ تلاش کرتے کرتے ہم نے اپنا خزانہ کھودیا۔''

شاہد کا قصہ تو ختم ہوگیا مگر بہت سے لوگوں کے لیے مثل عبرت بن گیا تھا' پیر بابا کے بارے میں سننے میں آیا کہ وہ اپنا بوریا بستر گول کرکے فرار ہوگیا تھا' وہ اپنا ٹھکانہ کسی اور جگہ بنا کر پھر کسی شاہد کو چند ہزار روپوں کی خاطر خزانے کی تلاش پر لگادے گا' یہ سلسلہ جاری ہے اور نا جانے کب تک جاری رہے گا۔ شاہد کے ساتھ سرنگ میں کیا پُراسرار واقعہ پیش آیا تھا اس کے بارے میں کسی کو خبر نہیں ہوسکی تھی اور یہ راز اس کے ساتھ ہی دفن ہوگیا تھا۔

❁

بھیانک راستہ

احمد سجاد بابر

انسان کی زندگی میں کچھ واقعات ایسے بھی رونما ہوتے ہیں جس کی کوئی عقلی توجیہہ نہیں ہوتی لیکن اس سے انکار بھی ممکن نہیں ہوتا۔
پنجاب کے ایک نواحی علاقہ میں ایک مغرور نوجوان کو پیش آنے والا عجیب و غریب واقعہ۔
وہ واقعی فقیر تھا یا کوئی اور مخلوق......

''لیٹ ہوگیا کافی، ابا نے تو بوہے کو کنڈی بھی لا لی ہوگی۔''

فرید نے لاہور کے پاور ٹائم سے چوک پر اترتے ہوئے سوچا۔ سردیوں کی اترتی رات تھی، دھند کے مرغولے جیسے درختوں سے پھوٹ رہے تھے، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا، چوک سائیں سائیں کررہا تھا۔

''لگتا ہے رکشے والے بھی گھروں کو بھاگ گئے آج تو، جدوں آئی مرزے دی واری تے ٹٹ گئی تڑاک کرکے۔'' فرید بڑبڑایا، اس کی نگاہیں کسی سواری کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔

''چاچا خیر دین بھی شاید ٹیشن سے ٹانگا لے کر گھر ٹر گیا ہے، چلو بھئی فریدے لگتا ہے پیدل ہی جانا پئے گا اج تاں۔'' فرید نے شلوار کو کھینچ کر نیفے میں اُڑس کر اوپر کیا اور چل پڑا۔

فرید ایک قریبی گاؤں کرماں والی کا رہائشی تھا، ویسے تو گاؤں تک کولتار کی پکی سڑک بھی بنی ہوئی تھی جس پر دن بھر چنگ چی رکشے اور تانگے چلا کرتے تھے جو نزدیکی شہر اور لاہور چوک سے سواریاں اٹھایا کرتے تھے مگر مغرب کے بعد گاؤں کے باشندے اپنے کام سمیٹ کر سونے کی تیاریوں میں لگ جاتے تھے، شام ہوتے ہی گاؤں کی گلیاں آدھی رات کا سماں پیش کرتی تھیں ایسے میں منظور سنار کے بیس سالہ بیٹے فرید کو بھلا کیا سواری ملنی تھی، اس نے گاؤں جانے کے لیے اسی کچے راستے کا انتخاب کیا جو گاؤں والے اس وقت آمدورفت کے لیے استعمال کیا کرتے تھے جب پکی سڑک نہیں بنی تھی لیکن سڑک بن جانے کے بعد لوگ شاذونادر ہی یہ راستہ استعمال کیا کرتے تھے۔

اس راستے کو ''کنڈیاں آلی سڑک'' کا نام دیا گیا تھا کیونکہ عدم استعمال کی وجہ سے اس پر جھاڑ جھنکار، گرے درخت اور خودرو جھاڑیوں کی بہتات تھی۔

''ہائے اوئے رحیمے، کھوتے دے پتّر، کہا بھی تھا کہ نکل لے، دیر ہورہی ہے، خود تو اس وقت گھر بیٹھا ہوگا، مجھے پھنسا دیا ادھی رات کو۔'' فرید نے اونچی آواز سے اپنے دوست رحیم بخش کو کوسا جس کی وجہ سے وہ لیٹ ہوا تھا، رحیم بخش اس کی ماسی کا بیٹا اور بچپن کا سنگی تھا، اس کا کہا وہ ٹالتا نہیں تھا۔

رحیم بخش کی ہی ضد تھی کہ بابا فرید کے دربار پر پاکپتن دیگ لگا کے آنی ہے، منت بول رکھی تھی اس نے مجبوراً فرید کو بھی ہامی بھرنا پڑی، رحیم بخش کی وجہ سے ہی منظور سنار نے بیٹے کو اجازت دے دی مگر ساتھ ہی مغرب سے پہلے لوٹ آنے کی شرط رکھ دی، مغرب تو جانے کب کی ہوئی، اس وقت تو آدھی رات ہوچلی تھی۔

''رحیمے کے ساتھ کہروڑ پکا ہی اتر جاتا تو بہتر تھا، رات تو سکون سے رہتا، ابا بھی یہی سوچ رہا ہوگا کہ میں رحیمے کے پاس ہی رک گیا ہوں۔''

فرید کو رحیمے کا اصرار یاد آنے لگا، اس کے بار بار اپنے ساتھ اترنے کے اصرار پر فرید کا ایک ہی جواب تھا کہ کوئی سواری ضرور مل جائے گی اور مل بھی جاتی لیکن موسم کی پہلی دھند کے باعث اس وقت کوئی سواری نظر نہیں آرہی تھی۔

فرید سوچوں کے انبار تلے دبا پکی سڑک پر چلا جارہا تھا، تھوڑی دیر بعد اس نے پکی سڑک چھوڑ کر کچی پر اترنا تھا جو اس کے گاؤں کا متروکہ راستہ تھا۔

''اوئے فریدے، کیوں زنانیوں کی طرح گڑ گڑ کررہا

ہے، جو ہوگا دیکھا جائے گا، چل رب دا ناں لے، اللہ سوہنا بہتر کرے گا۔" فرید نے سر جھٹکا اور کچے راستے پر قدم رکھ دیا۔

سردی کی لہریں برچھیوں کی طرح اس کی ہڈیوں میں اتر رہی تھیں، اس نے اچھی طرح چادر کی بُکل ماری، ٹاہلی کی ایک موٹی سی شاخ اس نے حفاظت کے لیے ہاتھ میں اٹھا لی تھی۔ اس کے ذہن میں عجیب عجیب خیال اور قصے کہانیاں آ رہے تھے، یہ سچ ہے کہ خوف ہمارے اندر کہیں کنڈلی مارے بیٹھا ہوتا ہے، یہ باہر سے سرایت نہیں کرتا بلکہ اندر سے ہی پھوٹتا ہے، یہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح گھیرا ڈالتا ہے پھر چپ چاپ بیٹھ کر انتظار کرتا ہے کہ کب شکار کمزور پڑے تو یہ اس کی طرف لپکے، کب شکار کی آنکھیں بند ہوں تو یہ اس کی تکا بوٹی کر ڈالے، تو خوف کو ہم خود راستہ دیتے ہیں۔ اس وقت فرید کی بھی یہی کیفیت تھی، اس کے اندر پہلا کمزور خیال سر سرایا تو پھر کمزور خیالات کا تار بندھ گیا۔

"سوں رب دی فریدے، کنڈیاں آلی سڑکی پر ادھی رات بعد چڑیل بیٹھی ہوتی ہے، میں نے اکھاں نال ویکھا ہے اور ادھی رات کو کنڈیاں آلی سڑکی پر ڈھول بجتے ہیں، بھوتوں اور سر کٹوں کی باراتیں رات کو نکلتی ہیں نا...... ایمان نال۔" ہر بات میں ایمان کی گواہی دینا اس کی عادت بن چکی تھی۔

فرید کو کوڑے مصلی کے لڑکے کی بات یاد آئی جسے ہر محفل میں مرکز نگاہ بننے کے لیے ایسی باتیں کرنے کی عادت تھی، اس وقت ہڈیوں میں گھستی سردی، ہُو کا عالم اور دھند کے مرغولوں میں اس کی وہی بات فرید کو سب سے بڑا سچ لگ رہی تھی۔

"مروادتا مینوں رحیمے۔"

فرید ایک بار پھر کراہا، اس نے ٹاہلی کے ڈنڈے پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔

اچانک فرید کو یاد آیا کہ ابھی راستے میں گاؤں کے بڑے قبرستان نے بھی آنا ہے، اس نے خوف سے جھرجھری لی، جانے قبرستان اسے یاد کیوں نہیں رہا تھا، قبرستان کے پاس سے تو وہ دن میں بھی نہیں جاتے تھے، کجا یہ کہ سردیوں کی تنہا و ویران آدھی رات کا وقت۔

فرید کو لگا اس کے پیچھے قدموں کی آواز آئی ہے، وہ تڑپ کر پیچھے پلٹا اور ڈنڈا بلند کیا مگر پیچھے کچھ بھی نہ تھا، فرید پسینے سے شرابور ہو رہا تھا، ایک گھنٹے کا راستہ صدیوں پر محیط لگ رہا تھا۔

فرید ایک درخت کے تنے کے پیچھے چھپ گیا، اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا، اندر تک لرزہ طاری تھا، اس نے چاروں طرف غور کیا۔

"کچھ وی نہیں ہے فریدے، ہمت کر، شیر بن شیر۔"

فرید نے خود کو ہمت دلائی، اس کے اندر ایک نیا ولولہ پیدا ہوا، وہ پھر سے چل پڑا۔

اچانک فرید کو آج مزار پر پیش آنے والا واقعہ یاد آ گیا، اس کی خود ساختہ جرات کی دیوار بھربھری مٹی کی طرح زمیں بوس ہو گئی۔



مزار کے باہر بھیڑ میں تیزی سے راستہ بناتے ہوئے اچانک فرید کو لگا کہ جیسے اس کی قمیض کے پلو کو کسی نے زور سے کھینچا ہو، آگے کی طرف زور لگاتے فرید کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور وہ گرتے گرتے بچا، اس نے آگ بگولا ہو کر پیچھے دیکھا تو وہ ایک تنومند ملنگ تھا جس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، اس نے ایک سبز رنگ کا چغہ نما لباس پہنا ہوا تھا، اسی نے فرید کا دامن پکڑ کر جھٹکا دیا تھا، قمیض ابھی تک اس کے ہاتھ میں ہی تھی۔

"دے جا سخی لے جا سخی، دے جا سخی، لے جا سخی۔" ملنگ نے سر جھٹک کر لہک لہک کر گردان کی۔

"دفع ہو پرے، وڈا آیا تو ولی، قمیض چھڈ میری۔" فرید جو ویسے ہی اس تمام سفر سے چڑ کھایا ہوا تھا اس نے ملنگ کا ہاتھ جھٹکا، اتنے میں رحیم بخش بھی آگے سے واپس پلٹ چکا تھا۔

"نا یار! یہ مزار کے بابا لوک ہیں، کبوتر ہیں درگاہوں کے، آج یہاں ہیں کل جانے کہاں ہوں۔ جانے کس کی دعا یا بد دعا پینڈا پکڑ لے، اینج نئی کرتے میرے بھرا، چل معافی منگ بابا جی کول۔"

رحیم بخش نے فرید کا ہاتھ تھام کر لجاجت سے کہا، اس کی کیفیت اس وقت ایسے ہو رہی تھی جیسے فرید نے جانے کیا جرم کر دیا ہے۔

"تیرا وقت آ گیا ہے بچے، تیرا بخت کھو گیا ہے بچے، تو آوے گا، تو آوے گا۔"

ملنگ جو رحیم بخش کی پتلی حالت تاڑ چکا تھا، نے لہک لہک کر گانے کے انداز میں کہنا شروع کر دیا۔

"بابا مافی دے دیو، پہلی واری آیا ہے نا، ادب آداب دا پتہ نہیں ہے ایہنوں۔" رحیم بخش گھگھیایا۔

"لال شہباز قلندر آوے گا ضرور آوے گا۔" اس بار ایک دوسرے گدڑی پوش ملنگ نے تان اٹھائی۔ اچھا خاصا مجمع لگ چکا تھا، لوگوں کے چہروں پر خوف اور عقیدت کا ملا جلا تاثر تھا۔

"مافی منگ لیو بابے کولوں ورنہ گھر زندہ بچ تے نا ویسو۔"

ایک چغہ پوش سفید ریش بابے نے کہا جس نے ایک موٹا سا ڈنڈا تھاما ہوا تھا جس پر کپڑے کی رنگین کترنیں بندھی تھیں، ایسے بابے مزار کے گرداگرد کثرت سے پائے جاتے تھے۔

رحیم بخش نے ایک ملنگ کی جھولی میں سو کا نوٹ ڈالا اور فرید کو آگے پکڑ کر گھسیٹا، ملنگ نے سو کا نوٹ فی الفور کہیں غائب کر دیا۔

"چل جھلیا، کیوں وقت کھوٹا کرتا ہے، اتھے نراض نہ کر کسی نوں بھراوا۔"

رحیم بخش نے خوف بھرے لہجے میں کہا۔

"تو آوے گا، تو آوے گا۔"

ملنگ کی دبنگ آواز ابھی تک ان کا پیچھا کر رہی تھی۔

فرید جو اس سارے واقعہ کی وجہ سے جھنجلایا ہوا تھا، سخت بیزاری کا شکار تھا۔

"رحیمے تو جس کام کے لیے آیا ہے، وہ کر اور چل یہاں سے جلدی۔"

فرید کافی دیر سے اسی ایک جملے کی تکرار کیے جا رہا تھا۔

"فریدے و یکھ، جس کام واسطے ہم آئے ہیں نا اُس میں ٹیم تو لگے گا، کوئی ہتھ لان تے نہیں آئے یار، ہم اتنا پند کر کے۔"

اس دفعہ رحیم نے فرید کو ڈانٹا اور فرید نے خلافِ توقع کوئی جواب نہیں دیا مگر اس کے اندر اضطراب جمع ہوتا جا رہا تھا، یہ سب کچھ اس کی طبیعت کے خلاف تھا۔

بھیڑ سے راستہ بناتے ہوئے اس کا کندھا زور سے کسی کو لگا اور وہ گر گیا، یہ ایک ضعیف بزرگ تھے، ان کے ہاتھ میں موجود تھیلا چھوٹ کر ایک طرف جا گرا۔ ان کی عینک بھی جھٹکے سے گری اور ٹوٹ گئی، بزرگ شاید عینک کے بغیر دیکھ نہیں پا رہا تھا۔

"پتر، میری عینک پھڑا دیو، او پُت، میری عینک تے دے جاؤ۔"

بابا جی ادھر ادھر ہاتھ مار رہے تھے مگر کوئی بھی ان کے واسطے رُک نہیں رہا تھا، رحیم بہت آگے نکل چکا تھا۔

"سارے منگتے اتھے ہی جمع ہیں۔"

فرید نے سفر کی کوفت، ملنگوں کی دیدہ دلیری کا سارا غبار ایک ہی جملے میں سمو دیا، اس نے بابا جی کو اٹھانے کی زحمت بھی نہیں کی۔

بابا جی کے عینک کے لئے مچلتے ہاتھ ایک دم سے ساکت ہو گئے اور ان کی آنکھوں میں آنسو در آئے۔ فرید کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مسل دیا مگر وہ آگے بڑھ گیا۔



کنڈیاں آلی سڑک پر سردیوں کی اس یخ بستہ خوفناک رات میں فرید کو سارا واقعہ ایسے یاد آ رہا تھا جیسے لحہ بھر پہلے ہوا ہو، اسے چاروں طرف ایک ہی آواز کی گونج سنائی دے رہی تھی

"تو آوے گا، تو آوے گا۔"

اس دبنگ آواز نے ہر آواز کو ڈھانپ لیا تھا، ہر منظر سے یہی آواز پھوٹ رہی تھی، ہر سمت عینک ٹٹولتے بوڑھے ہاتھ نظر آ رہے تھے۔

"ماف کر دے مینوں رب سوہنیا۔" فرید دل و جان کی شرمندگی سے گڑگڑایا۔

پسینہ فرید کے سارے جسم سے پھوٹ رہا تھا، وہ گرتا پڑتا چلتا جا رہا تھا، ہر دو قدم کے بعد وہ کسی آواز، کسی واہمے کے باعث ٹھٹک جاتا، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتا مگر ایک کریہہ خاموشی کے سوا کچھ بھی نہ تھا، وہ رات اور وہ راستہ جیسے بہت طویل ہو چلا تھا، کبھی اسے ہنسی کی آواز سنائی دیتی اور وہ اچھل پڑتا مگر کچھ بھی نظر نہ آنے پر پھر سے چل پڑتا

قبرستان بھی اب قریب آتا جارہا تھا، یہ آخری پُلِ صراط تھا جو فرید کو عبور کرنا مشکل نظر آرہا تھا، قبرستان سے وابستہ مافوق الفطرت کہانیاں اور ماورائی ہستیاں اس کے قدم جکڑ رہی تھیں، اس کا جسم اور دماغ دونوں ہی ہار مان چکے تھے، قدم من من کے ہو رہے تھے اور سوچیں منتشر تھیں، خوف اس کے روئیں روئیں کو لپیٹ میں لے چکا تھا، اس وقت اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ دو کلومیٹر کا فاصلہ تھا جو اس نے طے کرنا تھا۔

کنڈیاں آلی سڑک واقعی اس کے لیے کانٹوں بھرا راستہ بن چکی تھی جو خوف کی نوکیلی میخوں کی طرح اس کے بدن اور دل میں پیوست تھے، اس کی رگوں کو کھینچ رہے تھے۔

فرید نے چادر کس کے لپیٹ لی جیسے یہی چادر اس کا آخری سہارا ہے۔

''لیا مینوں لے جاؤ، اماں کتھے ہو تُسی۔''

فرید گڑگڑایا، اس کا جسم بخار کی حدت سے تپ رہا تھا، چلنا دوبھر ہو چکا تھا۔

قبرستان قریب آتا جارہا تھا۔ اچانک اس کے کانوں میں ڈھول کی ہلکی سی تھاپ کی آواز آئی، فرید پر لرزہ طاری ہو گیا، پہلے تو اس نے اس آواز کو واہمہ سمجھ کر نظر انداز کرنا چاہا مگر پھر کان لگا کر سننے پر اسے آواز واضح محسوس ہوئی جیسے بہت قریب سے آواز آئی ہو، تھوڑی دیر بعد اس پر انکشاف ہوا کہ آواز قبرستان کی پرلی سائیڈ سے آرہی ہے، ڈھول کی آواز میں اب گھنگھروؤں کی چھن چھن بھی شامل ہو چکی تھی، ساتھ میں آوازوں کی بھنبھناہٹ بھی تھی۔

فرید کو لگا وہ بے ہوش ہو کر گر جائے گا، اسے کوڑے مُصلی کے بیٹے کی بات یاد آنے لگی جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے مگر جو اس وقت سولہ آنے ٹھیک لگ رہی تھی۔

فرید کے قدم جیسے جکڑ سے گئے تھے، جیسے زمین نے اس کے بدن کی طاقت سلب کر لی تھی، وہ بت بنا وہیں کھڑا تھا، اس کا جسم بخار اور خوف کی حدت سے تھر تھر کانپ رہا تھا، ڈھول کی ڈھم ڈھم، گھنگھروں کی جھنکار اور قہقہوں کی آوازیں قریب آتی جارہی تھیں، ہر طرف رات کا سکوت طاری تھا مگر فرید کو وہ سکوتِ مرگ لگ رہا تھا، اسے ملنگوں کے ساتھ کی گئی بے ادبی اور بوڑھے بابے کے ساتھ کیا گیا سلوک یاد آرہے تھے، ہر طرف جیسے ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔

''تو آوے گا، تو آوے گا۔''

پھر جیسے رنگ و نور کا سیلاب امڈ آیا، قبرستان کے ساتھ ملحقہ ایک چھوٹی سی سڑک سے وہ قافلہ نمودار ہوا۔

ڈھول بردار، تاشے، شہنائی، نفیری تھامے ہوئے مجہول سے انسان لکڑی کے گھوڑے میں داخل ہو کر اس کو اٹھا کر رقص کرتا بوڑھا زرق برق لباس پہنے، چہرے پر سستے سے میک اپ کی تہیں چڑھائے بے ہنگم ناچتے ہوئے خواجہ سرا اُن کے عقب میں قہقہے لگاتا ایک جمِ غفیر۔

فرید کو لگا کہ چڑیلوں کی بارات آج رات اسی کے خون اور گوشت سے ضیافت کرے گی، جانے اس کے لرزیدہ بدن میں اتنی طاقت کہاں سے آئی کہ اس کے منہ سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی اور وہ پاگل اونٹ کی طرح سرپٹ بھاگ کھڑا ہوا، کئی بار گرا مگر کھڑا ہو کر دوبارہ دوڑ لگا دی، اس کے منہ سے لایعنی جملے اور گھگھیائی ہوئی آوازیں نکل رہی تھیں۔

بارات کا قافلہ اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا، ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔



کرماں والی کے باسیوں کو آج تک یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ منظور سنارے کا پُتر اپنے گھر کے دروازے پر بے ہوش کیوں پڑا تھا، اس کا جسم بخار میں کیوں تپ رہا تھا، وہ کرماں والی سے باہر جھگی والوں کی بارات سے ڈر کر کیوں بھاگا تھا اور اس کے منہ سے تین دن تک بے ہوشی میں صرف ایک ہی جملہ کیوں نکل رہا تھا۔

''تو آوے گا، تو آوے گا۔''



خونی بیوی

مجید احمد جائی

اس کائنات میں انسانوں سے قبل جنات آباد تھے یہ بھی مختلف قبائل مذاہب میں تقسیم تھے پھر جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر دنیا میں بھیجا تو جنات کی آبادیاں سمٹتے سمٹتے سمندروں اور ویرانوں تک محدود ہوگئیں پھر بھی کہیں کہیں انسان اور جنات کا ٹکراؤ ہوجاتا ہے۔
ایک ایسے شخص کا قصہ عجیب اس نے ایک جن خاتون سے شادی کرلی تھی۔

آج کے اس دور میں لوگ جنات پر یقین نہیں رکھتے مگر! یہ سچ ہے جہاں انسان بستے ہیں وہیں پر جنات کے بسیرے بھی ہوتے ہیں۔ یہ آگ سے پیدا ہوئی خلائی مخلوق کہلاتی ہے۔ جو عام طور پر نظر نہیں آتی۔ ان کے ٹھکانے ویران کھنڈرات، پرانے قبرستان ہوتے ہیں۔ مجھے بھی جنات پر یقین نہیں تھا مگر ایک دن میرے دوست کے ساتھ عجیب واقعہ ہوا تب سے میں نے تسلیم کر لیا کہ اشرف المخلوقات کی طرح جنات کی بھی دنیا آباد ہے۔ انسانوں کی طرح یہ بھی شادیاں کرتے ہیں۔ ان کے بھی خاندان ہوتے ہیں۔ جس طرح اچھے برے انسان ہوتے ہیں اسی طرح یہ بھی اچھے بھی ہوتے ہیں اور انتہائی کمینے بھی۔

سردیوں کے دن تھے۔ ہر بشر مغرب کی نماز پڑھتے ہی اپنے اپنے لحافوں میں گھس جاتے تھے۔ جمال اس وقت ڈیوٹی پہ جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ رات کی ڈیوٹی تھی۔ گھر سے تقریباً بیس کلومیٹر کا سفر تھا۔ نہر کنارے، ویران، سنسان راستہ، دن دیہاڑے بھی جہاں سے گزرتے ہوئے خوف آتا تھا۔ راستے میں ایک پرانا قبرستان پڑتا تھا۔ جب جمال ڈیوٹی پر جاتا، دور دور سے گیدڑوں کے چیخنے کی آوازیں ماحول میں ارتعاش پھیلا رہی ہوتی تھیں۔ کہیں کہیں آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ایک دن حسب معمول جمال ڈیوٹی پر گیا۔ اس دن کام تھوڑا تھا جو جلد ہی ختم ہو گیا۔ جمال کو گھر جانے کی سوجھی کیونکہ آفس میں سونے کے لیے کوئی انتظام نہیں تھا۔ جمال بائیک لیے آفس سے نکل پڑا۔ گھپ اندھیرا رات کو اپنی چادر میں لپیٹ چکا تھا۔ اوپر سے غضب کی سردی۔ ہاتھ تو کیا پورا جسم سردی سے سن ہو رہا تھا۔ موٹر سائیکل پر ویسے بھی ہوا لگتی ہے۔ جمال سردی سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ابھی آدھا سفر باقی تھا نہر کنارے گھپ اندھیرا تھا تھوڑا دور پرانا قبرستان آتا تھا جمال کا خوف سے برا حال تھا۔ اب پچھتا رہا تھا کاش! آفس سے نہ نکلتا۔ سہمے سہمے اپنے خیالوں میں گم محو سفر تھا کہ اچانک شور برپا ہوا۔ جیسے کوئی ہنگامہ ہو۔ کسی کی ''چیخ'' آرہی ہو۔ مگر اس وقت گپ اندھیرے میں جبکہ اردگرد کوئی بشر نظر نہیں آتا تھا۔ جمال کے خوف سے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ سخت سردی میں بھی پسینے سے شرابور تھا۔ اچانک بائیک کے آگے کوئی چیز نمودار ہوئی۔ جمال نے بائیک روکی ہی تھی پھر اسے ہوش ہی نہ رہا۔ ایک دن جمال نے مجھے یوں بتایا کہ

''جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو عالیشان محل میں پایا۔ خوشبوؤں سے معطر ایسا عالیشان محل میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ابھی چاروں طرف کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ دروازہ کھلا۔ ایک قوی ہیکل لڑکی اندر داخل ہوئی۔ ڈورانی شکل، لمبے لمبے ناخن، ہاتھوں پہ بال ہی بال تھے۔ کم از کم انسان تو ایسے نہیں ہوتے۔ میں سوچ ہی رہا تھا۔ میں کہاں آگیا ہوں؟ میرے چہرے کے تاثر دیکھ کر وہ لڑکی مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''ابن آدم کیسے ہو؟''

''آ.....آ.....آپ کون؟'' بمشکل میرے حلق سے آواز نکلی۔

''گھبراؤ نہیں۔ میں تمھیں کچھ نہیں کہوں گی۔ تم ہی تو میری جان ہو۔ تم مجھے بہت پسند ہو۔ میں تم پہ قربان ہوں۔ مجھ سے شادی کرو گے؟''

''تم ہو کون؟'' میں نے پوچھا۔

''میں جنات سے ہوں۔ میں نے تمھیں اُس رات دیکھا جب میں اپنے رشتے دار کی شادی میں بارات کے ہمراہ جارہی تھی۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں تمھیں اُس دُنیا سے اپنے محل میں لے آئی۔ تم اب یہاں سے کہیں نہیں جا سکتے؟ مجھ سے شادی کرو گے تو تمھاری ہر خواہش پوری کروں گی۔''

''لیکن مجھے تو آپ سے شادی نہیں کرنی، تم جنات میں سے ہو اور میں ابن آدم۔ میری اپنی دنیا ہے' میری اپنی قوم ہے۔ میں آپ سے شادی نہیں کرسکتا' ہرگز نہیں۔''

''آپ کو مجھ سے شادی کرنی ہی ہوگی۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تمھارا وجود آگ سے بنا ہے۔ میں ابن آدم ہوں میرا وجود مٹی سے بنا ہے۔ ہمارا ملاپ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''کیوں نہیں ہوسکتا؟ بس مجھے تم سے شادی کرنی ہے۔ میری ہی مرضی چلے گی۔ میری برادری، رشتے دار میری ہی بات مانتے ہیں۔''

مجھے اس نے ایک خوبصورت کمرے میں قید کررکھا تھا۔ اس کی مرضی کے بغیر میں کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ کئی دن یونہی گزر گئے۔ میں ہار گیا۔ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ مجبوراً مجھے شادی کرنی پڑی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس خوشی کے موقع پر شاندار جشن کا انعقاد کیا گیا۔ رات کے گہرے ہوتے ہی اس کی برادری جمع ہوگئی۔ انسانوں کی طرح ڈھول باجے والے آئے' گیت گائے گئے' ڈانس ہوا، رنگ رنگ کے کھانے تیار کیے گئے۔ خوب ہلہ گلہ تھا۔ آج تو مجھے کوئی بھی بدصورت نہیں لگ رہی تھی۔ حسین سے حسین لڑکیاں شریک تھیں۔ ایسا لگتا تھا سارا حسن یہاں اُمڈ آیا ہے۔ رات کے آخری وقت میں جشن ختم ہوا تو سبھی اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہ رات آخر گزر گئی۔ نئے سفر کا آغاز ہو چکا تھا' نئی زندگی کی شروعات ہوچکی تھی۔ میری بیوی حد سے زیادہ مجھ سے پیار کرتی تھی۔

مجھے اپنے ساتھ لیے مختلف علاقوں کی سیر کرواتی، جس چیز کی طلب ہوتی فوراً حاضر کردیتی۔ سب کچھ پاکر بھی میں خوش نہیں تھا۔ میں اپنی دُنیا میں جانا چاہتا تھا۔ مجھے امی جان بہت یاد آرہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے صدیاں گزر گئی ہوں۔ دل ہر چیز پاکر بھی خوش نہیں تھا۔ نجانے کیا چیز تھی جو اکسا رہی تھی۔ یہاں مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ پھر بھی میں نجات چاہتا تھا وہ بھی اپنی بیوی سے، اپنی شریک حیات سے، جو تن من سے اپنا مان چکی تھی۔

وقت کا پنچھی محو پرواز رہا۔ دن سالوں پر محیط ہوتے گئے۔ میرے اس سے دو بچے بھی ہوگئے۔ بالکل ماں کی طرح شکل وصورت، بیٹا دو سال کا اور بیٹی ایک سال کی تھی جب میری بیوی مجھے اپنے کسی عزیز کی شادی پر لے گئی۔ وہاں پر میری ملاقات ایک بزرگ جن سے ہوئی۔ جو بہت نیک تھا۔ اس بزرگ نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''آپ ابن آدم سے ہو ناں؟'' میں نے سر جھکا کر ہاں میں جواب دیا۔ علیک سلیک ہونے پر میں نے اپنی تمام کہانی اس کے گوش گزار کی۔ میں واپس اپنی دُنیا میں جانا چاہتا تھا۔

''باباجی! میں سب کچھ پاکر بھی خوش نہیں ہوں۔ آپ ہی مجھے نیک لگتے ہیں۔ کیا مجھے میری بیوی سے نجات دلا سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں بیٹا! کام مشکل ضرور ہے ناممکن نہیں ہے۔'' اس نے مجھے چھوٹا سا رومال دیا اور کہا۔

''جب بھی مجھ سے ملنے کی طلب ہوں۔ اس رومال کو سونگھ لینا میں حاضر ہو جاؤں گا، یہ جادو والا رومال ہے۔ اپنی بیوی کو خبر نہ ہونے دینا، ورنہ قیامت برپا کردے گی۔''

یوں میری اس نیک جن سے دوستی ہوگئی۔ میں جب

بھی اداس ہوتا، رومال کو سونگھ لیتا۔ رومال کا سونگھنا ہوتا تھا کہ نیک جن حاضر ہو جاتا پھر ہم ڈھیروں باتیں کرتے۔ نیک جن اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہتا تھا۔ کئی دفعہ مجھے اپنے ساتھ بھی لے گیا۔ پل بھر میں دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں پہنچ جاتے تھے۔ نیک جن نے کئی حج کر لیے تھے۔ مجھے اولیائے اللہ کی محفلوں میں لے جاتا۔ میں اس کی صحبت میں رہ کر خوش تھا۔ اداسی ختم ہوگئی تھی پھر ایک دن نیک جن نے مجھے کہا۔

"جمال! تیار رہنا آج آپ کو آپ کی دنیا میں چھوڑ آنا ہے۔"

پہلے تو ہم چند گھنٹوں کے لیے ملتے تھے پھر میں اپنے بیوی بچوں میں آجاتا تھا۔ اس طرح میری بیوی کو کوئی شکایت نہیں تھی۔

میں حسب وعدہ تیار تھا۔ نیک جن نے مجھے واپس اپنی دُنیا میں پہنچا دیا۔ وہی رات کا منظر تھا۔ میری بائیک نہر کے کنارے کھڑی تھی۔ میں حیران تھا کہ اس کا انجن ابھی تک گرم تھا۔ میں بائیک لیے کام پر چلا گیا۔ سب کچھ نارمل تھا جیسے کچھ ہوا نہیں ہے۔ میرے ساتھ کیا ہوا، کیا نہیں ہوا؟ مجھے ہی پتا تھا۔ میرے علاوہ کسی کو کچھ بھی خبر نہیں تھی۔

میری بیوی کو خبر ہوئی تو انتقام پر اُتر آئی۔ مجھے اذیت دینے پر تل گئی۔ کبھی بائیک کو نقصان پہنچا دیتی، کبھی میرے گھر میں توڑ پھوڑ کر دیتی۔ مجھے بار بار دھمکی دے رہی تھی کہ میرے پاس چلے آؤ اسی میں تمھاری بھلائی ہے ورنہ میں تمھیں ختم کر دوں گی۔ میری بیوی وحشی ہوگئی تھی۔ روز نئے حربوں سے مجھے تنگ کرتی تھی۔ کبھی میری بائیک کا نقصان کر دیتی، کبھی آفس میں باس سے ڈانٹ کھلانے میں اس کا ہاتھ ہوتا۔ میں ٹھیک ٹھاک کام کر رہا ہوتا اچانک کام خراب ہو جاتا۔ میرے آفیسر میری تمام اسٹاف کے سامنے بے عزتی کرتے۔ یہ تمام میری بیوی کر رہی تھی۔ میں اس کے روز روز کے نقصان سے تنگ تھا۔

میری کھوپڑی نے کام کیا۔ مجھے نیک جن نے جو رومال دیا تھا، وہ گھر اپنی الماری میں رکھ دیا تھا۔ اس کی یاد آتے ہی میں الماری کی طرف بھاگا۔ الماری کھولی تو رومال غائب تھا۔ مجھے تشویش ہوئی، رومال کہاں جا سکتا ہے؟ میں حیران و پریشان وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے مجھے اونگھ آگئی۔ نیند میں نیک جن سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے میرے کندھے تھپکائے اور تسلی دی۔

"جمال میں نے تمھیں رومال دیا تھا مگر تم اس کی حفاظت نہیں کر سکے۔ وہ رومال تمھاری بیوی نے اٹھالیا ہے' اسے خبر ہو چکی ہے کہ میں تمھاری مدد کر رہا ہوں۔ ایک دن اس کی میری ساتھ خوب لڑائی بھی ہوئی ہے۔ وہ چیختی، چلاتی چلی گئی تھی۔ اس کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں' وہ کسی بھی لمحے کچھ بھی کر سکتی ہے۔ تم جتنی جلدی ہو سکے کسی عامل کے پاس جا کر تعویذ لو۔ بیوی کو قابو کرنے کا چلہ کاٹو' ورنہ تمھارے ساتھ، تمھارے گھر والوں کو بھی ختم کر دے گی۔ وہ بڑی ظالم ہے' اسے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

نیک جن کافی دیر میرے پاس بیٹھا رہا پھر مجھ سے اجازت لی اور اپنی دنیا کو لوٹ گیا۔ اب مجھے عامل ڈھونڈنا تھا۔ میں نے اپنی ساری کہانی امی جان کو سنادی۔ میرے بارے میں جان گرامی حیران و ششدر رہ گئیں۔ پھر ہم نے بہت سے عاملوں سے رابطہ کیا۔ آخر کار ہم شہر کے مشہور عامل کے پاس پہنچ ہی گئے۔ عامل نے چند سوالات کیے اور منتر پڑھنے لگا۔ ہم اس کے سامنے بیٹھے سارا منظر دیکھتے رہے۔ عامل نے اپنے تمام منتر پڑھ ڈالے مگر وہ قابو میں نہ آئی۔ میری بیوی وحشی درندے کی طرح آگ بگولہ ہوگئی۔ میری بیوی کو قابو کرنا اس عامل کے بس کا کام نہیں تھا۔ ہوا کیا۔ الٹا عامل صاحب ہاتھ جوڑ کر بھاگ گئے۔ میری بیوی نے عامل صاحب کی ٹانگیں توڑ دی۔ اس کی شکل ڈورانی ہوگئی تھی۔ کبھی وہ خوبصورتی کا مجسمہ نظر آتی تھی مگر اب چڑیل کے روپ میں سامنے تھی۔ شاید یہی اس کا اصلی چہرہ تھا۔ اس نے بڑے بڑے ناخنوں والے ہاتھ آگے بڑھائے اور دوسرے لمحے میں اس کی گرفت میں تھا۔ اس کے بازوؤں پر لمبے لمبے بال تھے جیسے میں ریچھ کے حصار میں ہوں۔ پھر کیا، مجھے وہاں

سے اٹھا لے گئی۔ میں التجائیں کرتا رہ گیا، مگر اس نے ایک نہیں سنی۔

"میں نے تمھیں روکا تھا کہ ایسا کچھ نہ کرنا جس سے مجھے نقصان پہنچے، مگر تم نے میری ایک نہیں مانی۔ اب دیکھتے جاؤ میں تمھارے ساتھ کیا کرتی ہوں۔ تمھارے ساتھ ساتھ تمھارے خاندان کو بھی ختم کردوں گی۔"

اس نے مجھے قید خانے میں قید کر دیا۔ میں قیدی پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتا رہ گیا۔ عجیب کشمکش تھی۔ کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ کیا کروں، کدھر جاؤں؟ رہائی کی کوئی تدبیر ذہن میں نہیں آرہی تھی۔ سوچوں کی یلغار تھی اور میں تھا۔

کئی دن یونہی گزر گئے۔ دل ہی دل میں اس نیک بزرگ جن کو یاد کر رہا تھا۔ کہتے ہیں ناں کچھ لمحے قبولیت کے ہوتے ہیں۔ ابھی میں اس بزرگ جن کو یاد کر ہی رہا تھا کہ وہ حاضر ہوگئے۔

سلام ودعا کے بعد حال احوال ہوئے۔ کہنے لگے۔

"معاف کرنا، میں اجتماع میں گیا ہوا تھا۔ آپ کے حالات کی خبر مجھے ہو چکی تھی مگر آ نہ سکا۔ تمھیں اچھے عامل کے پاس جانے کا کہا تھا اور تم نام نہاد عامل کے پاس جا پہنچے۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ تمھیں بھی قید کروایا اور خود بھی سزا پا بیٹھا۔ اب اس کا علاج مجھے کرنا ہی ہوگا۔ اسے خبر ہو چکی ہے کہ میں تمھارے پاس آیا ہوا ہوں۔ میں تمھیں ایک نسخہ دے رہا ہوں اگر تمھیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرے تو اسے ختم کر دینا۔ اپنے اردگرد دائرہ لگا لو اور اس کے حصار سے باہر نہیں نکلنا جب تک چلہ مکمل نہ ہو جائے۔ تمھیں قرآن مجید پڑھنا تو آتا ہے۔ یہ نسخہ لو اور جتنا کہا جائے اتنا پڑھنا ہے' کم نہ زیادہ۔ انشااللہ رہائی ملے گی۔"

بھلا ہو اس نیک جن کا جس نے میری مدد کی۔ اس نے مجھے وہاں سے آزاد کرایا اور میں گھر پہنچ گیا۔ میری رہائی اور ٹھیک ٹھاک گھر پہنچنے میں نیک جن کا کمال ہی تو ہے۔ وہ نہ ملتے تو میں کب کا مر کپ گیا ہوتا۔ میرے ساتھ میرے گھر والوں کا نجانے کیا حال ہوتا۔

میں بیوی کے قید خانے سے چھٹکارا پا کر گھر پہنچ چکا تھا اور اپنی زندگی جی رہا تھا اسی طرح کئی دن گزر گئے پھر ایک دن میری بیوی آگ بگولہ، وحشت زدہ چہرہ لئے میرے گھر آ گئی۔ وہ مجھے مارنا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا کام کرتی' میں نے اس نیک بزرگ جن کا بتایا ہوا عمل کرنا شروع کر دیا پھر دیکھتے ہی دیکھتے، میری بیوی آگ کی لپیٹ میں آ گئی۔ آہستہ آہستہ آگ اسے ختم کرنے لگی اور چند لمحوں میں میرے سامنے آگ نے اسے ختم کر دیا۔ آگ سے پیدا ہوئی تھی آگ میں جل کر راکھ بن گئی۔

جانتے ہو وہ نسخہ کیا تھا۔ نہیں ناں؟ چلو آج میں تمھیں بھی وہ نسخہ دے دیتا ہوں۔ کیونکہ "کر بھلا ہو بھلا" اس نیک بزرگ جن نے سورۃ العمران کی آیت دی۔ ہاں مجھے آیت الکرسی کا نسخہ دیا تھا۔ میں نے آیت الکرسی پڑھ کر ہی اپنی بیوی پر پھونک ماری تھی، جس سے وہ جل کر ختم ہوگئی۔ اس دن سے آج تک میں نے آیت الکرسی پڑھنا نہیں چھوڑی۔ گھر میں ہوں یا کسی سواری پر سوار ہو رہا ہوں آیت الکرسی ضرور پڑھ لیتا ہوں۔ سونے سے پہلے آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لیتا ہوں اور اپنے گھر کو بھی آیت الکرسی کے حصار میں رکھتا ہوں۔ یوں رب کی ذات مجھے جنات سے محفوظ رکھتی ہے۔ میں آج تک اس نیک بزرگ جن کو دعائیں دیتا ہوں جس نے مجھے رہائی دلائی تھی۔ واقعی انسانوں کی طرح جنات میں بھی اچھے اور برے دونوں ہوتے ہیں۔ برے جن انسان اور اس کی اولاد کو نقصان پہنچاتے رہتے ہیں اور نیک جن ان کو ختم کرنے کے طریقے بتاتے ہیں۔ آپ کو یقین نہ آئے تو آیت الکرسی پڑھنا معمول بنا لیں پھر دیکھنا اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت کا نزول ہوگا اور رب تعالیٰ کی حفظ وامان میں بھی رہیں گے۔ (انشااللہ)



چیخت سناٹا

ساحل دعا بخاری

قرآن کریم کتاب ہدایت و حکمت ہے جس کی طاقت و شر کے سامنے دنیا بھر کی طاقتیں ہیچ نظر آتی ہیں اسے پڑھنے اور سمجھنے والے ہی اس کائنات میں اشرف المخلوق ہونے کا حق رکھتے ہیں۔
ایک طالب عالم کو پیش آنے والے عجیب و غریب واقعے کی روداد اس کی ملاقات اچانک جنات سے ہوگئی تھی۔

زندگی ایک عجیب ہی شے‘ سمجھ میں نہ آنے والی‘ ہم لاکھ بےزار ہوں اس سے زیادہ یہ ذرّہ بھر متاثر نہیں ہوتی۔ لاکھ ایڑھیاں رگڑیں مگر یہ ہمارا ہاتھ مضبوطی سے جکڑے‘ مسلسل محوسفر رہتی ہے۔ خواہ ہم اس کے ساتھ چلنا گوارہ بھی نہ کریں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور بعض اوقات ہم جب مزید جینے کی آرزو اس کے آگے ہاتھ پھیلائیں‘ روئیں‘ گڑگڑائیں‘ یہ رحم نہیں کھاتی اور بےحسی کی اعلیٰ مثال قائم کرتے ہوئے انتہائی سفاکیت سے ہمارا ہاتھ‘ موت کے ہاتھ میں دے دیتی ہے مجال ہے جو ذرا بھی رحم کھائے‘ الغرض زندگی ایک نہ سمجھ میں آنے والی شے ہے۔ آج ہم خوش ہیں‘ اگلے پل کا نہیں پتا کہ ہم آنسو بہا رہے ہوں اور ابھی رو رہے ہیں تو کیا خبر آنے والا لمحہ ہمارے لبوں پر مسکراہٹ سجادے اور کبھی کبھی زندگی میں کچھ ایسے بھی واقعات رونما ہوتے ہیں جو عقل سے ماورا‘ ناقابل یقین ہوتے ہیں۔ عقل ان کی کوئی توجیہہ پیش کرنے سے قاصر ہوتی ہے یکسر قاصر......

میں بھی آج ایک ایسا ہی محیرالعقول واقعہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔ پراسراریت کی بات ہو تو سب سے پہلے ذہن میں آنے والی مخلوق جنات ہیں‘ ان کی اہمیت یوں بھی مسلم ہے کہ ان کا وجود قرآن کریم سے ثابت ہے خیر میں پہلے اپنا تعارف کروادوں میرا نام آزر ہے۔ ماں اس دنیا میں نہیں صرف باپ ہے یا ایک بڑی بہن جو کہ شادی شدہ ہے اور کراچی جیسے گنجان آباد شہر میں رہتی ہے‘ قریبی رشتے دار زیادہ نہیں ہیں اور تنخواہ بس اتنی ہے کہ دو وقت کی روٹی نکال کر میری پڑھائی کے اخراجات پورے ہوجاتے ہیں۔

شہر سے قدرے پرے ہماری بستی ہے‘ جہاں ہمارے ہی جیسے لوگ یعنی سفید پوش طبقہ رہائش پذیر ہے۔ میں نے میٹرک اچھے نمبروں سے کیا تھا اس لیے شہر کے ایک اچھے کالج میں داخلہ بآسانی مل گیا۔ داخلہ فیس تو ابو کی پس انداز کی ہوئی رقم سے بھردی گئی مگر دیگر اخراجات منہ پھاڑے کھڑے تھے۔ ایسے میں مجھے ایک دوست کے توسط شہر میں ٹیوشن کی آفر ہوئی تو میں نے اس لیے بھی بنا کسی تامل قبول کرلی کہ ٹیوشن فیس اچھی تھی۔ کچھ تو آسانی پیدا ہوتی۔ اگرچہ جب ابو کو معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے منع بھی کیا مگر ان کے انداز میں نرمی تھی کیونکہ یہ بات وہ خود بھی جانتے تھے کہ محض ان کی تنخواہ سے کچھ بننے والا نہیں ہے‘ خیر تو میں بات کررہا تھا کہ ابو نے بعد میں اجازت دے دی لیکن ایک مشکل مرحلہ تھا کہ ٹیوشن کا ٹائم مغرب کے بعد طے کیا گیا تھا۔ شہر سے آتے آتے رات لازمی ہوجاتی اور راستہ ویران تھا خیر میں نے خود کو

یہ سوچ کر تسلی دے لی کہ جہاں مشکل ہوتی ہے وہیں کچھ اچھا بھی ہوجاتا ہے اور گلاب کا پھول جہاں ہوتا ہے وہاں کانٹوں کا ہونا لازم بات ہے۔



میرا اندازہ ٹھیک ہی نکلا تھا کہ شہر سے نکلتے نکلتے مجھے رات ہوگئی تھی' گاڑھا اندھیرا فضا میں پنجے گاڑھے ہوئے تھا' سناٹا شدید ترین تھا۔ میں جلدی جلدی سائیکل کا پیڈل گھمارہا تھا ستاروں کی ذراسی روشنی میں سپاٹ تاحد نگاہ ویران تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا' ذرا آگے جاکر تقریباً ایک ایکڑ پر محیط درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ اس جگہ کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں مثلاً اس جگہ جنات کا بسیرا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ویسے تو میں نے کبھی اس بارے میں زیادہ سوچا نہ تھا مگر اس وقت وہاں سے گزرتے ہوئے وہ تمام افواہیں ہولناک بھوتوں کا روپ دھار کر میرے اردگرد رقصاں تھیں۔ خوف کی لذت کو میرا دل پوری شدت سے محسوس کررہا تھا' درختوں کے اس جھنڈ کے پاس پہنچتے ہی مجھے ایک عجیب سی کیفیت نے آن لیا۔ ایک وحشت ناک سناٹا مجھے اپنے اندر اترتا محسوس ہوا' ایسا گہرا سناٹا کہ جیسے سمندر کے گہرے تاریک پانیوں میں میں اترتا جارہا ہوں۔ اسی جھنڈ کے کسی درخت پر براجمان ہراس کے ہیبت ناک پنچھی نے اپنے پَر پھڑ پھڑائے اور ایک لمبی اڑان بھر کر میرے سر پر سایہ فگن ہوگیا۔ سناٹا...... گہری خاموشی...... وحشت ناک سکوت' اچانک یوں لگا گویا سناٹا پوری قوت سے چیخ رہا ہو۔ اس کی چیخیں مجھے دہشت کے مہیب سمندر میں دھکیل گئیں۔ سائیکل اتنی بھاری ہوگئی کہ میری پوری قوت صرف کرنے پر بھی بمشکل گھسیٹ رہی تھی' وقت تھا گزر ہی نہ رہا تھا۔ فاصلہ تھا کہ سمٹ ہی نہ رہا تھا' وقت کچھوے کی سی رفتار سے رینگ رینگ کر گزر رہا تھا اور ہر گزرنے والا لمحہ سانسیں خشک کیے دیتا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں جھما کا سا ہوا جب میں چھوٹا تھا تو اپنے دوستوں کے ساتھ اکثر اک ایسے درخت سے جامن اتارنے جاتا تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ آسیب زدہ ہے تب ہم لوگ اپنا خوف دور کرنے کے لیے بلند آواز میں ایک جملہ بولا کرتے تھے اور حیرت انگیز طور پر ہمارے خوف میں خاطر خواہ کمی پیدا ہوجاتی تھی۔ مجھے نجانے کیا سوجھی کہ میں اس وقت وہی بچپن والی حرکت دہرا بیٹھا۔

''جنات نہیں ہوتے۔'' میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''اور اگر ہوتے بھی ہیں تو کم از کم یہاں نہیں ہیں۔'' میری آواز مزید بلند ہوگئی۔ ''اور اگر ہیں بھی تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔'' میں حلق پھاڑ کر چلایا۔ اس بات کا حیرت انگیز نفسیاتی اثر ہوا' چیختا سناٹا گویا دم سادھ گیا اور سائیکل ہلکی پھلکی ہوگئی' میں آگے بڑھتا چلا گیا۔



اب تو میرے ہاتھ کارگر نسخہ آ گیا تھا درختوں کے اس جھنڈ سے گزرتے ہوئے بس وہی الفاظ بآواز بلند دہرادیتا تھا اور بآسانی وہاں سے گزر جاتا تھا۔ انہی دنوں ابو کے ایک دوست کی ڈیتھ ہوگئی۔ وہ اندرون پنجاب' ایک پسماندہ گاؤں میں رہتے تھے' مجھے ابو کے ساتھ وہاں جانا پڑا' مرحوم کی ایک بیوہ اور دو بچے تھے۔ بیٹی مجھ سے کچھ چھوٹی

روحانی علاج

حافظ شبیر احمد

آر اے کے ...... لاہور

جواب:۔ بعد نماز فجر اور عصر سورۃ والضحیٰ 41 مرتبہ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔ تصور ہو کہ واپس لوٹ رہا ہے۔ پہلے استخارہ کر لیں۔

ف۔ف ...... ضلع چکوال

جواب:۔ بعد نماز فجر سورۃ قریش 111 مرتبہ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔ جاب کے لیے دعا کریں۔ جلد مسئلہ حل ہو جائے گا۔

ث۔ر ...... جام پور

جواب:۔ رشتوں کے لیے:۔ بعد نماز فجر سورۃ فرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔

بعد نماز مغرب اور عشاء سورۃ فلق' سورۃ الناس 9،9 مرتبہ۔

روزگار کے لیے:۔ بعد نماز عشاء سورۃ قریش 111 مرتبہ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔

(یہ دونوں وظائف آپ کی والدہ اور آپ دونوں بہنیں کریں۔ رشتوں کے لیے دعا کریں معاشی حالات اور سلائی کا کام چل جانے کے لیے بھی' وظائف پاکی کی حالت میں کرنے ہیں)۔

عابدہ پروین ...... خانیوال

جواب:۔ مسئلہ نمبر 1:۔ آپ کا اگر کوئی مسئلہ ہے تو آپ پوچھ سکتی ہیں۔ وظائف پڑھنے کی اجازت نہیں۔

مسئلہ نمبر 2:۔ ووصینا الانسان بوالدیہ احسناً (سورۃ احقاف آیت نمبر 15) بعد نماز فجر 101 مرتبہ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔ پڑھتے وقت معنیٰ ذہن میں ہوں اور مقصد بھی۔ ایک گلاس پانی پر دم بھی کریں صبح نہار منہ پلائیں۔ ان شاء اللہ مسئلہ جلد حل ہو جائے گا۔

(وظیفہ آپ کریں یا والدہ)۔

مسئلہ نمبر 3:۔ تیل پر 41 مرتبہ آیات شفا دم کر لیں روزانہ لگائیں۔ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف)۔ ہر نماز کے بعد یا قوی 11 مرتبہ سر پر ہاتھ رکھ کر پڑھیں۔

ص۔ب ...... اسلام آباد

جواب:۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھ کر دعا کریں۔ شادی ہوگی یا نہیں (اللہ بہتر جانتا ہے)۔

ثمینہ کوثر ...... چک صاحب خان

جواب:۔ مسئلہ نمبر 1:۔ بعد نماز فجر 3 مرتبہ سورۃ یٰسین پڑھ کر اپنے مسئلے کے لیے دعا کریں اور تصور میں لا کر دم بھی کریں سب کو۔

مسئلہ نمبر 2:۔ ہر نماز کے بعد سر پر ہاتھ رکھ کر 11 مرتبہ پڑھا کریں "یا قوی"

مسئلہ نمبر 3:۔ سورۃ یوسف کی تلاوت کیا کریں۔

ندیم خان ...... اسلام آباد

جواب:۔ نماز کی پابندی کریں۔ فجر کی نماز کے بعد سورۃ یٰسین' سورۃ مزمل' سورۃ الرحمن پڑھ کر اپنے لیے دعا کریں دم بھی کریں۔ روزگار کے لیے دعا کریں صدقہ خیرات کرتے رہا کریں۔

خالدہ پروین ...... سرگودھا

جواب:۔ "یا لطیف یا ودود" 313 مرتبہ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف بعد نماز عشاء۔ پڑھتے وقت مقصد ذہن میں ہو۔ پڑھنے کے بعد تصور میں لا کر دم بھی کریں ایک گلاس پانی پر بھی۔ وہ پانی صبح نہار منہ پلائیں دعا بھی کریں۔

صائمہ پروین ...... سیالکوٹ

جواب:۔ نماز کی پابندی کریں۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھ کر اللہ سے اپنے حق میں بہتری مانگیں۔

شا...... ضلع سکھر

جواب:۔ ہرنماز کے بعد بسم اللہ پوری اور سورۃ اخلاص 11،11 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں۔ اپنی بہن کے لیے بھی۔

ج...... ضلع گوجرانوالہ

جواب:۔ رشتے کے لیے فجر کی نماز کے بعد سورۃ فرقان والا وظیفہ کریں ساتھ ہی فجر کی سنت اور فرض اور مغرب کی اذان سے پہلے مصلے پر بیٹھ جائیں کہ وظیفہ مغرب کی اذان تک پورا ہو جائے۔ سورۃ والضحیٰ 41 مرتبہ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔ پڑھتے وقت تصور ہو کہ وہ آپ کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ دعا بھی کریں۔ جلد مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ

خدیجہ...... گوجرانوالہ

جواب:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74، 70 مرتبہ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔ جلد اور اچھے رشتے کے لیے دعا کریں۔ (سب بہنیں کرسکتی ہیں)۔

بعد نماز مغرب اور عشاء۔ سورۃ فلق، سورۃ الناس 21،21 مرتبہ اول وآخر 7،7 مرتبہ درود شریف۔ رکاوٹ ختم کرنے کے لیے۔

مدیحہ...... محلہ نوناری

جواب:۔ بعد نماز فجر سورۃ شمس 41 مرتبہ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔ پانی پر دم کریں صبح نہار منہ پلائیں۔ مقصد ذہن میں ہو۔

جب رات سو جائے تو سرہانے کھڑے ہو کر "سورۃ العصر" 111 مرتبہ۔ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔ نیت ہو اور دعا بھی کریں کہ والدین کی مرضی سے شادی کرے اور راضی ہو جائے۔

عائشہ...... سلانوالی

جواب:۔ سورۃ قریش بعد نماز عشاء 111 مرتبہ اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔ پڑھتے وقت مقصد ذہن میں ہو۔ بعد میں ایک گلاس پانی پر دم کر کے گھر کے تمام افراد کو پلائیں۔ تمام مسئلوں کے لیے دعا بھی کریں۔



http://facebook.com/elajbilquran
www.elajbilquran.com

نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کسی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔
ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔
rohanimasail @ gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے اکتوبر 2014ء

نام............ والدہ کا نام............ گھر کا مکمل پتا............

....

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں............

خوشبوسخن

عمر اسرار

مجھے تم سے محبت ہے
یہ کہنا کتنا ممکن ہے
اسے سمجھنے میں لیکن
اسے نباہنے میں
مگر
بہت وقت لگتا ہے
مجھے تم سے محبت ہے
یہ کہنا کتنا سہل ہے
لیکن محبت کے رنگ میں ڈھلنے میں
انا مصلوب کرنے میں
مگر
بہت وقت لگتا ہے
مجھے تم سے محبت ہے
یہ تو کہہ دیا تم نے
اس سودے کے سود و زیاں میں
عمر رائیگاں کرنے میں ہاں
مگر
بہت وقت لگتا ہے

ریحانہ سعیدہ.....لاہور

غزل

شکوہ تو ہے کہ سر پر میرے کوئی سائباں نہیں
دل اگر چہ افسردہ ہے مگر بدگماں نہیں
میں جھکا ہوں تو سمجھو مصلحت کا تقاضا اسے
میں ٹوٹ کر بکھر جاؤں اتنا آساں نہیں
اغیار ہیں کہ پہنچ چکے وطن کی فصیلوں پر
اک میرے حکمراں جن پر کچھ بھی عیاں نہیں
یہاں افلاس و پیاس کے ڈیرے وہاں رنگینیاں چمن کی
کر دے انصاف اے خدا، تجھ سے تو کچھ نہاں نہیں
باعث شرم ہے زمین و مکاں پر دست و گریباں ہونا
دیکھو اداس ہے وہ شجر جس پر کوئی آشیاں نہیں
طفل صاحب اقتدار کا بن گیا پنگھوڑے میں ہی حکمران
اور بچہ مفلسی کا جواں ہو کر بھی جواں نہیں
انسان ہی بھلا بیٹھا انسانیت سے شفقت کا اصول
نازیبا ہے فاروق پھر یہ شکوہ کہ خدا مہرباں نہیں

عمر فاروق ارشد.....فورٹ عباس

غزل

زندگی ہے بے بسی کے روپ میں
کیوں نہیں ملتی خوشی کے روپ میں
چھا گئے غم کے اندھیرے ہر طرف
اب وہ آئیں روشنی کے روپ میں
وہ فرشتہ صفت ہے میرے لیے
ہے اگر چہ آدمی کے روپ میں
الوداع کہتے ہوئے وہ کہہ گیا
چند جملے شاعری کے روپ میں
دشمنی پر کیوں اتر آیا ہے وہ
آج رانا دوستی کے روپ میں

قدیر رانا.....راولپنڈی

غزل

صحن گلشن میں اب نکھار کہاں
وہ بہاریں وہ لالہ زار کہاں
وہ جو خوگر ہیں حق بیانی کے
ان کو خوف صلیب و دار کہاں
ڈھونڈتی ہے عبث نگاہ مری
ریگ زاروں میں شاخسار کہاں
یہ بھی اک دور ہے محبت کا
اب مجھے ان کا انتظار کہاں
جو نظر آرہا ہے شیشے میں

میرے چہرے پر وہ غبار کہاں
ساتھ اس کے بدل گیا میں بھی
اب تمنائے دید یار کہاں
راہ اس کی جمال کیوں دیکھیں
جس کی آمد کا اعتبار کہاں
سمیع جمال......کراچی

غزل

جو ہیں پوشیدہ وہ اسرار بھی کھل جائیں گے
کھلتے، کھلتے مرے سرکار بھی کھل جائیں گے
کر رکھا ہے جنہیں افلاس نے قیدی گھر میں
میکدہ کھلنے دو میخوار بھی کھل جائیں گے
گر سلامت رہا احباب کا آنا جانا
آپ کے کوچے میں بازار بھی کھل جائیں گے
گر تری بزم میں کھل جائیں گے سب میرے رقیب
دیکھنا میرے طرف دار بھی کھل جائیں گے
خوش نصیبی سے ہوئی تیری رفاقت تو نصیب
کیا خبر تھی در آزار بھی کھل جائیں گے
جب بھی تنہائی میں سوچوں گا میں اسباب شکست
دیکھنا مجھ پر مرے یار بھی کھل جائیں گے
نیر سمجھوں گا کہ زندہ ہے ابھی قومی شعور
در صداؤں پر جو دوچار بھی کھل جائیں گے
نیر رضاوی......کراچی

غزل

رات کو جب بھی ماہتاب دیکھا تھا
میں نے تیرا ہی پھر خواب دیکھا تھا
تجھے دیکھا تو یہ محسوس ہوا مجھ کو
جیسے پھر ایک آفتاب دیکھا تھا
اپنی اوقات مجھ کو یاد دلا دی
جب بھی کوئی احباب دیکھا تھا
مجھ سے نہ پوچھ پھر غم زندگی ہے کیا
جیسے عمر بھر کوئی عذاب دیکھا تھا
یوں ہی تو یہ شب نہیں ملی ہمیں جاوید
غم بھی تو زمانے میں بے حساب دیکھا تھا
محمد اسلم جاوید......فیصل آباد

انتظار

ساجن کا انتظار
ساون بن کر
برس اٹھا ہے
آنکھوں سے......!

شاعرہ: فصیحہ آصف خان
انتخاب: شجاع جعفری......اکوال

غزل

اسے تیرے فیشن نے مارا دیکھ لو
دل ہوا ہے پارہ پارہ دیکھ لو
قرض خواہوں کا گریباں پر ہے ہاتھ
کیسا اچھا ہے نظارہ دیکھ لو
ساتھ چھوڑا دوستوں نے آج کل
ہوگیا ہوں بے سہارا دیکھ لو
گو ہوا شادی کو ایک عرصہ مگر
قرض اس کا اب اتارا دیکھ لو
کشتی دل غم کے گردابوں میں ہے
دور ہے کتنا کنارا دیکھ لو
چھا گئی ہے گلشن دل پر خزاں
ہے کوئی اس کا بھی چارہ دیکھ لو
جو تماشہ دیکھتے ہیں سارے لوگ
دیکھ لو تم بھی خدارا دیکھ لو
ریاض حسین قمر......منگلا ڈیم



ذوق آگہی

عفان احمد

لعنت

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ چھ طرح کے لوگ ہیں میں نے ان پر لعنت کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر لعنت کی ہے اور ہر نبی نے بھی لعنت کی ہے۔

(۱) اللہ کی کتاب میں زیادتی کرنے والا۔
(۲) اللہ کی تقدیر کو جھٹلانے والا۔
(۳) زبردستی مسلّط ہونے والا تاکہ جسے اللہ نے ذلیل کیا ہے اسے عزت دے اور جسے اللہ نے عزت دی ہے اسے ذلیل کرے۔
(۴) اللہ کے حرام کو حلال سمجھنے والا۔
(۵) میری اولاد سے اس چیز کو حلال جاننے والا جسے اللہ نے حرام کیا ہے۔
(۶) میری سنت کو ترک کر دینے والا۔

اسرار علی ...... کراچی

پیر کے دن چھ خصوصیتیں

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ پیر کے دن کو آقائے نامدار تاجدارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے ساتھ ایک خاص مناسبت اور خصوصیت ہے، وہ یہ ہیں کہ:

◆ پیر کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی۔
◆ پیر کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملی۔
◆ پیر کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ پہنچے۔
◆ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیر کے دن حجر اسود کو اپنی جگہ رکھا۔
◆ پیر کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے لیے غارِ ثور سے سفر کی ابتداء فرمائی۔
◆ پیر ہی کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا سانحہ پیش آیا۔

(مسند احمد: ۱/۲۷۷، رقم حدیث ۲۵۰۶)

نور سحر شاہ، جیا شاہ ...... شنکیاری، مانسہرہ

کیا آپ جانتے ہیں؟

❁ سلطان ابراہیم غزنوی ہر سال اپنے ہاتھ سے قرآنِ مجید لکھتا تھا۔
❁ سونے کے تاروں سے قرآن مجید لاہور میں لکھا گیا ہے۔
❁ پنجابی زبان میں سب سے پہلے قرآنِ مجید کا ترجمہ حافظ محمد لکھوی نے کیا تھا۔
❁ حرم شریف کے اندر دنیا کے چھ زبانوں کی گھڑیاں لگی ہوئی ہیں۔
❁ دنیا کا سب سے بڑا بلب پچاس کلوواٹ ہے اور یہ جاپان نے تیار کیا تھا۔
❁ دنیا میں سب سے زیادہ سگریٹ نوشی امریکہ میں ہوتی۔
❁ درختوں میں سب سے پہلا کھجور کا درخت پیدا ہوا تھا۔
❁ انارکلی کا اصلی نام نادرہ بیگم تھا۔
❁ رکشا جاپان نے ایجاد کیا تھا۔
❁ دنیا کا پہلا پاکٹ ٹیلی فون 28 اگست 1989ء میں بنایا گیا۔

انتخاب: نادیہ نور ...... ملتان

غریب ماں

سو گئے بچے ایک غریب ماں کے جلدی جلدی

ماں نے کہا تھا آتے ہیں فرشتے خواب میں کھانا لے کر

مدیحہ نورین...... برنالی

اقوال زریں

○ انسان اپنی توہین معاف تو کر سکتا ہے مگر بھول نہیں سکتا۔

○ کسی کو اتنا دکھ مت دو کہ اسے جینے سے نفرت ہو جائے۔

○ جن لوگوں کو آپ کی موت غم دے سکتی ہیں انہیں زندگی میں خوشی ضرور دیں۔

○ کچھ خوابوں کو پانے کے لیے کچھ خوابوں سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔

○ دوست وہ ہے جو تمہارے مزاج کے ہر موسم کو ہنس کر سہہ جائے۔

○ ہوا اور خوشبو جیسے بن جاؤ کہ جب اور جہاں جاؤ اپنا تعارف خود کراؤ۔

○ کچھ لوگ ہمیں اتنے عزیز ہوتے ہیں کہ ان کے لیے سب کچھ چھوڑ دینا بھی کم لگتا ہے۔

بانو ملک...... چوتالہ

ترکی بہ ترکی

جاحظ نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے۔

''میں ایک بار بصرہ کی ایک مشہور شاہراہ سے گزر رہا تھا۔ میں نے جوتوں کی ایک شاندار دوکان دیکھی۔ میں اس کے اندر چلا گیا اور ایک خوبصورت بخدی جوتا پسند کیا اور صاحب دوکان سے اس کی قیمت دریافت کی۔ جواب ملا ''دس درہم'' یہ بہت زیادہ تھے۔ اس لیے مجھے غصہ آ گیا میں نے کہا ''اگر یہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کہنے پر جو گائے قربان کی تھی اس کی کھال کا بھی بنا ہوا ہوتا تب بھی میں اس کے لیے ایک درہم سے زیادہ ادا نہ کرتا۔'' دوکان دار نے یہ سنا اور جیسے کچھ سوچتے سوچتے چونک اٹھا میری طرف نظریں اٹھائیں اور کہا ''اگر تمہارے پاس اصحاب کہف والے درہم ہوتے تب بھی میں تمہیں یہ جوتا ایک درہم میں نہ دیتا۔''

مرسلہ: شوکت علی...... نواب شاہ

تین چیزیں

❁ تین چیزیں خلوص دل سے کرنی چاہئیں۔
رحم، کرم، دعا

❁ تین چیزیں کسی کا انتظار نہیں کرتیں۔
موت، وقت، گاہک

❁ تین چیزیں بھائی کو بھائی کا دشمن بناتی ہیں۔
زن، زر، زمین

❁ تین چیزیں پردہ چاہتی ہیں۔
کھانا، دولت، عورت

❁ تین چیزیں یاد رکھنی ضروری ہیں۔
سچائی، فرائض، موت

❁ تین چیزیں انسان کو ذلیل کرتی ہیں۔
چوری، چغلی، جھوٹ

❁ تین شخص تین چیزوں سے پہچانے جاتے ہیں۔
صابر، مصیبت پر۔ بہادر، مقابلے پر۔ بھائی، ضرورت پر

کوثر جہاں...... راولپنڈی



ابن صفی کا ادبی نصب العین

محمد عارف اقبال



اردو ادب کا ایک درخشاں ستارہ اور عظیم ناول نگار ابن صفی کو شاید یہ گمان بھی نہ ہوگا کہ فریدی حمید کے لازوال کرداروں پر مشتمل ناول ''صحرائی دیوانہ'' ان کا آخری ناول ثابت ہوگا۔ فریدی جو اُن کا آئیڈل کردار ہے اور جس کے بارے میں ابن صفی نے خاص طور سے کہا تھا:

''...فریدی میرا آئیڈیل ہے جو خود بھی قانون کا احترام کرتا ہے اور دوسروں سے بھی قانون کا احترام کرانے کے لیے اپنی زندگی تک داؤ پر لگا دیتا ہے۔''

(میں نے لکھنا کیسے شروع کیا)

نومبر 1968 کے ایک ناول ''مہلک شناسائی'' کے پیش رس میں ابن صفی، فریدی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''مستقبل سے مایوسی غلط فہمی کی پیداوار ہے اور آدمی کو جرائم کی طرف لے جاتی ہے۔ مستقبل سے مایوس ہو کر یا تو آدمی جرائم کرتا ہے یا پھر کسی ایسے کرنل فریدی کی تلاش میں ذہنی سفر کرتا ہے جو قانون اور انصاف کے لیے بڑے سے بڑے چہرے پر مُکا رسید کر سکے...''

ابن صفی نے ''جاسوسی ادب'' کی ابتدا بھی فریدی۔حمید کے کرداروں پر مشتمل ناول ''دلیر مجرم'' (مارچ 1952) سے کی جسے نکہت پبلی کیشنز، الہ آباد نے ''جاسوسی دنیا'' کے تحت شائع کیا تھا۔ یہ سلسلہ ابن صفی کے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد بھی جاری رہا۔ پھر انہوں نے اگست 1955 میں اپنے ایک ناول ''خوفناک عمارت'' میں عمران کے کردار کو متعارف

کرایا۔ لیکن اس سے قبل ابن صفی کے تقریباً 39 شاہ کار ناول فریدی حمید کے کرداروں پر شائع ہو چکے تھے جن میں فریدی اور لیونارڈ، مصنوعی ناک، شاہی نقارہ، پتھر کی چیخ، خوفناک ہنگامہ، لاشوں کا آبشار، مونچھ مونڈنے والی، برف کے بھوت، جنگل کی آگ، موت کی چٹان اور تاریک سائے بھی شامل ہیں۔

فی الحال اس بحث سے قطع نظر کہ ابن صفی نے پاکستان سے ''عمران'' کے کردار پر ناول لکھنے کا سلسلہ کیوں شروع کیا، یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ وہ ''فریدی'' کو اپنا آئیڈیل کردار کیوں سمجھتے تھے؟ یہ بحث تحقیق طلب ہے۔ اس ضمن میں ابن صفی کے مذکورہ بالا اقوال سے رہنمائی حاصل تو کی جاسکتی ہے لیکن اُس وقت کے سماجی، سیاسی اور معاشی صورت حال کے بغور مطالعے کے بعد ہی ہم اصل نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھی جائے کہ کوئی بھی ناول نگار جو ''مقصدی ادب'' تخلیق کرتا ہے، اپنے سماج کو وسیع تر کینوس میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ساتھ ہی وہ سماج کا مشاہدہ اپنے عصری مسائل کے تناظر میں کرتا ہے تاکہ اس کی تحریروں میں سماج کے مسائل منعکس ہوں اور ان مسائل سے سماج کے افراد کو نبرد آزما ہونے کا سلیقہ آئے۔ اردو ادب میں ابن صفی کا ادبی رجحان اور ویژن دیگر مقصدی ادیبوں سے کہیں آگے اور منفرد زاویے کا حامل ہے وہ معاشرے کی اس نفسیاتی گرہ کی عقدہ کشائی کرتے ہیں جس کا شکار ابتدائے آفرینش سے پوری انسانیت رہی ہے۔ ابن صفی کا نکتہ نظر ریت پر قلعہ تعمیر کرنا نہیں ہے بلکہ وہ ادب کی ایسی عمارت کھڑی کرتے ہیں جس کی بنیاد ٹھوس اور مستحکم ہوتی ہے۔ وہ خواب ضرور دیکھتے ہیں لیکن ایسے خوابوں سے ہمیشہ دور رہے جو معدہ کی گرانی کے سبب ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ وہ ان خوابوں سے بھی دور رہے جس کے چکر میں انسان نفسیاتی مریض بن جاتا ہے۔ ایسے خوابوں کو دیکھنے والا آیا خبط (Mania) کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے یا مایوسی کی تاریکی (depression) میں چلا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ابن صفی نے اردو کے انحطاط کے دَور میں اردو ادب کو خبط اور ڈپریشن سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ادب کے ذریعے انہوں نے جہاں حال کو انتشار اور فتنہ و فساد سے محفوظ رکھنے کے طریقے بتائے تو دوسری طرف بہتر مستقبل کے اہداف کو پانے کا ہنر دیا۔ انہوں نے اردو ادب کو خواص کے ایوانوں سے نکال کر عوام کی دہلیزوں تک پہنچایا۔ ادب کو زندگی کے حقیقی نشیب و فراز اور سماجی شعور سے ہم آہنگ کیا۔ انہوں نے ایک بار لطیف پیرائے میں اس نکتے کی طرف بھی اشارہ کیا کہ ان کے ناول کے قارئین کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ ''ادبِ عالیہ'' بھی پڑھ لیتے ہیں۔ انہوں نے ناول نگاری کی دنیا میں ایک ایسا تجربہ کیا جس کی دوسری مثال شاید کسی بھی ادب میں موجود نہیں ہے۔ وہ اپنے قارئین سے مسلسل ربط رکھتے اور بعض قارئین کے مشورے کی روشنی میں انتہائی توازن کے ساتھ اپنے ناول کے ''پیش رس'' میں جواب بھی لکھتے۔ ان کے قارئین بسا اوقات انہیں دکھی بھی کر دیتے اور کبھی عجیب قسم کی فرمائش کر کے آزمائش میں بھی ڈال دیتے۔ لیکن ابن صفی انتہائی صبر اور تحمل کے ساتھ ان کے سوال کا جواب دیتے۔ فریدی حمید سیریز کا ایک ناول ''ستاروں کی موت'' (اکتوبر 1964) شائع ہوا تو ایک صاحب نے انتہائی غصے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ ''آپ ہی جیسے لکھنے والے فلمی دنیا کے متعلق غلط فہمیاں پھیلاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شریف گھرانوں کی لڑکیاں اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتیں۔''

ابن صفی چونکہ ایک منفرد مقصدی ادیب تھے لہٰذا ان کا ویژن عام اردو ادیبوں اور ناول نگاروں سے جُدا تھا۔ انہوں نے اپنے دوسرے ناول ''ستاروں کی چیخیں'' (دسمبر 1964) جس کا موضوع فلم انڈسٹری تھا، اس کے ''پیش رس'' میں اس قاری کے مذکورہ بالا اعتراض کو لکھنے کے بعد جو جواب تحریر کیا، اس سے ہمہ جہت علوم و ادبیات میں ابن صفی کی گہری بصیرت اور فکر و تدبر کے اعلیٰ و ارفع اُفق کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی یہ بات جو ''پیش رس'' میں لکھی گئی، پیشین گوئی کی طرح حرف بہ حرف آج بھی سماج کو آئینہ دکھا رہی ہے۔ ابن صفی لکھتے ہیں:

''بھائی آپ کیوں خفا ہو رہے ہیں۔ شاید آپ کو اس کی اطلاع نہیں کہ سماجی قدریں تیزی سے بدل رہی ہیں۔ آج سے پندرہ بیس سال پہلے شرافت کا جو معیار تھا اُسے آج فلاکت زدگی اور جہالت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر پردہ کو لے لیجیے۔ پہلے یہ شرافت اور عالی نسبی کی پہچان تھی۔ آج پردہ نشین خواتین کو یا تو نچلے طبقے سے متعلق سمجھا جاتا ہے یا جاہل۔ بہر حال آپ کی مراد بر آنے میں بہ مشکل دس سال اور لگیں گے کیوں کہ ابھی ہمارے یہاں کے شریف آدمی آزادانہ صنفی اختلاط کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کسی قدر ہچکچاتے ہیں... صرف دس سال اور صبر کیجیے... یہ خلیج بھی حائل نہ رہے گی... پھر ہوں گے آپ کے پو بارہ... لائیے ہاتھ اسی پر...'' (22 دسمبر 1964)

علامہ اقبال نے تو ابن صفی سے برسوں قبل ''سینما'' کو ''صنعتِ آزری'' کہا تھا۔ مگر افسوس کہ اس ''صنعتِ آزری'' کے محافظوں اور معماروں میں ابلیس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے افراد پیدا کر دیے ہیں جو کبھی ''بت پرستی'' سے تائب تھے۔

ابن صفی نے اپنے لافانی کردار کرنل فریدی کے حوالے سے سماج کو ایسا ویژن دیا جو اردو ادب میں نہ صرف یہ کہ روایت سے انحراف تھا بلکہ اسے ''بغاوت'' کے مترادف سمجھا گیا اس مقام پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ قول یاد آتا ہے کہ ''علم اٹھالیا جائے گا، کثرت سے زلزلے آئیں گے، زمانے قریب ہو جائیں گے، فتنے ظاہر ہوں گے، ہرج یعنی قتل بڑھ جائے گا، مال کی تمہارے پاس اتنی کثرت ہو جائے گی کہ مال والے کو فکر ہوگی کہ میرا صدقہ کون قبول کرے گا؟ وہ کسی کو مال دے گا تو دوسرا کہے گا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے یہاں تک کہ لوگ فلک بوس عمارتوں پر فخر کریں گے۔ لوگ قبر کے پاس سے گزریں گے تو کہیں گے کہ کاش! میں اس جگہ ہوتا۔'' (مشکوٰۃ، جلد سوم)

یہ خبر ساری انسانیت کو اُس رحمت للعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دی ہے جو تمام عالمین کے لیے رحمت بنا کر مبعوث کیے گئے۔ اس خبر میں حقیقی علم، زمین کی جغرافیائی صورتِ حال، فریب و دجل، مال کی کثرت اور زندگی کی محرومی و مظلومی کی سیکڑوں تصویریں دیکھی جاسکتی ہیں۔ کیا اردو ادیبوں اور نقادوں نے کبھی اس خبر کی روشنی میں اور وسیع تناظر میں اپنے معاشرے کے حالات، زمینی معاملات، واقعات اور ادبی رویے کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ اقبال نے ایک عرصہ قبل کہا تھا:

اے باد صبا! کملی والےؐ سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے امت بے چاری کے دیں بھی گیا، دنیا بھی گئی

اردو زبان و ادب کو عصر سے ہم آہنگ کرنے والے اور بامحاورہ رواں اردو بولنے اور لکھنے کی طرف رہنمائی کرنے والے عظیم ناول نگار ابن صفی نے جب ''ادب میں ہوس پرستی'' کے رجحان پر طنز کرتے ہوئے فریدی۔ حمید سیریز کے ایک ناول ''جنگل کی آگ'' (1955) میں فریدی کی زبان سے یہ بات کہلوائی کہ:

''میں جنسیت کو ایک سیدھا سادہ مسئلہ سمجھتا ہوں جسے آدمی جیسے سمجھ دار جانور کے لیے اتنا پیچیدہ نہ ہونا چاہیے کہ وہ شاعری کرنے لگے۔''

تو اس بات پر ''عضویاتی غزلیں'' کہنے والے کیوں کر ابن صفی کے حامی ہو سکتے تھے، ان کا شمار تو اقبال کے بھی بدترین مخالفوں میں ہوتا ہے۔ کیوں کہ ابن صفی نے علامہ اقبال کے الفاظ میں گویا یہ کہہ دیا تھا:

چھوڑ یورپ کے لیے رقصِ بدن کے خم و پیچ
روح کے رقص میں ہے ضربِ کلیم اللّٰہی!
صلہ اُس رقص کا ہے تشنگیٔ کام و دہن
صلہ اس رقص کا درویشی و شاہنشاہی!

''صحرائی دیوانہ'' ابن صفی کا وہ شاہ کار ناول ہے جو سب سے پہلے روزنامہ ''جسارت'' کراچی میں 15 دسمبر 1978 سے 18 مئی 1979 تک قسط وار شائع ہوتا رہا۔ ہندوستان میں یہ ناول اکتوبر اور نومبر 1979 میں دو حصوں میں شائع کیا گیا جبکہ کراچی سے مکمل ناول جولائی ہی میں شائع ہو چکا تھا۔ اس ناول کے ''پیش رس'' میں ابن صفی نے لکھا تھا:

''...سسپنس اور سراغ رسانی کے داؤ پیچ سے بھرپور

کہانی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان لوگوں کو بے حد پسند آئے گی جو غیر ضروری مار دھاڑ سے کتراتے ہیں اور صرف کہانی کی دلچسپی سے لطف اندوز ہونے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ جنہیں مار دھاڑ سے دلچسپی ہے وہ یہی محسوس کریں گے جیسے خاصی مار دھاڑ ہو رہی ہے۔ فریدی اور مجرم کے مابین کچھ ایسی ہی ذہنی جھڑپیں ہوتی ہیں جو آپ کو میدانِ کارزار کا مزہ دیں گی۔''

مار دھاڑ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ابن صفی نے بڑا لطیف اشارہ کیا ہے۔ ''ذہنی جمناسٹک'' سے اکثر لوگ کتراتے ہیں منشیات کے ذریعے انسانی نسل کو تباہ کرنے والے پُراسرار گروہ اور مافیا کی اس کہانی میں یقینی طور پر سسپنس اور سراغ رسانی کے داؤ پیچ ادبی پیرائے میں بھرپور طریقے سے پیش کیے گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ مصنف نے زندگی کے جملہ امور پر بڑی فنی چابک دستی کے ساتھ اس طرح گفتگو کی ہے کہ قاری کے ذہن پر انمٹ نقوش ثبت ہو جاتے ہیں۔ زبان و ادب، طنز و مزاح، عشق کی آگ، زندگی کے تلخ حقائق، مثالی زندگی کے اوصاف، سائنسی سوچ، سائنسی ترقی، قانون شکنی، جرائم اور قوانین، انسانی جبلت، مذہبی خیال، اصل دین داری وغیرہ ایسے عنوانات ہیں جو ''صحرائی دیوانہ'' میں جگہ جگہ موضوع بحث بنے ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ کریں:

''آدمی بسا اوقات درندہ کیوں ہو جاتا ہے؟''

''اس لیے کہ درندگی ہی سے وہ تہذیب کی طرف آیا ہے۔''



''کیا تم بھی کوئی نشہ استعمال کرتے ہو؟''

''اپنے وجود ہی کی مستی کیا کم ہے کہ کسی نشے کا سہارا لیا جائے۔''



''آدمی نے بے حد ترقی کی ہے۔ اپنے وجود سے خلا تک کو کھنگال ڈالا ہے لیکن اس معاملے میں بچہ ہی بنا رہنا چاہتا ہے۔ ایک احمقانہ تگ و دو کو عشق کا نام دے کر اس سے لذت اندوز ہوتے رہنا چاہتا ہے حالانکہ فطرت کا مقصد صرف اتنا ہے کہ دو سے تین ہو جائے۔''



''میرا خیال ہے کہ ہم دونوں کبھی نہیں ملے، لیکن تم مجھے پہچانتے ہو!'' فریدی نے کہا۔

''تم ظاہری حکومت کے افسر ہو۔ ہم باطنی حکومت کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ہم سے کیا پوشیدہ رہ سکتا ہے۔ بس کھلتے نہیں کسی پر۔''

''کھل جاؤ تو پھر باطن کہاں رہا!'' فریدی سر ہلا کر بولا۔

''تم پر ولیوں کا سایہ ہے، کرنل سائیں!''

''اللہ کا سایہ!''

''بہت گہرے ہو کرنل سائیں... اپنے مرشد کا نام بتاؤ!''

''کملی والے کے علاوہ اور کسی کی طرف نہیں دیکھا، جس کے سب غلام ہیں!''

اس طرح کے درجنوں مکالمے اور ادبی شہ پارے اس شاہ کار ناول میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اس ناول میں کرنل فریدی اور اس کے تربیت یافتہ کیپٹن حمید کی جدا جدا شخصیتیں ایک ہی نصب العین کے گرد گھومتی ہیں۔ ابن صفی نے ''جس کرنل فریدی'' کو اپنا آئیڈیل کردار تسلیم کیا ہے، اس کی نمایاں جھلک اس کہانی میں دکھائی دیتی ہے اور ابن صفی کے انتقال (26 جولائی 1980) کے بعد کرنل فریدی کا باب اس کہانی کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے تاریخ کا حصہ بن گیا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔



ایڈیٹر اردو بک ریویو



قسط نمبر14

جگت سنگھ

شمیم نوید

تاریخ کے صفحات میں محفوظ سرزمین پنجاب کی ایسی دلگداز داستان جو کلاسک داستانوں میں شمار ہوتی ہے.....جوروجبر کے خلاف بغاوت کی آتشیں آندھیوں کا احوال' جو حاکمانہ غرور کے کوہساروں کے ساتھ پورے جاہ و جلال سے ٹکراجاتی ہیں۔ یہ کہانی ان لوگوں کے لیے بھی فسانۂ عبرت ہے' جو آنے والی نسلوں کو انتقام اور دشمنی کے جذبات منتقل کرتے رہتے ہیں اور سیدھے سادھے نوجوان "جگت سنگھ" بن جاتے ہیں اور پھر حالات کسی کے قابو میں نہیں رہتے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار "جگت سنگھ" ایک ایسا ڈاکو ہے جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ دراصل فطری طور پر امن و آشتی کا پیامبر ہے۔ "جگت سنگھ" کے کردار کا رومانی پہلو' جو شروع سے آخر تک "چندن" اور "ویرو" کی صورت میں اس کہانی میں رچا بسا نظر آتا ہے اس بات کا معتبر ترین گواہ ہے کہ لطیف جذبات رکھنے والا نوجوان جسے دنیا خطرناک ڈاکو کے طور پر جانتی ہے اندر سے کتنا نرم اور محبت کرنے والا ہے۔
"جگت سنگھ" کہاں سے چلا اور کہاں پہنچا' آئیے قارئین یہ جاننے کے لیے ہم بھی زیر نظر کہانی میں "جگت سنگھ" کے ساتھ ساتھ گاؤں کے سرسبز کھلیانوں' اونچے نیچے ٹیلوں اور پر خطر کھنڈرات کے نشیب و فراز میں سفر کرتے ہیں۔

اچلا کا پیغام جب بچن نے جگت کو بتایا تو وہ الجھن میں پڑ گیا کہ چندن کور سے ملنے الور جانا چاہیے یا نہیں؟ بچن اس کی الجھن سمجھ گیا۔

''جگت! تم ایک بار بھابھی سے مل لو! اچلا کہہ رہی تھی کہ وہ بری طرح تڑپ رہی ہے۔ آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ اس نے پیغام بھیجا ہے۔''

جگت کو چندن کور کے بارے میں سن کر بے چینی ہونے لگی۔ ''اور کیا خبر لائی اچلا؟''

''وہ جب تمہارے گھر میں تھی تو پولیس چیف تمہارے گھر کی تلاشی لینے آیا تھا۔'' پھر دانت پیس کر بولا۔ ''مجھے یقین ہے کہ وہ ارجن سنگھ ہی ہوگا' مگر تمہارے باپو نے اسے لوٹا دیا۔''

جگت بچن کی طرف دیکھنے لگا۔ ''وہ کس طرح؟''

''تمہیں عاق کردینے کی دستاویز دکھا کر۔''

''مجھے عاق کردیا......؟'' جگت بھڑک گیا۔ اس کا چہرہ بدل گیا۔ بچن نے بات بدلنے کی غرض سے کہا۔ ''مگر ایسا انہوں نے پولیس کی پریشانی سے بچنے کے لیے کیا ہوگا۔ کوئی باپ اپنے بیٹے کو اس طرح عاق نہیں کردیتا۔''

''ممکن ہے ایسا ہی ہو۔'' جگت بھاری لہجے میں بولا۔ ''اب مجھے بیٹا کہنے میں بھی ان کی سبکی ہوتی ہوگی۔'' ہاتھ اٹھا کر اس نے بچن کو کچھ کہنے سے روک دیا۔ ''باپ دادا کی دشمنی کی خاطر ڈاکو بنا' اس وقت ان کو فخر ہوا تھا مگر ویرو کی وجہ سے گھر چھوڑا اس لیے انہیں ایسا کرنا کھٹک گیا۔''

''جگت! اپنا ذہن قابو میں رکھو۔ انہوں نے کوئی غلط بات نہیں کی۔ تم خواہ مخواہ ذہن پر جالے بن رہے ہو۔''

''جو کچھ بھی ہوا اسی وجہ سے مجھے چندن سے ملاقات کے لیے جانا پڑے گا۔ اسے بھی میں اب اس گھر میں نہیں رہنے دوں گا۔ اگر وہ میری عورت ہوگی تو میری بات مانے گی۔'' جگت کی آواز میں جوش تھا۔ بچن اب پچھتا رہا تھا کہ عاق کرنے والی بات اسے کیوں بتا دی؟ پھر بھی جگت چندن سے ملنے پر تیار تھا یہ سوچ کر اس کا پچھتاوا دب کر رہ گیا۔



کھیت اسٹیشن سے سات میل کے فاصلے پر تھا۔ گاڑی چار گھنٹے لیٹ تھی اس لیے شام ہوگئی۔ دیا جلنے کے وقت وہ کھیت پر پہنچے لہٰذا کسی کی نظر اس پر نہیں پڑے گی۔ چندن جو اس سے پہلے آ گئی تھی۔ انتظار کر رہی ہوگی۔ ماما سے بھی لمبے عرصے کے بعد ملاقات ہوگی۔ ریڑھے میں بیٹھا جگت انہی خیالات میں غلطاں تھا۔ سامان میں ایک تھیلا تھا جس میں دو جوڑے کپڑے، آٹومیٹک گن اور کارتوس بھرے ہوئے تھے۔ ریڑھے میں دوسری پانچ سواریاں تھیں۔ دو ایک عوتیں ان میں شامل تھیں۔ راجستھان کے لوگ اس کے نام سے انجان نہیں ہوں گے یہ بات جگت جانتا تھا۔ سکھوں کی آبادی بھی بڑی تھی۔ دوسروں کی نظر سے بچنے کی خاطر جگت باہر دیکھ رہا تھا۔

''تمہیں کہاں جانا ہے جوان......؟'' ادھیڑ عمر کے شخص نے پوچھا، جگت چونکا۔

''شنکر کے مندر والے کھیت پر۔'' جگت نے آدھا جواب دیا مگر وہ پہچان گیا۔

''ہزارہ سنگھ کے مہمان ہو۔''

''جی ہاں۔ اس کا دوست ہوں۔'' جگت نے سوچا یہ اچھا چپک گیا۔ ''دو دن کے لیے آیا ہوں۔''

''پھر تو تم جگا کو پہچانتے ہو گے۔ وہ اس کا بھانجا ہے۔'' اس نے کہا جگت سناٹے میں آ گیا۔ جتنا اس نے سوچا تھا، اس سے زیادہ لوگ اس کے متعلق جانتے تھے۔

''جگت کو کون نہیں جانتا؟ ہمارے پنجاب میں ایک چھوٹا سا بچہ بھی اس نام سے واقف ہے۔'' اپنی زبان سے اپنی تعریف کرتے ہوئے جگت کو ہنسی آ گئی۔ پھر تو راستے بھر لوگوں کی زبانی جگا کے متعلق اچھی بری باتیں سننے کو ملیں۔ شنکر کے مندر کے پاس ریڑھا کھڑا ہو گیا۔ لہٰذا آزادی کے ساتھ تھیلا شانے پر لادے وہ ریڑھے سے باہر آ گیا۔ ''رام رام'' کا جواب بھی پیٹھ پھیر کر ہی دیا۔

جگت کو دور سے آتا دیکھ کر ہزارہ سامنے آ گیا۔ کھیت کے درمیان ماموں بھانجا ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

''شام ڈھل گئی۔ میرا خیال تھا کہ آج بھی تم نہیں آؤ گے۔'' جگت سمجھ گیا کہ چندن اس سے پہلے پہنچ گئی تھی۔

''چندن کور ہی آئی ہے یا اور کوئی بھی ساتھ ہے؟''

''نہیں...... اکیلی آئی ہے۔'' یہ کہہ کر ہزارہ نے تھیلا اٹھا لیا۔ ''ارے...... بہت سارا سامان لائے ہو۔'' جگت ہنسا اور تھیلا ماموں سے واپس لے لیا۔

دو دن سے انتظار کرتی ہوئی چندن فانوس تھام کر دروازے میں کھڑی تھی۔ اندھیرے میں آتے شوہر کو دیکھ کر اس کا دل اچھلنے لگا۔ ماما ساتھ نہ ہوتے تو وہ دوڑ کر اس سے لپٹ جاتی۔ بھیگتے ہوئے آنکھ کے کونوں کو اس نے خشک کر لیا۔ جگت قریب آیا، آنکھیں ملیں اور پیار کے پھول جھڑنے لگے۔

''آ گئے......'' چندن خواہش کے باوجود کہہ نہ

سکی۔ ”سب کا کیا حال ہے؟“ جگت بھی پوچھ نہ سکا۔ خاموشی کے روپ میں انہوں نے ایک دوسرے سے بہت کچھ پوچھ لیا۔ کھانا کھانے بیٹھے تب ہزارہ نے بات شروع کی۔

”چندن کور میرے رشتے کا مسئلہ کر آئی ہے۔ تمہاری سسرال میں ہی کوئی لڑکی ہے۔“

”پھر تو ہو جائے رشتہ۔“ جگت نے خوش ہو کر کہا۔

”میں نے رشتے سے انکار کر دیا ہے۔“ ہزارہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک تم گھر میں قدم نہیں رکھو گے میں رشتہ نہیں کروں گا۔“

منہ تک پہنچا ہوا نوالہ جگت کے ہاتھ میں ہی رہ گیا۔ وہ ہزارہ کو کچھ غور سے دیکھنے کے بعد بولا۔

”ماما! تم غلط ضد کر رہے ہو۔ ویسے بھی اب میں گھر جانے کے قابل نہیں رہا۔ پولیس کا وہاں سخت پہرہ ہے۔“

”یہ بہانہ نہیں چلے گا بھانجے۔ ایک بار موقع دیکھ کر دو منٹ کے لیے جا کر چہرہ دکھا آؤ۔ بیٹے کو دیکھ کر ماں جی کا دل ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

”وہ میری ماں ہیں مگر میں ان کا بیٹا نہیں رہا ماما۔“ جگت نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”تم کو چندن نے عاق کرنے والی بات نہیں بتائی شاید۔“

پراٹھے تلتی ہوئی چندن کی انگلیوں کی پوریں جل گئیں۔ وہ اٹھی اور قریب جا کر بولی۔ ”کاغذ کے ایک ٹکڑے سے ماں باپ اور بیٹے کا رشتہ تو نہیں ٹوٹ سکتا۔“ ماموں بھانجا خاموش رہے تو چندن کو جھوٹ بولنا پڑا۔ ”میں نے باپو سے کہا تھا کہ پولیس کی پریشانی سے بچنے کے لیے اس طرح کاغذ بنا لیں۔“

جگت سخت نظروں سے چندن کو دیکھنے لگا۔ ماموں کی موجودگی کا خیال کر کے وہ کچھ نہیں بولا۔ مگر اس کی تیکھی نظریں چندن کے جگر کے پار ہو گئیں۔ اچلا سچ کہہ رہی تھی۔ ان کا مزاج پہلے جیسا نہیں رہا۔ اسے ماں جی کی بات یاد آ گئی۔ ”بہو! تم اس سے ملنے ضرور جاؤ۔ مگر میرا کہا ہوا کام تمہیں کرنا پڑے گا۔ جگت کی گردن میں ایک تعویذ ہے وہ ویرو کا دیا ہوا ہے‘ وہ تم اتار لینا۔ جب تک وہ تعویذ ہوگا‘ ویرو اس کے ذہن سے نہیں نکلے گی۔ چندن نہ چاہنے کے باوجود یہ کام کرنے پر راضی ہو گئی تھی۔ اس وقت اس کی نظریں تعویذ پر جمی ہوئی تھیں۔ ممکن ہے ساس کی بات سچ ہو‘ ورنہ وہ اس قدر سخت مزاج نہ ہو جاتے۔ اسی لمحے اس نے فیصلہ کیا کہ جدا ہونے سے پیشتر وہ اس کی گردن سے تعویذ ضرور اتار لے گی...... تین دن اور چار راتیں وہ ساتھ رہے۔ جی بھر کر باتیں کیں‘ کچھ روٹھے منائے گئے‘ دو چار نرم گرم دلیلیں بھی ہوئیں۔ جگت بار بار ایک بات کا افسوس کر رہا تھا کہ جب وہ جیل سے رہا ہو کر آیا تھا اس وقت ماں نے اس سے ویرو کی بات کیوں نہیں کی؟ اگر ایسا ہو جاتا تو وہ دوبارہ ڈاکو نہ بنتا۔

”کون جانے وہ کہاں ہوگی؟ اس کی کیا حالت ہوگی......؟“

چندن ماضی کو بھلانے میں ناکام رہی تھی۔ ”یہ قسمت کی بات ہے۔ اس میں کسی کا کیا قصور؟ جب بھی ویرو کے متعلق معلوم ہوگا تو میں ماں جی اور باپو کو سمجھا کر اسے گھر لے آؤں گی۔ ہماری تو تمہارے سکھ میں خوشی ہے۔“

جگت کی ایک اور ضد بھی تھی۔ ”چندن! اب تمہیں ماں جی اور باپو کے ساتھ نہیں رہنا۔ میں ان کا بیٹا نہیں رہا‘ اسی طرح تم ان کی بہو نہیں رہیں۔

میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔''

''آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟'' چندن یہ بات برداشت نہ کرسکی۔ ''میں آپ کے ساتھ ہر جگہ جانے کو تیار ہوں، مگر ماں جی اور باپو کی اجازت کے بغیر نہیں۔'' پھر جگت کے چہرے کا بدلا ہوا رنگ دیکھ کر نرم لہجے میں بولی۔ ''شادی سے پہلے آپ نے ہی مجھ سے وچن لیا تھا کہ مجھے ماں اور باپو کی خدمت کرنی ہے۔ اب انہیں چھوڑ آنے کا حکم دے رہے ہیں۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ ہمارے علاوہ ان کا اور کون ہے؟'' چندن کے آنسوؤں نے جگت کو خاموش کردیا۔

چوتھی رات جگت نے اچانک کہا۔ ''کل صبح میں روانہ ہوجاؤں گا۔'' چندن نے دو دن مزید رکنے کی گزارش کی، مگر جگت نہ مانا۔ ''میرا ذہن مجھے خطرے سے خبردار کررہا ہے۔ میری چھٹی حس مجھے یہاں سے نکل جانے پر اکسا رہی ہے۔'' پھر وہ چندن کے چہرے پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔ ''مگر اس میں فکر کی کوئی بات نہیں، میں ہوشیاری سے نکل جاؤں گا۔''

وہ رات چندن نے جاگ کر گزاری۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے سوتے ہوئے جگت کی گردن سے تعویذ اتار لیا۔ پہلی بار شوہر کے خلاف یہ سازش کرتے ہوئے اس کا دل بہت زور سے دھڑکا۔ مگر صبح جب جگت اس سے محبت بھرے انداز میں رخصت ہوا تو چندن نے سکھ کی سانس لی کہ تعویذ کا اثر اب کم ہونے لگا ہے۔



دہلی ریلوے اسٹیشن پر ارجن سنگھ نے پولیس پارٹی کے ساتھ پڑاؤ ڈالا ہوا تھا۔ وہ دو دن سے جگا کا انتظار کررہا تھا۔ اس کا انفارمر چندکور کا تعاقب کرتا ہوا الور تک گیا تھا۔ دوسرے دن اس نے جگت کو آتے دیکھ کر فوراً پولیس چیف کو پیغام بھیج دیا۔

''جلدی آجائیں۔''

ارجن سنگھ کے لیے جگا کی گرفتاری میں راجستھان کی پولیس کی مدد لینی ضروری تھی ممکن ہے بات پھیل جائے اور جگا فرار ہوجائے۔ اس کے علاوہ جگا کی گرفتاری کے کارنامے میں دوسرے کو شریک کرنا اسے اچھا نہیں لگا۔ اتنے سال سے وہ یہ کارنامہ انجام دینے کے لیے کتنی تکلیف اٹھا چکا تھا۔ پہلی بار جگا نے خود کو قانون کے سپرد کیا تو اسے کیسی عزت ملی تھی؟ وہ یہی سوچ کر پولیس پارٹی کے ساتھ دہلی پہنچ گیا۔ الور سے دہلی آتی ہوئی اور دہلی سے لاہور جانے والی گاڑیوں پر سوار ہوتے اور اترتے مسافروں کی سخت نگرانی کی جارہی تھی۔

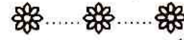
''کوئی بھی شخص تمہاری نظروں کے باہر نہیں رہنا چاہیے۔ یہاں تک کہ برقعہ پوش عورتوں پر بھی گہری نظر رکھو! ممکن ہے اس طرح وہ فرار ہوجائے۔'' یہ ارجن سنگھ کی سخت ہدایت تھی۔

جگا کو گرفتار کرنے کی خواہش جتنی ارجن سنگھ کو تھی، اتنی ہی اس کی بے چینی بھی بڑھی ہوئی تھی۔ سیکڑوں مسافروں کے درمیان جگا کو چھیڑنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ فائرنگ ہو اور بے گناہ لوگ مارے جائیں، ایک مجرم کو گرفتار کرنے کے لیے ایسا خطرہ کس طرح مول لیا جاسکتا تھا؟ یہی وجہ تھی کہ اس نے لاہور تک جگا کا تعاقب کرنے کا منصوبہ تیار کرلیا تھا۔ دوسرے دن دوپہر انفارمر نے اطلاع دی۔ ''وہ آ گیا۔ لاہور کی گاڑی میں بیٹھا ہے۔'' ارجن سنگھ کے جسم کے بال کھڑے ہوگئے جس لمحے کا اسے شدت سے انتظار تھا وہ آ گیا۔ وہ فوراً ہی ہوشیار ہوگیا۔

''اس کے پاس ہتھیار کیا ہے؟''

''کچھ دکھائی نہیں دیا ممکن ہے تھیلے میں ہو۔''

''کچھ سوچ کر ارجن سنگھ نے کہا۔ ''تم تین آدمی سادہ لباس میں اس کی بوگی میں سفر کرنا' اس پر نظر رکھتے ہوئے۔ پھر ہر اسٹیشن پر تم میں سے ایک شخص مجھے رپورٹ دیتا رہے گا۔''



گاڑی چار کی بجائے پونے چھ بجے دہلی سے روانہ ہوئی۔ اسٹیشن ماسٹر سے مشورہ کر کے ارجن سنگھ نے پولیس کی بوگی جگت کی بوگی کے برابر لگوائی۔ انجن ڈرائیور اور گارڈ کو بھی اعتماد میں لے لیا گیا۔ اس چکر میں گاڑی ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہوگئی۔ جگت کھڑکی کے باہر سر رکھ کر اونگھنے کی اداکاری کر رہا تھا۔ وہ ایک کونے میں بیٹھا رہا۔ انجن نے سیٹی بجائی تو اس نے اطمینان کی سانس لی۔ صبح کے وقت کسی بھی اسٹیشن پر اتر جانے کے متعلق اس نے سوچ رکھا تھا۔ دن کے اجالے میں لاہور کے اسٹیشن پر اترنا خطرناک تھا۔ کھڑکی کے راستے آنے والی ٹھنڈی ہوا نے اسے نیند کی آغوش میں پہنچا دیا۔ اچانک برابر والے مسافر کی گفتگو اس کے کان سے ٹکرائی۔

''پولیس والوں کی وجہ سے گاڑی لیٹ ہوئی ہے۔'' اس نے سنا۔ اس کا جسم لرز کر رہ گیا۔ اس نے ڈبے میں بیٹھے ہوئے مسافروں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ایک شخص اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ دو تین بار اس شخص کو گھورتے دیکھا جیسے وہ اس پر نظر رکھے ہوئے ہو۔ وہ ہوشیار ہوگیا۔ گاڑی پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ درمیان میں لہلہاتے کھیت نظر آ رہے تھے۔ دن ڈوب رہا تھا۔

پولیس کو کس نے اطلاع دی ہوگی؟ کیا اس کے کسی ساتھی نے؟ چندن کو یقین تھا کہ گھر والوں کے علاوہ کوئی جگت سے ملنے کی بات نہیں جانتا پھر پولیس نے اسے الور میں کیوں نہیں گھیر لیا؟ جگت کے ذہن پر ہتھوڑے سے برس رہے تھے۔ ان خیالات میں وقت ضائع کرنے کی بجائے پہلے فرار ہونے کے بارے میں سوچنا تھا۔ انبالہ اسٹیشن پر بھی پولیس اسے گھیر سکتی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا۔

''اب کون سا اسٹیشن آنے والا ہے؟'' اس نے برابر والے مسافر سے پوچھا۔

''انبالہ......'' نام سن کر اس نے چونکنے کی اداکاری کی۔ پیر کے پاس پڑا ہوا تھیلا اٹھایا۔ مسافر نے بتایا کہ انبالہ ابھی دور ہے تو اس نے اپنی آخری انگلی اٹھائی اور اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

لیٹرین بند تھی۔ لہٰذا وہ بوگی کے دروازے کے قریب کھڑا ہوگیا۔ دور اسٹیشن کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ وقت گاڑی کے دوڑتے ہوئے پہیوں کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔ جگت نے نیچے نظر ڈالی۔ زمین نرم دکھائی دی۔ کھیت گزرنے لگے۔ اس نے گرو گوبند کا نام لے کر دوڑتی گاڑی سے باہر جست لگائی۔ قلابازی کھاتا ہوا وہ پندرہ فٹ دور گرا۔

''کوئی گرا......کوئی گرا......'' کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ارجن سنگھ کے آدمی نے زنجیر کھینچ لی۔ دو فرلانگ دور جھٹکے کے ساتھ گاڑی رک گئی۔ ارجن سنگھ گرجا۔ ''کون تھا جاؤ سب۔''

پندرہ منٹ میں پچھتر پولیس والے اس جگہ پہنچ گئے جہاں جگا گرا تھا ارجن سنگھ گرجا۔ ''جگا! تم گھیر لیے گئے ہو۔ اسلحہ پھینک دو۔'' جواب نہ ملا۔ ٹارچ کی روشنی الٹے پڑے ہوئے جگا کے جسم پر رک گئی۔ رائفلیں تان کر گول گھیرے میں پولیس والے ایڈوانس کر رہے تھے۔ جگت کا جسم اسی طرح ساکت رہا۔ کچھ دیر تک سب سانس روکے کھڑے رہے۔ جگا کسی بھی لمحے وار کر سکتا تھا مگر ٹارچ کی روشنی میں سر سے بہتی ہوئی لہو کی لکیر نظر آئی تو ارجن

سنگھ ہمت کر کے آگے بڑھا۔ نزدیک جا کر دیکھا تو جگا بے ہوش تھا۔

جگت نے آنکھیں کھولیں تو اس کی کلائیاں ہتھکڑی میں پھنسی ہوئی تھیں۔ پیر باندھ دیئے گئے تھے۔ حلق پر ہاتھ پھیرا تو تعویذ کی جگہ حلق کے گرد ڈور کا حلقہ بندھا ہوا تھا۔ جگت کا دل بیٹھ گیا۔ تعویذ کہاں گیا؟ کیا اس کی موت قریب آ گئی؟

''جگت کو گردن میں ڈورا کھٹک رہا ہے۔'' ارجن سنگھ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''کچھ دن برداشت کرنا پڑے گا' پھانسی کا پھندہ کھینچا جائے گا تو سب کھیل ختم ہو جائے گا۔''

❀......❀......❀

لرزتے ہوئے دل سے چندن کور نے گھر میں قدم رکھا۔ الور سے روانگی کے وقت دل میں کیسے کیسے منصوبے بنائے تھے؟ گھر جا کر ساس سے یہ کہوں گی' اس طرح سمجھاؤں گی' تعویز دکھا کر خوش کروں گی' اب ان کے ذہن میں بڑا فرق پڑ گیا ہے۔ جدا ہوتے ہوئے سلام بھی کہلوایا ہے۔ موقع ملنے پر گھر آ کر آپ دونوں کو چہرہ دکھانے کا بھی یقین دلایا ہے۔''

مگر دل کی بات دل میں رہ گئی۔ شیخوپورہ پہنچنے سے قبل ہی ٹرین میں دل دہلانے والی خبر ملی۔

''جگا ڈاکو گرفتار ہو گیا۔ پولیس کو ایک گولی نہیں چلانی پڑی۔ دوڑتی ٹرین سے کودا' مگر بیچارہ کامیاب نہ ہوا۔''

یہ سن کر چندن کور کا دل اتنے زور سے دھڑ کنے لگا جیسے اس کا سینہ پھٹ جائے گا۔ کسی کو پتہ نہ چل جائے کہ وہ جگا کی بیوی ہے اس لیے اس نے خود پر بڑا ضبط کیا۔ کیا تنہائی میں جگت سے اس کی یہ آخری ملاقات تھی؟ اب تو......؟ اس منحوس خیال کو اس نے جلدی سے دل سے نکال پھینکا۔ لیکن اس طرح کرنے سے ہونی کو روکا جا سکتا ہے؟

کالا پانی...... عمر قید یا پھانسی...... اور اسی کے ساتھ اسے دوپٹے کے سرے پر بندھا ہوا تعویذ یاد آ گیا۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ میں نے ان کی گردن سے تعویذ کیوں اتار لیا؟ وہ خالی گردن دیکھ کر کیا سوچیں گے؟ ان کے دل میں ہمیشہ کے لیے نفرت بیٹھ جائے گی۔ اب میں انہیں کس طرح چہرہ دکھاؤں گی؟ ان کا کیا ہو گا؟

چندن کے ذہن میں خیالات کا سیلاب موجزن تھا۔ وہ خود کو کوسنے لگی۔ ''وہ مجھ سے ملنے آئے' میں نے بلایا اور وہ گرفتار ہو گئے۔'' سکھ پانے کے بدلے اس کے پاگل پن نے دکھ کا پہاڑ سر پر لے لیا۔ چلتی ٹرین سے کود گئے۔ یقیناً ضرب لگی ہو گی۔ پھر پولیس ظلم ڈھائے گی...... اوہ بھگوان؟ میری زندگی لے لو مگر انہیں آنچ نہ آنے دو۔ چندن کور نے بمشکل سفر پورا کیا۔

اس نے سوچا تھا کہ گھر پر خبر نہیں پہنچی ہو گی۔ میں یہ خبر اس طرح دوں گی کہ ساس سسر کو صدمہ نہ ہو مگر اس کا خیال غلط ثابت ہوا' ماں جی' نانا اور سوہن سنگھ اداس چہرے لیے بیٹھے تھے۔ چندن بمشکل کمرے تک پہنچی' کپڑوں کا بنڈل پھینک کر کھلے دل سے رونے لگی...... ضبط کا بند ٹوٹ چکا تھا۔ آنسوؤں کا سیلاب بہنے لگا۔ بزرگوں نے اسے رونے دیا اچھا ہے دل کا غبار نکل جائے گا۔ اب اسے دلاسا دینے کا بہانہ بھی کیا تھا؟ انجام سے سب واقف تھے۔

❀......❀......❀

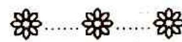
جگت کے ساتھی بھی مایوس ہو گئے۔ بچن سنگھ ''مٹھیاں کتا'' دانت پیستا ہوا ارجن سنگھ کو گالیاں بک رہا تھا۔ ''میں اس کی کھال اتار دوں گا۔'' مگر فی الحال

یہ غصہ کھمبا نوچنے کے برابر تھا۔ ارجن سنگھ سے پہلے یہ سوچنا تھا کہ جگت کو کس طرح آزاد کرایا جائے؟ پولیس اب غافل نہیں رہے گی، بچن جل رہا تھا ممکن ہے جگت کا اس پر شک جائے؟ چندن کور کے ساتھ ملاقات کا پروگرام اسی نے بنایا تھا۔

''نہیں، نہیں...... میں پولیس کے ہاتھ میں جگت کو تڑپنے نہیں دوں گا۔ چاہے ہم میں سے دو چار کو جان کی قربانی دینی پڑے۔'' بچن گرجنے لگا۔ ہنومان سرخ آنکھوں سے بچن کو دیکھ رہا تھا۔ جگت کی گرفتاری نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ساری رات وہ منہ چھپا کر رو دیا تھا۔ اس کو اپنی اپاہج حالت اب کھٹک رہی تھی۔

''بچن! میرے پیر صحیح ہوتے تو تم لوگوں کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اکیلا جا کر اسے رہا کرا لاتا۔ مجھے چھوڑ کر بچن تم کچھ نہ کرنا۔ میں نے سب سوچا ہوا ہے۔ اب میں جو کہوں گا وہی تم لوگوں کو کرنا ہے۔''

ہنومان کو پہلے کبھی اتنا پرجوش نہیں دیکھا گیا تھا۔ بچن نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تو وہ اور بھڑ گیا۔ ''مجھے بہلانے کی ضرورت نہیں، اس بار میں اپنی مرضی کروں گا اور تم سے وہی کراؤں گا جو میں نے سوچا ہے۔ ورنہ......'' ہنومان رک گیا، پھر سب کو تیز نظروں سے گھور کر بولا۔ ''جگت کو کچھ ہو گیا تو تم لوگ مجھے زندہ نہیں دیکھو گے۔''



ہر طرف ارجن سنگھ کی تعریف ہونے لگی۔ آخر اس نے جگا کو گھیر لیا اور وہ بھی بڑی آسانی سے۔ حالانکہ کچھ لوگ اسے اس کے پیچھے برا کہتے تھے۔

''بے ہوش تھا اس لیے گرفتار کر لیا، اس میں کیا بہادری کی؟ ورنہ جگا کسی صورت میں زندہ ہاتھ نہ لگتا۔'' اخباروں میں پہلی بار جگا کی تصویریں شائع ہوئیں۔ ساتھ ہی ارجن سنگھ کی تصویر بھی تھی۔

''پنجاب کا خوفناک ڈاکو پولیس کے ہاتھ لگ گیا۔ فرد جرم تیار ہو رہی ہے۔ عنقریب کیس چلے گا۔''

ارجن سنگھ کی اب ایک ہی خواہش باقی تھی کہ وہ جگا کو پھانسی پاتے دیکھ لے، مگر اس بار وہ بہت محتاط تھا۔ اس نے عدالت سے ریمانڈ لے لیا۔ جس قدر ہو سکے الزامات عائد کیے جائیں، مضبوط ثبوت پیش کیے جائیں۔ اسے نیند میں بھی جگت پھانسی پاتا دکھائی دینے لگا۔ جگت کے چہرے پر سیاہ کپڑا لپٹا ہوا ہے۔ اس کو پھانسی گھر کی جانب لے جانے سے پہلے پوچھا گیا ہے۔ ''بولو! تمہاری آخری خواہش کیا ہے؟'' جگا کی آخری خواہش کیا ہوگی؟ ارجن سنگھ سوچ میں ڈوب جاتا۔ یہ جاننے کی خواہش میں وہ ایک دن زنجیروں میں جکڑے ہوئے جگت کے پاس گیا۔

''کیا حال ہے؟ تمہاری کیسی خاطر ہو رہی ہے؟ کچھ ضرورت ہو تو بتا دینا!'' طنزیہ لہجے میں ارجن سنگھ نے کہا۔

جواب میں جگت نے آنکھیں پھیلا کر غصے کا اظہار کیا۔ اس کے غصے پر ارجن سنگھ کو لطف آیا۔

''کیوں جگا اس بار پھانسی یقینی ہے نا؟'' جگت کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے خوف کا تاثر ابھرا۔ وہ خاموش رہا۔ ''تمہاری آخری خواہش کیا ہے پہلے سے بتا دو تا کہ آخر میں الجھن نہ رہے۔'' جگت نے دانت پیس لیے۔ اس کی مٹھیاں کس گئیں اور اس نے ہتھکڑی توڑنے کے لیے طاقت لگائی۔ ارجن سنگھ اس کی بے بسی پر قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ اس کا قہقہہ ابھی تھما نہیں تھا کہ جگت بولا۔

''آخری خواہش پوچھنے سے پیشتر اس وقت

میری خواہش کیا ہے یہ پوچھو۔'' وہ کچھ دیر رک گیا۔ پھر دانت پیس کر بولا۔ ''میری پہلی خواہش تمہاری زبان کاٹنے کی ہے۔ بولو! مجھے اتنی دیر کے لیے آزاد کرتے ہو؟''

''ہاہاہا......'' بیہودگی سے ہنس کر ارجن سنگھ بولا۔ ''جگا یہ بھول جا...... میری زبان تو کیا میرا بال بیکا نہیں کر سکے گا۔'' یہ کہہ کر ارجن سنگھ نے جگت کے جبڑے پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ لگایا۔ جگت بپھر گیا مگر اس کے بازو رسی سے جکڑے ہوئے تھے اور دو سپاہیوں نے اسے سختی سے کھینچا ہوا تھا۔ وہ سرخ جبڑوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا ارجن سنگھ کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگا۔ نہ جانے کیوں اس وقت ارجن سنگھ وہاں سے چلا گیا جیسے وہ اچانک خوف زدہ ہو گیا ہو مگر دس قدم دور جا کر رک گیا۔ جگت کو ستانے کی خواہش کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے بولا۔

''اپنی خواہش بتادوں...... تمہارے پھانسی پر چڑھتے وقت ویرو کو تمہارے سامنے لاؤں گا۔ تمہارے گلے میں پھندہ ہوگا' اس لمحے ویرو کے گلے میں میری باہوں کا پھندہ ہوگا۔''

''بدمعاش......!'' جگت چیخ اٹھا۔ ''ویرو کو تم نے چھپا رکھا ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ اسے گالیاں دینے لگا۔ سپاہی جگت پر ٹوٹ پڑے اور ارجن سنگھ خوش ہوتا ہوا چلا گیا۔ اس نے جگا کے دل میں ایسی آگ بھڑکائی تھی کہ اسے آہستہ آہستہ جلاتی رہے گی۔



''صاحب! جگا کے گھر والے جگا سے ملنا چاہتے ہیں۔'' سنتری نے سلام کر کے چیف کو خبر دی۔ ارجن سنگھ بہت دنوں سے یہی سوچ رہا تھا کہ اس بار جگا کے گھر والے ملاقات کے لیے کیوں نہیں آئے؟ وہ ڈنک مارنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ جگت کے ماں باپ نے عاق کرنے کی دستاویز دکھا کر اسے تلاشی لینے سے روک دیا تھا' وہ غصہ اتارنے کا اب وقت آ گیا تھا۔ پرمسرت لہجے میں اس نے پوچھا۔ ''کون ملنے آیا ہے؟''

''جگا کی بیوی ہے صاحب!''

ارجن سنگھ ٹھنڈا ہو گیا۔ جگا کا باپو آیا ہوتا تو ذلیل کر کے نکالتا پھر بھی کچھ نہیں' اس کی بیوی کو بھی کچھ تڑپاؤں گا۔ ''جاؤ! اسے یہاں بھیج دو۔''

چندن کو آ کر کھڑی رہی' پھر بھی بہت دیر تک وہ کاغذات پر نظر گاڑ کر کام کرنے کا دکھاوا کرتا رہا۔

''ہم...... کیا ہے؟'' کہہ کر اس نے سر اٹھایا تو چندن نے سر جھکا لیا۔ رحم کھانے والے انداز میں ارجن سنگھ بولا۔ ''خاندانی عورت کو پولیس تھانے آنا پڑا؟ تمہارا بھی ایسے سے ساتھ ہو گیا۔''

چندن نے جھٹکے سے گردن اٹھائی۔ اس کی آنکھوں میں غصہ برس رہا تھا۔ ارجن سنگھ نے پھر جلتی پر تیل ڈالا۔ ''ابھی بھی محبت کم نہیں ہوئی؟ اکیلی ہی آئی ہو؟''

''نہیں...... ماما جی باہر بیٹھے ہیں۔'' وہ غصہ ضبط کر کے بولی کیونکہ جواب دینا ضروری تھا۔ ملاقات کی اجازت اسی سے لینی تھی۔ ''کیا میں ان سے مل سکتی ہوں؟'' ارجن سنگھ انکار نہیں کر سکتا تھا' مگر اتنی آسانی سے اجازت بھی نہیں دینی تھی۔

''تمہارے ملنے کے پاگل پن سے تو میرا شکار مجھے آسانی سے مل گیا...... تم یہ سمجھتی تھیں کہ راجستھان تک کون تعاقب کرے گا۔'' چندن نے ہونٹ کاٹ لیے۔ اس کی بے پروائی سے جگت گرفتار ہوا' اس کا اسے یقین ہو گیا۔ اسے یہ سوچ کر صدمہ ہوا' آنکھیں بھر آئیں۔

''اس میں رونے کی کیا بات ہے' ملاقات کی اجازت مل جائے گی۔'' پھر چندن کو خوش ہوتا دیکھ کر بولا۔ ''وہ بھی صرف ایک بار...... دو منٹ کے لیے۔''

وہ آہ بھر کر بولی۔ بہتر...... جیسی آپ کی مرضی۔''

پولیس چیف نے سنتری کو حکم دیا۔

''جاؤ اسے لے جاؤ...... شوہر کو زنجیر میں جکڑا دیکھ کر اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔'' یہ سن کر چندن کو آگ لگ گئی مگر وہ مجبور تھی...... یہ سننے اور ضبط کرنے کا وقت تھا۔ اس کے پیچھے ارجن سنگھ کے الفاظ ہنٹر کی طرح ٹکرائے۔ ''دیکھنا' اسے دور سے ملنے دینا...... پولیس چوکی میں پیار کرنا منع ہے۔'' دو منٹ کی ملاقات کے دوران نصف منٹ تک چندن روتی رہی۔ جگت سے وہ آنکھیں نہیں ملا پا رہی تھی۔

''نہ رو چندن ایک دن ایسا ہونا تھا۔ بس ذرا پہلے ہو گیا۔'' مگر چندن کے منہ سے سسکیوں کے علاوہ کچھ نہ نکلا۔ جگت نے پوچھا۔ ''اکیلی آئی ہو؟'' چندن نے روتے ہوئے سر جھکا لیا۔ وہ پھر بولا۔ ''اب ماں اور باپو کیسے آئیں گے؟ انہوں نے مجھے عاق جو کر دیا ہے۔''

''نہیں' نہیں...... انہوں نے ہی مجھے بھیجا ہے آپ کی خبر معلوم کرنے کے لیے۔ کہتے ہیں کسی اچھے وکیل کو پیروی کے لیے کھڑا کریں گے۔'' جگت نرم ہو گیا۔ وہ سخت الفاظ کہہ کر چندن کور کا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا۔

''اس میں وکیل سے کام نہیں بنے گا۔ میں خود اپنا راستہ تلاش کر لوں گا۔'' یہ سن کر چندن کور کے پاس کھڑے ہوئے پہریدار کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس لیے اس نے بات بدل دی۔ ''میں خود اپنا کیس لڑوں گا۔''

''ٹائم پورا ہو گیا......'' پہریدار کی آواز آئی اور وہ لرز گئی۔ جس کام کے لیے آئی تھی وہ تو رہ گیا۔ اس نے گڑگڑانے والے لہجے میں چوکیدار سے کہا۔

''جانے سے پہلے میں ان کے پاؤں تو چھو لوں۔''

دور سے ملنے کا صاحب کا حکم تھا۔ وہ منع کرنا چاہتا تھا مگر چندن کا رحم طلب چہرہ دیکھ کر پگھل گیا۔ ایک عورت کی خواہش کو وہ ٹھکرا نہ سکا۔ نظر گھما کر اس نے یقین کر لیا کہ چیف نہیں ہے۔ اس لیے وہ بولا۔

''اچھا...... جلدی کرو۔''

چندن کور لرزتے قدموں سے قریب گئی۔ فولادی سلاخوں کے درمیان سے دو ہاتھ جگت کے پیروں کی جانب بڑھاتے ہوئے اس کا دل بھر آیا۔ جگت کو پیروں کے قریب کوئی چیز محسوس ہوئی۔ اس نے ہوشیار ہو کر پنجہ اٹھا لیا۔ چندن کور نے پنجے کے نیچے کی دھول لینے کے بہانے کوئی چیز دبا دی' پھر چرن دھول سر پر چڑھاتی تیزی سے کھڑی ہو گئی۔ جاتے ہوئے جگت کو ایک نظر دیکھا' جگت کی مسکراہٹ نے ڈوبتے ہوئے دل کو سکون بخشا' چندن کور چلی گئی تو پاؤں کھجانے کے بہانے جگت نیچے جھکا۔ پولیس کی نظر بچا کر اس نے وہ چیز مٹھی میں دبا لی۔ چندن کیا دے گئی؟ اس کا تجسس بڑھ رہا تھا۔ مگر تنہائی ہونے تک اسے صبر کرنا تھا۔ کوٹھڑی کے اندر جا کر اس نے پڑیا کھولی تو آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''تعویذ...... چندن کے پاس کہاں سے آیا؟ ممکن ہے میں الور بھول گیا ہوں۔ تعویذ واپس لوٹانے کے لیے چندن نے خوب ترکیب کی' کیا اسے بھی تعویذ پر میری طرح یقین ہو گا؟

تعویذ کے لمس سے جگت کے جسم میں پھرتی آ گئی۔ ارجن سنگھ کے چبھتے ہوئے الفاظ اسے یاد آئے اور وہ سوچنے لگا کہ کیا ویر و اس کے قبضے میں

ہوگی؟ جگت نے فیصلہ کرلیا کہ ہر قیمت پر یہاں سے فرار ہوجائے گا۔ اس نے سوچا کہ جب اسے عدالت میں لے جانے کے لیے باہر نکالا جائے گا' اس وقت وہ فرار کی کوشش کرے گا۔ پہلے وہ تمام باتوں پر غور کرلینا چاہتا تھا۔ اب تو اسے روز روز عدالت کے چکر لگانے تھے۔ کبھی موقع مل ہی جائے گا اور جگت کا ذہن کمزور پہلو تلاش کرنے میں محو ہوگیا۔

ڈیڑھ ماہ بیت گیا...... پھر بھی ارجن سنگھ کی خواہش کے مطابق ثبوت نہیں مل رہے تھے۔ ریمانڈ لینے کے لیے اسے بار بار عدالت سے درخواست کرنی پڑ رہی تھی۔ سرکاری وکیل کو یقین نہیں تھا کہ اتنے ثبوت پر اسے پھانسی ہوجائے گی۔ ارجن کی ضد تھی کہ جگا کے گلے میں پھانسی کا پھندہ نہیں پڑا تو اسے صدمہ ہوگا۔ وہ کہتا۔ ''مجھے اس سے انتقام لینا ہے۔''

ڈھلتی دوپہر کو موسم کی پہلی برسات ہوئی۔ ارجن کا نشہ کرنے کو جی چاہا۔ اس نے جلدی گھر جانے کے لیے میز پر پڑی ہوئی فائل بند کی' کمر پر بیلٹ باندھی اور اٹھ گیا۔ مگر کوئی شخص دروازے میں اس کا راستہ روک کر کھڑا ہوا تھا۔ بیساکھیاں بغل میں دبائے ان کے سہارے کھڑا ہوا وہ شخص ارجن سنگھ کو دیکھ کر ہنسا۔ ارجن سنگھ کو اس شخص کا چہرہ دیکھا ہوا لگا۔

''تو کون ہے؟'' اس نے رعب سے پوچھا۔

''مجھے نہیں پہچانا صاحب؟ میں ہنومان سنگھ ہوں۔'' پھر مزید بولا۔ ''ہنومان...... جگت کا ساتھی۔''

''اوہ......'' کہتے ہوئے پولیس چیف کا ہاتھ بیلٹ پر گیا۔

ہنومان پرسکون انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ ''پستول کی ضرورت نہیں۔ تم دیکھ رہے ہو' میں اپاہج ہوں اور بغیر اسلحہ کے ہوں۔'' پھر بھی ارجن سنگھ نے پستول تیار رکھا تھا۔ سپاہیوں نے بھی ہنومان کو گھیر لیا۔ ہنومان بیساکھیوں کے سہارے دو قدم آگے بڑھا' ارجن سنگھ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''اسے گرفتار کرلو۔'' دو آدمیوں نے ہنومان کے بازو تھام لیے۔ ''اگر اس نے اسلحہ چھپایا ہوا ہو تو اسے تلاش کرکے قبضے میں کرلو۔'' ارجن سنگھ کو اب بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ ممکن ہے وہ لنگڑا ہونے کی اداکاری کررہا ہو...... اس نے تین سپاہی باہر بھیجے۔ ''دیکھو...... اردگرد اس کے ساتھی تو نہیں چھپے ہوئے؟''

ہنومان ہنس دیا۔ ''صاحب! یہ سب تکلیف کیوں اٹھا رہے ہوں؟'' پھر جبڑے سخت کرتا ہوا بولا۔ ''میرے ساتھیوں کو گرفتار کرنا ہو تو مجھے ذرا بیٹھنے دو اور میری بات سنو۔'' یہ سن کر ارجن سنگھ کے ذہن میں روشنی ہوگئی۔ بات کچھ اور ہے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اسے کرسی دو' اور اس کی بیساکھیاں لے کر باہر چلے جاؤ' دروازے پر سخت پہرہ رکھو۔'' ارجن سنگھ نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ہنومان اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا تو ارجن سنگھ جلدی سے بولا۔ ''اب بتاؤ' تمہاری کیا چال ہے؟''

''چال نہیں چیف صاحب!'' ہنومان مطمئن لہجے میں بولا۔ ''سودے بازی کرنے آیا ہوں۔''

''سودے بازی۔'' ارجن سنگھ کا اندازہ صحیح ثابت ہورہا تھا۔ ''جلدی بول ڈالو ورنہ یاد رکھو چالاکی دکھائی تو گولی ماردوں گا۔''

''چالاکی تو آپ آزمائیں گے۔'' ہنومان نے

آنکھ ماری۔ ''میں بچن سے انتقام لینے آیا ہوں۔ اس نے جگا سے دغا کی اور مجھے بھی دھکے دے کر نکال دیا۔'' ارجن سنگھ کی بھویں تن گئیں۔ اسے بات میں کچھ وزن نظر آنے لگا۔ اس نے ہنومان کو بولنے دیا۔ ''جگا کو تم اس لیے گرفتار کر سکے کہ بچن نے چندن کور سے جگا کی ملاقات کا منصوبہ بنایا تھا' پھر تمہارے ڈیپارٹمنٹ کو خبر کردی۔''

''غلط بات۔'' ارجن سنگھ نے میز پر ہاتھ مارا۔ ''ہمارا انفارمر جگا کے مکان کی چوبیس گھنٹے نگرانی کر رہا تھا۔''

''یہ کارنامہ تم چاہے اپنے حساب میں رکھو۔'' ہنومان بغیر ہچکچائے بولا۔ ''مگر بچن نے جگت کو زبردستی الور بھیجا تھا اور اس کے جانے کے بعد ہم سے کہا تھا' اب جگا کبھی واپس نہیں آئے گا۔''

''یہ تو اتفاقیہ بات ہوئی۔ میں ماننے کو تیار نہیں۔'' ارجن سنگھ نے ہنومان سے مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے کہا۔ ''اس میں تم کیسا سودا کرنے آئے ہو؟''

''میں یہی کہوں گا' جگا کی گرفتاری کے بعد میری باری آئی۔ مجھے گروہ سے نکال دیا۔ میں نے حصہ مانگا تو کہنے لگا لنگڑے' تم چھ سال سے پڑے ہماری کمائی کھا رہے ہو اور اب حصہ مانگ رہے ہو؟''

ہنومان کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا اور آواز میں سختی آ گئی۔ ''جس نے مجھے دھکے دے کر نکال دیا' میں اس کو دھکا دینا چاہتا ہوں تاکہ اسے پتہ چلے کہ میں لنگڑا ہونے کے باوجود بھی کچھ کر سکتا ہوں۔''

ارجن سنگھ جوش کو روک نہیں سکا۔ ''وہ کس طرح......؟''

''بچن کے گروہ کو گرفتار کرا کر۔'' ہنومان نے ہتھیلی کھجائی۔ ''مگر اس کے بدلے میں اپنی معافی کا وعدہ چاہتا ہوں۔'' کچھ دیر تک ارجن سنگھ تیز نظروں سے ہنومان کا جائزہ لیتا رہا' بات کچھ بات بن رہی تھی۔ جگا اور ہنومان اس کے قبضے میں آ گئے تھے۔ اب بچن کا گروہ پکڑا جائے تو اس صورت میں گورنر اس کی پیٹھ تھپتھپانے ضرور آئے گا۔ جوتشی نے سچ کہا تھا کہ اسے ایک بڑی کامیابی حاصل ہونے والی ہے' پھر بھی ہنومان کو ٹٹولنا چاہیے۔ اس نے سوچا۔

''اور اگر تمہاری اطلاع غلط ہوئی پھر؟''

''پھر میں تمہارے ہاتھ میں ہوں گا...... جو چاہو کرنا۔'' اس کی آواز مستحکم تھی۔

ارجن سنگھ کھڑا ہوگیا۔ ''پھر میرے ساتھ چلو اور بچن کا پتہ بتاؤ۔''

ہنومان نے کھڑے ہونے کی کوشش نہیں کی۔ ''یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ میں ساتھ رہوں گا تو اس صورت میں زندہ نہیں لوٹوں گا۔ بچن کو شک نہیں ہونا چاہیے کہ میں نے اطلاع فراہم کی ہے۔ تمہیں میری حفاظت کرنی پڑے گی۔''

ارجن سنگھ کو ہنومان کی ہوشیاری پر غصہ آیا' مگر اسے تجربہ ہو چکا تھا کہ آدمی ضد پر آ جائے تو اسے کوئی نہیں جھکا سکتا' اس نے سوچا کہ اسے چالاکی سے کام لینا پڑے گا۔

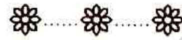
''اچھی بات ہے...... پھر بتاؤ اس کا پڑاؤ کہاں ہے؟''

ہنومان کچھ دیر خاموش رہا' اردگرد نظر گھمائی۔ ''دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا چہرہ ارجن سنگھ کے کان کے قریب کرلیا۔ ارجن سنگھ مسرت سے جھوم اٹھا۔ کتنے آدمی ہیں؟ کیا اسلحہ ہے؟ ڈاکوؤں کے فرار کے اور کون سے راستے ہیں؟ تمام تفصیلات جان کر وہ کھڑا ہوگیا۔ ''صاحب! میں نے انفارمیشن دی مگر معافی کا

مجھے یقین نہیں ملا۔'' ہنومان سر جھکاتا ہوا بولا۔

''میری زبان پر اعتماد کرو۔'' ارجن سنگھ جاتے ہوئے بولا۔ ''ابھی مجھے تمہاری اطلاع کا پھل بھی نہیں ملا۔''

دو سپاہیوں کو حکم کر کے ہنومان کو الگ کوٹھڑی میں بند کیا اور پولیس چیف سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ ڈاکوؤں کو گرفتار کرنے روانہ ہوگیا۔



نصف شب سے پہلے ہنومان کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا۔ ارجن سنگھ پیر پٹختا ہوا داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر غصہ اور افسوس جھلک رہا تھا۔ ہنومان کی سانسیں تیز ہوگئیں۔ بہت دیر تک ارجن سنگھ اسے گھورتا رہا پھر ہونٹ کاٹ کر بولا۔ ''بیکار تھکن ہوئی۔'' یہ سن کر ہنومان نے آہ بھر کر پیشانی پر ہاتھ مارا۔ ''ہمارے پہنچنے سے پہلے بچن اپنے ساتھیوں کے ساتھ فرار ہوگیا۔ ہنومان! سچ بتا کیا تو ہم سے کسی قسم کا کھیل کھیلنے آیا تھا؟''

''اب بھی تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں کہ میری اطلاع سچ تھی۔ تم لیٹ ہوگئے اس میں میرا کیا قصور؟ تمہارا کوئی آدمی چغلی کھا کر آیا ہوگا۔''

''بکواس مت کرو۔'' ارجن سنگھ دہاڑا۔ ''پولیس پر الزام دھر کر تم بچ نہیں سکتے۔ جیپ سے زیادہ رفتار سے کوئی نہیں پہنچ سکتا تھا۔''

''پھر بچن کو مجھ پر شک ہوگیا ہوگا۔'' ہنومان نے ہاتھ جوڑے۔ ''صاحب! تمہیں وچن نبھانا ہوگا' بچن کے دوسرے ٹھکانے بھی میں جانتا ہوں' وہ جب تک ہاتھ نہیں آتا' آپ مجھے بند رکھنا۔'' ارجن سنگھ الجھن میں پڑ گیا۔

پورے راستے اس کے ذہن میں ایک خیال گردش کرتا رہا تھا۔ ''بچن کو تو پھر بھی پکڑا جا سکتا ہے مگر جگت کا کیا ہو؟'' پھر کسی فیصلے پر پہنچ کر اچانک رک گیا۔ ''اب ہم سودا بدلیں گے۔ تمہیں رہا ہونا ہے تو میرا کہنا مانو گے۔''

''کیا؟'' ہنومان کا منہ کھل گیا۔

''تمہیں جگت کے خلاف گواہی دینی پڑے گی۔''

''کیا......؟'' ہنومان سرتاپا لرز گیا۔

''میں...... میں...... مگر یہ مجھ سے کیسے ہوسکتا ہے؟'' یہ کہتے ہوئے اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔

''ورنہ جگا کے ساتھ تم بھی پھانسی پر لٹکو گے۔'' یہ کہہ کر ارجن سنگھ نے کوٹھڑی کا دروازہ بند کرا دیا اور جاتے ہوئے کہتا گیا۔ ''چوبیس گھنٹے کی مہلت دے رہا ہوں۔ سوچ لینا' تم سرکاری گواہ بنو گے تو تمہارے جرائم معاف ہوسکتے ہیں۔''

چوبیس گھنٹے بعد ارجن سنگھ جواب لینے آیا تو ہنومان پیروں میں گر گیا۔ رویا' گڑگڑایا۔ ''میں تو بچن سے انتقام لینے آیا تھا۔ آپ مجھے جگا کے سلسلے میں کہاں پھنسا رہے ہیں؟''

''سرکاری گواہ بنے بغیر تمہیں معافی نہیں ملے گی۔'' ارجن سنگھ کی ضد جاری رہی۔

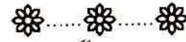
ہنومان نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ ''رہا ہو کر کیا کروں گا؟ جگا کا ماموں مجھے زندہ نہیں رہنے دے گا۔''

''اس کا میں انتظام کردوں گا۔ دو چار سال کے لیے پنجاب سے باہر چلے جانا۔ سفر خرچ میں دوں گا۔'' ارجن سنگھ نے اطمینان دلایا۔ آخر مجبوراً ہنومان راضی ہوگیا۔

''اچھی بات ہے۔ جگا کے جو بھی نصیب ہو' میں کیوں اپنی زندگی خراب کروں؟''

وہ گھڑی ارجن سنگھ کو نصیب والی محسوس ہوئی۔ اب ہنومان کو حفاظت سے رکھنا ہوگا۔ عدالت میں

ہنومان کو دیکھ کر جگت کے جسم کے بال کھڑے ہوجائیں گے۔وہ سوچ رہا تھا۔



پیشی کے دوران ارجن سنگھ ہر طرف سے مطمئن تھا۔بچن کی جگا سے دشمنی ہوگئی یہ جاننے کے بعد اسے اطمینان تھا کہ اب جگا فرار نہیں ہوگا۔سرکاری وکیل نے تیار کی ہوئی گواہی پر ہنومان سے انگوٹھا لگوایا۔اب عدالت میں اقرار کرلے' اتنی دیر تھی۔ جگت کی جانب سے کوئی وکیل نہیں تھا مگر قتل کے مجرم کی صفائی کے لیے عدالت کی جانب سے وکیل کا انتظام ہوتا ہے۔اس میں صفائی کی ضرورت بھی کیا تھی؟ چٹکی بجاتے کھیل ختم ہوجائے گا۔باہر کے لوگوں کو داخلے کی ممانعت تھی۔جالی دار بند وین میں جگا کو لایا گیا۔پچھلی جیپ میں ارجن سنگھ تھا۔کچہری میں دونوں گاڑیاں داخل ہوئیں۔اس وقت آسمان پر اساڑھ کے بادل گھرے ہوئے تھے۔

ہوا زور سے چل رہی تھی۔جگت کو وین سے نیچے اتارا گیا۔ہتھکڑی کے باوجود اس کے بازوؤں پر رسی بندھی تھی۔دو رائفل بردار پولیس والے رسی کے سرے پکڑ کر اس کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔ ارجن سنگھ کی جیپ سے ہنومان کو اترتے دیکھ کر جگت چونکا۔یہ کب اور کس طرح پکڑا گیا؟اس نے سوچا۔ ارجن سنگھ اس کی الجھن دیکھ کر خوش ہوا۔اپاہج ہنومان کو ہتھکڑی پہنانے کی ضرورت نہیں تھی' پھر بھی اس کے گلے میں رسی پڑی ہوئی تھی۔ بیساکھیوں کے سہارے ہنومان دو قدم آگے بڑھا۔عقب میں ایک پولیس والا رسی تھام کر چل رہا تھا۔ہنومان اور جگت کی آنکھیں ملیں' ہنومان نے سر جھکا لیا۔جگت کو تعجب ہوا۔ارجن سنگھ بولا۔

''اب یہ تمہارا دوست نہیں رہا۔ہمارا ساتھی بن گیا ہے۔یہ سرکاری گواہ ہے۔''

جگت نے ہونٹ کاٹ لیے۔ دونوں کے درمیان سات آٹھ قدم کا فاصلہ تھا۔ ارجن سنگھ درمیان میں کھڑا ہوا تھا۔اسی لمحے مجسٹریٹ کی بگھی آتی نظر آئی۔ سب احترام کے طور پر کھڑے ہوگئے۔ بگھی کے پیچھے بیٹھے ہوئے اردلی نے دروازہ کھول کر سلام کیا۔مجسٹریٹ بگھی سے نیچے اتر آیا' جگا کو دیکھ کر اس نے نظریں گھمالیں۔ارجن سنگھ نے سلیوٹ کیا۔

''خبردار......!'' ایک گرج دار آواز سنائی دی جیسے بجلی کڑکی ہو۔سب چونک پڑے۔سناٹے میں آئے ہوئے مجسٹریٹ کے عقب سے اچانک بچن سنگھ نمودار ہوا۔اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور انگلی لبلبی پر رکھی ہوئی تھی۔ارجن سنگھ کا ہاتھ بیلٹ پر گیا۔

''ارجن سنگھ! ذرا بھی حرکت کی تو مجسٹریٹ صاحب کی موت کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔'' بچن نے مجسٹریٹ کی پشت سے رائفل کی نال ٹکادی۔جگت ساتھیوں کو مدد کے لیے پاکر تیار ہوگیا۔اس نے نظر گھمائی' ہوشیار اور دوسرے چار ساتھی رائفلیں تان کر الگ الگ کھڑے ہوئے تھے۔جگت کے عقب میں کھڑے ہوئے پولیس والوں کو بچن نے حکم دیا۔

''رائفلیں پھینک کر الگ ہٹ جاؤ۔'' دونوں پولیس والوں نے ارجن سنگھ کی جانب دیکھا' بچن گرجا۔''میں جس طرح کہہ رہا ہوں اگر ایسا نہیں ہوا تو سب کی لاشیں گر جائیں گی ارجن سنگھ!'' پولیس چیف نے پولیس والوں کو ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ جگت آہستگی سے پیچھے ہٹا۔بچن نے اسے اشارہ کیا کہ بگھی میں بیٹھ جاؤ! اسی لمحے ارجن سنگھ کا ہاتھ پستول پر گیا۔''ارجن سنگھ پستول پھینک دو۔''

سبھی نازک صورت حال میں گرفتار تھے۔

ہوشیار نے اپنی جگہ بدلی۔ بگھی چلانے والے کو نیچے اتار کر اس کی جگہ وہ خود بیٹھ گیا۔ سانس روک کر ارجن سنگھ نے پستول بیلٹ سے نکال لیا۔ اسے پھینکنے کے بہانے ہاتھ اچھال کر پستول کا ٹرائیگر دبا دیا...... بہت صفائی سے اس نے نشانہ لیا تھا مگر ہنومان اس کا غور سے جائزہ لے رہا تھا' فائر ہونے سے قبل ہنومان نے بیساکھی سے ارجن سنگھ کی کلائی پر ضرب لگائی۔ نشانہ خالی گیا۔ ارجن سنگھ بپھر گیا' کیا ہنومان سازش میں شامل ہے؟ پلک جھپکتے ہی اس نے دوسرا نشانہ لیا' گولی چلی مگر اسی لمحے بچن کی رائفل کی گولی ارجن سنگھ کی جانب جھپٹی' ہنومان کے پہلو میں اور ارجن سنگھ کے سینے میں سوراخ ہو گیا۔ دونوں زمین پر الٹ گئے۔

دونوں دھماکے بادلوں کی گڑگڑاہٹ میں دب گئے۔ بگھی کا گھوڑا الف ہو گیا۔ مجسٹریٹ اور پولیس والے لرز گئے۔ ارجن سنگھ کے سینے سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔ اس نے بیٹھنے کی کوشش کی مگر پھر زمین پر لیٹ گیا۔ اس کے ہاتھ سے پستول بچن کے ساتھیوں نے لے لیا۔ بچن' ارجن سنگھ پر دوسرا فائر کرنے کا ارادہ کر رہا تھا مگر جگت نے اسے روکا۔ ''رہنے دو' ہم فرار ہو جائیں گے۔ ہنومان کو اٹھا کر بگھی میں ڈالو۔''

موسلا دھار بارش ٹوٹ پڑی۔ پھر بھی کسی نے حرکت نہیں کی۔ سپاہیوں کی ہمت ٹوٹ چکی تھی۔ زخمی ہنومان کے ساتھ جگت بگھی میں بیٹھ گیا۔ بچن بگھی کے پچھلے حصے پر چڑھ گیا۔ ہوشیار کے ایک ہاتھ میں لگام' دوسرے میں رائفل تھی۔ سب پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور بگھی دوڑتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ان کے چاروں ساتھی گھوڑوں پر آگے جا رہے تھے۔

ڈاکوؤں کے فرار ہونے کے بعد سب نے اطمینان کی سانس لی۔ بارش میں بھیگتے ہوئے مجسٹریٹ اور سپاہی ارجن سنگھ کے پاس پہنچ گئے۔ خون میں لت پت اس کا جسم آخری سانسیں لے رہا تھا۔ ''جلدی کرو! گاڑی میں ڈال کر اسے اسپتال پہنچا دو۔'' مجسٹریٹ نے حکم دیا۔ مگر ارجن سنگھ کی وہ آخری سانس تھی۔ گاڑی میں ڈالنے کے لیے اسے اٹھایا گیا تو ایک جھٹکے سے اس کی گردن ایک طرف لڑھک گئی۔ جگا کو پھانسی پاتے دیکھنے کو ترسنے والی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔ نصف گھنٹے کے بعد پولیس کا دستہ ڈاکوؤں کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ چار میل دور انہیں خالی بگھی ہاتھ لگی مگر ڈاکوؤں کا نشان تک نہ ملا۔



پڑاؤ پر پہنچنے کے بعد ہنومان کے زخموں پر ڈریسنگ شروع کی گئی مگر دو گھنٹے کے دوران اس کے جسم کا آدھا خون بہہ چکا تھا۔ بارش میں جسم ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ہنومان کا سر گود میں رکھ کر جگت اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ ہاتھ پیروں کی زنجیریں توڑنا بھی بھول گیا تھا۔ ہنومان نے آنکھیں کھولیں۔ آس پاس نظر گھمائی' ساتھیوں کے اداس چہرے دیکھ کر اس کے ہونٹ ہلے۔

''جگت کو رہا کرا لائے' اس خوشی کے بجائے......'' پھر جگت سے نظریں ملیں' اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر وہ بولا۔ دوست! میرا کام مکمل ہو گیا...... سلام......'' اس نے تین ہچکیاں لیں...... جگت کے ہاتھ کو پوری قوت سے دبایا پھر آنکھیں چڑھ گئیں۔

''نہیں ہنومان نہیں۔'' جگت نے دل دہلانے والی چیخ ماری۔ ''مجھے رہا کرانے کے لیے تم قربان

ہو گئے۔" دوست کے چہرے کو بوسہ دیتا ہوا جگت بلک بلک کر رونے لگا۔ ساتھیوں نے ہنومان کے جسم پر چادر ڈال دی۔ باہر طوفانی بارش ہو رہی تھی۔

❀......❀......❀

مسلسل پانی برساتے برساتے آسمان شاید اب تھک چکا تھا اور بھیگے اندھیرے میں ہنومان کی چتا جل رہی تھی۔ رو رو کر سوجی ہوئی جگت کی آنکھیں جگری یار کی جلتی ہوئی چتا پر جمی ہوئی تھیں۔ آگ اس کے دوست کے جسم کو نگل رہی تھی۔ وہ بھی سن ہو گیا تھا۔ رگوں میں خون دوڑ رہا تھا' مگر ذہن میں خیالات جم گئے تھے۔ بچن اس کے برابر بیٹھا ہوا تھا۔

"جگت! میں ارجن سنگھ پر دوسرا فائر کر رہا تھا تو تم نے مجھے روکا تھا۔ حساب ادھورا رہ گیا۔"

جگت نے شعلوں کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ میں پورا کروں گا مگر اس سے پہلے مجھے اس سے کچھ معلوم کرنا ہے۔" بچن خاموش رہا۔ جگت کی پیشانی کی رگیں ابھرنے لگیں۔ اس کے خیالات حرکت کرنے لگے۔ "ارجن سنگھ مجھے پھانسی پاتے دیکھنے کے لیے بے چین تھا۔ وہ میری آخری خواہش جاننا چاہتا تھا۔"

"اب تم اس کی آخری خواہش پوچھنا چاہتے ہو؟"

"نہیں بچن! اس کی کسی خواہش سے مجھے دلچسپی نہیں۔ مجھے تو اس سے ویرو کے متعلق معلوم کرنا ہے۔" بچن چونک گیا...... پھر اس کے ذہن میں وہی خیالات گردش کر رہے ہیں۔

"اس بدمعاش نے مجھ سے کہا تھا کہ تم پھانسی چڑھو گے تو اس وقت ویرو میرے پہلو میں موجود ہو گی۔"

"یہ تو تمہیں جلانے کے لیے کہا ہو گا۔"

"تم اسے نہیں جانتے بچن! عدالت کا انتقام لینے کے لیے وہ ہر اوچھا حربہ استعمال کرنے سے نہیں ہچکچائے گا۔ ویرو کو اسی نے کہیں چھپایا ہو گا۔ اس کے الفاظ میرے دل کو چیر گئے تھے اور اسی لمحے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جان خطرے میں ڈال کر بھی میں فرار ہو جاؤں گا۔"

کسی کام کی وجہ سے باہر گیا ہوا ہوشیار لوٹ آیا اور اس نے خبر دی۔ "اس وقت شیخوپورہ میں بھی دوسری چتا جل رہی ہے اور وہ چتا ارجن سنگھ کی ہے۔ بچن! تمہارا وار اس کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوا۔" جگت نے سرد آہ بھری۔ ہوشیار کو تعجب ہوا۔ اس نے سوچا تھا کہ اس اطلاع سے ہنومان کی موت کا غم ہلکا ہو گا مگر جگت کی اداسی کا سبب سمجھ گیا۔ "ایک بات مجھے معلوم ہوئی ہے جگت' ویرو کے سلسلے میں جو لوگ ملوث ہیں وہ سب موت کے گھاٹ اتر رہے ہیں۔"

"یہی تو مصیبت ہو گئی۔ ویرو گئی پھر ہنومان کو گنوایا۔ ایسا جی چاہتا ہے کہیں دور چلا جاؤں۔"

"ہم سب کو جانا پڑے گا۔" بچن کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ "اسی وجہ سے تو ہم نے تمہیں رہا کرانے میں جلدی کی۔ اب پورا مہینہ بھی نہیں لگے گا۔" جگت کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"تم کس کی بات کر رہے ہو؟"

"بٹوارے کی...... انگریز ملک چھوڑ کر جا رہے ہیں...... ہمیں بھی یہاں سے جانا پڑے گا جگت! اب یہ ملک ہمارا نہیں رہے گا۔"

جگت کو جھٹکا سا لگا۔ ابھی تک اس نے اس سلسلے میں سوچا ہی نہیں تھا گرو بخش جیسے نہ جانے کتنے لوگ شہید ہو چکے تھے تو ملک کو آزادی مل رہی تھی۔ اسے

خوش ہونا چاہیے تھا مگر اس کے چہرے پر غم تھا۔ جہاں پیدا ہوا، جہاں پلا بڑھا، جسے وطن سمجھا، وہ چھوڑ کر جانا ہے اسے آزادی کس طرح کہا جاسکتا ہے؟

''جگت! کیا سوچ رہے ہو؟'' ہوشیار نے سوال کیا۔ ''میں بھی پہلے بچن سے کہتا تھا کہ ہمیں یہاں سے کیوں جانا چاہیے؟ ملک کا نام بدل جائے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم ہندوستان کی بجائے پاکستان میں رہیں گے، مگر......''

''ہمارے چار پانچ ساتھی پارٹی سے الگ ہوگئے۔'' بچن نے بات آگے بڑھائی۔ ''ہندوؤں اور سکھوں کو یہاں سلامتی معلوم نہیں ہوتی۔ جو کچھ لے جاسکتے ہیں وہ لے کر لوگ جارہے ہیں۔'' اب جگت کو یاد آیا۔ کیا اس کے گھر والے بھی ملک چھوڑ جائیں گے؟ عدالت میں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ اسے ماں جی اور باپو پر غصہ آگیا۔ میرا کیا ہوگا؟ یہ جاننے کی پروا کیے بغیر چلے گئے؟

''بچن! مجھے گھر کسی کو بھیجنا پڑے گا...... وہ لوگ ہیں یا چلے گئے؟''

''وہ لوگ کس طرح جاسکتے ہیں؟ تھوڑے دن پہلے اپنا آدمی وہاں ہو آیا ہے۔ ہم نے کہلوایا تھا کہ آپ میں سے کوئی عدالت میں نہیں آئے گا اور نہ ہی وکیل کرنے کی کوشش کریں۔''

''ایسا کیوں کیا؟''

''تمہیں عدالت سے فرار کرانا تھا۔ اس لیے کہ اگر تمہارے گھر کا کوئی فرد وہاں ہوتا تو ارجن سنگھ اسے سازش میں شامل کرکے پریشان کرتا۔'' جگت کے دل میں بچن کا احترام بڑھ گیا۔ اس میں سلاب سے پہلے بندھ باندھنے کی عقل تھی۔ شاید اس کی بات سچ ہو اور سب کو ملک چھوڑنا پڑے۔ نئے وطن میں سب نیا کام شروع کرنا پڑے گا۔

''بچن! ہمارے پاس وقت کم ہے جبکہ کام بہت سارے کرنے ہیں، تین چار ڈاکے ڈال لیں۔ کسے خبر پھر کب موقع ملے؟'' بچن یہی چاہتا تھا وہ جگت کو ہنومان کے غم اور ویرو کے خیال سے نکالنا چاہتا تھا۔

''جگت! میں نے اس بار ڈاکہ ڈالنے کا نیا طریقہ سوچ لیا ہے۔ تمہارا انتظار تھا۔ کہو تو بتاؤں؟''

جگت نے اثبات میں سر ہلا دیا تو وہ بولا۔ ''سکھے کی منڈی کا پنجابی دکاندار لوٹنے کے لائق ہے۔ اس کی بڑی دکان ہے۔ آڑھت کا بہت بڑا کام چلتا ہے۔ ہفتے میں ایک بار کیش لے کر ٹرین میں سفر کرتا ہے۔''

''کہاں جاتا ہے؟''

''سنگھ محل...... وہاں اس کی دکان ہے۔ وہاں اناج کی خریداری ہوتی ہے۔ ہم اسے راستے میں لوٹ لیں گے۔''

''تمہیں اطلاعات کس نے فراہم کی ہیں؟''

''ہمارے ایک ساتھی نے۔ وہ پہلے وہاں پلے دار (مزدور) تھا۔ وہ اناج کی بوریاں بھرنے کا کام کرتا تھا۔ ایک بار سیٹھ نے اسے مارا اس لیے کام چھوڑ کر چلا آیا۔''

جگت کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ ''کیا وہ پھر وہاں کام کرنے جائے تو وہ اسے رکھ لے گا؟''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ اسے سیٹھ سے اس قدر نفرت ہے کہ وہاں کام کرنے نہیں جائے گا۔''

''اسے سمجھانا پڑے گا۔ میں اسے سمجھاؤں گا۔''

دولت رام سیٹھ کے ہاں چاول کی بوریاں بھرتا ہوا سور جیت دسویں دن خبر لایا۔

''سیٹھ آج دوپہر کی گاڑی سے جائے گا۔''

''کتنے روپے لے کر؟''

''بہت سارے......اس بار بڑا مال خریدا ہے۔''
''روپے کس میں رکھتا ہے؟''
''کمر میں باندھتا ہے۔ اس پر لمبا کوٹ پہنتا ہے اس لیے دکھائی نہیں دیتا۔''
''بہتر ہے......اب تم جاؤ۔'' جگت نے اسے بھیج دیا۔''دو دن اور کام کرتے رہو! ورنہ لوٹ میں ملوث کر دیئے جاؤ گے۔'' اگلے جمعہ کو جگت نے اپنے ساتھی شیر سنگھ کو سکھے کی منڈی اسٹیشن پر دولت رام کی نگرانی کے لیے بھیجا۔ اس نے اطلاع دی کہ سیٹھ تھرڈ کلاس میں سفر کر رہا ہے۔
''میرا یار پکا ہے۔ سیکنڈ کلاس میں سفر نہیں کرتا تاکہ کسی کی نظر میں نہ آ جائے۔'' جگت نے منہ بنا کر کہا۔ پھر شیر سنگھ کو دوڑایا۔''جاؤ! دوپہر دو بجے گاڑی روانہ ہوتی ہے۔ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لے کر سیٹھ کے ڈبے میں بیٹھنا۔ سیٹھ کو شک ہو جائے ایسی کوئی حرکت نہ کرنا۔''
شیر سنگھ کو بھیج کر جگت، بچن، ہوشیار اور دو ساتھی گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ سکھے کی منڈی سے سنگھ محل بتیس میل کے فاصلے پر تھا۔ دن ڈوبنے سے پہلے دولت رام سیٹھ وہاں پہنچنے والا تھا۔ مگر جگت اسے پانچ میل تک نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔
سکھے کی منڈی سے گاڑی چلی اور سیٹھ نے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بیڑی جلائی۔ اسے بینکوں پر بھروسہ نہیں تھا اس لیے کیش کا کام خود کرتا تھا۔ اس سلسلے میں اسے سگے بیٹے پر بھی اعتماد نہیں تھا۔ یہ اس کا اصول تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں بیڑی تھی اور بایاں ہاتھ کمر پر بندھے ہوئے نوٹوں پر تھا۔ بار بار بغیر وجہ کے اسے شانے اچھالنے کی عادت تھی۔ شیر سنگھ کو یہ بات بری طرح کھٹک رہی تھی۔ ڈبے کے مسافر ملنے والی آزادی کی باتیں کرنے میں مشغول تھے۔

ایک سکھ بول اٹھا۔
''چاہے کچھ ہو، ہمارا راج ہو گا۔ پھر مزے رہیں گے۔''
دولت رام کے برابر بیٹھا ہوا مسلمان بگڑ گیا۔
''تمہارا نہیں، ہماری حکومت ہوگی۔ ہمارا سبز پرچم لہرائے گا، تمہاری حکومت ہندوستان میں ہو گی۔ یہاں پاکستان میں تم لوگ ہمارے غلام ہو گے۔''
سامنے بیٹھا ہوا سکھ سرخ ہو گیا۔ دولت رام سیٹھ بھڑک گیا۔ یہ لوگ مار دھاڑ کریں گے تو میں مشکل میں پھنس جاؤں گا۔ اس نے سوچا۔ اسے کمر پر بندھے ہوئے پیسوں کی فکر تھی۔ وہ مسلمان شخص سے کچھ دور کھسک کر بولا۔
''جھگڑا کیوں کر رہے ہو بھئی؟ تم بادشاہ ہو ہم رعایا ہیں۔''
مسلمان کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ شیر سنگھ بار بار کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔
تقریباً چار میل کا فاصلہ گزر چکا تھا۔ طے کیا ہوا ٹھکانہ قریب آ رہا تھا۔ جنگل اور جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شیر سنگھ نے باہر جھانکا، دور گھوڑ سوار نظر آئے۔ اس نے کھڑکی سے باہر رومال لہرا کر اشارہ کیا، پھر پیتل کی صراحی اٹھائی، جوش کی وجہ سے اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ وہ کھڑکی پر صراحی رکھ کر پانی بھر رہا تھا، اسی لمحے ہاتھ میں سے صراحی نکل کر باہر گر گئی۔ دو چار مسافروں کا دھیان ادھر گیا۔
''ارے صراحی گر گئی۔'' کسی نے ہمدردی دکھائی تو کسی نے مذاق کیا۔ مگر شیر سنگھ ان کی جانب دیکھے بغیر کھڑا ہو گیا۔ وہ زنجیر کھینچنے والی جگہ سے قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر زنجیر پر زور آزمایا۔
''ارے کیا کر رہا ہے؟ پانچ روپے کی صراحی کے لیے پچاس روپے کا جرمانہ بھرنا پڑے گا۔'' شور

ہو گیا۔ ایک مسافر نے شیر سنگھ کا ہاتھ تھام لیا۔ شیر سنگھ نے گھونسہ مار کر اسے دور ہٹا دیا۔ پہیے پٹریوں پر گھسٹنے لگے۔ گاڑی رک گئی۔ شیر سنگھ نے گاڑی کے باہر سر نکال کر جھانکا' جگت اور بچن تیز رفتاری سے قریب آرہے تھے۔ جس نے مار کھائی تھی وہ مسافر دانت پیس کر شیر سنگھ کی جانب بڑھا۔ ''بیوقوف! تمہاری بھلائی کی مگر تم نے برائی سے بدلہ دیا۔'' شیر سنگھ نے میان سے کرپان نکالی۔ دولت رام سیٹھ ڈر گیا۔

''ارے بھائی! کیوں ناراض ہوتا ہے؟ نیچے اتر کر پہلے اپنی صراحی لے آؤ۔'' کسی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اور جرمانہ بھرنے کے پچاس روپے بھی ساتھ لے جانا۔ گارڈ چاچا تمہیں باہر مل جائیں گے۔'' شیر سنگھ نے ہونٹ کاٹے۔ آنکھیں دولت رام کو گھورنے لگیں اور کرپان اٹھا کر اس کی طرف بڑھا۔ سیٹھ دولت رام دونوں ہاتھ پھیلا کر بولا۔

''ارے! مجھ پر کیوں غصہ ہو رہے ہو؟'' مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہے' آوازیں آنے لگیں۔

''ڈاکو...... ڈاکو......'' بوگی میں سناٹا چھا گیا۔ جگت اور بچن کھڑکی کے قریب نظر آئے۔ شیر سنگھ نے سیٹھ کی جانب اشارہ کیا۔ جگت نے گھوڑے کو قریب کر لیا۔ کھڑکی پر رائفل کی نال رکھ کر وہ بولا۔

''سیٹھ! جیب کا وزن ہلکا کر دے...... جلدی سے۔'' ایک طرف رائفل دوسری جانب کرپان۔ دولت رام کو پسینہ آ گیا۔

''مم...... مم...... میرے پاس کچھ نہیں ہے۔'' یہ کہتا ہوا وہ قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص سے لپٹ گیا۔ وہ شخص بھی اس کے ساتھ لرزنے لگا۔ شیر سنگھ اب سر پر پہنچ چکا تھا۔ سیٹھ کا گریبان تھام کر اس نے دوسرے شخص سے اسے الگ کیا اور کرپان کی نوک اس کے پیٹ پر رکھ دی۔

''کمر سے بندھے روپے نکال دے! ورنہ کرپان گھسیڑ دوں گا۔''

''جلدی کرو شیر سنگھ۔'' جگت نے تاکید کی۔ سب مسافر گم صم اسے دیکھ رہے تھے۔ ایک شخص سیٹھ کی مدافعت میں کچھ بولنا چاہتا تھا شیر سنگھ نے اسے چانٹا مار دیا۔

''خاموش بیٹھے رہو۔'' یہ کہہ کر اس نے سیٹھ کے کوٹ کو کرپان سے چیر ڈالا۔ دولت رام ہاتھ بلند کر کے ''مر گیا...... مر گیا...... بچاؤ......'' کا شور کرنے لگا۔ تب جگت نے باہر سے رائفل کی نال اس کے جبڑے پر لگا دی۔

''شور کیا تو جان بھی گنواؤ گے۔'' سیٹھ کا منہ کھلا رہ گیا۔ آواز حلق میں گھٹ گئی۔ کرپان نے پیٹ پر ہلکا سا چرکا لگایا اور خون بہنے لگا۔ شیر سنگھ نے چیرا لگے کوٹ میں ہاتھ ڈال کر اسے کھول دیا۔ اس کا ہاتھ کمر پر بندھی بیلٹ پر گیا۔ نوٹ اندر کپڑے کی بیلٹ میں سلے ہوئے تھے۔

''کتنی دیر لگے گی بھئی!'' جگت جلدی میں تھا۔ شیر سنگھ نے دانت پیس کر کہا۔

''سالے نے بیلٹ میں نوٹ سی لیے ہیں۔'' جگت اور بچن تنگ ہو گئے۔ گاڑی میں سیکڑوں آدمی تھے۔ کسی کے پاس آتشی اسلحہ ہونے کی صورت میں فائر کا امکان بھی تھا۔ گارڈ کے پاس رائفل تانے کھڑا ہوا ہوشیار بھی انہیں جلدی کرنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ شیر سنگھ بوگی میں تھا' لہٰذا کوئی بھی آسانی سے اس پر وار کر سکتا تھا۔ جگت نے فیصلہ کیا۔

''شیر سنگھ! سیٹھ کو باہر دھکا دو۔'' پھر دوسرے مسافروں سے کہا۔ ''تمہیں اگر صحیح سلامت جانا ہے تو اسے باہر نکالو۔'' شیر سنگھ سے تعاون کرنے کے

سلسلے میں ایک شخص اٹھا۔

"سالا...... پیسے کی خاطر سب کو مروائے گا۔"

دولت رام بہت گڑگڑایا۔

"میں پیسے دیتا ہوں۔ مجھے چھوڑ دو......" مگر اس کی بات سننے والا کوئی نہیں تھا۔ گریبان پکڑ کر شیر سنگھ نے سیٹھ کو کھڑکی سے باہر کھینچ لیا۔

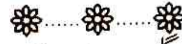
"بچن! گارڈ ماسٹر سے جا کر کہو گاڑی چلا دے۔ اگر آگے جا کر کوئی چالاکی کی تو سیٹھ کو بھون دیا جائے گا۔" گاڑی چلنے لگی۔ دولت رام سیٹھ آنکھیں پھاڑے چیخنے لگا۔

"ارے مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ! یہ ڈاکو مار ڈالیں گے مجھے۔" مگر ٹرین کی سیٹی میں اس کی آواز دب گئی۔ جگت نے اس کے پیٹ میں گھونسہ مارا۔

"زندہ رہنا ہے تو ہمیں اپنا کام کرنے دو۔" پھر نوٹوں والا بیلٹ نکال لیا۔ ہوشیار نے سیٹھ کی گردن میں سے سونے کی زنجیر کھینچ لی۔ "سب ملا کر کتنا مال ہے؟" جگت نے گرج کر پوچھا۔

سیٹھ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "دس ہزار۔"

"اب اسے جانے دو۔" جگت نے اتنا کہا' اسی لمحے سیٹھ مٹھیاں کس کر کھیتوں میں دوڑ گیا۔



آزادی کی اگلی رات ملتان کے زمیندار کے گھر ڈاکہ ڈالنے کا فیصلہ کیا گیا۔ "کم از کم پندرہ ہزار روپے کا مال ہاتھ آئے گا' پھر ہم حصے کریں گے۔" جگت نے کہا تھا۔ جدا ہونے کے بعد کئی لوگ خوش نہیں تھے۔ پھر بھی حصے کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اپنا حصہ جس کا جس طرح جی چاہے اپنے کام میں لا سکتا تھا۔ پھر اگر حالات سازگار ہوں تو پارٹی کا کام آگے بڑھایا جائے۔

بڑے زمیندار کی حویلی کے عقبی حصے کے کھیت میں جگت اور اس کے تین ساتھیوں نے شام سے پڑاؤ ڈالا ہوا تھا۔ گاؤں کے کنارے تنہائی میں حویلی تھی' آس پاس بنجر یا کھیتی کے لائق زمین اسی کی تھی۔ وہ اس علاقے میں ایک خطرناک شخص کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ اسے بات بات پر گولیاں چلانے کی عادت تھی۔ حسین عورتیں اس کی نظروں سے دور رہتیں۔ زمیندار کی جوان بیٹیوں کو کوئی شخص نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایسی گستاخی کرنے والے کو زندہ نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ جس کھیت میں جگت نے پڑاؤ ڈالا تھا' اس کسان کا جوان بیٹا زمیندار کی رائفل کا نشانہ بنا تھا۔ بیٹے کی موت کا انتقام لینے کی خاطر باپ جگت کی مدد کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ زمیندار کی حویلی کے دو چوکیداروں کو اس کسان نے شراب کی دعوت دی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

"انگریز کل ملک چھوڑ جائیں گے۔ اس کی خوشی منائیں گے۔"

گیارہ بجے سے پہلے جگت اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر آیا۔ کیونکہ چوکیدار نشے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ "بچن! اگر زمیندار مقابلے پر آئے تو اسے فوراً ختم کر دینا۔ بہت سے لوگوں کا خون اس کی گردن پر ہے۔"

"مگر زمیندار پہلے مارا گیا تو مال ہاتھ نہیں لگے گا۔ گھر میں اس نے پوشیدہ سرنگ بنائی ہے۔ اس میں دولت رکھی ہوئی ہے۔ سرنگ کی تلاش میں صبح ہو جائے گی۔"

جگت کو بچن کی دلیل مناسب نظر آئی۔ "پھر ہم اسے سرنگ معلوم کیے بغیر نہیں ماریں گے۔" جگت نے جواب دیا۔

ماحول پر گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دس دس

آدمیوں کے تین دستے بنائے تھے۔ جگت اور بچن کے دستوں نے حویلی کے دونوں بازو سنبھال لیے۔ ہوشیار عقب میں رہا۔ دو چار کتے بھونکے مگر کسی نے پروا نہیں کی۔ حویلی کے گرد چھ فٹ دیوار کے برابر آ کر وہ لوگ رک گئے۔ جگت کو پہل کرنا تھی۔ ایک ساتھی جھک گیا۔ جگت اس کی پشت پر سوار ہو کر دیوار کے کنارے پر ہاتھ رکھے اندر دیکھنے لگا۔ اسی لمحے ایک شکاری کتا جست لگا کر اس پر کودا۔ جگت کی آنکھیں ذرا ہی بچ گئیں ورنہ کتے کے ناخن آنکھوں میں گھس جاتے' اچانک حملے سے بھڑک کر جگت نیچے گرا۔ کتے نے بھونک بھونک کر تمام حویلی والوں کو جگا دیا۔ بچن کو افسوس ہوا' اس نے کتے کے متعلق اطلاع کیوں حاصل نہیں کی؟

''کون ہے؟'' زمیندار کی آواز سنائی دی۔ جگت نے رائفل سنبھال لی۔ کتا دیوار کی جانب دیکھ کر بھونک رہا تھا۔ دوسری جانب سے بچن نے جھانکا۔ وہ کتے کو پھونک دینے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اسی لمحے حویلی کا دروازہ کھلا۔ جواب نہ ملا تو اس نے گالی دی۔ ''بے وقوف چوکیدار کہاں مر گئے؟'' اس نے برآمدے میں جلتے ہوئے لیمپ کی روشنی بڑھائی۔ اس کی روشنی میں بچن نے دیکھا زمیندار کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ جگت ساتھی کی پشت پر کھڑا ہو گیا۔ اس کا ارادہ زمیندار کا نشانہ لینے کا تھا۔ اسی لمحے راستے پر دوڑتی ہوئی ایک جیپ حویلی کے دروازے کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ جگت اور بچن دیوار کے پیچھے چھپ گئے۔ یہ نئی آفت تھی۔ کتا بھونکتا ہوا فولادی دروازے کے قریب گیا۔ جیپ سے ایک شخص نکلا۔ کتا اور زور سے بھونکنے لگا۔ زمیندار نے آواز دی۔ ''ٹائیگر! ٹائیگر......!'' سناٹا چھا گیا۔ کتا ہانپتا ہوا زبان سے زمیندار کے پیر چاٹنے لگا۔ زمیندار نے پوچھا۔

''کون ہے......؟''

''دروازہ کھولو! میں ملٹری کی جانب سے آ رہا ہوں۔'' ایک تحکمانہ آواز سنائی دی۔

زمیندار نے ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ وہ ملٹری کا کوئی پٹھان تھا۔ اس بات کا یقین کر لینے کے بعد وہ برآمدے سے نیچے اتر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رائفل تھی اور دوسرے میں ٹارچ۔ چوکیدار کی غیر حاضری اسے کھٹکنے لگی۔ دروازے کے پاس پہنچ کر آنے والے نے کہا۔

''رنجیت سنگھ چوہدری تمہی ہو؟''

''بالکل...... کیا کام ہے؟'' اس کی آواز میں حکم نہیں تجسس جھلک رہا تھا۔

''ہم بلوچ رجمنٹ سے آ رہے ہیں۔ دروازہ کھولو۔'' زمیندار نے کھڑی ہوئی جیپ پر نظر ڈالی' دوسرے چار افسران اس میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''مگر آپ لوگوں نے کام نہیں بتایا۔'' سامنے کھڑے ہوئے افسر کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ گھر میں جوان بیٹیاں تھیں۔ زمیندار خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

''پہلے دروازہ کھولو......!'' اس افسر نے رعب سے کہا۔ اس نے فولادی سلاخوں کے درمیان سے گن کی نال دکھائی۔ زمیندار سمجھ گیا کہ معاملہ خطرناک ہے۔

''ٹھہرو! میں چابی لے کر آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ لوٹا' پھر کافی دیر تک زمیندار نہیں آیا تو پٹھان افسر نے گرج کر کہا۔

''چابی تلاش کرنے میں کتنی دیر لگے گی؟''

''تمہیں کام ہو تو صبح آنا' اس طرح آدھی رات کو میں کسی کو حویلی میں آنے کی اجازت نہیں دے

سکتا۔'' زمیندار کے الفاظ ابھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ پٹھان افسر کی گن چیخ اٹھی۔ زمیندار کھمبے کی آڑ میں تھا اس لیے بچ گیا۔ اسے یقین ہوگیا کہ افسران اسے لوٹنے آئے ہیں۔ پچھلی رات ایسا ہی ایک قصہ ہوچکا تھا۔ زمیندار نے دروازے کی جانب فائر کیا مگر نشانہ خالی گیا۔ کتا پھر بھونکنے لگا۔ جیپ سے چاروں افسر بھی باہر کود گئے۔

''اندر کود جاؤ! سالے کی نظر کے سامنے اس کی لڑکیوں کی عزت لوٹ لیں گے۔''

اب جگت ہوشیار ہوگیا۔ ملٹری والے عوام کی بہن بیٹیوں کی عزت پر ہاتھ ڈالیں گے یہ سوچ کر وہ بھپر گیا۔ اس نے دیوار سے جھانک کر دیکھا ایک افسر دروازے پر چڑھ رہا تھا۔ جگت نے رائفل کا ٹرائیگر دبایا...... سن کرتی ہوئی گولی افسر کی پیشانی میں گھس گئی۔ وہ چیختا ہوا زمین پر گرا۔ اس سے پہلے اس کے ہاتھ سے گن اچھل کر دروازے کے اندر گری۔

زمیندار چونک گیا۔ کس نے فائر کیا؟ کیا چوکیدار اس کی مدد کے لیے آ گیا تھا؟ یہ دیکھنے کے لیے کھمبے سے ہٹ کر اس نے دیوار کی جانب دیکھا۔ اسی لمحے دروازے سے دوسرے افسر نے فائر کیا۔ زمیندار کا شانہ زخمی ہوگیا۔ وہ لڑکھڑا کر سیڑھیوں پر گرا۔ حویلی میں سے عورتوں کی چیخیں سنائی دیں۔ زمیندار نے دروازے باہر سے بند کردیے تھے لہٰذا کوئی باہر نہیں آ سکتا تھا۔ دوسرا افسر دروازہ کود کر اندر آنا چاہتا تھا' اسی لمحے بچن نے اس کا نشانہ لیا۔ گولی اس کے پیر میں لگی اور وہ باہر الٹ گیا۔ پھر تو جگت' بچن' ہوشیار اور ان کے ساتھیوں نے گولیوں کی بارش کردی۔ افسران خوفزدہ ہوگئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ڈاکو حویلی کو گھیر کر بیٹھے ہوں گے' مرے ہوئے ساتھی کو چھوڑ کر زخمی ساتھی کو جیپ میں ڈال کر وہ فرار ہونے لگے۔ ''کتو...... کھڑے رہو۔'' جگت نے گرج کر کہا۔

دوڑتی جیپ پر جگت اور اس کے ساتھیوں نے گولیوں کی بارش کردی۔ نشانے خالی گئے مگر جیپ چلانے والا جیپ پر کنٹرول نہ رکھ سکا اور جیپ دھماکے کے ساتھ کھڈ میں گری۔ دو تین دھماکے ہوئے اور جیپ جل اٹھی۔ بچن اور جگت اس طرف دوڑے۔ جا کر دیکھا تو چار میں سے دو افسر زخمی پڑے تھے اور دو جیپ کے شعلوں میں جل رہے تھے۔

''بچن! ان دونوں کی گن لے لو...... اب ہمیں جلدی سے فرار ہوجانا چاہیے۔ دھماکے سے گاؤں جاگ گیا ہوگا۔'' ہوشیار ساتھیوں کو لے کر زمیندار کی حویلی میں پہنچ گیا۔ جگت اور بچن جب وہاں پہنچے وہ آخری سانس لے رہا تھا۔ زمیندار کی بیوی اور جوان لڑکیاں ڈاکوؤں کو دیکھ کر سہمی ہوئی تھیں۔

''تم نے اسے مار دیا ظالم......'' زمیندار کی بیوی شور کر کے رونے لگی۔

''نہیں بملا...... انہوں نے تو......'' زمیندار کی سانس اکھڑنے لگی۔ مگر وہ بمشکل بولا۔ ''ہماری بیٹیوں کی عزت بچائی ہے۔'' زمیندار کا جسم ٹھنڈا ہوگیا۔

بچن نے جگت کی جانب دیکھا۔ ''کیا کرنا چاہیے؟''

جگت نے زمیندار کی لاش پر نظر ڈالی' پھر بچن کو اشارہ کیا۔ ''سب پڑاؤ پر پہنچ جاؤ۔'' یہ کہہ کر جگت نے ساتھیوں کو بھیج دیا۔ جاتے ہوئے اس نے زمیندار کی بیوی سے کہا۔

''دروازے پر افسر کی لاش پڑی ہوئی ہے' اس کو جلی ہوئی جیپ کے قریب ڈلوا دینا' نہیں تو ملٹری

والے تم لوگوں کو پریشان کریں گے۔"
زمیندار کی عورت آنسو بھری آنکھوں سے جگت کی جانب دیکھنے لگی۔ "مگر آپ کون ہیں؟"
"پولیس والے پوچھیں تو کہہ دینا جگا ڈاکو سے ملٹری والوں کا ٹکراؤ ہو گیا تھا۔" اس نے اس طرح اپنا تعارف کرایا' پھر باہر نکل گیا۔ جاتے ہوئے اس نے پٹھان افسر کی آٹومیٹک گن اٹھالی' پھر بچن سے بولا۔ "بچن اور کچھ نہیں تو ہمیں تین قیمتی گنیں ملیں۔ خالی ہاتھ نہیں لوٹے۔"



آزادی کا جشن دھوم دھام سے منایا گیا۔ اس شور میں بٹوارے کا غم دب گیا تھا۔ انگریز چلے گئے اور اب اپنا راج تھا۔ اس خوشی میں لوگ رقص کر رہے تھے۔ جگت نے سوچا ملک چھوڑ کر جانے کا خوف غلط ہے۔ ساتھیوں نے حصے بانٹ لیے تھے۔ کچھ دن آرام کر کے جشن آزادی منا لینے کے بعد سب نے ملنے کا پروگرام بنایا تھا۔ جگت' بچن اور ہوشیار بھیس بدل کر کچھ دن ہوٹل میں عیش کر آئے۔ انہیں بہت دنوں بعد یہ موقع ملا تھا۔
سینما کا آخری شو دیکھ کر تینوں آ رہے تھے کہ اسی لمحے عقب سے آواز سنائی دی۔ "جگا............!"
جگت چونک گیا۔ اس نے دیکھا وہ خطرناک بدمعاش خانو تھا۔ اسے حیرت ہوئی۔ "ارے تم تو دو سال کے لیے جیل چلے گئے تھے مگر اتنی جلدی واپس آ گئے؟"
"یار! اس بار بڑے احترام سے چھوٹ کر آیا ہوں۔ آزادی کی خوشی میں مجھ جیسے بہت سے لوگوں کو حکومت نے رہا کر دیا ہے۔"
خانو اس علاقے کا دادا تھا۔ چھوٹے موٹے جرائم کے سلسلے میں پانچ سال جیل کاٹ کر آیا تھا۔ اس کی نظر میں کوئی بڑا شکار آتا تو وہ جگا کو اطلاع فراہم کرتا اور اپنا کمیشن لے جاتا۔ ویسے وہ جگت سے ڈرتا تھا۔ چاقو مارنے میں اس کا جواب نہیں تھا مگر رائفل سے اس کی جان نکلتی تھی۔ اس نے ایک بار جگت سے کہا تھا۔ "یار! تم مجھے اپنے گروہ میں شامل کر لو۔"
مگر جگت نے انکار کر دیا۔ "خانو! تمہیں میرے ساتھ کام کرنے میں مزہ نہیں آئے گا' میرا ساتھی بننا ہے تو سب سے پہلے عورت بازی چھوڑنی پڑے گی۔"
جیل سے رہا ہو کر آئے ہوئے خانو کی نئی لنگی اور لکھنوی کرتہ دیکھ کر جگت نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "ارے خانو! باہر آتے ہی کہیں ہاتھ مارا ہے کیا؟"
"یار! اب تو ہماری حکومت ہے۔ دو چار سرمایہ داروں نے بھتہ باندھ دیا ہے تاکہ قومی چکر چلا کر ہندو سرمایہ داروں کو نقصان پہنچایا جائے۔" یہ سن کر جگت کی آنکھیں پھیل گئیں۔ خانو خوش مزاج انداز میں کہہ رہا تھا۔ "اگر تم ساتھ دو تو مزے ہی آ جائیں۔ پولیس والے بھی آنکھ بچا جاتے ہیں۔"
مگر جگت کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
"خانو! تم مجھے کرائے کا غنڈہ سمجھتے ہو؟ تم سے بھی کہتا ہوں کہ اس چکر میں نہ پڑنا۔ ہمارے لیے رشتہ' ذات' رنگ یا مذہب کیسے؟ سب سرمایہ دار ہمارے شکار۔ ساری پولیس ہماری دشمن۔" خانو منہ بنا کر آگے بڑھ گیا۔
بچن نے کہا۔ "دیکھا جگت...... انگریز ابھی ولایت نہیں پہنچے اور قوم و مذہب کے نام پر یہ چکر شروع ہو گیا۔"
پھر ایک ہفتے میں آگ بھڑک اٹھی۔ پہلے

پنجاب جل اٹھا۔قومی اور مذہبی تعصب کا دیوننگا ہو کر رقص کرنے لگا......لوٹ مار، آبرو ریزی اور قتل عام شروع ہو گیا......ملک کے بٹوارے نے انسانوں کے دل بھی بانٹ دیے۔

''بچن! تمہاری آ گہی صحیح ہے۔ہم ڈاکوؤں کو گالیاں دینے والے خود کیا تماشہ کر رہے ہیں؟'' جگت کا خون جوش مارنے لگا۔''اب تھوڑے دن ہمیں آرام کرنا پڑے گا۔آدھے ساتھی ابھی واپس نہیں لوٹے۔''

''ایسا کرو جگت تم اپنے گھر ایک چکر لگا آؤ' مجھے ان سب کی فکر ہو رہی ہے۔'' بچن نے سوچا جگت اس بات میں ماں کے ساتھ ہونے والے جھگڑے کو یاد نہیں کرے گا۔مگر اس نے غلط سوچا تھا۔

''نہیں بچن! مجھے بھی فکر ہو رہی ہے مگر میں وہاں نہیں جاؤں گا۔کسی کو بھیج کر خیریت معلوم کرا لو۔'' پھر بولا۔''اور ایک شخص کو اچلا کی خیریت لینے بھیجنا۔''

جگت کے گھر گیا ہوا شخص دو دن سے پہلے واپس لوٹنے والا نہیں تھا مگر اچلا کے ہاں بھیجا ہوا شخص شام کو واپس لوٹ آیا۔

''جگت...... بچن...... غضب ہو گیا۔'' وہ اس طرح کانپ رہا تھا جیسے کوئی بھیانک منظر دیکھ کر آیا ہو۔

''کیا ہوا......؟'' دونوں نے ایک ساتھ پوچھا۔

''اچلا......'' وہ آگے نہ بول سکا اور نظریں جھکا لیں۔بچن جھٹکے سے کھڑا ہو گیا اور اس کا شانہ پکڑ کر چیخا۔

''کیا ہوا اچلا کو......؟''

''غنڈے اٹھا لے گئے۔'' یہ سن کر بچن پر بجلی گر پڑی۔جگت کا غصہ بھڑک اٹھا۔

''کون سے غنڈے؟ کب اٹھائے۔''

''کہتے ہیں وہ مسلمان تھے......آج دوپہر ان میں خانو بھی تھا۔''

''خانو......؟'' جگت نے دانت پیس لیے۔''میں اس کی کھال اتار دوں گا۔اپاہج شوہر کی بیوی چھین لینے کی ایسی سزا دوں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔''

''اس کے شوہر کو لوگوں نے بری طرح مار دیا۔''

''اوہ......!'' بچن سرتاپا لرز گیا۔''اور لڑکا؟''

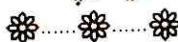
''وہ سلامت ہے۔جب غنڈے آئے تھے تو وہ گھر میں نہیں تھا۔باپ کی لاش کے سامنے بیٹھ کر وہ بری طرح رو رہا تھا۔'' بچن نے رائفل اٹھالی۔وہ غصے سے کانپ رہا تھا۔

''جگت! میں جا رہا ہوں...... اچلا کی تلاش میں۔''

''ٹھہر جاؤ'' جگت گرجا۔''خانو سے میں حساب صاف کروں گا۔تم اس کے گھر جاؤ۔''

''مجھے اس کے گھر جا کر کیا کرنا ہے؟'' بچن یہ کہتا ہوا آگے بڑھا مگر جگت درمیان میں آ گیا۔

''میں تم سے جو کہہ رہا ہوں وہ کرو! تمہاری وہاں زیادہ ضرورت ہے۔معصوم بچہ دہرا صدمہ نہیں سہہ سکے گا۔باپ کی موت اور ماں کا اغوا......اسے کوئی پیار دینے والا نہیں ہے۔اچلا کو واپس لائے بغیر میں تمہیں صورت نہیں دکھاؤں گا۔میں تمہیں حکم دیتا ہوں......تم جاؤ۔'' جگت اس قدر جوش میں بولا تھا کہ بچن اختلاف نہ کر سکا۔دل میں اٹھتے ہوئے درد کو دباتا ہوا وہ اچلا کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا اور جگت چھ سات ساتھیوں کے ساتھ خانو سے حساب صاف کرنے کے لیے چل پڑا۔



نصف شب سے پہلے بچن' اچلا کے گھر پہنچ گیا۔ گلی میں جنازے کا سامان نظر آیا۔ دو چار آدمی سرگوشیاں کر رہے تھے۔ گھوڑے کی لگام تھام کر آتے ہوئے بچن کو دیکھ کر سب خاموش ہو گئے۔ آپس میں آنکھوں سے اشارے کیے' پھر بچن کے چہرے پر اداسی دیکھ کر غمگین ہو گئے۔ بچن نے گھر کی چوکھٹ پار کی۔ کمرے کے درمیان چادر اوڑھائی ہوئی شاردول کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ محلے کی پانچ سات عورتیں اور کچھ مرد گم صم بیٹھے ہوئے تھے۔ بچن کی نظر لاش سے لپٹ کر بیٹھے ہوئے اچلا کے بیٹے پر پڑی۔ اس کی سسکیاں سنائی دیں۔ بچن کا دل رو اٹھا۔ وہ چند لمحے سناٹے میں کھڑا رہا۔ سب اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دو چار آدمیوں نے ہٹ کر اسے راستہ دیا۔ جوتے اتار کر بچن آگے بڑھا' شانے پر سے رائفل اتار کر الگ رکھ دی پھر اس نے اچلا کے بارہ سالہ لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس نے اسی طرح محبت بھرے ہاتھوں سے اس کی پشت تھپتھپائی۔ "بیٹے اٹھ جا......"

"بہت سمجھایا مگر ہٹتا نہیں ہے۔" ایک شخص نے کہا۔ "کہتا ہے میں باپو کو نہیں جانے دوں گا۔ پہلے میری ماں کو لا دو۔"

"زبردستی لاش سے الگ کیا تھا تو اس وقت بے چارہ کتنا چیخنے لگا تھا۔" دوسرا کہنے لگا۔ "اچھا ہوا تم آ گئے۔ اس کا دوسرا تو کوئی رشتے دار نہیں۔" لفظ رشتے دار خاص وزن سے بولا گیا تھا۔ یہ بچن نے محسوس کیا۔ ایسے موقع پر بھی لوگ برائی کرتے نہیں چوکتے۔ وہ اکثر اچلا سے ملنے آتا اور زیادہ تر رات کو آتا' لہٰذا محلے والے اور کیا اندازہ لگاتے؟

کوئی پوچھتا۔ "اچلا رات کون مہمان آئے تھے؟" تب وہ بچن کا نام بتائے بغیر کہتی۔

"میرے میکے کے رشتے دار ہیں۔" اس جواب سے محلے کی عورتوں کے پیٹ میں گڑبڑ ہوتی۔ وہ کہتیں۔ "کسی دن رکتے کیوں نہیں؟ رات ہی میں کیوں آتے ہیں؟" پوچھنے کا مطلب سمجھ کر غصے کا اظہار کیے بغیر اچلا بڑی صفائی سے جواب دیتی۔

"ان کی ملازمت ہی ایسی ہے۔ رات ہی کو چھٹی ملتی ہے۔" بچن اور شاردول نے ضد کر کے اچلا کو دوسروں کے گھر کام کرنا چھڑا دیا تھا۔ پھر محلے والے پیٹھ پیچھے بولنے لگے۔

"میکے کا رشتے دار پیسے دے جاتا ہے' پھر وہ کیوں ہمارے برتن صاف کرے گی؟" بچن کو ان باتوں کی بو مل گئی تھی لہٰذا وہ اب اچلا کے گھر بہت کم جاتا تھا۔

اسی لمحے اس کا جی چاہا کہ کہہ دے۔ "تمہاری نظروں کے سامنے غنڈے محلے کی ایک عورت کو اٹھا لے گئے اور اس کے شوہر کو قتل کر گئے' پھر بھی تمہارا خون گرم نہیں ہوا؟ مگر یہ سب کہنے کا موقع نہیں تھا۔ پھر فائدہ بھی کیا؟ یہ سوچ کر اس نے اچلا کے بیٹے کی جانب توجہ مبذول کی۔ باپ کی لاش سے لپٹے ہوئے لڑکے کو اس نے پیار سے اپنی طرف کھینچا۔

"بیٹا' سکھ کا بیٹا ہو کر نہ رو' تیرے باپ کے قاتل کو ہم زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

جیسے بارہ سالہ لڑکا اسی قسم کی ہمدردی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ سسکیاں لیتا ہوا رک گیا اور "چاچو" کہہ کر بچن سے لپٹ گیا۔ دونوں دلوں کا بوجھ ہلکا کرنے لگے۔

"اچلا بے چاری برابر والی ہندو عورت کو بچانے گئی تھی مگر خود بھی پھنس گئی۔" کسی نے کہا۔

"ساوتری کی چیخیں سن کر دوڑی گئی تھی مگر چار پانچ غنڈوں کے مقابلے میں اس کی وقعت ہی کیا

تھی؟ وہ اسے بھی اغوا کر کے لے گئے۔ شاردول درمیان میں آیا مگر کٹے ہوئے ہاتھوں سے وہ کیا کرسکتا تھا؟ دو تین بار دھکے دے کر ہٹایا گیا مگر اس کی جدوجہد جاری رہی۔ بدمعاشوں نے اس کا پورا جسم چھری سے کاٹ دیا اور دونوں عورتوں کو اغوا کرلیا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ یہ لڑکا گھر پر موجود نہیں تھا' نہیں تو بے چارہ......" وہ سرہلائے جارہا تھا' مگر بچن اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"چلو! اب مرنے والے کو اس کی آخری منزل تک پہنچادیں۔ اچلا یہاں ہوگی تو واپس لوٹ آئے گی۔"

"آجائے گی......؟" تین آدمی ایک ساتھ بولے۔ لہجے میں بے پناہ حیرت تھی۔ "کون لائے گا اسے؟" ایک صاحب ہوشیاری سے بولے۔

"ہے ایک مرد...... آئے تو دیکھ لینا۔" پھر شاردول کی لاش کو باہر نکالا گیا۔ بچن نے جنازے کو کندھا دیا۔ بارہ سالہ لڑکا باپ کے جنازے کے ساتھ بچن کے برابر چل رہا تھا' جیسے وہ جنازے کا بوجھ اپنے معصوم دل پر اٹھا رہا ہو۔

خانو کو تلاش کرنے کا کام جگت نے جس طرح سوچا تھا اتنا آسان نہیں تھا۔ تین چار جگہوں کا پتا تھا ان میں سے دو جگہوں پر آخری چار دن سے خانو دیکھا نہیں گیا تھا۔ ویسے خانو کو تلاش کرنا ہو تو رات کے وقت طوائفوں کے کوٹھوں پر تلاش کرنا پڑتا تھا۔ مگر جگت کو یقین تھا کہ آج وہ اغوا کی گئی عورتوں کے ساتھ کسی محفوظ مقام پر چھپا ہوا ہوگا۔ اسے کہاں تلاش کیا جائے؟ وقت تیز رفتاری سے گزر رہا تھا۔ جگت کا غصہ بڑھنے لگا۔ وہ اچلا کو برباد کردے گا۔ نہ جانے کتنے غنڈے اس کے ساتھ ہوں گے؟ وہ اس کی عزت لوٹ لیں گے۔ اسے فروخت کردیں گے...... جگت نے دانت پیس لیے۔

"خانو تمہاری موت نے مجھے یہ راستہ بتایا ہے۔ میں تجھے نہیں بخشوں گا۔" وہ بڑبڑایا۔ اس کی مٹھیاں کسی ہوئی تھیں اور پیشانی کی رگیں تنی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

جگت اور ہوشیار کے سات ساتھیوں میں انور اور عبدل بھی تھے۔ دونوں دوست سال بھر سے جگت کے گروہ میں داخل ہوئے تھے۔ اب جگت کو ان پر پکا اعتماد ہوگیا تھا۔ خانو کی تلاش میں یہ مفید ثابت ہوں گے یہ سوچ کر انہیں ساتھ لیا تھا۔

"انور اور عبدل! باقی دو مقامات پر تم لوگ تلاش کرنے جاؤ گے۔ تمہیں مسلمان ہونے کے سبب شاید اطلاع مل جائے۔" یہ کہہ کر جگت رک گیا۔ "مگر شاید اس طرح خانو کا پتہ نہیں ملے گا۔" اس نے ایک ترکیب آزمائی۔ "ایک کام کرو! خانو کے آدمی سے جاکر کہو' تمہیں خانو نے بلایا ہے۔ اغوا کی ہوئی عورتوں کو ٹھکانے لگانے کا کام ان کے سپرد کرنا ہے اور آج رات ہی یہ کام ختم کرنا ہے۔ لہٰذا تمہیں جلدی اطلاع مل جائے گی۔ جلدی جاؤ' ہم تمہارا انتظار کررہے ہیں۔"

اس کے بعد پورا ایک گھنٹہ اضطراب میں بیت گیا۔ بار بار اچلا کا خیال دل کو جھلسا دیتا تھا۔ ہاتھ آجانے کی صورت میں خانو کے ٹکڑے کردینے کی خواہش زور کرنے لگی۔ کوئی مذہب عورت کی عزت لوٹنے کا سبق نہیں دیتا بلکہ عورت کی حرمت کی حفاظت مذہب کی سچائی ہوتی ہے۔ پھر انسانوں پر ایسا پاگل پن کیوں سوار ہوا ہے؟ ایک قوم دوسری قوم کو تباہ کرنے میدان میں نکل آئی ہے...... انور پون گھنٹے میں لوٹ آیا۔

"سردار! وہاں تو کل ہونے والے ہنگامے کی

تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ایک شخص کو قتل کرنے کے پچاس روپے، ایک عورت کو اغوا کرنے کے سو روپے کی سودا بازی ہو رہی ہے۔" یہ سن کر جگت کا خون گرم ہو گیا مگر اس وقت اسے خانو پر ہاتھ ڈالنے کی جلدی تھی۔

"خانو کا پتہ کسی نے نہیں بتایا؟"

"نہیں...... وہ لوگ کہہ رہے تھے کہ خانو نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ دو دن میں بہت ساری عورتیں اغوا کر لی ہیں مگر اس کے پتے کے متعلق کسی کو معلوم نہیں۔" انور نے افسوس کا اظہار کیا۔

عبدل کے انتظار میں دوسرا نصف گھنٹہ گزر گیا مگر اس مرتبہ کا انتظار رنگ لایا۔ عبدل نے آتے ہی خبر دی۔

"پتہ مل گیا...... خانو حاجی خان کی سرائے میں ٹھہرا ہوا ہے۔" جگت نے مٹھیاں کس لیں۔

"وہ سرائے کس جگہ ہے؟" گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے جگت نے پوچھا۔

"میں نے دیکھی ہے......" اب انور جوش میں آ گیا۔ "یہاں سے چار میل کا فاصلہ ہے۔ مسافر رات کے وقت وہاں قیام کرتے ہیں۔ اس کا چوکیدار مجھ سے واقف ہے۔"

گھوڑوں کی باگیں ڈھیلی ہو گئیں۔ جگت نے پشت پر ٹی این سی گن چھپائی ہوئی تھی۔ بلوچ آفیسر کی اس گن کو پہلی بار استعمال کرنے کے لیے وہ بے چین تھا۔ نصف راستے پر پہنچے تو بارش ٹوٹ کر برسی۔ جگت خوش ہو گیا۔

"قدرت ہماری موافقت میں ہے۔ سرائے میں ٹھہرنے کا بہانہ مل گیا۔"

"سردار! خانو کو ختم کرنے کا کام میں اور عبدل نمٹا لیں گے۔" انور کہہ رہا تھا۔ "مذہب کے رشتے سے وہ ہمارا بھائی ہے۔ ہم اس کے ساتھ زیادہ انصاف کر سکیں گے۔"

"نہیں انور! ایسے بدمعاش کو بھائی کہنا بھی گناہ ہے۔ خانو کا حساب میں چکاؤں گا۔ وہ نالائق چاقو بازی کا ماہر ہے۔ میں تمہیں یہ خطرہ مول نہیں لینے دوں گا۔"

ساتھی جانتے تھے کہ خطرے کے کام جگت خود کرتا تھا۔ حاجی خان کی سرائے تک پہنچتے ہوئے نصف شب گزر چکی تھی۔ بارش مدھم ہو گئی تھی۔ انور نے چوکیدار کو جگایا۔

"رحیم چاچا! رات کو قیام کرنا ہے۔ ایک کمرہ کھول دو۔" کچی پکی نیند سے جاگے ہوئے چوکیدار نے اسے پہچان لیا۔

"ایسے وقت کیوں آئے ہو...... کتنے مسافر ہو؟"

"نو آدمی ہیں چاچا! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہمارا کام بے وقت کا ہوتا ہے۔ ایک جگہ ہاتھ مارا تھا۔ مال اچھا ملا ہے۔ سحر کے وقت چلے جائیں گے۔ اچھی بخشش ملے گی۔"

رحیم چاچا جھٹکے سے بیٹھ گیا۔ "خدا جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ وہ خانو بھی لمبا ہاتھ مار کر آیا ہے۔" پھر جیب سے سونے کی انگوٹھی نکال کر دکھائی۔ "اس نے پہلے سے بخشش دے دی ہے۔" انور کو بھی جوش آ گیا۔

"پھر ہماری بخشش بھی پہلے سے رکھ لو۔" یہ کہہ کر اس نے گلے سے سونے کی چین کھینچ لی۔ پھر سنبھل کر پوچھا۔ "خانو کس قسم کا ہاتھ مار کر آیا ہے چاچا؟" رحیم چاچا نے ادھ کھلی آنکھ سے انور کی چین لے لی تھی مگر جواب گول کر گیا۔

"اس نے کیسا ہاتھ مارا یہ تو میں نے بھی نہیں

پوچھا' ہر ایک اپنے مطلب کا کام کرتا ہے' جو ہماری سرائے میں آئے ہمیں اسے آسرا دینا ہے۔'' انور نے محسوس کیا اس نے معلوم کرنے میں جلدی کی تھی' اس لیے اس نے بات بدل دی۔

''بالکل بھئی...... آپ کو بخشش سے مطلب ہے چاچا۔''

کمرہ سپرد کر کے رحیم چاچا سونے کے لیے چلا گیا۔ پھر انور نے کہا۔ ''خانو یہاں ہے' یہ بات یقینی ہوگئی ہے۔''

''اور عورتیں بھی یہیں رکھی گئی ہیں یہ بات بھی یقینی ہے۔'' جگت نے کہا۔ ''میدان میں ریڑھے تھے' تم نے دیکھے ہوں گے۔ ان پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ ضرور خانو عورتوں کو ریڑھے میں چھپا کر لایا ہوگا۔'' سرائے کافی بڑی تھی۔ پچاس ساٹھ کمروں میں خانو کو تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔ پہلے تو یہ معلوم ہو کہ وہ کس کمرے میں ہے اور اس کے ساتھ کتنے افراد ہیں؟ انور...... عبدل تم ایک کام کرو' آہستہ قدموں سے سرائے میں چکر لگاؤ وہ جس کمرے میں ہوگا وہاں ضرور کچھ نہ کچھ آہٹ سنائی دے گی۔ کان لگا کر سن لینا۔ پھر چپ چاپ واپس لوٹ آنا۔ کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔''

''بہتر......'' کہتے ہوئے انور اور عبدل چلے گئے۔ جگت نے جوش پر قابو پالیا۔ جب بھی خطرے کے کام میں ہاتھ ڈالنا ہوتا وہ ذہن کو پرسکون رکھنا سیکھ گیا تھا۔ جوش آدمی سے غلطی سرزد کرا دیتا ہے۔ اس بات کا اسے تجربہ تھا۔ دونوں ساتھی کچھ دیر بعد واپس لوٹ آئے۔ ''اس جانب بند کوٹھڑی میں تین چار آدمی تاش کھیل رہے ہیں۔ وہ بات بات پر گالیاں بک رہے ہیں۔ وہ خانو کے ساتھی بھی ہوسکتے ہیں۔''

''کسی عورت کی آواز سنائی دی؟''

''نہیں سردار باقی ہر طرف خاموشی ہے۔''

جگت کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ ''ایسا کرو! تم دونوں واپس جاؤ! کمر کھلواؤ۔ اگر اندر خانو نہ ہو تو تم لوگ ان کے ساتھ تاش کھیلنا۔ وہ جوا کھیلتے ہوں تو کچھ ہار بھی جانا۔ اس ترکیب سے خانو کے متعلق اطلاع کرنا۔ پھر دونوں میں سے کوئی کسی بہانے وہاں سے اٹھ آنا۔ ہوشیاری سے کام کرنا ہے۔'' جگت نے جیب سے روپے نکال کر انور کے سپرد کیے۔ ''انہیں دیکھ کر وہ لوگ جلدی پگھل جائیں گے۔ چوکنے رہنا...... وقت ضائع نہ کرنا سمجھے۔''

عبدل اور انور واپس نہیں ہوئے' لہٰذا جگت نے سمجھ لیا کہ وہ اندر داخل ہوگئے ہیں۔ اس نے ہوشیاری سے کہا۔ ''مار دھاڑ کے دوران اگر مجھے کچھ ہوگیا تو تم اچلا کو گھر پہنچا دینا۔''

''میں ساتھ ہوں' پھر تمہیں کیا خطرہ جگت؟''

نصف گھنٹے بعد انور آ گیا۔ ''سردار! وہ چاروں خانو کے ساتھی ہیں۔ ان کے برابر والی کوٹھڑی میں عورتوں پر قبضہ جما کر خانو ٹھہرا ہوا ہے۔ ہم نے ایک دبی ہوئی چیخ سنی تھی تو خانو کے ساتھی نے بتایا تھا کہ برابر میں نو بیاہتا جوڑا آیا ہوا ہے۔ عورت بے چاری گھبرا رہی ہوگی۔ یقیناً خانو کسی پر جبر کر رہا ہے۔''

جگت کھڑا ہوگیا۔ ''چلو ہوشیار'' پھر اس نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت دی۔ ''تم لوگ کمرے کے دروازے پر جم جاؤ' پہلے ان چاروں کو قابو کر لینا۔ ضرورت پڑنے پر کرپان گھسیڑ دینا۔ مگر گولی نہ چلانا۔''

جگت اور ہوشیار سرائے کے عقبی حصے کی طرف چلے گئے۔ بارش بند ہو چکی تھی مگر آسمان گھرا ہوا تھا۔ درمیان میں کبھی کبھی بادلوں کی گرج سنائی دے رہی

تھی۔ بجلی چمک رہی تھی۔ کمرے میں داخلے کا راستہ جگت نے سوچ لیا تھا۔ ہوشیار کا سہارا لے کر وہ سرائے کے چھپر پر چڑھ گیا' پھر ہاتھ بڑھا کر ہوشیار کو بھی کھینچ لیا۔ مکان کے چھپر کی دو چار اینٹیں ٹوٹ گئیں۔

''ہوشیار! میں چھت توڑ کر اندر جا رہا ہوں۔ تم تیار رہنا' ضرورت پڑنے پر نیچے کود سکتے ہو۔''

آٹھ دس اینٹیں ہٹانے کے بعد اندر گھسنے کے لیے سوراخ ہو گیا۔ جگت نے سر اندر کر کے جھانکا ایک کمرے میں فانوس جل رہا تھا۔ کھونٹی پر تر کی ٹوپی ٹنگی ہوئی تھی۔ کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ کمرہ خالی دیکھ کر جگت مایوس ہو گیا۔ سر باہر نکال کر ہوشیار کی جانب دیکھا۔ ''اندر کوئی نہیں ہے۔''

برقی رو کی کڑک سے دونوں لرز گئے۔

''انسان کی حیوانیت پر آسمان بھی روٹھ گیا ہے۔'' ہوشیار بولا۔ اسی لمحے ایک دبی ہوئی چیخ سنائی دی۔

جگت چونک گیا۔ اس نے چھت سے چہرہ اندر کیا۔ کمرے کے اندر دوسرے کمرے میں جانے والا درمیانی دروازہ ہل رہا تھا۔

''ہوشیار! میں اتر رہا ہوں۔'' جگت نے کہا اور اندر کود گیا۔

''بات مان لے! ورنہ کاٹ کر پھینک دوں گا۔''

خانو کی آواز سنائی دی۔

''نہیں نہیں ......عورت کی آواز دبی ہوئی تھی۔

پھر سناٹا چھا گیا۔ جگت نے گن سنبھال لی۔ کونے میں پڑا ہوا فانوس اٹھا کر آہستہ قدموں وہ دروازے کی جانب بڑھا' پھر فانوس ایک جگہ رکھ کر دروازے کو دھکا دیا۔

اندر کا منظر بڑا عبرتناک تھا۔ جگت لرز کر رہ گیا۔ ایک عورت فرش پر چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے پیٹ پر گھٹنے رکھ کر خانو ایک ہاتھ سے اس کا گلا دبا رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں تھامی ہوئی چھری سے وہ عورت کے کھلے ہوئے سینے پر چرکے لگا رہا تھا۔ وہ عورت تکلیف سے تڑپ رہی تھی۔ مگر دبائے ہوئے حلق میں آواز پھنس کر رہ جاتی تھی۔ جگت کی موجودگی کا اب تک خانو کو پتہ نہیں تھا۔ دانت پیس کر جگت چیخا۔

''خانو......!''

خانو کا چھری اٹھایا ہوا ہاتھ رک گیا۔ آنکھیں ٹھہر گئیں اور جبڑے چوڑے ہو گئے۔ ''جگا تم؟''

جگت کا غضب ناک روپ اور ہاتھ میں تھمی ہوئی گن دیکھ کر خانو کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے عورت کے حلق پر سے ہاتھ ہٹا لیا' پھر گھٹنا ہٹا کر خاموشی سے جگت کو دیکھنے لگا۔ عورت اس خیال سے کہ اسے کوئی بچانے آیا ہے جھٹکے سے اٹھی اور جگت کی جانب دوڑنے لگی۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ جھپٹتی ہوئی عورت کے سینے پر سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک طرف کا سینہ چاقو کے گھاؤ سے کٹ گیا تھا۔ جگت یہ منظر نہ دیکھ سکا اور پل بھر کے لیے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر آنکھیں کھلیں تو خانو نے عورت پر قابو پا لیا تھا۔ اس کو اپنے سینے سے چمٹا کر خانو نے چھری والا ہاتھ بلند کیا۔ ''جگا! اس معاملے میں تم دخل نہیں دو گے۔'' وہ غضب ناک الفاظ میں کہہ رہا تھا۔ ''اگر گولی چلائی تو اس کے سینے میں چھری اتار دوں گا۔'' جگت کپکپا کر رہ گیا۔ وہ گن کا ٹرائیگر نہیں دبا سکا مگر وہ عورت لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

''تم اس کی دھمکی کی پروانہ کرو! میں تو برباد ہو گئی ہوں۔ مگر دوسری عورتیں سامنے والی کوٹھڑی میں بند ہیں' تم گولی چلاؤ! میری جان کی فکر نہ کرو۔''

اس عورت کے سینے سے اب بھی خون ٹپک رہا تھا۔ جگت کو اب اچلا یاد آئی۔ دماغ کی رگیں تن گئیں گن کے ٹرائیگر پر انگلی رکھ کر اس نے خانو کی کھوپڑی کا نشانہ لیا۔ اس سے پہلے کہ خانو اس پر چاقو سے حملہ کرے اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر دینے کا جگت ارادہ کر چکا تھا۔ مگر خانو اس کا ارادہ سمجھ گیا۔ اس نے ہلکی سی سیٹی بجائی اور کوٹھڑی میں سے ایک خونخوار کتا جھپٹ کر آ گیا' جگت چونک گیا وہ کتا خانو کی طرح خطرناک تھا۔ کہتے ہیں ایک بار غلط جگہ پر بھونکا تھا اور خانو خطرے میں گھر گیا تھا۔ اس کے غصے میں خانو نے کتے کی آدھی زبان کاٹ لی تھی۔ تب سے وہ بھونکتا نہیں تھا مگر اب وہ اور بھی غضب ناک ہو گیا تھا۔ پہلے کتے کو ہلاک کرنے کے لیے جگت نے نشانہ بدلا مگر اتنے وقفے میں خانو کے اشارے پر کتے نے جست لگائی' جگت پیچھے ہٹنے لگا مگر دیر ہو چکی تھی۔ کتے کے دانت اس کی کلائی میں اتر گئے۔ زور آزما کر اس نے جھٹکا دیا۔ کتا دور گرا مگر اس کے ساتھ ہی جگت کی گن بھی دور جا گری۔ جگت کی کلائی سے خون بہنے لگا۔ خانو کسی شیطان کی طرح قہقہہ مارنے لگا۔

"جگا! اب تمہاری بندوق سے تمہیں شوٹ کروں گا۔"

جگت پھنس گیا تھا۔ گن کافی دور تھی۔ خانو کے ہاتھ میں کھلا ہوا خنجر تھا۔ سامنے ظالم کتا منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ خانو اس عورت کو دھکیلتا ہوا گن کی جانب بڑھنے لگا۔ جگت اچانک حملہ نہ کر دے اس غرض سے خانو جگت کی حرکت پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ چاقو چلانے میں خانو ایسا ماہر تھا کہ وہاں کھڑے کھڑے جگت کو زخمی کر سکتا تھا پھر بھی وہ پہلے گن پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ جگت نے آس پاس نظر گھمائی

مگر آڑ کے لائق جگہ دکھائی نہیں دی۔ مقابلہ کرنے کے لیے کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا اور دروازہ فاصلے پر تھا۔ وہ بری طرح پھنس گیا تھا۔ مگر ایک ہی آس تھی کہ خانو گن لینے جھکے گا تو وہ اس پر حملہ کردے گا مگر اسے یہ موقع بھی نہیں ملا۔ خانو نے کتے کو گن اٹھالانے کا اشارہ کیا۔ جگت کی حرکت سے پہلے گن خانو کے ہاتھ میں پہنچ گئی۔ خانو نے دانت پیس لیے۔ اس عورت کو لات مار کر دور ہٹایا' پھر گن کا رخ جگت کی طرف کردیا۔

''خانو یہ بندوق نہیں آٹو میٹک گن ہے۔ اس کو چلانا تمہارا کام نہیں۔'' جگت نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر خانو کی انگلی گن کے ٹرائیگر پر جم چکی تھی۔

''آج تک میں بندوق سے ڈرتا تھا جگا اب اس کی آزمائش کرلوں۔ خدا نے تمہیں میرے پاس بھیجا ہے۔ تمہاری لاش پر انعام کماؤں گا۔'' جگت کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ بندوق کا نشانہ خالی جاسکتا تھا مگر گن میں سے چھوٹنے والی گولیاں اسے چھلنی کردیں گی اس میں شک نہیں تھا۔ موت اس کے سامنے تھی۔ پھر دھماکہ ہوا...... جگت نے آنکھیں بند کرلیں مگر اسے گولی کیوں نہیں لگی؟ وہ اب بھی اسی طرح کھڑا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا تو خانو کی لاش سامنے پڑی ہوئی تھی۔ دوسرے لمحے ہوشیار لاش پر کودا۔

''ہوشیار! سنبھلنا۔'' اس پر جھپٹتے ہوئے کتے سے جگت نے اسے خبردار کیا۔ ہوشیار تیار تھا۔ جیسے ہی کتا اچھلا اس نے دونوں ہاتھوں سے بندوق کا بٹ اس پر دے مارا۔ کھوپڑی ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ کتا مردہ ہوکر دور جا گرا۔

''شاباش دوست! تم چھت پر بیٹھے ہو یہ تو میں بھول گیا تھا۔ تم نے خانو کی کھوپڑی کا خوب نشانہ لیا۔ ایک لمحہ دیر ہوجاتی تو تمہیں خانو کی جگہ میری لاش نظر آتی۔'' جگت نے ہوشیار کو سینے سے لگالیا۔ باہر دروازے پر آوازیں آنے لگیں۔ برابر والی کوٹھڑی کے دروازے ہلنے لگے۔ اندر سے عورتوں کی چیخیں سنائی دیں۔ زخمی عورت دھماکے سے بے ہوش ہوگئی تھی۔ خانو کی لاش کو لات مار کر جگت نے دروازے کھول دیئے۔ درجن بھر عورتیں اندر سناٹے میں ڈوبی ہوئی کھڑی تھیں جن کے چہرے دکھ کے مارے سوکھ گئے تھے۔ سب کے پیچھے کھڑی ہوئی اچلا جگت کو پہچان گئی۔

''بھیا!'' کہہ کر دوڑتی ہوئی آکر وہ جگت کے سینے سے چمٹ گئی۔ اس کے بلک بلک کر رونے سے جگت کا دل بھر آیا اور آنکھیں آنسوؤں سے چھلک اٹھیں' عورتیں جگت کو اس طرح دیکھ رہی تھیں جیسے کوئی فرشتہ ان کی مدد کو آیا ہو۔ عورتیں کمرے سے باہر جانے لگیں۔ کمرے میں بے ہوش پڑی ہوئی عورت کی عبرت ناک حالت دیکھ کر وہ لرز گئیں۔

''ہوشیار باہر نکلنے کے دروازے کھول دو۔'' جگت کو اس صورت حال میں باہر نکلنے کی جلدی ہو رہی تھی۔ ''پہلے دیکھ لینا کہ باہر ہمارے ساتھی ہیں یا نہیں۔'' باہر سب ٹھیک تھا۔ خانو کے چار ساتھیوں کو مار کر بے ہوش کرنے کے بعد ایک کوٹھڑی میں بند کردیا گیا تھا۔ سرائے کے چوکیدار کو کھمبے سے باندھ دیا گیا تھا اور سرائے کی تمام کوٹھڑیوں کے دروازے باہر سے بند کردیئے گئے تھے۔

''اب دونوں ریڑھے تیار کرکے عورتوں کو اندر بٹھادو' صبح ہونے سے پہلے انہیں گھر پہنچانا ہے۔''

''جگت بھیا! غنڈوں نے انہیں بری طرح زخمی کردیا تھا۔ وہ کیسے ہیں؟'' اچلا کی آنکھیں اب بھی

آنسو بہا رہی تھیں۔ اسے اپنے شوہر کی فکر ستا رہی تھی۔ جگت کو جھٹکا سا لگا مگر اس نے چہرے کے تاثرات بدل لیے۔

''اچلا بہن! میں نے وہاں بچن کو بھیجا ہے۔ ہم وہاں ابھی پہنچ جائیں گے۔'' پھر بات بدلنے کی غرض سے بولا۔ ''ان میں تمہارے محلے کی کون عورت ہے؟''

''ہاں...... ساوتری ہے۔'' اچلا نے دور کھڑی ہوئی ایک عورت کی جانب اشارہ کیا۔

''تو پھر تم دونوں ہمارے ساتھ چلو! ہم گھوڑے پر نکل چلیں گے۔ بچن وہاں بے چین ہوگا۔ ان لوگوں کو میرے ساتھی صحیح سلامت پہنچا دیں گے۔''

دو ریڑھے تیار ہوئے اور بارہ عورتوں کو لے کر جگت کے ساتھی روانہ ہوگئے۔ پھر جگت 'ہوشیار' اچلا اور ساوتری روانہ ہوئے۔ بارش پھر شروع ہوگئی تھی۔

❀......❀......❀

اچلا کے محلے میں گھوڑا داخل ہوا اور جگت کو اپنے دل میں خوف سا محسوس ہونے لگا۔ اس کے شانے تھام کر پشت کی جانب بیٹھی ہوئی اچلا نے کئی بار بے چینی کا اظہار کیا تھا۔

''غنڈوں کو ان پر چھریاں چلاتے دیکھ کر میں بے ہوش ہوگئی تھی۔ کسے معلوم بدمعاشوں نے ان کا کیا حال کیا ہوگا؟ جگت بھائی' گھوڑے کو اور تیز دوڑائیں میری جان آدھی ہو رہی ہے۔ وہ مجھے زندہ ملیں گے بھی یا نہیں؟'' جگت نے اسے جھوٹے دلاسے دے دے کر راستہ ختم کیا تھا۔ مگر جو سچ تھا وہ اب سامنے آنے والا تھا۔ اس خیال سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ بیوہ ہو چکی ہے' کیا وہ یہ صدمہ برداشت کر سکے گی؟ سوگ سے سناٹے میں ڈوبے ہوئے محلے میں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز گونجنے لگی۔ شمشان سے آنے کے بعد ابھی لوگ سوئے ہی تھے۔ بچن برآمدے میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ لڑکا اس کے پہلو میں سو گیا تھا۔ گھوڑے کی ٹاپوں کا تصور کر کے، بچن دو تین بار اٹھ کر بیٹھ گیا تھا مگر اس بار واقعی گھوڑے دکھائی دیے۔ وہ چارپائی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ''اچلا آ گئی۔'' جیسے اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ جگت جست لگا کر نیچے اتر آیا۔ ہاتھ تھام کر اچلا کو نیچے اتارا۔ بچن نے دیکھا ہوشیار کے ساتھ بھی ایک عورت تھی۔ ''جگت!'' کہتا ہوا بچن دوڑا اور جگت سے بری طرح لپٹ گیا۔ پھر برابر میں کھڑی ہوئی اچلا سے آنکھیں چار ہوئیں۔ مسرت اور لوگوں کے درمیان اس کا دل پس کر رہ گیا۔ اسی لمحے لڑکا دوڑتا ہوا آ کر ماں سے لپٹ گیا۔

''ماں...... ماں...... تم آ گئیں؟'' اچلا نے اسے سینے سے لگا لیا۔

''بیٹا......!'' اس کا دل بھر آیا اور آنکھیں بہنے لگیں۔

''ماں!'' لڑکا اب بلک بلک کر رو رہا تھا۔ ''باپو کو ہم چھوڑ آئے۔'' بچن اور جگت کانپ گئے۔ بیٹے کے سر پر پھرتے ہوئے اچلا کے ہاتھ تھم گئے۔ اچانک آنسو رک گئے۔ ''چھوڑ آئے؟'' ان الفاظ کے ساتھ اچلا کی چیخ گونجی۔ اس چیخ سے سناٹے میں آگ سی لگ گئی۔ شاید قدرت بھی لرز گئی ہوگی۔

''ارے اچلا آ گئی...... ساوتری آ گئی۔'' چیختے ہوئے پڑوسی آ گئے۔ ساوتری اور دوسری عورتوں نے اچلا کو سنبھال لیا۔ جگت نے لڑکے کو اپنے قریب کر کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''سینہ مضبوط رکھنا بیٹا! ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔''

''رام بھگت...... رام بھگت! دیکھو تمہاری

ساوتری آ گئی۔" بھیڑ میں داخل ہوتے ہوئے ساوتری کے شوہر سے کسی نے کہا۔"اس مرد نے ہماری عورتوں کی لاج بچالی۔"

شوہر کو سامنے دیکھ کر ساوتری کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ شوہر کے قدم چھونے جھکی مگر بھگت رام نے پیر کھینچ لیے اور جھٹکے سے پشت پھیرلی۔ یہ جھٹکا سب کی آنکھوں میں کھٹک گیا۔

"اب کیوں واپس آئی؟ غنڈوں نے تجھے خراب کردیا ہوگا۔" بھگت رام دانت پیس کر بولا۔

"نہیں نہیں......" ساوتری بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

ہوشیار سے نہ رہا گیا۔"ہم موقع پر پہنچ گئے تھے۔کسی عورت کو آنچ نہیں آئی ہے۔"

بھگت رام نے ترچھی نظروں سے ہوشیار کو دیکھا۔

"ہمارے نجی معاملے میں دخل اندازی کرنے کی ضرورت نہیں۔غنڈوں کو اسے پہلو میں دبا کر لے جاتے ہوئے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔میرے لیے اب یہ بیکار ہے۔"

"احسان کا بدلہ بدی سے دے رہا ہے؟" ایک عورت بولی۔"یہ بیچارے راتوں رات ہماری عورتوں کو لے آئے......" مگر بھگت رام درمیان میں ہی بول اٹھا۔

"میں نے انہیں لے آنے کو نہیں کہا تھا۔اسے رکھنا ہوتو اپنے ساتھ لے جائیں۔" ساوتری کے دل میں آگ لگ گئی۔ بزدل شوہر بیوی پر بہادری جتا رہا تھا مگر اس کے کچھ کہنے سے پہلے جگت نے بھگت کو تیز نظروں سے گھورا۔ بھگت رام جگت کی نظروں کی تاب نہ لا کر نیچے دیکھنے لگا۔

"گدھے......عورت واپس آ گئی۔ بھگوان کا احسان مان' خواہ مخواہ بات بڑھا رہا ہے۔" جگت غصے کو قابو میں رکھ کر کہہ رہا تھا۔

"تیری بیوی پاک ہے۔اس کی جانب دیکھ' ہاتھ تھام کر گھر میں لے جا۔"

"نہیں نہیں......ایسا نہیں ہوسکتا۔راون سیتا کو لے گیا اور سیتا نے اگنی پرکشا دی۔ پھر بھی رام نے اسے نکال باہر کیا......" بھگت رام کے الفاظ ختم ہونے سے پیشتر جگت نے اس کے جبڑے پر چانٹا جڑ دیا۔

"بیوقوف......بزدل......رام کی مثال دے رہا ہے۔اس کی بیوی کو راون اٹھا لے گیا اس وقت وہ تمہاری طرح گھر میں چھپ نہیں گیا تھا۔ مقابلہ کرکے سیتا کو آزاد کرالایا تھا۔" یہ کہہ کر جگت نے دوسرے رخسار پر بھی چانٹا مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔

"نہیں جگت بھیا!" ساوتری درمیان میں آ گئی۔"میرے سوامی کو نہ مارنا۔"

جگا کا نام سنتے ہی سب سناٹے میں آ گئے۔ بھگت رام بھڑک کر دور ہٹ گیا۔

"بھائی صاحب! مجھ سے غلطی ہوگئی......مجھے خبر نہیں تھی کہ......" اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ لہٰذا تفصیل میں جانے کی بجائے اس نے ساوتری کا ہاتھ تھام لیا۔"چل گھر میں۔" وہ نرم ہو کر چپ چاپ وہاں سے چلا گیا۔اب سب کی آنکھیں جگت کو دیکھنے لگیں۔ان کے سامنے پنجاب کا خطرناک ڈاکو جگا کھڑا ہوا تھا۔ وہ اچلا کو رہا کرانے کیوں گیا ہوگا؟ اچلا کے میکے کا وہ رشتے دار کیا جگا کا ساتھی ہے؟ اس دوران اچلا کو ہوش آ گیا تھا۔ جگت اس کا منتظر تھا۔ وہ ظاہر ہونے کے بعد زیادہ دیر رک نہیں سکتا تھا۔

"بچن! اچلا کو ساتھ لے کر ہم روانہ ہو جائیں۔" پھر لڑکے کو چپت مار کر بولا۔ "کیوں بیٹا! میرے ساتھ گھوڑے پر بیٹھے گا؟" اس کے بعد ضروری سامان باندھ کر اچلا نے گھر کی چوکھٹ پار کی تو اس کا دل رو رہا تھا۔ شاردول کے ساتھ گزری ہوئی زندگی کے سکھ اور دکھ کے لمحات سے اس کا دل بھر آیا تھا۔ اس نے محلہ اس طرح چھوڑا تھا جیسے ایک جنم پورا کر کے دوسرے جنم میں قدم رکھ رہی ہو۔

گھر خبر لینے گیا ہوا سور جیت تین دن تک واپس نہیں لوٹا اس لیے جگت کو فکر ہونے لگی۔ دن بدن ہنگامے بڑھتے جا رہے تھے۔ ہجرت شروع ہو چکی تھی۔ جو کچھ لے جا سکتے تھے وہ باندھ کر لوگ وطن چھوڑنے لگے تھے۔ راستوں پر جہاں نظر ڈالو عورت' مرد اور بچوں کے قافلے چلے جا رہے تھے۔ جڑیں اکھڑے ہوئے درختوں کی طرح انسان دوسری دھرتی پر جمنے جا رہے تھے۔ کسے پتا ان میں سے کتنے لوگ اپنے نئے وطن صحیح سلامت پہنچ جائیں گے؟ پشتوں سے ایک جگہ رہتے ہوئے ان لوگوں کی پیشانیوں پر اچانک مہاجرین کی مہر لگ چکی تھی۔

جگت نے سوچا ممکن ہے اس کے گھر کے لوگ ہجرت کر گئے ہوں یا پھر جسے گھر بھیجا تھا وہ سور جیت ہجرت کرنے والوں میں مل کر چلا گیا ہو۔ مگر سور جیت لوٹ آیا۔ زخمی ہو کر سہی...... واپس ہوتے وقت کسی نے اس کی پیٹھ پر خنجر مارا تھا۔

"یہ تو اچھا ہوا کہ میرے پاس رائفل تھی۔ ورنہ زندہ واپس نہ آتا۔" اس نے سرد آہ بھری۔

"جدھر دیکھو قتل عام ہو رہا ہے۔ معصوم بچوں کو بھی بدمعاش نہیں چھوڑ رہے ہیں۔ بے رحمی سے انہیں ذبح کیا جاتا ہے۔ میرا خون کھول گیا ہے۔"

جگت کو گھر کی خیریت معلوم کرنے کی جلدی تھی۔ "گھر پر سب کیسے ہیں؟"

"سب ٹھیک ہیں' مگر......"

"رک کیوں گئے سور جیت؟" جگت کا دل بیٹھ گیا۔

"تمہاری ماں نے پیغام دیا ہے کہ دو دن میں ہجرت کر جائیں گے۔ انہوں نے کہا ہے کہ جگت سے ایک بار چہرہ دکھانے کے لیے کہنا۔ ماں جی کی آنکھیں ساون بھادوں کی طرح بہہ رہی تھیں۔ مجھ سے کہنے لگیں کہ جگت سے کہنا گھر میں قدم نہ رکھنا ہو تو دروازے میں ایک بار اس کی صورت دیکھ لوں۔ کسے پتا پھر ملاقات ہو گی بھی یا نہیں؟" یہ کہتے ہوئے سور جیت بھی رو دیا۔ "میں ماں جی کے آنسو نہیں دیکھ سکا۔ تمہیں خبر دینے کے لیے تیزی سے لوٹا مگر راستے میں دو دن ضائع ہو گئے' کیونکہ یہ زخم......"

جگت کے تصور میں آنسو بہاتی ہوئی ماں کی تصویر ابھر آئی۔ دستاویز میں انہوں نے بیٹے کی حیثیت میں چاہے اسے عاق کر دیا تھا مگر کوئی ماں اپنے دل سے بیٹے کو عاق نہیں کر سکتی۔

"جگت! ہم فوراً ہی تمہارے گاؤں روانہ ہوں گے۔" بچن نے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں ہم انہیں پالیں گے۔ گاڑیاں اس قدر بھر کر جا رہی ہیں کہ لوگ دو چار دن اسٹیشن پر پڑے رہتے ہیں۔"

"جی ہاں جگت بھائی! مجھے بھی کسی کے ساتھ کی ضرورت ہے۔ کب تک تم پر بوجھ بن کر پڑی رہوں گی؟" اب اچلا بولی۔ "تم مجھے وہاں چھوڑ آؤ تو میں ان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔"

"اس کی بجائے ہم سب ساتھ روانہ ہوں پھر......؟" ہوشیار نے مشورہ دیا۔ "جلد یا بدیر یہاں سے جانا ہی ہے تو جانے والوں کے ساتھ مل

کر آسانی سے کیوں نہ نکل جائیں؟" جگت خاموش رہا۔ گروہ کے ٹوٹنے کا خیال اسے بے چین کر رہا تھا۔ دوسرے ویرو کا خیال اسے پریشان کر رہا تھا۔ وہ کہاں ہوگی؟ کیا وہ بھی ہجرت کر جائے گی؟

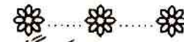
"کیا سوچ رہے ہو جگت؟" بچن بولا۔ "تمہارا خیال نہیں تو ہم نہیں جائیں گے۔ مگر ساتھیوں کو کیوں روکا جائے؟ انہیں بھی گھر والوں کی فکر ہو رہی ہوگی۔"

"بہتر ہے......" جگت بمشکل کہہ سکا۔ "جیسی آپ لوگوں کی مرضی۔" آپس میں مال کی تقسیم کر کے سالوں پرانے ساتھیوں سے جدا ہوتے ہوئے ان کے دل بھاری ہو گئے۔ جگت سب کو بار بار سینے سے لگا رہا تھا۔

"مقدر میں ہوا تو پھر ملیں گے۔"

"کہاں......امرتسر میں؟" ایک نے پوچھا۔

"ہاں......شاید وہیں۔" جگت نے کہا مگر اسے یقین نہیں تھا' کون جانے تقدیر کہاں لے جائے گی؟ ویرو مل جائے تو ممکن ہے سب کچھ سوچا ہوا رائیگاں ہو جائے۔



رتیا پہنچتے ہوئے دو راتیں گزر گئیں۔ جگت' بچن اور ہوشیار تینوں کے پاس آٹومیٹک گنیں تھیں۔ تینوں کے حصے کی چار پانچ ہزار کی چیزیں اور نقد رقم ان کے پاس تھی۔ اچلا بچن کے ساتھ گھوڑے پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کا بیٹا جگت چاچا سے لپٹ کر سواری کر رہا تھا۔ مال سب ہوشیار کے پاس تھا۔ پولیس سے بچنے کے لیے وہ رات کے وقت سفر کرتے اور دن میں کسی محفوظ جگہ آرام کرتے۔ راستے میں جگہ جگہ لوگوں کے قافلے نظر آ رہے تھے۔ سب کی منزل ایک تھی۔ انسانیت پر سے سب کا بھروسہ اٹھ چکا تھا۔ خدا کے بھروسے پر سب چل پڑے تھے۔ کبھی کبھی تو ایسے واقعات ہوتے کہ انسانوں کی لاشیں ٹھوکروں میں آتیں۔ زخمیوں کی موت کی چیخیں سنائی دیتیں' کسی بوڑھی بیمار ماں کو نصیب کے حوالے کر کے جوان بیٹے ہجرت کر گئے تھے۔ مذہب کے نعرے لگا کر لوگ مذہب کا جنازہ نکال رہے تھے۔

"آج صبح ہمارے گاؤں میں بڑا عبرتناک واقعہ ہو گیا۔" ایک جگہ کوئی کہہ رہا تھا۔ "پانچ چھ عورتیں کنویں پر پانی بھر رہی تھیں۔ نہ جانے کہاں سے دس بارہ غنڈے جھپٹ کر آ گئے۔ عورتیں گھبرا گئیں۔ کہاں جائیں؟ کیا کریں؟ کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ چاروں طرف سے گھر گئی تھیں۔ فرار کا راستہ بند تھا۔ کسی قیمت پر عزت کی حفاظت کرنی تھی۔ بے چاریوں کے پاس کوئی راستہ نہ تھا' لہٰذا انہوں نے ایک کے بعد ایک کنویں میں چھلانگیں لگا دیں۔ ایک عورت کی ہمت نہ ہوئی۔ اس نے فرار کی کوشش کی مگر غنڈوں نے اسے پکڑ لیا۔ دس بارہ غنڈوں نے اسے پامال کر دیا۔ دوسری پانچوں کو کنویں سے نکالا تو ان کی لاشیں ہی ملی تھیں۔" ایسا عبرتناک واقعہ بچن اور ہوشیار نے دل پر پتھر رکھ کر سنا مگر اچلا بلک بلک کر رونے لگی۔ اس کی نظر میں خانو کا غضب ناک چہرہ گھومنے لگا۔ جگت اگر نہ بچاتا تو اس کا بھی وہی حال ہوتا۔ اس نے سوچا گاؤں میں ایک جگا ڈاکو ہوتا تو کم از کم عورتوں کی عزتیں محفوظ رہتیں۔

برسات کی رات میں تین گھوڑے منزل کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ایک گاؤں کی حد پار کر کے کچھ آگے گئے تو ایک بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ جگت نے گھوڑے روک لیے۔

"بچن! تم لوگ یہیں رہنا! میں ابھی آ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ گھوڑے سے نیچے کودا۔ کھیتوں

میں پانی بھرا ہوا تھا' گن تیار رکھ کر جگت ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھا۔

جگت اکیلا گیا تھا اس لیے بچن کو فکر لگ گئی۔ وہ بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ جگت روتے ہوئے بچے کو لے کر واپس آیا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ اچلا کے ہاتھوں میں بچے کو تھما کر بولا ''اس کی ماں پر جبر کر کے بدمعاش فرار ہو گئے ہیں۔ وہ بے چاری نیم برہنہ حالت میں مردہ پڑی ہے اور.......'' وہ اس طرح رک گیا جیسے اس کے حلق میں کوئی چیز پھنس گئی ہو۔ پھر لمبی آہ بھر کر بولا۔ ''بچہ بے چارہ اپنی ماں کے برہنہ سینے کو چوسنے کی کوشش کرتے ہوئے رو رہا تھا۔''

''اوہ ......!'' اچلا کی ممتا تڑپ اٹھی۔ ''ان بدمعاشوں کو ایسے معصوم بچوں پر بھی رحم نہیں آتا ہوگا۔ اب بے چارے کا کون ہے؟''

''اچلا! اب تو تم ہی اس کی ماں ہو۔ اس ویرانے میں اس کے کسی رشتے دار کو کہاں تلاش کریں گے؟'' جگت نے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے کہا۔ اس کی ماں بے چاری تازہ بیوہ ہوئی ہوگی۔''

بچے کو اچلا نے سینے سے لگا لیا۔ گرم گود پا کر بچہ خاموش ہو گیا۔ پھر بھی اس کی سسکیوں میں اچلا کو دنیا کے تمام یتیم بچوں کی آہیں سنائی دے رہی تھیں۔

صبح ہونے سے پہلے رتیا کی حد آ گئی۔ اپنے گاؤں کا منظر دیکھ کر جگا نے عجیب سنسنی محسوس کی۔ ماضی کی یادوں کی موجوں سے سفینہ ڈولنے لگا۔ ہنومان کی یاد نے دل کے زخم ہرے کر دیے۔ ویرو کی یاد سے دل تڑپ اٹھا۔ جیسے جیسے گھر قریب آتا گیا' ماں' باپو اور چندن کور سب اس کے دل پر قبضہ جمانے لگے۔ گلیاں سونی تھیں۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا جیسے انسانی آبادی کے بغیر یہ محلّہ سونا ہو۔

سناٹے میں جگت کا دل گھبرانے لگا' اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹائے گا تو کون کھولنے آئے گا؟ کیا گھر میں داخل نہ ہونے کی ضد پر وہ قائم رہ سکے گا؟ یا دروازے کے باہر ہی سے سب کو مل کر واپس لوٹ جائے گا؟ وہ کیسی ضد کر رہا تھا؟ کیا ماں سے ایسا سلوک کیا جاتا ہے؟ خیالات کے گھیرے سے وہ کچھ آگے نکل گیا۔ اس کا اسے خیال تک نہیں رہا کہ گھر آ گیا ہے' اندازے پر اس نے گھوڑے کو روکا' ساتھ ہی خیالات کی لگام بھی کھینچ لی۔ پہلے تو اس نے محسوس کیا کہ وہ بھول گیا ہے' غلط جگہ پر آ گیا ہے۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ یہ کیا؟ گھر تو جل کر راکھ ہو گیا تھا...... جس دروازے کو کھٹکھٹانے کے لیے اس کے ہاتھ تڑپ رہے تھے' اس دروازے کا ایک ادھ جلا پٹ ہوا سے ہل رہا تھا۔ جس چوکھٹ پر پیر نہ رکھنے کی اس نے قسم کھائی تھی وہ چوکھٹ ہی نہیں رہی تھی......!

''جگت چاچا! رک کیوں گئے؟ پشت پر بیٹھا جھونکے کھاتا ہوا اچلا کا بیٹا بولا۔ ''آپ تو کہہ رہے تھے کہ آپ کا گھر آ گیا۔'' جگت پھر بھی خاموش رہا۔ بچن' اچلا اور ہوشیار بھی سکتے میں آ گئے۔ سب سمجھ گئے کہ انہیں آنے میں دیر ہو گئی ہے۔

''جگت! عقب کے دو چار گھر بھی جلے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔''

جگت خاموش سا گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ کیا کرنا چاہیے؟ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ آخر نیچے جھک کر اس نے دروازے کے پاس پڑی ہوئی راکھ اٹھائی' کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے پیشانی پر لگائی اور پھر جھٹکے سے دور ہٹ گیا۔

''گھر کی یہ حالت ہوئی ہے تو گھر والوں کی کیا گت بنی ہوگی؟'' وہ گرجا' تایا کے گھر جا کر معلومات

حاصل کرنے کے متعلق سوچ کر وہ گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا' اسی لمحے بچن نے اس کی توجہ ایک جانب مبذول کرائی۔

''جگت! سامنے درخت کے نیچے کوئی سویا ہوا نظر آ رہا ہے۔ دیکھیں کون ہے؟'' جگت نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا کوئی پیر سکوڑے سویا تھا۔ ''کون ہوگا؟'' یہ سوچ کر جگت نے قدم بڑھائے۔ نزدیک جا کر دیکھا تو کوئی سردی میں کپکپا رہا تھا۔ جگت نے آہستگی سے سر کا کپڑا اٹھایا۔

''آ گیا بیٹے؟'' بوڑھی عورت کی آواز سنائی دی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جگت نے لمحہ بھر محسوس کیا کہ اس کی ماں انتظار کر رہی تھی مگر آواز دوسری تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔

''ارے ہری چاچی...... آپ یہاں؟''

بوڑھی نے آہ بھری۔ ''تب تم میرے مدن نہیں ہو؟''

''نہیں چاچی' میں جگت ہوں...... مایا کور کا جگت۔''

''جگت...... مایا کا جگت۔'' چاچی کچھ دیر تک دیکھتی رہی۔ ''تمہاری ماں بھی میری طرح بیٹے کا انتظار کر کے چلی گئی۔'' جگت نے محسوس کیا اس کا دل بیٹھ جائے گا۔ مگر ہری چاچی نے کہا۔ ''اچھا ہوا سب صحیح سلامت چلے گئے۔ حرام خوروں نے مکان تک جلا دیے۔''

''چاچی! وہ لوگ کب گئے؟''

''تین چار دن ہو گئے تمہارے نانا آ کر لے گئے۔ کہہ رہے تھے وطن چھوڑ کر صحیح سلامت چلے جائیں تو اچھا ہے۔'' جگت کو کچھ اطمینان ہوا۔ اسے چاہے دیر ہوگئی ہو اور کوئی نہ مل سکا مگر گھر کے سب لوگ سلامت چلے گئے۔

''چاچی! آپ کیوں رہ گئیں؟''

''بیٹے! میں مدن کے انتظار میں رک گئی۔'' چاچی کی آواز بھیگ گئی۔ ''وہ میکے گئی ہوئی بہو کو لانے گیا ہے۔ ابھی نہیں لوٹا۔'' کچھ دیر خاموش ہو گئیں' پھر آہ بھر کر بولیں۔ ''مدن بہو کو لے کر آئے اور جلا ہوا مکان دیکھ کر غلط نہ سمجھ بیٹھے' لہٰذا یہاں سامنے لیٹی ہوئی ہوں۔''

جگت کو ایک منحوس خیال آیا' ممکن ہے بیٹا ماں کو لینے ہی نہ آئے۔ اس نے چاچی کو بہت سمجھایا۔ ''ہمارے ساتھ چلو! گاڑی میں بٹھا دیں گے۔ جوان بیٹا کسی طرح نکل آئے گا۔'' مگر چاچی نہیں مانی۔ ''مجھے نہ دیکھ کر اس کا دل بیٹھ جائے گا۔''

آخر جگت کو اٹھنا پڑا مگر جانے سے پہلے اس نے بڑھیا کے ہاتھ میں کچھ روپے دیے۔ ''انہیں رکھیں! کام آئیں گے۔'' چاچی نے چپ چاپ لے لیے۔ دعائیں دیں مگر نہ جانے کیوں جگت کو محسوس ہو رہا تھا کہ ماں جس بیٹے کے انتظار میں یہاں سردی گرمی برداشت کرتی ہوئی پڑی ہے' وہ بیٹا بہو کو لے کر تنہا ہی چلا جائے گا۔ وہ بھاری دل سے گاؤں چھوڑ کر شیخوپورہ کی جانب روانہ ہوا۔ کافی دیر خاموشی کے بعد جگت نے کہا۔

''بچن! اس چاچی کو چھوٹے بچے پاگل کہہ کر چڑاتے تھے' مگر پاگل ہونے کے باوجود اس کی ماتا ختم نہیں ہوئی یہ بات آج سمجھ میں آئی۔''

(ان شاءاللہ باقی آئندہ ماہ)

